38

اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی اَور انوکھی کتاب

مکافاتِ عمل

دید و شنید

اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ یہاں بھی محدود پیمانے پر جزا اَور سزا کا عمل جاری ہے۔ اس حوالے سے مصنّف نے اسی معاشرے کے ۲۳۰ سچے اَور جیتے جاگتے واقعات مرتّب کیے ہیں۔ بہت دلچسپ، سبق آموز، ایمان افروز اَور عمل پر ابھارنے والے۔

تحقیق و ترتیب: ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی ایچ ایم ایس

اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی اور انوکھی کتاب

مکافاتِ عمل

دید و شنید

اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ یہاں بھی محدود پیمانے پر جزا اور سزا کا عمل جاری ہے۔ اس حوالے سے مصنف نے اسی معاشرے کے ۲۳۰ سچے اور جیتے جاگتے واقعات مرتب کیے ہیں۔ بہت دلچسپ، سبق آموز، ایمان افروز اور عمل پر اُبھارنے والے۔

تحقیق و ترتیب

ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ ڈی ایچ ایم ایس

کتاب سرائے
بیت الحکمت لاہور کا اشاعتی ادارہ
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

بیاد

پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ

۱۹۴۷ - ۲۰۰۹

۱۴۳۱ ہجری ۲۰۱۰ء

نام کتاب : مکافاتِ عمل

مؤلف : ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : روشن پرنٹرز، لاہور

اس کتاب کے مختلف کرداروں کے اصل نام تبدیل کر دیے گئے ہیں، پھر بھی کسی خاندان یا فرد سے مماثلت اتفاقیہ ہوگی اور مصنف اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

ڈسٹری بیوٹرز

فضلی بک

فضلی بک سپر مارکیٹ

اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔

فون: 32212991-32629724

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884

ای میل: hikmat100@hotmail.com

انتساب

میں اس کتاب کا انتساب دو ایسی شخصیات سے کر رہا ہوں جو مجھے بے حد محبوب ہیں اور میرے دل میں اُن کے لیے بہت گہری عقیدت موجزن ہے...... یعنی مشہور ناول نگار، مورّخ اور مفکر نسیم حجازیؒ اور مدیرِ تکبیر، شہیدِ اسلام محمد صلاح الدینؒ...... اللہ دونوں کی قبروں کو نور سے بھر دے، انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات سے نوازے اور مجھے اُن کی رفاقت عطا کر دے۔

نسیم حجازی میرے مرشدِ اوّل ہیں۔ مَیں نے اُن کی کتابوں سے تحریر کا حسن اور وقار، خیالات کی پاکیزگی اور دینِ اسلام سے گہری محبت کا درس لیا...... اور محمد صلاح الدین شہیدؒ سے اعلیٰ اخلاقی، انسانی اور علمی اقدار کی روشنی حاصل کی۔ بلاشبہ یہ دونوں محترم حضرات بے مثال خوبیوں کے حامل تھے اور مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے دونوں سے غایت درجے کی محبت ہے۔

(مصنّف)

فہرست عنوانات

دیباچہ

گزارشات اَور وضاحتیں

یہ میرے بچپن کے زمانے کی بات ہے۔ اُس دور میں دیہات میں سب سے بڑی تفریح کبڈی اُور کشتی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ مارچ اپریل کا میٹھا موسم تھا اور نہر اپر چناب کے کنارے کھلے میدان میں کشتیوں کے مقابلے ہو رہے تھے اور قریب قریب واقع چار دیہات کے سینکڑوں لوگ وسیع اکھاڑے کے گرد کھڑے ہو کر یہ مقابلے دیکھ رہے تھے۔

مہر عظیم ہمارے پڑوسی گاؤں کا نامی گرامی پہلوان تھا۔ وہ مثالی صحت اُور مثالی جسم کا مالک تھا۔ اللہ نے اُسے واقعی بہت خوبصورت بنایا تھا اُور اس نے بھی اپنے جسم کو بہت سنبھال کے رکھا ہوا تھا، لیکن اُس کی کمزوری یہ تھی کہ وہ تین چار جماعتوں سے زیادہ پڑھ نہیں سکا تھا اور صحت اور وجاہت نے اُسے غیر معمولی غرور میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ اکھاڑے میں اُترا تو جوانی کی مستی اور غرور میں مدہوش تھا۔ اُس کے انگ انگ میں بجلیاں بھری ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ کمال پھرتی کے ساتھ ناچ رہا تھا اُور حریف کو بار بار للکار رہا تھا، لیکن کوئی بھی اُس کے مقابل آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔ تب اُس کا تکبر فزوں تر ہو گیا اُور وہ پکار اُٹھا کہ کسی ماں نے وہ بیٹا جنا ہی نہیں جو میرے سامنے آئے اُور میرا مقابلہ کرے۔ اُس کے للکاروں میں اور ناچ میں کہیں زیادہ شدت آ گئی تھی۔

تب ایک حیرت انگیز منظر نمودار ہوا۔ تماشائیوں میں سے ایک شخص لنگوٹا باندھے ہوئے باہر آیا اُور عظیم کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس کا قد ساڑھے چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا جبکہ مہر عظیم بلند قامت تھا اُور اُس کا قد چھ فٹ سے بھی زیادہ تھا۔

یہ شخص دبلا پتلا تھا اُور کسی طرح بھی پہلوان دکھائی نہ دیتا تھا۔ اسے دیکھ کر مہر عظیم نے فلک شگاف قہقہے لگائے، وہ ہاتھوں کو پوری بلندی تک اُوپر لے گیا اُور انہیں اپنی رانوں پر زور سے

گرا دیا۔ یہ گویا طنز، تمسخر اُور حقارت کا ایک غیر معمولی انداز تھا۔ تماشائیوں نے بھی مہر عظیم پہلوان کے سامنے ایک ناٹے قد کے منحنی سے آدمی کو دیکھ کر بے اختیار قہقہے لگائے: ''اوئے کیوں اپنی جان کے دشمن بن گئے ہو، مہر عظیم تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دے گا''۔ چاروں طرف سے آوازیں گونجیں۔ ''شیر کے سامنے خرگوش آ کھڑا ہوا ہے''۔

لوگوں کے قہقہوں اور تبصروں سے مہر عظیم کی گردن مزید تن گئی اُور وہ فخر سے دائیں بائیں دیکھنے لگا تو یکا یک دنگ کر دینے والا منظر بن گیا۔ ''چھٹانکی'' پہلوان کمال پھرتی سے نیچے جھکا اُور اُس نے مہر عظیم کو پنڈلیوں سے پکڑ کر دھم سے زمین پر گرا دیا اُور لوگوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا کہ عظیم زمین پر چِت گرا پڑا ہے۔

عظیم تڑپ کر چیتے کی طرح نہایت تیزی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا اُور خوفناک انداز میں حریف کی طرف بڑھا، لیکن ''دشمن'' نے پھر وہی داؤ آزمایا اُور عظیم کو آنِ واحد میں پنڈلیوں سے پکڑ کر دوبارہ زمین پر گرا دیا۔ وہ ایک بار پھر اُٹھا، دوبارہ مقابل پر حملہ آور ہوا، لیکن حریف نے حیرت انگیز طور پر اُسے تیسری بار پھر چِت گرا دیا اُور لپک کر اُسے کے سینے پر بیٹھ گیا۔ عظیم کے دونوں کندھے زمین کو چھو گئے، ریفری نے ناٹے پہلوان کی فتح کا اعلان کر دیا اُور مہر عظیم ذلّت و نکبت کا نشان بنا، سر جھکائے، ماتھے سے پسینہ پونچھتا ہوا میدان سے نکل گیا۔

میں نے یہ حیرت انگیز منظر بڑی توجہ سے دیکھا۔ اگرچہ میری عمر اُس وقت تقریباً بارہ برس تھی، لیکن طبعی ذکاوتِ حس اُور سلامتِ طبع کی وجہ سے مَیں فوراً ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ مہر عظیم کو اُس کے غرور کی سزا ملی ہے اُور اس سزا کا انتظام اللہ نے خود کیا ہے۔

دوسرا منظر جسے مَیں کبھی فراموش نہیں کر پایا اُس کا تعلق غلہ منڈی سیالکوٹ سے ہے۔ مَیں نے ۱۹۵۹ء میں میٹرک کیا اُور جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں داخلہ لے لیا۔ چونکہ گاؤں سیالکوٹ سے خاصا دُور تھا، اس لیے عام حالات میں روزانہ ریل گاڑی سے سفر کر لیتا تھا، لیکن سردیوں میں مجھے مجبوراً شہر ہی میں قیام کرنا ہوتا تھا۔ پہلے سال کی بات ہے مَیں سمبڑیال کے ایک

کلاس فیلو کے ساتھ اُن کے رشتہ داروں کے ایک مکان میں مقیم تھا۔ یہ کمرہ غلہ منڈی سیالکوٹ میں تھا اُور اس میں چار پائیوں کے نیچے کسی چیز سے بھری ہوئی بوریاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔

مَیں نے اپنے دوست سے ایک روز پوچھا کہ ان بوریوں میں کیا ہے تو اس نے راز داری سے کہا کہ اِن بوریوں میں چائے کا پھوگ ہے۔ اس مکان کے مالک فلاں شیخ صاحب ہیں، وہ ہوٹلوں سے استعمال شدہ چائے خرید لیتے ہیں اُور پھر اصل چائے میں ملا کر فروخت کرتے ہیں۔ اُن کا اشیائے خورد نوش کی تھوک کا کاروبار ہے۔ یہ شیخ صاحب بظاہر بہت ہی نیک اُور پارسا تھے، متشرع داڑھی تھی، سر پر جناح کیپ رکھتے تھے اُور دینی تبلیغ کا خاصا اہتمام بھی کرتے تھے، لیکن افسوس کہ وہ حرام حلال کی چنداں پروانہ کرتے تھے۔ چنانچہ مَیں نے اس ظلم کا وبال ان پر اس طرح پڑتے ہوئے دیکھا کہ کہ اُن کے بڑے بیٹے صفدر کی کمر پر پھوڑا نکل آیا جو ہزار علاج کے باوجود ٹھیک نہ ہوا اُور اسی عارضے میں یہ خوبصورت نوجوان عین جوانی میں جان ہار گیا ... مجھے اس امر میں ہرگز کوئی شبہ نہیں کہ یہ المیہ شیخ صاحب موصوف کی بے ایمانی اور حرام خوری کی وجہ سے رونما ہوا۔

اُور اس سلسلے میں مجھے اپنا بی اے کا کلاس فیلو اکرام اللہ خاں کبھی نہیں بھولا۔ یہ ایک تھانیدار کا بیٹا تھا۔ بی اے ایل ایل بی کرنے کے بعد سول جج بن گیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی دینی یا اخلاقی اعتبار سے ذرا بھی تربیت نہیں ہوئی تھی، چنانچہ اس نے رشوت ستانی اُور جلبِ زر میں کمال حاصل کیا۔ خوب دولت بنائی۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں بیوی کے نام پر خاصا بڑا مکان بھی خرید لیا۔ ریس بھی کھیلتا تھا اُور عیاشی کی دیگر صورتوں کو بھی جائز سمجھتا تھا۔

اُور پھر دو بیٹیوں اُور دو بیٹوں کے ہوتے ہوئے اکرام اللہ خاں نے ایک نوجوان نرس سے اُس وقت شادی کر لی جب اُس کی عمر تقریباً اٹھاون سال تھی اُور اُس کے سارے بچے جوان ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خاندان میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ بیٹوں اُور بیٹیوں نے باپ کی باقاعدہ پٹائی کی اُور بیوی نے پستول کی نوک پر اُس سے طلاق نامے پر دستخط کرا لئے اور اُس مکان سے اُسے ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا گیا جو اُس نے بڑے شوق سے خریدا تھا۔

اب اکرام اللہ خاں گزشتہ دس سال سے اپنی نرس بیوی کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ دوسری بیوی سے اُس کا ایک بیٹا ہے، ایک بیٹی ہے۔ بچوں کی عمریں بالترتیب چھ سال اُور چار سال ہیں۔ بیوی ایک ہسپتال میں نرس ہے، وہ ملازمت پر چلی جاتی ہے تو یہ بچوں کی خبر گیری کے لیے گھر پر ڈیوٹی دیتا ہے...... اُور اڑسٹھ سال کی عمر میں اُس کی زندگی مسائل اُور مصائب کا ایک مجموعہ بن کے رہ گئی ہے اُور یہ سارا وبال مالِ حرام کا ہے جو اُس نے نہایت ذوق وشوق سے کمایا تھا۔

یہ اللہ کا مجھ پر خصوصی کرم ہے کہ اُس نے مجھے نگاہِ عبرت عطا فرمائی اُور اپنے فضل ہی سے مشاہدے کی ایک غیر معمولی حس سے نواز دیا چنانچہ میں ایک واقعہ دیکھتا ہوں تو اس کی تہ میں اُتر جاتا ہوں اُور سمجھ جاتا ہوں کہ پسِ پشت کیا اسباب کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ اپنے گاؤں میں، رشتہ داروں اور خاندان میں اور اردگرد کے ماحول میں بہت سے واقعات میرے سامنے آئے جن سے میرے اس نقطۂ نظر کو تقویت ملتی گئی کہ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے اُور یہاں بھی جزا اُور سزا کا عمل محدود پیمانے پر جاری ہے، چنانچہ موضوع کی اہمیت اُور افادیت کے پیشِ نظر ارادہ کرلیا کہ میں اِن واقعات کو باقاعدہ کتابی صورت میں مرتب کروں گا کہ حیرت انگیز طور پر اُردو میں اس حوالے سے کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

''مکافاتِ عمل'' پر کام کرتے ہوئے ذہن میں کئی طرح کے خدشات پیدا ہوتے رہے کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ اگرچہ مَیں نے اصل کرداروں کے نام تبدیل کر دیے ہیں، لیکن واقعات کے آئینے میں بہت سے لوگ ناراض ہوں گے، پیچ پا ہوں گے اُور میرے در پے آزار ہونے کی کوشش کریں گے، لیکن درجنوں بیسیوں مشاہدات اُور جیتے جاگتے زندہ واقعات مجھے مجبور کرتے رہے کہ میں دنیا والوں کو لازماً دکھاؤں کہ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے اُور یہاں بھی محدود پیمانے پر جزا اُور سزا کا عمل جاری ہے۔

اس ضمن میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا مودودیؒ اُور حکیم محمد عبداللہؒ (جہانیاں والے) کی تحریروں نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ حضرت مولانا تھانویؒ کی کتاب

اصلاحی نصاب میں ''جزاء الاعمال'' کے عنوان سے ایک باب شامل ہے جو تقریباً چالیس صفحات پر محیط ہے اور دنیا میں گناہوں کی سزا پر بحث کرتا ہے۔اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:'' یہ ناچیز ناکارہ اپنے دینی بھائیوں کی خدمت میں عرض رساں ہے کہ اس وقت میں جو حالت ہم لوگوں کی ہے کہ طاعت میں کاہلی وغفلت اور معاصی میں انہماک و جرأت ظاہر ہے، جہاں تک غور کیا گیا، اس کی بڑی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ لوگ اعمالِ حسنہ وسیئہ کی پاداش صرف آخرت میں سمجھتے ہیں انہیں اس کی ہرگز خبر تک نہیں کہ دنیا میں بھی اس کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے''۔

میں ذیل میں اس باب کی ضروری تلخیص پیش کر رہا ہوں:

☆ اللہ کی اطاعت سے طرح طرح کی برکت ہوتی ہے۔قرآن میں ہے:

(ترجمہ) یعنی لوگ اگر ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے، تو ہم اُن پر کھول دیتے طرح طرح کی برکتیں آسمان سے اور زمین سے، لیکن اُنہوں نے جھٹلایا اور ہم نے اُن کو اُن کے اعمال کے بدلے میں پکڑ لیا

☆ اللہ فرماتے ہیں: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجاً وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتے ہوئے زندگی گزارتا ہے اللہ اُس کے لیے راستے آسان کر دیتا ہے اُس کو ایسی جگہ سے رزق عطا کرتا ہے جہاں اُس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا اور جو اللہ پر بھروسہ کرتا ہے، اللہ اُس کے لیے کافی ہو جاتا ہے۔

☆ اللہ فرماتے ہیں: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْراً یعنی جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اُس کے لیے آسانیاں پیدا فرما دیتے ہیں۔

☆ پھر فرمایا: مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یعنی جو مومن مرد یا عورت صالحیت اختیار کرلے اللہ اس کو بڑی ہی صاف ستھری زندگی عطا کرتے ہیں۔

ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اَنَّ الرَّجُلَ لَیُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ یُصِیْبُهٗ یعنی بے شک آدمی محروم ہو جاتا ہے رزق سے اُس گناہ کے سبب جو وہ اختیار کرتا ہے۔

ابنِ ماجہ میں عبداللہ ابنِ عمرؓ سے روایت ہے کہ ہم دس آدمی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ آپ ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے کہ پانچ چیزیں ہیں مَیں خدا کی پناہ چاہتا ہوں کہ تم ان کو پاؤ: جب کسی قوم میں بے حیائی کے افعال علی الاعلان ہونے لگیں گے، وہ طاعون میں مبتلا ہوں گے اور ایسی ایسی بیماریوں میں گرفتار ہوں گے جو ان کے بڑوں کے وقت میں نہیں ہوئیں اَور جب کوئی قوم ناپنے تولنے میں کمی کرے گی، قحط اور تنگی اَور ظلمِ حکّام میں مبتلا ہوں گے اَور نہیں بند کیا کسی قوم نے زکوٰۃ کو، مگر بند کیا جاوے گا بارانِ رحمت اُن سے اگر مویشی اَور جانور نہ ہوتے تو کبھی ان پر بارش نہ ہوتی اَور نہیں عہد شکنی کی کسی قوم نے مگر مسلّط فرماوے گا اللہ تعالیٰ اُن کے دشمنوں کو غیر قوم سے، بجبر لے لیں گے ان کے اموال کو......

- ☆ ایک بزرگ کا قول ہے کہ مجھ سے کبھی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس کا اثر اپنی بیوی اور سواری کے جانور کے مزاج میں پاتا ہوں، وہ دونوں پوری طرح اطاعت گزار نہیں رہتے۔
- ☆ گناہ کرنے والے کو اکثر کاموں میں مشکل پیش آتی ہے جبکہ تقویٰ اختیار کرنے سے کامیابی کی راہیں نکل آتی ہیں۔
- ☆ عبداللہ ابن عباسؓ کا قول ہے کہ نیکی کرنے سے چہرے پر رونق، قلب میں نور، رزق میں وسعت، بدن میں قوت اَور لوگوں کے دل میں محبت پیدا ہو جاتی ہے جبکہ بدی کرنے سے چہرے پر بے رونقی، دل میں اندھیرا، بدن میں سستی، رزق میں تنگی اور لوگوں کے دلوں میں بغض پیدا ہو جاتا ہے۔
- ☆ گناہ سے عمر گھٹتی ہے اَور برکت ختم ہو جاتی ہے۔
- ☆ گناہ سے عقل میں فتور آ جاتا ہے۔

☆ گناہوں کے نتیجے میں زمین میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پانی، ہوا، غلہ، پھل ناقص ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ یعنی لوگوں کے اعمال کی وجہ سے خشکی اور تری پر فساد برپا ہو گیا۔

☆ حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: نہیں نازل ہوتی کوئی بلا مگر بسبب گناہ کے اور نہیں دور ہوتی کوئی بلا مگر بسبب توبہ کے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں مختلف حوالوں سے مختلف مقامات پر ''مکافاتِ عمل'' کی اکاون مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں مختلف قسم کے لوگوں کی جزا و سزا کا ایک مفصل قانون موجود ہے اور یہ جزا و سزا دنیا سے آخرت تک انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے (تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۴۲۴) اس ضمن میں مولانا مودودیؒ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی ایک حدیث کا بھی حوالہ دیا ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ تم میں سے جو شخص نیکی کرے گا اس کی جزا آخرت میں ہے اور جو کسی قسم کی برائی کرے گا وہ اسی دنیا میں اس کی سزا مصائب اور امراض کی شکل میں بھگت لے گا (ابنِ مردودیہ تفہیم القرآن جلد ۶ ص ۴۲۵) ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے ہی سے مولانا مودودی نے اپنے ایک مکتوب میں بڑی ہی ایمان افروز بات کی ہے۔ حافظ آباد کے حکیم محمد شریف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: ''ایک بات اصولی طور پر سمجھ لیجیے کہ جو شخص خدا اور خلق کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے اور خدا کی راہ میں اس کی خلق کی بھلائی کے لیے کام کرے، خدا اُس کے ساتھ کبھی بُرا معاملہ نہیں کرتا'' (''مکاتیبِ زنداں'' ص ۶۲)

حکیم محمد عبداللہ جہانیاں والے ایک بے مثال طبیب، جید عالمِ دین اور باعمل مسلمان تھے۔ اُنہوں نے اپنی خودنوشت میں ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے اپنے مشاہدات بھی لکھے ہیں۔ اس سے میرے موقف کو تقویت ملی اور میں نے یہ واقعات اس کتاب میں شامل کر لیے جو آخری باب

میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

عہدِ حاضر کے مشہور مصنف، مبلغ اور محقق ڈاکٹر گوہر مشتاق (پی ایچ ڈی، مقیم امریکہ) اپنی قابلِ قدر کتاب ''موسیقی، اسلام اور جدید سائنس کی روشنی'' میں لکھتے ہیں۔

''اگر ہم قرآن کے انداز پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک طریقہ جس سے قرآن اپنا پیغام لوگوں کے دل ودماغ تک پہنچاتا ہے، وہ سچے واقعات کا بیان ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ واقعات کے ذریعے پیغام پہنچانا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، بہ نسبت خشک اندازِ بیان کے۔ انسانوں کو ایسے واقعات کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ذریعے وہ زندگی میں کوئی سبق حاصل کرسکیں۔ اس کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ واقعات کا تعلق تاریخ سے ہوتا ہے اور قرآن ہمیں ہمیشہ تاریخ سے سبق حاصل کرنا سکھاتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (سورۃ الاعراف آیت۱۷۶)

''پس بیان کرو واقعات تاکہ لوگ غوروفکر کریں۔''

امریکی مفکّر اور ماہرِ لسانیات بیری سینڈرز (BARRY SANDERS) اپنی کتاب A FOR OX میں لکھتا ہے کہ ہر تہذیب کی بنیاد ایک کتاب ہوتی ہے اور اس کی سب سے اہم خصوصیت اُس میں موجود تاریخ وقصص ہوتے ہیں اور قرآن تو ہے ہی ''احسن القصص''، یعنی اس میں بہترین قصے، بہترین انداز میں سنائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر گوہر مشتاق صاحب ہی کے حوالے سے امریکی نومسلم عالمِ دین شیخ حمزہ یوسف ہین سن (HANSON) اپنی کتاب BEYOND SCHOOLNG میں قصص وامثال کی اہمیت کے متعلق لکھتے ہیں: ''ہمیں کہانیوں کی اُسی طرح ضرورت ہے جس طرح پانی کی۔ ہمیں حکایات کی ضرورت ہے۔ قرآن ایک عظیم تذکرہ ہے۔ يَقُصُّ عَلَيْنَا۔ قرآن میں بہت سے قصص

ہیں۔ انسانوں کو ایسی کہانیوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کے معانی نکلتے ہیں''۔

مشہور نومسلم علامہ محمد اسدؒ اپنی تفسیرِ قرآن میں لکھتے ہیں ''قرآن جب بھی ماقبلِ اسلام پیغمبروں کے احوال یا قدیم تاریخی کہانیوں، واقعات یا قبل از نبوت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے واقعات کا حوالہ دیتا ہے تو اُس کا مقصدِ وحید اخلاقی سبق آموزی ہی ہوتا ہے۔

اور اس کتاب کو مرتب کرنے کا میرا بھی واحد مقصد یہ ہے کہ قارئین کے اخلاق کی تعمیر ہو، وہ روزمرہ زندگی میں غیر سنجیدگی کو ترک کر دیں اور انہیں بعض حکماء کے اس قول کی صداقت کا یقین ہو جائے کہ جو شخص دنیا کی چیزوں پر بغیر عبرت حاصل کئے نظر ڈالتا ہے، اس کے دل کی آنکھیں اس غفلت کے نتیجے میں کمزور ہو جاتی ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ میرے قارئین کو شرحِ صدر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص اور نیکی کو کبھی ضائع نہیں کرتا اور اس دنیا میں بھی اس کا صلہ اور انعام عطا فرما دیتا ہے جبکہ بدنیتی، بدخواہی، بددیانتی اور ظلم وطغیان کو وہ ہرگز گوارا نہیں کرتا اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو دنیا میں بھی اس کا لازماً خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے اور ''مکافاتِ عمل'' کی سچی کہانیاں ہر بستی، ہر قریے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ میں نے تو جس محفل میں اس موضوع کو چھیڑا، مجھے کوئی نہ کوئی واقعہ سننے کو مل گیا۔ تاہم مَیں نے صرف اُن واقعات کو کتاب کے لیے منتخب کیا ہے جن میں مجھے غیر معمولی پن نظر آیا۔ وسائل اور وقت اجازت دے تو بلا مبالغہ اس موضوع پر متعدد ضخیم کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ یہ کتاب انشاء اللہ اس سلسلے کا راستہ کھول دے گی اور مستقبل میں اس موضوع پر بہت سی کتابیں منظرِ عام پر آئیں گی۔

میرا ارادہ تھا کہ اسی کتاب میں مکافاتِ عمل کے حوالے سے مَیں عالمی اور تاریخی واقعات بھی شامل کروں گا، مگر عمومی واقعات کی تعداد ہی اتنی کثیر ہوگئی اور کتاب کی ضخامت اس قدر بڑھ گئی کہ مجھے یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اللہ کو منظور ہوا تو میں اس سلسلے کی دوسری جلد ''مکافاتِ عمل، تاریخ کے تناظر میں'' مرتب کروں گا (انشاء اللہ)

آخر میں میں پھر وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ چونکہ یہ سارے واقعات اسی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں، اور سو فیصد سچائی پر مبنی ہیں، اِن کے بیان میں اگرچہ مَیں نے نام تبدیل کر دیئے ہیں (خیر کے واقعات میں نام اور مقامات تبدیل نہیں کئے گئے) پھر بھی بعض لوگ اُنہیں پہچان جائیں گے اور وہ خود بھی اس آئینے میں اپنی تصویر کو ملاحظہ کرلیں گے۔ مَیں معذرت خواہ ہوں کہ اس ضمن میں مَیں کسی رورعایت سے کام نہیں لے سکا۔ ان لوگوں سے میری درخواست ہے کہ براہ کرم ناراض نہ ہوں، مجھے کوسنے نہ دیں بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے آخرت کی فکر کریں اور سنجیدگی سے غور کریں کہ مَیں نے تو یہ واقعات ڈھکے چھپے انداز میں، نام لئے بغیر لکھ دیئے ہیں، لیکن روزِ قیامت اُس وقت کیا ہوگا، جب اربوں کھربوں انسانوں کے سامنے اعمال کی ساری جزئیات، مکمل ثبوت کے ساتھ پیش ہوں گی اور اُن کا بے لاگ محاسبہ ہوگا۔

مَیں اپنے اُن سب دوستوں اور خیر خواہوں کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے مختلف واقعات زبانی سنائے یا تحریری صورت میں فراہم کئے۔ مَیں ''کتاب سرائے'' کے مالک جناب جمال الدین افغانی صاحب کا بھی سپاس گزار ہوں جو اس کتاب کو اہتمام کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔

عبدالغنی فاروق

جمعرات ۳۱؍دسمبر ۲۰۱۰ء

باب:۱

نیکیوں کا بدلہ دنیا میں

قرآنِ پاک کی مشہور آیت ہے (سورۃ النحل ۱۶/ آیت نمبر ۹۷)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًامِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ج وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

یعنی جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ ہو وہ مومن، اُسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اُور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان بھی نیک اعمال کرے گا اُور نیک اعمال میں خدمتِ خلق اُور عامۃ الناس کی بھلائی بھی لازماً شامل ہے، اُسے آخرت میں تو اُس کے اخلاص کے مطابق بہترین اجر ملے گا ہی، لیکن ایسے شخص کی دنیاوی زندگی بھی کامیاب و بامراد ہوگی اُور اُسے قلبی سکون اُور راحت کی نعمتوں سے بھی سرفراز کیا جائے گا۔ اسی سلسلے کی ایک اور آیت ہے وَ اَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (الرعد ۱۳/ آیت ۱۸) یعنی ہر وہ چیز جو خلقِ خدا کے لیے نفع بخش ثابت ہوتی ہے اُسے اللہ تعالیٰ دوام عطا کر دیتا ہے۔

ذیل کے واقعات اِن قرآنی نویدوں کی زندہ اُور جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ اُمید ہے قارئین انہیں دلچسپی سے پڑھیں گے اُور یہ اُن کے لئے افزونیِ ایمان کا سبب بنیں گے۔

قرآنِ پاک کا ایک زندہ معجزہ

یہ حیرت انگیز اور ایمان افروز واقعہ مجھے سردار غلام جیلانی نے سنایا۔ سردار صاحب کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے۔ بڑے باوقار، سنجیدہ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باعمل مسلمان ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ موضع گورا، تحصیل پلندری، ضلع سدنوتی کے رہنے والے ہیں۔ زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گورا گاؤں راولپنڈی سے ۹۶ کلومیٹر جانبِ مشرق واقع ہے۔ پولیس کالج سہالہ سے آزاد پتن جانے والی سڑک اُدھر کو جاتی ہے۔

سردار صاحب نے بتایا: میرے گاؤں میں ریٹائرڈ کیپٹن محمد صدیق خاں بڑے ہی نیک نام انسان ہیں۔ مخیّر ہیں اور انسانی ہمدردی کے پیکرِ مجسّم ہیں۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد گاؤں ہی میں زمیندارہ کرتے اور رفاہی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ رشتے میں یہ میرے پھوپھا ہیں، ان کی والدہ محترمہ مساۃ مہرجان (زوجہ حسین خاں مرحوم) ۸۵ سال کی بزرگ خاتون ہیں۔ وہ اگرچہ ان پڑھ ہیں، لیکن قرآن پڑھنا اور پڑھانا ان کا عمر بھر محبوب ترین مشغلہ رہا ہے۔ انہوں نے بلا مبالغہ سینکڑوں بچوں اور بچیوں کو قرآنِ پاک پڑھایا ہے۔ قرآنِ پاک سے ان کے شغف کا یہ عالم ہے کہ ۱۹۸۵ء میں انہوں نے تقریباً ستر سال کی عمر میں اصرار کر کے اپنی پوتیوں سے اردو پڑھنا سیکھی۔ پوتیاں کالج میں پڑھتی تھیں اور مذاق کرتی تھیں کہ دادی اماں! اب آپ اردو پڑھ کر کیا کریں گی؟ جواب دیتیں کہ قرآن کو ترجمے کے ساتھ سمجھنا چاہتی ہوں، چنانچہ انہوں نے واقعی اردو پڑھنا سیکھ لیا اور دو سال میں پورا قرآنِ پاک ترجمے کے ساتھ ختم کر لیا۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ۱۹۸۷ء میں مہرجان کی بائیں آنکھ میں درد شروع ہو گیا جو بڑھتا چلا گیا۔ ۱۹۸۸ء میں موصوفہ اپنے دوسرے بیٹے محمد نذیر (سرکاری ملازم، کالا پل کراچی) کے پاس گئیں۔ وہاں ایک ڈاکٹر نے بتایا کہ آنکھ میں کالا موتیا اتر آیا ہے، اس لئے آپریشن نہیں ہو سکتا۔

جلد ہی دوسری آنکھ بھی اسی کیفیت سے دوچار ہوگئی تو ۱۹۹۱ء میں الشفاء ہسپتال راولپنڈی میں دائیں آنکھ کا آپریشن ہوا، لیکن بینائی میں چنداں فرق نہ آیا اور ۱۹۹۲ء میں دونوں آنکھوں کا نور کافور ہوگیا۔

مہر جان کی دنیا اندھیر ہوگئی، لیکن انہیں سب سے بڑا صدمہ یہ تھا کہ وہ قرآن کی تلاوت اور زیارت سے محروم ہوگئی ہیں۔ اس تصور نے انہیں ہلکان کر دیا اور وہ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہتیں کہ کلامِ پاک کی نعمت ان سے چھن گئی ہے۔ انہوں نے رو رو کر اپنے بیٹے کیپٹن محمد صدیق سے التجا کی کہ وہ انہیں کسی لائق ڈاکٹر کے پاس لے جائے اور علاج کرائے تاکہ بینائی کی بحالی کی کوئی صورت نکل سکے۔ ان کا بیٹا محمد صدیق انہیں ایک روز راولپنڈی کے الشفاء آئی سنٹر میں لے گیا اور وہاں سینئر اور لائق ترین ماہرینِ چشم ڈاکٹروں سے آنکھوں کا معائنہ کرایا۔ سب کا بالاتفاق فیصلہ تھا کہ آنکھوں کی بینائی مکمل طور پر ختم ہوچکی ہے اور اب اس کی بحالی کا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ سب ڈاکٹروں نے محترمہ مہر جان کو صبر کی تلقین کی اور اللہ سے دعا کرنے کا مشورہ دیا، لیکن مہر جان کا اصرار تھا کہ ہر قیمت پر اس کا علاج کرایا جائے۔ وہ بضد رہتیں کہ انہیں کسی دوسرے ڈاکٹر کے پاس لے جایا جائے، چنانچہ ماں کی آہ وزاری اور اصرار سے متاثر ہو کر کیپٹن محمد صدیق انہیں فوجی فاؤنڈیشن ہسپتال مورگا (پنڈی) لے گئے۔ افسوس یہاں بھی سب ڈاکٹروں نے مکمل معائنے کے بعد یہی رپورٹ دی کہ دماغ سے بینائی کا سرچشمہ خشک ہوگیا ہے اور اب اس کی بحالی کسی صورت بھی ممکن نہیں۔

۱۹۹۸ء میں موضع گورا میں آئی کیمپ لگا۔ ملک کے مختلف ہسپتالوں سے معروف ماہرینِ امراضِ چشم یہاں یکجا ہوئے۔ ان میں ڈاکٹر محمد منظور ملک (ملتان آئی کلینک) ڈاکٹر محمد ایاز (واپڈا ہسپتال راولپنڈی) ڈاکٹر محمد اجمل اور ڈاکٹر حمید (شیخ زید ہسپتال، لاہور) شامل تھے۔ اماں مہر جان کیمپ میں تشریف لے گئیں، سب ڈاکٹروں سے فرداً فرداً ملیں اور اضطراب اور اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ اس کی آنکھوں کا علاج کیا جائے۔ وہ تکرار کے ساتھ یہ کہتی تھیں کہ اللہ مجھے

بینائی کی نعمت دوبارہ ضرور عطا فرمائے گا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہی یہ ہے کہ میں قرآن پڑھتی رہوں اور جب دنیا سے کوچ کروں تو میرے لب قرآن کی تلاوت کر رہے ہوں، لیکن کسی ڈاکٹر نے بھی مہرجان کو امید کی بشارت نہ دی۔ سب نے تاسّف اور دکھ کے ساتھ انہیں یہی بتایا کہ ان کی بینائی کے سوتے خشک ہو چکے ہیں، اور ان کی بحالی کے دور دور تک امکانات نہیں ہیں۔

ڈاکٹر منظور ملک نے بتایا کہ جب میں اماں مہرجان کی آنکھوں کا معائنہ کر رہا تھا تو وہ درود پاک کا ورد کر رہی تھیں اور یقین و اعتماد سے کہہ رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی آنکھیں روشن کر دے گا۔

۹۹ء کا رمضان آیا تو مہرجان کی بے قراری غیر معمولی حد تک بڑھ گئی۔ ان کا زندگی بھر کا معمول تھا کہ وہ رمضان المبارک میں تلاوت کا غیر معمولی اہتمام کرتیں اور کئی بار قرآن ختم کر لیتیں، لیکن افسوس کہ بینائی کے خاتمے نے انہیں زندگی کے سب سے بڑے لطف اور راحت سے دور کر دیا تھا۔ تب انہوں نے اپنی محرومی کا مداوا عجیب و غریب طریقے سے کیا۔ عشق نے محبوب سے ملاقات کا نیا ڈھنگ ایجاد کر لیا۔ اماں مہرجان تلاوت کے لئے تیرہ سطروں والا قرآن پاک حاصل کرتی تھیں۔ اس رمضان میں بھی وہ باوضو ہو کر بیٹھتیں، وہی تیرہ سطروں والا قرآن پاک گود میں رکھتیں، اسے کھولتیں اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہہ کر سطر پر انگلی پھیر دیتیں اور تیرہ بار بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر صفحہ مکمل کر لیتیں۔ اس طرح ۱۹۹۹ء کے رمضان میں اُنہوں نے دو بار قرآن پاک ختم کر لیا۔

اس رمضان میں انہیں کئی بار خواب آیا کہ ان کی بینائی لوٹ آئی ہے، لیکن نیند سے بیدار ہوتیں تو ماحول بدستور تاریک پاتیں، تب رو رو کر آہ و زاری کرتیں، اللہ سے خوب دعائیں کرتیں کہ الٰہی میری بینائی بحال کر دیجئے تاکہ میں قرآن کے الفاظ دیکھ سکوں اور پڑھ سکوں۔ اسی طرح رمضان گزر گیا، عید الفطر آ گئی، گھر میں قرب و جوار کے سارے رشتہ دار اکٹھے ہوئے، لیکن اماں مہرجان کے لئے کسی کو دیکھنا ممکن نہ تھا، تاہم وہ آوازوں سے سب کو پہچانتی اور سب کا حال احوال

پوچھتی تھیں۔

۱۹۹۹ء کی عیدالضحیٰ کے موقع پر سردار غلام جیلانی اپنے گاؤں گئے تو اماں مہر جان نے انہیں بتایا کہ کہ پچھلے رمضان کے بعد شوال گزرا، ذیقعد آیا، ایک رات میں سوئی ہوئی تھی کہ خواب میں آواز آئی: ''تمہاری بینائی بحال کردی گئی ہے''، مَیں خوشی سے نہال ہوگئی، بیدار ہوئی تو اندازہ ہوا کہ فجر کا وقت ہو رہا ہے۔ وضو کیا، نماز پڑھنے لگی تو آنکھوں کے سامنے روشنی محسوس ہوئی۔ مجھے جانماز نظر آرہا تھا۔ نماز سے فارغ ہوکر کمرے سے باہر صحن میں آئی تو اردگرد کے مکانات دکھائی دینے لگے۔ مَیں بے پایاں خوشی کے ایک نئے احساس سے سرشار ہوگئی، لیکن مَیں نے ضبط کیا اور خاموش رہی۔ طلوعِ آفتاب کے آثار واضح ہوئے تو مجھے ہر چیز نمایاں ہوکر نظر آنے لگی۔ گردونواح کے پہاڑ، درخت، آنے جانے والے سب دکھائی دینے لگے۔ مَیں نے یہ سوچا ''یہ کوئی خواب تو نہیں'' لیکن خیال آیا کہ یہ خواب نہیں، حقیقت ہے۔ میرے مالک نے میری التجائیں سن لی ہیں اور قرآنِ پاک کی برکت سے مجھے بینائی کی کھوئی ہوئی بے مثال نعمت دوبارہ مل گئی ہے۔ تب مَیں دوبارہ اپنے کمرے میں آئی۔ قرآن پاک مجھے دور سے نظر آگیا، مَیں نے دوڑ کر اسے اٹھالیا، سینے سے لپٹالیا، خوب چوما اور پھر کھول کر دیکھا تو اس کے مبارک حروف میرے سامنے جگمگا رہے تھے۔ اب مَیں خوشی سے رونے لگی اور قرآن کو والہانہ انداز سے چومنے لگی۔

میرے رونے کی آواز سن کر میری چھوٹی بہو کریم جان بھاگ کر آئی، پوچھا کیا بات ہے؟ خیر تو ہے، مَیں نے مسرت انگیز سسکیوں کے درمیان اسے بتایا کہ دیکھو میری آنکھیں ٹھیک ہوگئی ہیں، میری بینائی لوٹ آئی ہے اور اب مَیں باقاعدہ دیکھ کر قرآن پڑھ رہی ہوں۔ کریم جان بھی خوشی اور تعجب سے نہال ہوگئی، اس نے زور زور سے آوازیں دے کر گھر کے سب افراد کو بلایا اور انہیں اس عجوبے کی اطلاع دی۔ سب حیران تھے، مبہوت تھے اور اللہ کی حمد و ثناء کرنے لگ گئے تھے۔ جلد ہی یہ اطلاع سارے گاؤں میں پھیل گئی اور سب آآ کر مجھے مبارکباد دینے لگے۔ سب قرآن کے اس معجزے پر حیران بھی تھے اور مرعوب بھی   بینائی کی بحالی پر مَیں نے خوب کسر

نکالی اور چند دنوں میں پانچ مرتبہ قرآن پاک ختم کرلیا۔ مہرجان کی مجموعی صحت بالکل ٹھیک ہے۔
البتہ عمر کی نسبت سے ضعف بڑھ گیا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح بچوں کو قران تو نہیں پڑھاتیں، لیکن
دن کا بیشتر حصہ اس عظیم و زندہ کتاب کی صحبت میں گزارتی ہیں۔

قرآن پاک ہر اعتبار سے ایک معجزاتی کتاب ہے اور چونکہ یہ براہ راست خالقِ کائنات کا کلام ہے اس لیے اس کے فرمودات محکم اور اٹل ہیں اور ریاضی کے کلیوں کی طرح ٹھوس نتائج کے حامل ہیں۔ اس ضمن میں ایک آیتِ مقدسہ ہے:

وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ رعد:۱۷

''یعنی جو چیز بھی انسانوں کے لیے نفع بخش ثابت ہوتی ہے، اللہ اسے مضبوطی سے زمین میں گاڑ دیتا ہے۔''

بالفاظِ دیگر اسے دوام حاصل ہو جاتا ہے اور وہ چیز خیر و برکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ قرآن پاک کے اس قولِ فیصل کے حوالے سے متعدد واقعات میرے پیشِ نظر ہیں جو معلومات اور افزونیِ ایمان کی خاطر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

(۱)

چودھری نذیر احمد (وفات ملتان ۱۹۷۶ء) جماعتِ اسلامی کے حلقوں میں نمایاں حیثیت کے حامل تھے۔ وہ ملتان کی مشہور تعلیمی درس گاہ جامع العلوم کے بانی اور سربراہ تھے اور اپنی جماعت کے شعبۂ تعلیم کے نگران تھے۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ریاضی میں ایم۔ اے کیا۔ ایک استاد کی حیثیت سے محکمہ تعلیم سے منسلک ہونا چاہتے تھے، لیکن ان کے والد محکمہ مال میں گرداور تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا تحصیل دار بنے، اس لیے والد کے اصرار پر چودھری نذیر احمد نے متعلقہ امتحان دیا اور نائب تحصیل دار بن گئے۔

یہ بات مجھے چودھری صاحب کے پرانے دوست غلام محمد بھٹی مرحوم نے سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ چودھری صاحب ضلع حصار کی تحصیل فتح آباد میں نائب تحصیل دار تھے۔ ایک مرتبہ وہاں

شدید ترین ژالہ باری ہوئی اور علاقے کی ساری فصلیں تباہ و برباد ہوگئیں۔ چودھری صاحب محکمہ مال کے ایک افسر کی حیثیت سے ''خرابہ'' لکھنے کے لیے اپنے عملے کے ساتھ وہاں دورے پر تشریف لے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ژالہ باری سے واقعی پورا علاقہ برباد ہوگیا ہے، لیکن حیرت انگیز طور پر عین اس آفت زدہ علاقے کے اندر کچھ کھیت بالکل سلامت ہیں اور انہیں معمولی سا بھی گزند نہیں پہنچا ہے۔

ظاہر ہے یہ منظر بڑا ہی پُراسرار اور حیران کن تھا۔ پتہ چلا کہ یہ کھیت ایک مسلمان زمیندار کے ہیں۔ دورے سے فارغ ہوکر چودھری صاحب خود اس زمیندار کے پاس تشریف لے گئے اور معلوم کیا کہ اس کا کیا خاص ''عمل'' ہے کہ مکمل تباہ شدہ علاقے کے اندر اس کے کھیتوں کو معمولی سا نقصان نہیں پہنچا۔

اس زمیندار نے بتایا کہ جب میری کوئی بھی فصل تیار ہوتی ہے، تو مَیں اپنے گاؤں کے غربا و مساکین کو بلا لیتا ہوں اور باقاعدہ وزن کر کے اناج اور بھوسے کا دسواں حصہ ان کے حوالے کر دیتا ہوں اور اپنا حصہ بعد میں گھر لے جاتا ہوں۔

''لیکن مَیں اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔'' اس زمیندار نے بتایا'' یہ تو شرعی طور پر میرا فرض ہے۔ مَیں اس حوالے سے کسی پر احسان نہیں کرتا۔ یہ نہیں کروں گا تو گنہگار رہوں گا۔ اس کے بعد خاص عمل مَیں یہ کرتا ہوں کہ اپنے ذرائع سے جائزہ لیتا رہتا ہوں کہ گاؤں میں کسی غریب کے گھر سے یا کسی بیوہ عورت کے گھر سے گندم یا غلہ ختم تو نہیں ہوگیا۔ وہ ضرورت مند تو نہیں ہے اور جس کے بارے میں مجھے ایسی خبر مل جائے، مَیں بغیر اس کے طلب کیے، ازخود اس کے گھر میں غلہ پہنچا دیتا ہوں۔ یہ ہے میرا خاص ''عمل''، جس کی وجہ سے میرے کھیت اللہ کی ناراضگی سے مکمل طور پر محفوظ رہے ہیں۔''

مَیں نے یہ واقعہ ایک محفل میں سنایا تو وزیر آباد کے معروف تاجر شیخ محمد انور مرحوم (سابق امیر جماعتِ اسلامی ضلع گوجرانوالہ) نے بتایا کہ اسی قسم کا ایک واقع ہمارے قریبی قصبے سوہدرہ

میں بھی رونما ہو چکا ہے۔ وہاں ایک مرتبہ کیڑے نے چاول کی ساری فصل تباہ کر دی تھی، مگر میاں عبدالخالق کے پچاس ایکڑ پر مشتمل سارے کھیت مکمل محفوظ رہے تھے اور انہیں معمولی سا نقصان نہیں پہنچا تھا اور اس کا سبب بھی یہ تھا کہ میاں صاحب بہت عبادت گزار اور خدا ترس انسان تھے۔ غربا و مساکین کا خاص خیال رکھتے اور انہیں بھوکا ننگا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

سوہدرہ میں میرے عزیز رہتے ہیں۔ مجھے وہاں ایک شادی میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ پنڈال میں بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ مَیں نے یہ بات چھیڑ دی اور حاضرین سے اس کی تصدیق چاہی تو سب لوگوں نے اس واقعہ کی صداقت کی گواہی دی۔ انہوں نے بتایا کہ میاں عبدالخالق تو انتقال کر چکے ہیں، مگر ان کے بھائی میاں عبدالرشید اسی محفل میں موجود ہیں۔ میاں عبدالرشید صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے ایک اور عجیب واقعہ سنایا۔ بتایا کہ مئی کا مہینہ تھا۔ تھریشر لگا ہوا تھا اور گندم نکل رہی تھی۔ اچانک شمال کی جانب سے گہرے کالے بادل امنڈ کر آئے اور ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اب لازماً بارش ہوگی۔ (سوہدرہ وزیرآباد کے قریب دریائے چناب کے نواح میں مشہور تاریخی قصبہ ہے۔ کسی زمانے میں اس پورے علاقے میں بارشیں کثرت سے ہوا کرتی تھیں۔)

میاں عبدالخالق تھریشر کے قریب ہی موجود تھے۔ انہوں نے گہرے کالے بادلوں کا یہ منظر دیکھا تو فوراً وضو کیا اور بے اختیار سجدے میں گر گئے اور اُس وقت سر اُٹھایا جب سارے بادل ہوا کے ساتھ تحلیل ہو کر غائب ہو گئے تھے۔

(۲)

چودھری علی محمد بدر میرے جاننے والے ہیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں، ان کا بڑا بیٹا سمال بزنس کارپوریشن میں افسر تھا اور اس حیثیت سے وہ کئی سال تک گلگت میں تعینات رہا۔ چودھری صاحب چونکہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے اور فارغ تھے،

اس لیے وہ گرمیوں کا سارا عرصہ اپنے بیٹے کے پاس گلگت میں گزارا کرتے تھے۔

انہوں نے مجھے یہ واقعہ سنایا کہ وہاں ان کا تعارف معراج عالم نامی ایک صاحب سے ہوا جو بڑے زمیندار تھے اور پاکیزہ دینی زندگی گزار رہے تھے۔ اس زمیندار نے چودھری علی احمد بدر صاحب کو بتایا کہ چند سال قبل ان کی ایک پنڈلی پر ایک پھوڑا نکل آیا جو کسی بھی علاج سے ٹھیک نہ ہوا اور پھیلتا چلا گیا، حتیٰ کہ اسلام آباد کے ایک اعلیٰ درجے کے ہسپتال کے ڈاکٹروں نے بھی اسے لاعلاج قرار دے دیا اور بتایا کہ ٹانگ کاٹنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں، ورنہ زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ اس کے لیے ہسپتال کے سرجنوں نے آپریشن کی تاریخ دے دی اور انہیں ہسپتال میں داخل کر لیا۔

مذکورہ زمیندار نے بتایا کہ حتمی طور پر جب یہ طے پا گیا کہ میری ٹانگ کاٹ دی جائے گی اور مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا تو اس روز میرے پاس پچھتر ہزار روپے تھے۔ میں نے ہسپتال کے نچلے درجے کے ملازموں کو یعنی چپراسیوں، صفائی کرنے والوں اور مالیوں، بیلداروں کو بلا لیا اور ساری کی ساری رقم ان میں تقسیم کر دی۔

آپریشن والا دن آیا تو آخری مرتبہ ڈاکٹروں کا پینل بیٹھا۔ ان میں ایک نیا ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے پھوڑا دیکھ کر کہا کہ ابھی ٹانگ نہ کاٹیں، فلاں ٹیکہ آزمالیں۔ جب وہ ٹیکہ لگایا گیا تو حیرت انگیز طور پر پھوڑا ٹھیک ہونا شروع ہو گیا اور چند روز میں پھوڑے کا وجود ختم ہو گیا۔ حالانکہ اس سے پہلے دنیا جہاں کے بہترین علاج آزمائے جا چکے تھے اور افاقے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ دراصل یہ کرامت تھی پچھتر ہزار روپے کے صدقے کی اور قرآن پاک کی اس نوید کی کہ جو چیز عام انسانوں کے لیے نفع بخش بنتی ہے، اللہ اس کو دوام عطا کر دیتا ہے، وہ خیر و برکت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

(۳)

چودھری مظفر حسین مرحوم (وفات ۲۲ر جولائی ۲۰۰۳ء) علمی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ وہ محکمہ زراعت میں اکیسویں گریڈ کے افسر تھے، لیکن انہیں تعلیم اور اقبالیات سے گہری مناسبت تھی اور اس حوالے سے وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ''تعلیم'' کے حوالے سے وہ اردو اور انگریزی زبانوں میں دو رسالے بھی شائع کرتے تھے۔

چودھری صاحب بہت اچھے انسان تھے اور مجھ سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے۔ ایک بار میں نے ''مکافاتِ عمل'' ہی کے حوالے سے ان سے کوئی یادگار واقعہ سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے بتایا: ''چودھری غلام قادر گوجر محکمہ زراعت ہی میں افسر تھے اور میرے دوست تھے۔ ان کا آبائی تعلق قصبہ مینگڑی تحصیل شکر گڑھ (ضلع نارروال) سے تھا۔ ان کے والد زمیندار تھے اور بہت ہی نیک اور خدا ترس انسان تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ زکوٰۃ اور عشر کا اہتمام کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بہت غریب پرور اور حساس تھے۔ انہوں نے اپنے قصبے کی بیواؤں اور یتیم بچوں کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔ یتیم لڑکیوں کی شادیوں میں خرچ کرتے اور غریب طالب علموں کی دل کھول کر امداد کرتے تھے۔

غلام قادر گوجر نے بتایا کہ ایک برس چاول کی فصل بالکل تیار ہو چکی تھی کہ چوہوں نے یلغار کر دی اور پورا علاقہ کاٹ کر رکھ دیا لیکن ہمارے کھیتوں میں پُراسرار طور پر دو بڑے بڑے بلّے آ کر بیٹھ گئے اور انہوں نے کسی چوہے کو کھیتوں میں نہیں گھسنے دیا اور ہماری فصل بالکل محفوظ رہی، اسے معمولی سا بھی نقصان نہ پہنچا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ زکوٰۃ اور عشر وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں، انہیں بھی اس کے روحانی ثمرات حاصل ہوتے ہیں لیکن اللہ کی طرف سے غیر معمولی فضل وکرم ان افراد کے حصے میں

آتے ہیں جو غریب پروری اور صدقات وخیرات کا غیر معمولی اہتمام کرتے ہیں۔

(۴)

یہ واقعہ میرے گاؤں واقع ضلع سیالکوٹ کی تحصیل سمبڑیال کے ایک شخص محمد شریف نے مجھے سنایا۔ وہ غریب آدمی ہے اور مزدور پیشہ ہے۔

اس نے بتایا کہ سمبڑیال میں رانا شاہ نواز نامی ایک شخص تھا۔ چھوٹا زمیندار تھا اور سمبڑیال منڈی کے قریب ہی تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر اس کی چند ایکڑ زمین تھی جس میں وہ سبزیاں کاشت کرایا کرتا تھا۔ شاہ نواز ایک معذور آدمی تھا۔ کسی حادثے میں اس کی ایک ٹانگ اس طرح متاثر ہوئی کہ اس کا فریکچر تو نہ ہوا، مگر گھٹنا منجمد ہو کر رہ گیا۔ وہ حرکت نہیں کرتا تھا اور شاہ نواز کو بیساکھیوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔

شاہ نواز مزاج کا بہت ہی اچھا انسان تھا۔ نماز کا بھی پابند تھا اور بڑا ہی خوش اخلاق تھا۔ آلو اور سبزیاں کاشت کراتا اور جو مزدور اس کے کھیتوں میں کام کرتے، وہ انہیں دوپہر کا کھانا بھی کھلاتا، آرام کا موقع بھی فراہم کرتا اور کام ختم ہو جاتا تو اجرت دینے سے پہلے سب کو چائے پلاتا اور جلیبیاں کھلاتا تھا...... یہ اس کی مستقل عادت تھی اور اس میں وہ ناغہ نہیں ہونے دیتا تھا۔

لیکن ایک روز یوں ہوا کہ وہ جلیبیاں منگانا بھول گیا۔ چائے کا وقت ہو رہا تھا، اس نے بیساکھیاں پکڑیں اور جلیبیاں لانے کے لیے خود ہی منڈی سمبڑیال کی طرف چل پڑا۔

محمد شریف نے بتایا کہ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ہم نے نہایت حیرت کے ساتھ دیکھا کہ رانا شاہ نواز اپنی دونوں ٹانگوں پر بیساکھیوں کے بغیر خراماں خراماں چلتا ہوا آ رہا ہے۔ ہم کام روک کر، کھڑے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ وہ ہمارے قریب آیا تو سب نے بیک زبان چلا کر پوچھا: ''یہ کیا ہو گیا، یہ کیسے ہو گیا؟ آپ تو ٹھیک ہو گئے! آپ تو ٹھیک ہو گئے۔'' تب شاہ نواز نے بتایا کہ میں سمبڑیال منڈی سے جلیبیاں لے کر واپس آ رہا تھا کہ ریلوے لائن کے پاس ایک کھلی جگہ پر

اچانک ایک بگولے نے مجھے گھیر لیا اور اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور جب میں کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا تو دیکھا کہ میرا گھٹنا بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔ اس کا تناؤ ختم ہو چکا ہے...... مَیں نے جلیبیوں کا لفافہ اٹھا لیا اور اور چلتا ہوا آ گیا ہوں۔ اب مجھے چلتے ہوئے ذرا بھی تکلیف نہیں ہو رہی۔

اور یہ اعجاز تھا شاہ نواز کی غریب پروری کا، اپنے مزدوروں کی سچی خیر خواہی اور ہمدردی کا۔ مولانا حالیؒ نے اسی جانب تو اشارہ کیا تھا:

کرو مہربانی تُم اہلِ زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرشِ بریں پر

(۵)

مندرجہ ذیل معلومات مجھے میرے شاگرد اور عزیز دوست انجنیئر اشفاق احمد بھٹی (مقیم مرغزار کالونی عقب اعوان ٹاؤن) نے فراہم کی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ شیخو پورہ روڈ پر ایک گاؤں ہے: مومن پورہ۔ یہ بھٹی صاحب کا آبائی گاؤں ہے۔ وہاں چودھری شیر عالم نامی ایک زمیندار تھے۔ چار سو ایکڑ زمین کے مالک تھے۔ (۷۵ سال کی عمر میں ۲۰۰۰ء میں وفات پائی) اگرچہ ان پڑھ تھے، لیکن بہت نیک، عبادت گزار، مخیّر اور غریب پرور تھے۔ گاؤں کے قریب جو زمین تھی اس میں سبزیاں، خربوزے اور گنے کاشت کراتے اور ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ جو جب چاہے سبزیوں، خربوزوں اور گنوں کو بلا معاوضہ آزادی سے حاصل کرے۔ چودھری شیر عالم غربا و مساکین اور مستحق لوگوں کو ان نعمتوں سے مستفید ہوتے دیکھتے تو بہت خوش ہوتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔ یہی نہیں بلکہ چودھری صاحب نے گاؤں کے بالکل قریب ایک قطعۂ زمین پرائمری اسکول کے لیے وقف کر دیا، اور وہاں اسکول تعمیر کر دیا جب کہ اس سے پہلے اسکول گاؤں سے بہت فاصلے پر تھا اور ننھے بچوں کو وہاں پہنچنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ چودھری صاحب

نے گاؤں میں دو دینی مدرسے بھی قائم کیے۔ایک بچوں کے لیے، دوسرا بچیوں کے لیے اور ان کے سارے اخراجات خود برداشت کرتے، کہیں سے چندہ وصول نہ کرتے، غریب بچوں اور بچیوں کے لیے رہائش، کھانے اور لباس کا بھی خود ہی انتظام کرتے، جس پر ماہانہ خرچ چالیس ہزار تک پہنچ جاتا تھا۔

چودھری شیر عالم بھٹی مرحوم کو اللہ نے پانچ بیٹے عطا فرمائے۔سب والدین کے فرمانبردار، نیک اور اپنے والد کے مزاج اور روایت کے امین تھے۔وہ موصوف محترم کی زندگی میں بھی باہم متحد ہو کر ایک ہی گھر میں زندگی گزارتے رہے اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کی باہمی محبت اور تعلق میں کمی واقع نہیں ہوئی۔سب بھائی خدمتِ خلق اور دینی بھلائی کے کاموں میں بدستور مصروف ہیں۔

غریب پروری اور فلاحِ عامہ کا دوسرا انعام چودھری شیر عالم کو یہ ملا کہ ان کی ساری فصلیں حیرت انگیز طور پر خوب پھلتی پھولتی تھیں۔انہیں کبھی کیڑا لگا نہ کوئی دوسری موسمی افتاد متاثر کرتی تھی۔ حد تو یہ ہے کہ ۱۹۷۱ء میں دریائے راوی میں زبردست سیلاب آیا اور پورا علاقہ اس کی زد میں آ کر برباد ہو گیا، مگر موصوف محترم کی فصلوں کو معمولی سا بھی گزند نہ پہنچا۔یہ زمینیں مومن پورہ کے مغرب میں واقع ہیں۔سیلاب آیا اور شمال اور جنوب میں تباہی مچاتا ہوا گزر گیا، لیکن چودھری صاحب کی زمینیں بالکل محفوظ رہیں۔اللہ نے اپنے وعدے کے مطابق خلقِ خدا کے لیے نفع بخش بننے والی فصلوں کو نقصان سے بالکل محفوظ رکھا۔

(۶)

محمد زاہد مخدومی منصورہ کے قریب ایجوکیشن ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ریٹائرڈ انجنیئر ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ناظم آباد کراچی میں ان کی بیگم کے تین قریبی رشتہ دار بھائی رہتے ہیں۔ان کے

چھوٹے چھوٹے کاروبار تھے اور انہیں بہت آسودگی حاصل نہ تھی۔ سوء اتفاق کہ چند سال پہلے ان کی والدہ فالج کے عارضے میں مبتلا ہو کر صاحب فراش ہوگئی۔ تینوں بھائی چونکہ کاروباری آدمی تھے اور بہت مصروف رہتے تھے، اس لیے چھ چھ ہزار روپے تنخواہ دے کر انہوں نے دو نرسوں کا انتظام کیا جو سارا دن ان کی والدہ کی خبر گیری کرتی تھیں۔ وہ خود بھی والدہ کا بہت خیال رکھتے اور ان کی دلدہی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔

والدہ کی بیماری اور علاج معالجے کا سلسلہ ڈھائی تین سال تک جاری رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مالیات پر شدید بوجھ پڑا۔ کاروبار تباہ ہوگیا، وہ مقروض ہوگئے حتیٰ کہ جس مکان میں رہتے تھے، وہ بھی گروی رکھنا پڑا۔

لیکن پھر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور سال ڈیڑھ سال میں حالات میں غیر معمولی تبدیلی واقع ہوگئی۔ کاروبار میں برکت شروع ہوگئی اور پھر ان پر پیسہ بارش کی طرح برسا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ تینوں بہت خوش حال ہیں۔ تینوں کے الگ الگ مکان ہیں اور مجھے یقین ہے یہ سارا انقلاب اس لیے رونما ہوا کہ انہوں نے اپنی بیمار والدہ کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک وقت میں اپنی معیشت کو بھی خطرے میں ڈالنے سے دریغ نہیں کیا تھا۔

(۷)

میں ایک شخص عبدالرحمٰن کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور سرکاری ملازم تھا۔ تنخواہ کے سوا اس کی آمدنی کا کوئی معمولی سا بھی ذریعہ نہ تھا، مگر اللہ نے اسے بہت بڑا دل عطا فرمایا تھا اور وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر اپنے والدین اور غریب رشتہ داروں کی مدد کرتا تھا۔ خصوصاً اس نے اپنی تین غریب بہنوں کی خوب خدمت کی، جس کے نتیجے میں اللہ نے

اسے خوب نوازا اور حیرت انگیز طور پر اسے تیزی کے ساتھ ترقیاں ملتی رہیں حتیٰ کہ وہ ملازمت کے بیسویں گریڈ تک پہنچ گیا۔

اپنے آبائی گاؤں میں عبدالرحمٰن کے دو بڑے بھائی بھی رہتے تھے۔ یہ خود ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھا اور والد کی وفات کے بعد والدہ اسی کے ساتھ رہتی تھیں۔ گاؤں میں اس کے حصے میں تین کمروں کا ایک مکان آیا تھا اور دنیاوی اعتبار سے اس مکان کے سوا اس کی کوئی جائیداد نہ تھی: نہ زمین نہ پلاٹ نہ کوئی دکان۔ یہی اس کا کل اثاثہ تھا...... اب چونکہ والدہ اس کے پاس شہر میں رہتی تھیں اور مکان خالی پڑا تھا، اس لیے بڑے بھائی نے وہ خریدنے کی خواہش ظاہر کی اور اس نے بہت سستی قیمت پر یعنی صرف بیس ہزار روپے میں مکان بھائی کے حوالے کر دیا۔

یہ بات مارچ ۱۹۸۳ء کی ہے۔ بیس ہزار روپے کی رقم عبدالرحمٰن نے زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی۔ اس کی بہت سی ضروریات تھیں، مالی مسائل تھے لیکن اس نے کمال ایثار سے کام لیا اور یہ ساری کی ساری رقم اپنی بڑی بہن کی بیٹی کی شادی میں صرف کر دی۔ اس کا بہنوئی بہت نالائق اور غیر ذمہ دار آدمی تھا۔ بیوی بچوں پر کچھ بھی خرچ نہیں کرتا تھا اور ان کی کفالت بھی عبدالرحمٰن کے ذمے تھی۔ چنانچہ اس نے بھانجی کا سارا ضروری جہیز بنایا، شادی کے جملہ انتظامات کیے اور بارات کو کھانا وغیرہ کھلا کر بیٹی کو عزت سے رخصت کر دیا۔

اس واقعے کو تین ہی مہینے گزرے تھے کہ جون ۱۹۸۳ء میں حیرت انگیز طور پر عبدالرحمٰن کو لاہور کی ایک بہت اچھی بستی میں دس مرلے کا بنا بنایا کھلا، روشن اور ہوادار مکان مل گیا۔ وہ ذاتی وسائل سے عمر بھر بھی کوشش کرتا تو اس بستی میں تین مرلے کا پلاٹ بھی نہیں خرید سکتا تھا...... مگر اللہ کا یہ وعدہ بھی تو اٹل ہے کہ ”جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا، اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو۔“ (سورۃ الطلاق، آیت: ۲-۳)

(۸)

مَیں عبدالکریم نامی ایک شخص کو جانتا ہوں جو خدمتِ خلق کا بے پایاں جذبہ رکھتا ہے اَور دوست احباب کی بچیوں کے رشتے کرانے میں سرگرم رہتا ہے چنانچہ اُس نے اب تک کم از کم بیس رشتوں کا اہتمام کیا ہے......اس کا صلہ اللہ نے اُسے دنیا ہی میں یہ دیا کہ اُس کی تین بیٹیاں ہیں اَور تینوں کے رشتے اس طرح طے ہوئے کہ کسی تیسرے فرد کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں پڑی، اُس کے تینوں داماد بہت لائق اور اچھے مزاج کے ہیں اَور اُس کی بیٹیاں اپنے گھروں میں خوش اور آسودہ ہیں۔

(۹)

رزقِ حلال کی طلب نے انہیں مالا مال کر دیا

متشرّ ع صورت کے خوش اخلاق اَور معصوم پیکر مہر محمد انیس صاحب (تاریخ پیدائش ۱۹۶۴-۳-۱) سے میری ملاقات محمد یونس مغل صاحب کی معیّت میں ۲۰۰۶-۳-۶ء کو ہوئی۔ وہ عوامی روڈ، پرانا ڈسکہ میں رہتے ہیں اور پراپرٹی کا کاروبار کرتے ہیں۔ غلہ منڈی میں اُن کی آڑھت کی دکان بھی ہے۔ اُن کی کہانی رزقِ حلال کی برکات کی ایک ایمان افروز کہانی ہے۔

اُنہوں نے بتایا: مَیں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۸۵ء میں پولیس کی ملازمت سے کیا۔ معمولی کانسٹیبل بھرتی ہوا۔ ۱۹۹۵ء میں ترقی کر کے اے ایس آئی بن گیا، لیکن ۱۹۹۹ء میں مَیں نے ملازمت ترک کر دی اَور پراپرٹی کا کاروبار شروع کر دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مَیں ملازمت کے دوران رشوت نہیں لیتا تھا۔ لوگوں کے جائز کام کرا دیتا تھا، تاہم کوئی خوشی سے کچھ دیتا تو انکار نہیں کرتا تھا۔

مَیں نے ۱۹۸۹ء میں شادی اپنے قریبی رشتہ داروں میں کی۔ مَیں نے عزم کر لیا تھا کہ اپنے سسرال کے لیے کسی پریشانی کا سبب نہیں بنوں گا۔ چنانچہ مَیں نے اُن سے کوئی معمولی سی چیز بھی طلب نہ کی۔ اس کا صلہ مجھے خدا نے یہ دیا کہ شادی کے پہلے ہی مہینے سیالکوٹ میں بِگ سٹی الاؤنس کا اجرا ہو گیا اَور میری تنخواہ ڈیڑھ سو روپے بڑھ گئی۔

پولیس کی ملازمت چھوڑنے کا سبب اردگرد کا یہ مشاہدہ تھا کہ تقریباً سارے پولیس افسروں کے گھریلو حالات بہت ہی خراب نظر آتے تھے۔ انسپکٹر، ڈی ایس پی وغیرہ سب کی اولاد خراب تھی، نالائق تھی، اِن کے لڑکے چوری اَور ڈاکوں میں ملوث تھے اور ماں باپ کو طرح طرح کی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا اَور اس کا سبب مالِ حرام تھا، رشوت کی کمائی تھی، مَیں سوچا کرتا کہ اگر مَیں

بھی ملازمت پر اکتفا کرتا ہوں، تو گزارہ مشکل ہوگا اور اگر رشوت لوں گا، تو میرے گھر کا اور اولاد کا وہی حشر ہوگا جو اِن لوگوں کا ہو رہا ہے۔ چنانچہ مَیں نے پختہ ارادہ کرلیا کہ نوکری چھوڑ دوں گا اَور کاروبار کروں گا۔

اس مقصد کی خاطر مَیں اپنی تنخواہ میں سے ہر ماہ ایک ہزار کی بچت کرنے لگا۔ چونکہ ہم پانچوں بھائی والدین کے ساتھ اکٹھے ہی رہتے تھے، اس لئے یہ بچت آسانی سے ہوگئی اَور مَیں نے ۱۹۹۵ء میں ایک بیگھ زمین نوے ہزار میں خرید لی۔ بیس ہزار ایڈوانس دیئے۔

اللہ نے کرم فرمایا اَور وہ زمین مَیں نے جلد ہی ایک لاکھ تیس ہزار روپے میں فروخت کردی۔ میرا حوصلہ بڑھا اور کاروبار کا سلسلہ چل نکلا۔ ۱۹۹۹ء میں مَیں نے ملازمت ترک کرکے ساری توجہ کاروبار پر مرکوز کردی۔ مَیں ایک ہاؤسنگ کالونی میں حصہ دار بن گیا اَور وہاں سے پندرہ سولہ لاکھ کا منافع ہوگیا۔ چنانچہ اب تک مَیں تین ہاؤسنگ کالونیاں بنا چکا ہوں۔ اللہ کا مجھ پہ بے حدوحساب کرم ہے اَور اب غلہ منڈی میں آڑھت کا کاروبار بھی ہے۔

مَیں اللہ کے فضل سے گزشتہ ڈیڑھ سال سے تبلیغ سے وابستہ ہوں۔ پہلے نیند نہیں آتی تھی۔ روپے پیسے ہی کے خیالات ذہن پر چھائے رہتے تھے۔ اب سکون سے سوتا ہوں اَور اللہ کی بے حدوحساب نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کرتا ہوں تین بیٹے اَور ایک بیٹی ہے۔ بحمد للہ سب فرمانبردار اَور نیک ہیں۔

(۱۰)

میرے آبائی گاؤں کوٹ بھگت (واقع تحصیل سمبڑیال، ضلع سیالکوٹ) کے قریب ہی ایک دوسرا گاؤں کوٹ بلند ہے۔ وہاں میرے ایک عزیز دوست چودھری محمد نواز گھمن رہتے ہیں۔ وہ خود چھوٹے زمیندار ہیں مگر اُن کے رشتے دار بارسوخ لوگ ہیں۔ ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ اُن کے

بڑے بیٹے نوید نواز گھمن نے بی اے کیا، تو اسے ملازمت کی تلاش ہوئی، رشتے داروں کے اثر و رسوخ کی وجہ سے اُسے پولیس میں اے ایس آئی کی پیش کش ہوئی، مگر اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پولیس میں رہ کر رشوت سے بچنا مشکل ہوتا ہے اُور وہ کسی قیمت پر مالِ حرام کے قریب نہیں جانا چاہتا۔

کچھ وقت کے بعد چودھری محمد نواز گھمن کے ایک رشتہ دار نے بتایا کہ نوید کو نائب تحصیل داری کا منصب مل سکتا ہے، لیکن اس کے لیے ایک لاکھ روپے خرچ کرنے پڑیں گے.....نواز گھمن صاحب راضی ہو گئے اُور انہوں نے جذبہ مسرّت کے ساتھ نوید کو یہ خوشخبری سنائی کہ تم عنقریب نائب تحصیل دار بن جاؤ گے......لیکن یہ جان کر کہ اس کے لیے ایک لاکھ روپے رشوت میں دینے پڑیں گے، نوید نے دوٹوک انداز میں انکار کر دیا کہ مجھے خواہ کتنا عرصہ بیکار رہنا پڑے، لیکن مَیں رشوت کے بَل پر ہرگز کوئی ملازمت قبول نہیں کروں گا۔ چودھری محمد نواز گھمن نے بتایا کہ نوید کی یہ بات سن کر مَیں بہت برہم ہوا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ تھانیداری تم نے مسترد کر دی اُور اب تحصیل دار بننے سے تم انکار کر رہے ہو، آخر تم زندگی میں کیا بننا چاہتے ہو؟

اس کے جواب میں نوجوان نوید نے کہا: مَیں مسلمان ہُوں اُور مَیں صرف اُور صرف حلال کے رزق پر زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ ہمارے نبیؐ نے صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ رشوت دینے والا اُور لینے والا دونوں جہنمی ہیں اس لیے مَیں رشوت دے کر یا لے کر جہنم میں نہیں جانا چاہتا۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا آپ فکر نہ کریں۔ اللہ مالک ہے، وہ اپنا فضل فرمائے گا اُور میری ملازمت کا انشاءاللہ بہت اچھا انتظام ہو جائے گا۔

چودھری محمد نواز گھمن نے بتایا: سچی بات ہے دینی معلومات کی کمی کی وجہ سے اُن دنوں میرا ایمان خاصا کمزور تھا چنانچہ مَیں اپنے بیٹے کی بات کو نہ سمجھ سکا اُور بڑبڑانے لگا کہ دیکھوں گا خدا تمہیں محض بی اے کی بنیاد پر تھانیداری سے اُور تحصیلداری سے اچھی ملازمت کیسے دیتا ہے؟ تم خواب دیکھ رہے ہو اُور خواب اکثر پورے نہیں ہوتے۔

لیکن حیرت انگیز طور پر ایک ہی مہینے کے بعد نوید کو سعودی عرب سے بلاوا آ گیا۔ اُس کے ایک ماموں وہاں ٹھیکے دار تھے۔ اُنہوں نے اُسے ویزہ بھجوا دیا۔ وہاں جاتے ہی اُسے ایک بین الاقوامی ادارے ''یونی لیور'' میں ملازمت مل گئی اَور تیس ہزار روپے تنخواہ مقرر ہوئی اَور اس طرح ثابت ہو گیا کہ مالِ حرام سے نفرت کرنے اَور رزقِ حلال کی طلب کرنے والوں کی اللہ اپنے فضل سے مدد کرتا ہے۔

نوید گھمن اب بھی سعودی عرب میں باعزت ملازمت کر رہا ہے۔ اَور مالی کشادگی کے علاوہ متعدد حج اَور عمروں کی سعادت سے فیض یاب ہو چکا ہے۔

(۱۱)

محمد اشفاق بھٹی (پیدائش مارچ ۱۹۶۳ء) دیال سنگھ کالج میں میرے شاگرد تھے جہاں سے اُنہوں نے ۱۹۸۴ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اشفاق احمد غیر معمولی سلامت طبع رکھنے والے نوجوان ہیں اور نیکی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ وہ اپنے بھائیوں کے اصرار پر ۱۹۸۵ء میں پولیس میں اے ایس آئی بھرتی ہو گئے، مگر ۱۹۸۸ء میں اس ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ اُنہوں نے پہلا سال ٹریننگ میں گزارا اور باقی دو سال ریزرو فورس میں خدمات انجام دیں۔ اس دوران میں وہ مجھے خط لکھتے رہتے اَور شدید کرب کا اظہار کرتے کہ پولیس کا ماحول شرافت اَور انسانیت کے بہت منافی ہے اَور اگر مَیں زیادہ دیر تک اس محکمے سے وابستہ رہا تو ضمیر مردہ ہو جائے گا اَور نیکی کا احساس دم توڑ دے گا۔

تب مَیں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ فوراً اس ملازمت کو ترک کر دیں۔ مجھے یقین ہے اللہ اپنے فضل سے انہیں بہتر رزق اور وسائل عطا فرمائیں گے۔

اَور میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اشفاق نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی۔ اُنہوں نے فوری طور پر چھ ماہ کا بوائلر انجنیرنگ کا کورس مکمل کر لیا اَور ۸۸ء ہی میں انہیں صوفی فیکٹریز

شیخوپورہ روڈ میں ملازمت مل گئی۔ چونکہ وہ محنت اَور دیانت پر کاربند تھے۔ اپنے فرائض نہایت خلوص سے انجام دیتے تھے، اس لیے انہیں وہاں بہت عزت حاصل ہوئی اَور پندرہ برس یعنی ۲۰۰۳ء تک ''صوفی'' میں کام کرتے رہے۔

۲۰۰۳ء میں اشفاق بھٹی صاحب نے بوائلرز کی مرمت اَور ری کنڈیشن کا کاروبار شروع کیا اَور ایک چھوٹی سی فیکٹری قائم کرلی اَور پانچ سال کے مختصر عرصے میں اللہ نے اُن کے کاروبار میں بہت برکت اور وسعت عطا کردی ہے اَور انہیں کروڑوں کے آرڈر ملنے لگ گئے ہیں۔

اشفاق صاحب دیانت دار اَور محنتی ہی نہیں ہیں وہ خلقِ خدا کے لیے بہت مخلص اَور مخیّر بھی ہیں۔ اپنے غریب رشتہ داروں کے کام آتے ہیں۔ غریبوں مسکینوں کی دل کھول کر مدد کرتے ہیں اَور رفاہی کاموں میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔ مَیں نے انہیں جب بھی کسی غریب اَور مستحق فرد کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا ہے، اُنہوں نے کبھی بھی اُس کی مدد سے پہلوتہی نہیں کی۔

(۱۲)

اصغر علی چودھری بھی دیال سنگھ کالج لاہور میں میرے شاگرد تھے۔ وہ خاموش طبع اَور غیر نمایاں طالب علم تھے، مگر بی اے کے بعد اُن کی شادی ایک صنعت کار خاندان میں ہوگئی اَور تقدیر نے انہیں ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مِل کا جنرل منیجر بنادیا۔ وہ کروڑوں کے مالک ہوگئے اَور حیرت انگیز طور پر اللہ نے انہیں بہت بڑا ظرف عطا کردیا۔ وہ زکوٰۃ پابندی اَور باقاعدگی سے نکالتے۔ اُنہوں نے فیکٹری کے اِردگرد خاصے بڑے علاقے کی بیوہ عورتوں، یتیم بچوں اَور غریبوں مسکینوں کے وظائف مقرر کردیئے۔ اس کے علاوہ بھی وہ مستحقین کا بہت خیال رکھتے۔ میری سفارش پر اُنہوں نے متعدد بیوگان اَور غریب طلبہ کے وظائف مقرر کر رکھے ہیں، کتنی ہی یتیم بچیوں کی شادیوں کے اخراجات کا انتظام ہوا ہے اَور کتنے ہی قرض خواہوں کو قرض سے نجات ملی ہے۔

اس فیاضی اَور خدا ترسی کا اصغر علی چودھری کو دنیا ہی میں یہ انعام ملا کہ اُن کی فیکٹری میں کبھی ہڑتال نہیں ہوئی اَور ان کا کاروبار انتہائی بحرانی حالات میں بھی کبھی نقصان سے دوچار نہیں ہوا...... وہ امراء کے طبقے کے برعکس کسی بھی بیماری میں مبتلا نہیں ہیں اَور پرسکون نیند سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سیکورٹی کے نقطہ نظر سے بھی اُن کا معاملہ بہت عجیب ہے۔ وہ بہت قیمتی اَور جدید پجارو میں سفر کرتے ہیں، لیکن اُن کے ساتھ کوئی گارڈ نہیں ہوتا اَور آج تک وہ کسی خطرے یا حادثے سے دوچار نہیں ہوئے۔ ایک بار اُن کی پجارو چوری ہوگئی تھی، لیکن ڈیڑھ دو ماہ کے بعد مل گئی تھی اَور اس دوران میں یہ پجارو ایک گیراج میں محفوظ انداز میں کھڑی رہی تھی۔

(۱۴)

تقریباً پندرہ سال پہلے شادی کی ایک تقریب میں ایک تاجر اظہر میاں صاحب سے تعارف ہوا جو ''ہیپی فیملی'' کے نام سے ایک فرم کے مالک تھے اَور ''الفلاح'' میں اُن کا آفس تھا۔ اُنہوں نے بتایا کہ دو سال پہلے ایک دن ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ مَیں فلاں مسجد میں امامت کراتا ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں تشریف لائے تھے اَور فرمایا تھا کہ اظہر میاں کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارے حج کا انتظام کریں گے۔

یہ سن کر میری عجیب حالت ہوئی۔ مَیں نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں صرف نہیں کیا اَور فوراً حامی بھرلی کہ آپ اگلے ہفتے آجائیں، مَیں چالیس ہزار روپے آپ کو ادا کردوں گا (اُس زمانے میں حج پر اتنی ہی رقم خرچ ہوتی تھی) اَور مقررہ دن پر مَیں نے وعدے کے مطابق مولوی صاحب کو چالیس ہزار روپے ادا کردیئے اَور اس معاملے میں ذرا بھی تحقیق و تفتیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

اظہر میاں صاحب نے بتایا: پروفیسر صاحب اس سال مجھے کاروبار میں دس لاکھ روپے کا نفع ہوا اَور یہ بڑی غیر معمولی بات تھی۔

(۱۴)

نویدالاسلام صدیقی صاحب نے بتایا: جہلم سے تعلق رکھنے والے ہمارے ایک قریبی رشتہ دار پولیس میں ڈی ایس پی تھے اُور حرام حلال کی چنداں پروانہ کرتے تھے۔ اِن کا تعلق سندھ پولیس سے تھا اُور یہ کراچی ہی میں مقیم ہو گئے تھے۔

متذکرہ ڈی ایس پی کے دو بیٹے تھے۔ بڑے حامد صاحب اپنے والد کے بالکل برعکس کمال درجے کے متقی تھے اُور کوشش کرتے تھے کہ قوتِ لا یموت (یعنی اتنی خوراک کہ جس سے زندہ رہ سکیں) کے سوا باپ کی کمائی سے کچھ بھی حاصل نہ کریں۔ متقی ہونے کے ساتھ یہ بہت لائق بھی تھے۔

یہ قیامِ پاکستان کے جلد بعد کی بات ہے۔ اُس زمانے میں انٹر پاس نوجوانوں کو بھی پولیس میں اچھی ملازمت مل جاتی تھی چنانچہ حامد صاحب نے ایف ایس سی کا امتحان پاس کرلیا، تو باپ نے زور دیا کہ پولیس میں اے ایس آئی بن جاؤ، لیکن موصوف نے انکار کر دیا کہ مَیں ابھی ملازمت نہیں کروں گا اُور مزید تعلیم حاصل کروں گا۔

حامد صاحب بی ایس سی ہو گئے تو اب والد نے اصرار کیا کہ پی سی ایس کا امتحان دو اُور اِس مقصد کی خاطر ایک موثر سفارش بھی تلاش کرلی۔ لاہور میں انٹرویو تھا۔ باپ کے کہنے پر وہ لاہور کے لیے روانہ ہو گئے، مگر امتحان اور انٹرویو میں شامل ہونے کے بجائے سیدھے اپنے آبائی شہر جہلم چلے گئے اُور جب باپ نے باز پرس کی تو صاف دوٹوک لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مَیں نہ پولیس کی ملازمت کروں گا نہ سول سروس میں جاؤں گا، مَیں محکمہ تعلیم میں جاؤں گا اُور ایک اُستاد کی حیثیت سے زندگی گزاروں گا۔

اس پر باپ سخت برافروختہ ہوا اُور حامد صاحب کو گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ یہ پہلے ہی باپ کے ذرائع آمدنی سے مطمئن نہیں تھے، چنانچہ کراچی ہی میں ایک رشتے دار کے ہاں

جا کر پناہ گزین ہو گئے اَور وہیں رہ کر اُنہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم ایس سی باٹنی کا امتحان اس شان سے پاس کیا کہ یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی اَور گولڈ میڈل کے مستحق قرار پائے۔اس کے ساتھ ہی اُن کی نیک نیتی کا انہیں یہ پھل ملا کہ انہیں کراچی یونیورسٹی ہی میں لیکچرار کا منصب حاصل ہو گیا۔

حامد صاحب کو لیکچرار بنے بہت تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ انہیں پی ایچ ڈی کے لیے سکالرشپ مل گیا اَور اُنہوں نے آسٹریلیا سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی اَور واپس آئے تو اُن کی اس طرح عزت افزائی ہوئی کہ وہ کراچی یونیورسٹی میں باٹنی ڈیپارٹمنٹ کے صدرِ شعبہ بن گئے۔وہ کتنی ہی کتابوں کے مصنف بن گئے اَور اُنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہو گئی۔اسی حیثیت سے وہ اپنے منصب سے ریٹائر ہوئے۔

حامد صاحب کے دو بیٹے ہیں اَور بیٹیاں ہیں۔ساری اولاد بہت لائق اَور بہت باعمل مسلمان ہے۔ایک بیٹا بھی پی ایچ ڈی ہے اَور کراچی یونیورسٹی ہی سے منسلک ہے۔

نوید صاحب نے بتایا کہ جب میں نے حامد صاحب کو فون پر بتایا کہ مَیں نے آپ کے حالات ایک صاحب کو بتا دیئے ہیں اَور وہ اپنی کتاب میں آپ کا ذکر کریں گے تو موصوف سخت برہم ہوئے اَور سختی سے روک دیا کہ میرا ذکر کہیں بھی ہرگز نہ آنے پائے کہ اُن کے خیال میں یہ ریاکاری اَور شہرت پسندی میں شمار ہوگا اَور اللہ کی ناراضگی کا سبب بنے گا۔اسی لئے مَیں نے اس واقعے میں اُن کے اصل نام کی بجائے فرضی نام لکھا ہے۔

(۱۵)

میری ایک عزیزہ شاہدہ عباس نے بتایا (۰۶-۵-۳۱) کہ تقریباً سولہ سال قبل یتیم خانے کے علاقے میں کہ جہاں پہلے ہماری رہائش تھی، تاجر گھرانے کی ایک خاتون شمیم اختر صاحبہ کو سینے میں تکلیف محسوس ہوئی تو وہ ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ ڈاکٹر نے ضروری چیک اپ اُور ٹیسٹوں کے بعد تشخیص کی کہ موصوفہ کو دل کی خرابی کا عارضہ لاحق ہے۔ اس کا فوری اپریشن کرانا چاہیے جس پر ستر ہزار روپے خرچ آئے گا۔

محترمہ شمیم اختر صاحب نے شاہدہ عباس کو بتایا کہ مَیں نے فوری طور پر ستر ہزار روپے کی رقم اپنے رشتہ داروں میں دو یتیم بچیوں کی شادی کے لیے دے دی اُور ایک یتیم لڑکے کی تعلیم کا بندوبست کر دیا......اُور چند روز کے بعد جب مَیں دوبارہ اُسی ڈاکٹر کے پاس گئی اُور اُس نے چیک کیا، تو وہ یہ دیکھ کر حیران پریشان رہ گیا کہ اَب میرے جسم میں مرض کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

(۱۶)

یہ واقعاتی کہانی ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور کے شمارہ ۲۲ رفروری ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی تھی۔ انٹرویو ابو شیراز نے لیا تھا۔

کراچی سے تعلق رکھنے والا ایک اکیس سالہ نوجوان سید قرب احمد نیو یارک کے ایک تعلیمی ادارے جمالوجیکل انسٹی ٹیوٹ آف امریکہ میں ایک خصوصی کورس کر رہا تھا اُور ویک اینڈ پر ٹیکسی چلاتا تھا۔ ٹیکسی چلاتے ہوئے اُسے صرف تین ہفتے گزرے تھے کہ جولائی ۹۸ء کی ایک رات کو ساڑھے نو بجے اُس نے اپنی شیورلیٹ ٹیکسی میں ایک حبشی بڑھیا کو اُس کے سٹاپ پر اُتارا اُور کچھ فاصلہ آگے جا کر اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر بیگ نظر آیا جو وہ بڑھیا ٹیکسی سے اُترتے

ہوئے بھول گئی تھی۔ اُس نے ٹیکسی روکی، بیگ کھول کر دیکھا تو وہ سوسو ڈالروں کے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

قرب احمد نے فوری طور پر پولیس سے رابطہ کیا۔ اُسے تھانے میں بلالیا گیا اَور تھوڑی دیر کے بعد پولیس اُس بڑھیا کو تلاش کر کے تھانے میں لے آئی، وہ اپنا بیگ دیکھ کر بے حد خوش ہوئی اَور اُس نے قرب احمد کو ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ اس بیگ میں 32859 ڈالر کی رقم تھی اَور یہ اُس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ چونکہ امریکہ میں بنک دیوالیہ ہوتے ہی رہتے ہیں اس لیے لوگوں کا اعتماد بنکوں پر سے اٹھ گیا ہے اَور یہ بڑھیا بھی اسی خوف سے اپنی جمع پونجی ایک بیگ میں ڈال کر ہر وقت اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔

قرب احمد نے اتنی بڑی رقم واپس کر کے بڑھیا پر جو احسانِ عظیم کیا تھا اُس کے شکریے کے طور پر اُس نے قرب احمد کو کچھ رقم کی صورت میں اصرار کے ساتھ نقد انعام دینا چاہا مگر قرب احمد نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا۔ امریکہ کے ماحول اَور معاشرے میں جہاں کسی کو دس ڈالر بھی مل جائیں تو وہ واپس نہیں کرتا.....قرب احمد کی یہ مثال منفرد اَور یکتا نوعیت کی تھی، چنانچہ مختلف سرکاری اداروں اَور اخبارات اَور عام میڈیا نے اس کی خصوصی قدر افزائی کی.....اور دوسرے ہی روز اخبارات کے کتنے ہی رپورٹر اَور ٹی وی کے نمائندے آگئے اَور سب نے اس سے انٹرویو کئے اَور اس نوجوان کی دیانت اَور ایثار کی بہت تعریف و توصیف کی۔

یہی نہیں بلکہ نیویارک کے میئر مسٹر جولیانی نے قرب احمد کو ملاقات کے لیے بلایا، اُسے شیلڈ دی اَور اُس کی خاص حوصلہ افزائی کی۔ پولیس کمشنر نے اُسے بلایا اَور شیلڈ دی.....انہی دنوں پاکستان کے مرکزی وزیر شیخ رشید وہاں گئے ہوئے تھے، اُنہوں نے نوجوان کو اپنے پاس بلایا، ۱۴راگست کی پیریڈ میں اُسے شامل کیا اَور شیلڈ بھی عطا کی..... پاکستانی کمیونٹی نے بھی اس کی عزت افزائی کی اور شیلڈ دی۔ وزیر اعظم پاکستان میاں نواز شریف نے قرب احمد کو والدین اَور بھائیوں سمیت سرکاری خرچ پر اسلام آباد بلایا اور اُس کی خاص عزت افزائی کی۔

قرب احمد مرسیڈیز گاڑی چلایا کرتا تھا، چنانچہ مرسیڈیز والوں نے اُسے ۹۸ ماڈل کی کار انعام میں دے دی اُور دو سال کی انشورنس بھی کرادی۔ بہت سے افراد اُور اداروں نے بھی اُسے انعامات سے نوازا۔ چنانچہ مجموعی طور پر اُسے گاڑی وغیرہ ملا کر تقریباً ستر ہزار ڈالر کے انعامات حاصل ہوئے۔ اس طرح مکافاتِ عمل کے تحت اُس نے 32859 ڈالر کی رقم واپس کی تھی اُور ستر ہزار ڈالر کے قیمتی انعامات اُور عزت وشہرت اُسے حاصل ہو گئے اُور اس طرح دیانت اُور ایثار کا اُسے نقد انعام مل گیا۔

(۱۷)

پروفیسر صدیق قمر صاحب گورنمنٹ کالج عارف والا میں اُردو کے اُستاد ہیں، اُنہوں نے ایک ملاقات میں بتایا:

قبولہ میں ہمارے ہی محلے میں ولی محمد نامی ایک موچی رہا کرتا تھا۔ پرائمری تک پڑھا ہوا تھا۔ مطالعے کا ذوق رکھتا تھا اُور بہت سمجھ دار آدمی تھا...... خدا اُور خلقِ خدا کے ساتھ اُس کا تعلق بہت اچھا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند، خداترس اُور خیر پسند تھا۔ جوتے بنا کر بیچتا اُور اپنے خاندان کی کفالت کرتا تھا۔

ولی محمد بہت خوش اخلاق تھا، سراپا شفقت تھا اُور بچوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ امامِ غزالی کا ایک قول اکثر دہرایا کرتا تھا کہ حرام کا ایک لقمہ بھی اندر چلا جائے تو وہاں تاریکی پھیل جاتی ہے اُور ایک لقمہ حلال کا چلا جائے تو اندر روشنی ہو جاتی ہے۔

ولی محمد موچی کے دو بیٹے تھے: فتح محمد اُور محمد علی، دونوں بہت لائق اُور محنتی تھے۔ فتح محمد فزکس میں ایم ایس سی کر کے لیکچرار ہو گئے اُور امریکہ سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی میں صدرِ شعبہ فزکس کے منصب تک پہنچے جبکہ محمد علی بنک میں اعلیٰ افسر بن گئے۔ ایک غریب دستکار کی نیکی اُور رزقِ حلال نے اُن کے بیٹوں کو دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ ترین عزت عطا کردی۔

(۱۸)

شاہد محمود انور (سن پیدائش ۱۹۶۸ء) ایم ایس سی میتھ ہیں۔ باعمل اُور مضبوط ایمان کے مسلمان ہیں۔ آج کل مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں اُور وہیں کامیابی سے کاروبار کر رہے ہیں۔

اُن کی تیسری بیٹی مریم پیدا ہوئی (۱۹۹۹ء) تو وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوئے۔ اُن کی والدہ آرزدہ خاطر ہوئیں تو اُنہوں نے انہیں تسلّی دیں ''امی جی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں، میری تو ابھی تیسری آئی ہے اُور اس طرح مزید ایک اُور بیٹی کی گنجائش ہے۔ کیا خبر چار بیٹیاں حضورؐ سے مماثلت کا ذریعہ بن جائیں...... اس کے ساتھ ہی شاہد صاحب نے دوستوں، عزیزوں میں مٹھائی تقسیم کی اُور بیگم کو سونے کی بارہ چوڑیاں بنوادیں۔

اللہ تعالیٰ نے شاہد صاحب کے اس ایمانی جذبے کی یوں قدر افزائی کی کہ کمپنی نے فوری طور پر تنخواہ میں پانچ سو ریال ماہانہ کا اضافہ کر دیا۔ انہیں دس ہزار ریال کا بونس ملا، تین ماہ کی چھٹی اُور پاکستان کا فری ٹکٹ مل گیا اُور بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں دو بیٹے بھی عطا فرما دیے۔ لاہور میں بہت بڑا ذاتی مکان اُور کاروبار میں وسعت اُور برکت اس کے علاوہ ہے۔

(۱۹)

پروفیسر عبدالجبار خالد صاحب کا تعلق ہارون آباد ضلع بہاول نگر سے ہے۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد ہارون آباد ہی میں خالد پبلک ہائی اسکول کو کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ وہاں اُن کا زرعی رقبہ بھی ہے۔

اُنہوں نے بتایا (۲۰۰۷-۰۱-۱۷ کو) کہ زراعت کا سارا کام مَیں نے اپنے بڑے بیٹے

فارقلیط کے حوالے کر دیا ہے۔ جب تک مَیں خود کاشت کراتا تھا، پابندی سے عشر دیتا تھا، اَور کپاس چار سو من پیدا ہوتی تھی، مگر فارقلیط نے گزشتہ برس تساہل سے کام لیا، باقاعدہ حساب کر کے عشر ادا نہیں کیا، نتیجہ یہ کہ کپاس کی پیداوار بہت ہی کم رہ گئی یعنی صرف انچاس من۔

تب مَیں نے اُسے احساس دلایا، اُس نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا، توبہ کی اَور اس برس حساب کر کے عشر کی رقم ادا کی تو اللہ کے فضل سے کپاس کی پیداوار دوبارہ چار سو من ہو گئی۔

(۲۰)

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (۱۹۳۹-۲۰۰۷) نے ۳۱-۷-۲۰۰۴ کو ایک ملاقات میں فرمایا:

دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ اخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کرتے ہیں اَور اس حوالے سے قربانیاں دیتے ہیں، اللہ اُن کی اولاد کو بے سہارا نہیں چھوڑتا بلکہ دنیاوی اعتبار سے اُسے خوب خوب نوازتا ہے۔ میرے سسر مستری عبدالکریم جماعتِ اسلامی کے دورِ اوّل کے رُکن تھے، اُن کی سلائی مشینوں کی دکان تھی۔ خود بھی بہت اچھے کاری گر تھے۔

اُنہوں نے اپنا سب کچھ جماعت پر نثار کر دیا گھر میں کچھ بھی نہ رہا۔ بالکل قلاش ہو گئے۔ دو سالے تھے وہی کفالت کرتے تھے۔ مستری صاحب ۱۹۶۵ء میں وفات پا گئے۔

مرحوم کے دو بیٹے اَور تین بیٹیاں تھیں۔ اللہ کی شان کہ تینوں بیٹیوں کی شادیاں بہت اچھی جگہ ہو گئیں۔ بہت ہی اچھے داماد مل گئے (یعنی عبدالخالق صاحب، عبدالشکور صاحب اور محمد افتخار کھوکھر)

دونوں بیٹوں کو اللہ نے خوب خوب نوازا۔ ایک سعودی عرب میں ہے، دوسرا امریکہ میں۔ اُن کے پاس اتنی دولت ہے کہ سنبھالی نہیں جا رہی۔

(۲۱)

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے بتایا:

بھائی پھیرو میں ملک محمد بوٹا ولد حاجی محمد منشی تھے۔ آٹھ دس جماعتیں پڑھے ہوئے تھے۔ جماعتِ اسلامی کے رُکن تھے اَور جماعت کی دعوت کو خوب سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے دین کے راستے میں مالی، جسمانی اَور سیاسی ہر اعتبار سے بہت قربانیاں دیں۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک میں جیل بھی گئے۔ میرے دستِ راست تھے۔ بہت مخلص کارکن تھے۔

ملک محمد بوٹا نے جماعت کے لیے بہت خرچ کیا جس سے اُن کا کاروبار بھی متاثر ہوا اَور ایک بار تو بالکل بیٹھ ہی گیا۔ لیکن پھر اُنہوں نے اینٹوں کے بھٹے کا کاروبار شروع کردیا جس میں اللہ نے خوب برکت دی اَور وہ بہت امیر ہو گئے۔

ملک صاحب نے اپنی دولت کو دین پر کھلے دل سے خرچ کیا۔ جماعت کو موٹر سائیکل لے کر دی، دس دس ہزار روپے یکمشت دے دیتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے جتنا جماعت کو دیتا ہوں، اللہ مجھے اس سے دوگنا دے دیتا ہے۔

اللہ کی حکمت کہ ۱۹۹۰ء میں ملک محمد بوٹا عین جوانی میں وفات پا گئے اُس وقت اُن کی چھ بیٹیاں تھیں اَور دو بیٹے تھے...... اللہ نے اس شخص کے اخلاص اَور دینی خدمت کا صلہ یہ دیا کہ سارے بچے بہت اچھے طریقے سے پل گئے اَور وہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے، سب بیٹیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ چنانچہ بھٹے اب بھی چلتے ہیں اَور مرحوم کے دونوں بیٹے رئیسوں کی طرح زندگی گزارتے ہیں، مارکیٹ میں دکانیں ہیں، تین مکان ہیں...... اَور وہ پابندی سے زکوٰۃ دیتے اور دینِ حق کے لئے خرچ کرتے ہیں۔

(۲۲)

۰۹-۸-۱۹ کو معروف مصنف پروفیسر احسان الحق چیمہ صاحب (سن پیدائش ۱۹۳۴) سے خاصی طویل ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے قریبی رشتہ داروں میں دو بھائی تھے۔ بڑے کے چار بیٹے اَور تین بیٹیاں تھیں، لیکن یہ والد کا نافرمان تھا اَور اُن کی خواہشات کی پروا نہیں کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی اولاد میں سے کسی کو رزق کی وسعت نصیب نہیں ہوئی۔ سب تنگدست اَور پریشان ہیں۔

دوسرا بیٹا باپ کا بہت فرمانبردار تھا حالانکہ وہ ذاتی طور پر اچھے کردار کا مالک نہیں تھا۔ اس کے چھ بیٹے اَور دو بیٹیاں تھیں اِن سب پر دنیاوی اعتبار سے اللہ نے خوب خوب فضل فرمایا۔ اس کی ساری اولاد بہت امیر ہے۔ زیادہ بیٹے امریکہ میں ہیں، انہوں نے گاؤں میں بھی خاصی جائیداد بنالی ہے اَور بڑی عزت وتوقیر کے مالک ہیں۔

(۲۳)

خیر پسندی ہر اعتبار سے باعثِ برکت ہے

مَیں نے ’’خواتینِ میگزین‘‘ میں قارئین سے اپیل کی تھی کہ وہ مکافاتِ عمل کے حوالے سے مُجھے اپنے مشاہدات سے آگاہ کریں۔ اس کے جواب میں چکوال سے محترمہ ڈاکٹر سعدیہ ظفر نے یہ تحریر ارسال فرمائی تھی۔ اس کی افادیت اَور اہمیت کے پیشِ نظر اِسے ڈاکٹر صاحبہ کے شکریے کے ساتھ کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔

☆☆☆

جو لوگ خیر پسند کرتے ہیں، خلق خدا کی اخلاص کے ساتھ خدمت کرتے ہیں، غریب پرور اور والدین کے خدمت گزار ہیں اور رزق حلال کا اہتمام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں بڑی برکت اور وسعت پیدا کرتا ہے۔ میرے والدین کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ میرے والدین شروع ہی سے نیک نیت اور خداترس واقع ہوئے اور پھر جماعتِ اسلامی تعلق کے بعد ان کی ان خصوصیات میں مزید اخلاص اور نکھار پیدا ہوا۔

میرے ابو (محمد اکرم صاحب عمر ۶۰ سال) کہتے ہیں کہ مَیں روزانہ کافی دیر اس بات کو سوچتا ہوں کہ اللہ کے راستے پر چلنا کتنا آسان ہے اور اس میں کس قدر برکت ہے۔ مَیں نے ہمیشہ اللہ کی خوشنودی کو مدنظر رکھا تو مَیں ہر میدان میں کامیاب رہا پھر لوگ اس صراطِ مستقیم پر کیوں نہیں چلتے۔ لوگ خود کہتے ہیں کہ جنابِ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ بالکل سچ ہے اور اسی طرح کرنا چاہیے، مگر آج کل کے دور میں اس پر عمل کرنا مشکل ہے۔ ہماری مجبوری ہے دنیاداری بھی نبھانی ہے۔ پتہ نہیں لوگوں کے لیے ایمانداری اور سچائی سے زندگی گزارنا مشکل کیوں ہے۔ یہ آج سے تقریباً ۳۰ سال سے پہلے کا واقعہ ہے کہ میرے ابو جان کے گھر میں ایک خاتون کام کرتی تھی۔ ایک دن وہ کام کر کے نکلی تو کمر درد کی وجہ سے نڈھال تھی میرے ابو نے فرمایا کہ خالہ گھروں میں کام کی بجائے ایک بھینس رکھ لو تو ماہانہ ۳۰ روپے کی بجائے ۱۵۰ روپے کما سکتی ہو اور کام کا بوجھ بھی کم ہوگا۔ کیونکہ ہمارے محلے میں ایک اور خاتون نے ایک دن ذکر کیا تھا کہ بھینس کے دودھ کی وجہ سے ہم ماہانہ ۱۵۰ روپے کما لیتے ہیں۔ تو اس خاتون جس کا نام اقبال تھا۔ اُس نے کہا میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے بہرحال اس کو یہ تجویز پسند آئی۔ ایک دن بعد وہ میرے ابو کے پاس آئی اور کہا کہ اگر تین ہزار روپے کا بندوبست ہو جائے تو میں بھینس خرید سکتی ہوں۔ اس وقت ۲۵۰۰ روپے کی بھینس مل جاتی تھی۔ میرے ابو نے کہا فکر نہ کریں۔ میں آپ کو ۳۰۰۰ روپے دیتا ہوں تاکہ آپ کے روزگار کا بندوبست جائے۔ بہرحال اس نے بھینس خرید لی۔ اور دنوں میں ہی اس کا کاروبار چلنا شروع ہو گیا اور کچھ ہی عرصہ میں وہ اس قابل ہو گئی کہ اس نے دو بھینسیں اور خرید لی۔ شروع

میں وہ دودھ میں پانی نہیں ملاتی تھی۔تو اللہ نے بھی اس کی حلال کی کمائی میں برکت دے دی۔اور وہ بہت خوشحال ہوگئی۔میرے ابو جان ملازمت کے سلسلے میں بیرون ملک زیادہ رہتے تھے۔کچھ سالوں کے بعد جب ابو گھر آئے تو کسی نے بتایا کہ اب خالہ اقبال دودھ میں پانی ملا کر بیچتی ہے۔ میرے ابو جان نے اس کو گھر بلایا اور سمجھایا کہ دیکھو اللہ کی نافرمانی نہ کرو اور حلال کا رزق کماؤ لیکن اس نے یہ بات نہ مانی اور ملاوٹ شدہ دودھ بیچتی رہی۔اب خدا کی قدرت دیکھیں جب تک وہ ایمانداری سے کام کرتی رہی تو اس کے کاروبار میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی رہی۔جب اس نے اللہ کی نافرمانی شروع کی تو فوراً اس کو اس کا پھل دنیا میں مل گیا۔سب سے پہلے اس کی ایک بھینس بیمار ہوکر مرگئی۔دوسری کو ایک زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا۔جس کی وجہ سے وہ بھی مرگئی۔ تیسری بھینس نے خالہ اقبال کو ٹکر ماری تو خالہ اقبال کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی اور بھینس کی مناسب دیکھ بھال نہ کرسکنے کی وجہ سے اس نے وہ بھینس بھی بیچ دی اور پھر وہ اسی معذوری میں اس دنیا سے رخصت ہوگئی اس کا تمام کاروبار ٹھپ ہوگیا۔یہ واقع جہلم کا نیا محلّہ کا ہے۔

لیکن میرے ابو جان نے خلق خدا کی خدمت اور مدد کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔جن میں مستقل ۱۵ بیواؤں کے گھرانے کا ماہانہ راشن، تعلیمی سال کے شروع ہونے پر نادار طلبہ کو کتابیں، غریب بچیوں کی شادی کے موقع پر مدد کرنا، بیماروں کا علاج، مساجد کی تعمیر وغیرہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا میرے ابو کا بہترین مشغلہ ہے۔میرے امی اور ابو پڑھے لکھے ہیں۔امی جان ہر چیز کا حساب کتاب لکھ لیتی تھیں۔امی جان اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔(اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں جگہ دے۔آمین)ان کی وفات کے بعد ابو جان نے ان کی ڈائریاں دیکھیں تو بولے کہ میں نے بیرونِ ملک سے بہت سا پیسہ تمہاری امی کو بھیجا تھا، لیکن انہوں نے اس سے زیادہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔لگتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے پرس میں پیسے بھر دیتا تھا۔انہوں نے بہت سے پودے لگائے ہیں۔امی جان خود کہتی تھیں کہ جب میں اللہ کی راہ میں ۵۰۰ دیتی ہوں تو مجھے پتہ نہیں چلتا تو ۵۰۰۰ مل جاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کی راہ میں ۵۰۰۰ دوں تو دوسری راہ سے ۵۰،۰۰۰ مل جاتا ہے۔اللہ

تو بدلہ دینے میں ذرا دیر نہیں لگاتا۔

میرے ابو جان اور امی جان اپنے والدین کے بہت فرماں بردار تھے اور دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے والدین کے لیے بھی بہت محبت رکھتے تھے۔ میری دادی جان جب بیمار تھیں اور ہسپتال میں داخل تھیں تو ان کی خدمت کرتے ہوئے ہسپتال کے بیت الخلاء میں میری امی گر گئیں تو میری دادی جان اس پر بہت رنجیدہ ہوئیں کہ میری خاطر تمہیں کس قدر تکلیف پہنچی اور خدمت کے صلہ میں دعا دی کہ اللہ تم لوگوں کو اپنی اولادوں سے بھی نفع دے۔ ابو نے اپنے والدین کو حج بھی کروایا۔ میرے ابو جان کی ایک ہی بہن ہیں وہ عین جوانی میں بیوہ ہوگئیں۔ ان کے تین بچے تھے جو ابھی زیر تعلیم تھے۔ میرے ابو جان نے فیصلہ کیا چاروں بھائی مل کر بہن کی مدد کریں گے۔ لیکن ایک بھائی نے کہا کہ ایسا ممکن نہیں۔ تب میرے ابو جان نے عزم کر لیا کہ اگر کوئی بھی نہ دے تو مَیں اکیلے ہی بہن کا مشکل میں ساتھ دوں گا۔ پھر میرے ابو جان اور چھوٹے چچا نے مل کر اس ذمہ داری کو اٹھایا۔ آج ان پھوپھو کا ایک بیٹا ڈاکٹر ہے۔ جو امریکہ میں دل کے امراض کا ماہر ہے اور دوسرے دو بیٹے بھی بزنس کر کے کروڑ پتی بن گئے ہیں۔ اس وقت صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور حقوق العباد کو مدنظر رکھ کر میرے ابو نے فیصلہ کیا۔ لیکن اللہ نے دنیا میں میرے ابو جان کو یہ صلہ دیا کہ پھوپھو نے اپنے ڈاکٹر بیٹے کی شادی میری بہن سے کر دی دوسرے بیٹے کی شادی چھوٹے چچا کی بیٹی سے کر دی اور آج وہ دونوں اپنے گھروں میں راج کر رہی ہیں۔ اس وقت میرے ابو جان کو پتہ نہیں تھا کہ اس نیکی کا صلہ ان کو اس دنیا میں ہی ایک نیک سیرت اور کامیاب ڈاکٹر داماد کی صورت میں مل جائے گا۔ مجھے بھی اللہ نے ڈاکٹر بنا دیا اور میری شادی بھی ایک اچھے انسان سے ہوئی۔ مَیں اپنے والد کو کہتی ہوں کہ میرے باپ کی نیکیوں کی وجہ سے آج ہم بہنیں اپنے گھروں میں خوش اور آباد ہیں اور ابو جان کو دونوں داماد پڑھے لکھے ڈاکٹر اور وکیل کی صورت میں مل گئے۔ ابو جان صلہ رحمی پر بڑا زور دیتے تھے۔

اپنے والدین کی زندگی کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ اللہ کی خوشنودی کو مدنظر رکھتے ہیں

نیک نیت ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں اور غریب پرور ہیں ان کو اس دنیا میں بھی اطمینان، خوشحالی نصیب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے جس طرح ان کی دنیاوی زندگی اچھی گزری، اللہ کرے ان نیکیوں کے سبب ان کی آخرت بھی سنور جائے۔

(۲۴)

پروفیسر احسان الحق چیمہ صاحب نے بتایا:

مَیں نے ۱۹۷۰ء میں دوسری شادی کی۔ میری یہ اہلیہ نرسنگ کے شعبے سے وابستہ تھی۔ ۱۹۷۴ء میں اس کو مکہ مکرمہ کے ایک ہسپتال میں ملازمت مل گئی اور مَیں بھی وہیں چلا گیا۔ ۱۹۷۶ء میں مجھے سعودی عرب کا مستقل ویزہ مل گیا۔ مَیں ۱۹۹۰ تک وہیں مقیم رہا۔

سعودی عرب میں مَیں نے تجارت شروع کردی۔ جدہ سے چیزیں خریدتا اُور مکہ اُور دوسرے شہروں میں سپلائی کرتا تھا۔ جدہ میں چاول کا ایک پاکستانی ڈیلر تھا۔ وہ باسمتی میں ملاوٹ کرتا اُور مہنگے داموں بیچتا تھا۔ چونکہ اس میں منافع بہت تھا، اس لئے لالچ میں آ کر مَیں نے بھی یہ چاول خریدا اُور اپنے منی ٹرک میں ڈال کر مکہ آ رہا تھا کہ یہ ٹرک میقات میں اُلٹ گیا۔ سارا چاول ضائع ہو گیا اُور مَیں مرتے مرتے بچا، یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ ۱۹۸۱ء میں دوسری بار اسی طرح کا حادثہ پیش آیا۔ اس مرتبہ بھی مَیں ملاوٹ والا چاول لے کر مکہ جا رہا تھا اُور عین میقات کے مقام پر ٹرک اُلٹ گیا۔ اس مرتبہ بھی مشکل سے جان بچی۔

تب مَیں چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا خدا مجھ سے ناراض ہے اُور میری اصلاح چاہتا ہے، چنانچہ مَیں نے سچے دل سے توبہ کرلی اُور ۱۹۸۵ء میں جب پانچواں حج کیا تو عرفات کے میدان میں ہر طرح کے گناہوں سے سچی اور پکی توبہ کرلی۔ قرآنِ پاک سے گہری وابستگی قائم کرلی اور اپنے آپ کو تبلیغِ دین کے لیے وقف کرلیا۔ اس کے نتیجے میں اللہ نے مجھے متعدد دقیع کتابوں کا مصنف بنادیا اُور میری دعاؤں کو شرفِ قبولیت عطا فرمادیا۔

(۴۵)

مشہور دانشور مغل شہزادے دارالشکوہ نے حضرت میرؒ کے ملفوظات پر مشتمل اپنی تصنیف ''سکینۃ الاولیاء'' میں انسانی خدمت کے حوالے سے ایک بصیرت افروز واقعہ یوں رقم کیا ہے کہ ایک دن ایک مغل بڑے اضطراب کی حالت میں حضرت میرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت نے دعا کرنے کے بعد فرمایا: ''اہلِ دنیا عجیب لوگ ہیں۔ مطلب کے حصول کے لئے درویشوں کی دعا کو کس قدر آسان سمجھتے ہیں۔ اگر یہ بھوکے کو روٹی کھلائیں اور ننگے کو کپڑا پہنائیں تو مَیں ضامن ہوں کہ ان کی مراد بر آئے گی''۔ اس وقت وہ شخص رخصت ہو گیا، دوسرے دن پھر آیا۔ کچھ نقدی اور چند طشت حلوے کے لایا۔ نقدی تو حضرت نے لوٹا دی اور حلوہ درویشوں میں تقسیم کر دیا اور اس کا حال پوچھا۔ اس نے کہا: میرا بیٹا سخت بیمار تھا۔ اس کی زندگی کی اکوئی امید نہیں رہی تھی۔ کل جب میں خدمت شریف میں حاضر ہوا تھا اور حضرت نے دعا کے بعد بھوکے کو روٹی اور ننگے کو کپڑا پہنانے کی تلقین فرمائی تو یہاں سے رخصت ہوتے ہی مجھے ایک مستحق درویش ملا۔ میرے پاس انگوٹھی تھی، وہ مَیں نے اسے دے دی۔ گھر کے قریب آیا تو کچھ فقیر نظر آئے، جن کے تن پر کپڑا نہیں تھا۔ مَیں نے اپنے کچھ کپڑے انہیں پہنا دیئے۔ وہاں سے چلا تو گھر سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ مَیں ڈرا کہ شاید کوئی بری خبر لایا ہے۔ جب اس سے دریافت کیا تو وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہا: اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیٹے کی جان بچا لی ہے، اسے اب صحت ہے تو میرے منہ سے بے اختیار یہ نکلا کہ یہ سب کچھ حضرت کی توجہ کی برکت سے ہوا۔''

(مترجم: مقبول بیگ بدخشانی صفحہ ۱۴۵)

پروفیسر خالد ہمایوں۔ مطبوعہ روزنامہ ''پاکستان'' ۲۰۰۵-۱۱-۱۹

(بشکریہ پروفیسر خالد ہمایوں)

---

(۲۶)

خاں بہادر نقی محمد خاں نے اپنی خود نوشت ''عمرِ رفتہ'' کا خاصا حصہ والیانِ ریاست کے لیے وقف کیا ہے۔ ہم اُن کی اس کتاب میں سے چند دلچسپ واقعات پیش کرتے ہیں۔

مہاراجہ رام سنگھ والیٔ ریاست دتیا بڑے فراخ حوصلہ، وضع دار اَور مخیر انسان تھے۔ نہایت تنومند اَور قوی شخص تھے اَور ورزش اَور کشتی کے شوقین۔ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک وقت کھانا کھاتے۔ مشہور ہے کہ بکری کے بچے کی یخنی پی جاتے۔ خود کشتی لڑتے اَور کئی کئی پہلوانوں کو ایک ہی وقت میں ہرا دیتے۔ گاما پہلوان بھی اُن کی ریاست میں رہے تھے۔ جس کو ملازم رکھ لیتے، اُس کو برخواست نہ کرتے۔ کوئی مر جاتا تو اُس کی جگہ اس کے لڑکے کو ملازم رکھ لیتے۔ اگر وہ نابالغ ہوتا تو اس کو آدھی تنخواہ ملتی۔ گویا ریاست کی ملازمت پشتینی چیز تھی۔

مہاراجہ گوالیار ایک دفعہ اپنی اسپیشل ٹرین میں بمبئی جا رہے تھے۔ دتیا اسٹیشن راستے میں پڑتا تھا۔ مہاراجہ نے اسپیشل رکوائی اَور مہاراجہ رام سنگھ سے کہلوا بھیجا کہ مَیں باوجود پڑوسی ریاست کا سربراہ ہونے کے ابھی تک آپ سے نہیں ملا۔ اب ملاقات کا خواہش مند ہوں۔ یہ پیغام جب راجہ رام سنگھ کو مِلا تو وہ باغ میں پہلوانوں کے ساتھ ورزش کر رہے تھے۔ فرمایا اگر وہ اپنے کے تعلقات کی وجہ سے مجھے اپنا چچا سمجھتے ہیں، تو مَیں سوار بھیجے دیتا ہوں، اسی حالت میں وہ مجھ سے آ کر مل لیں اَور اگر مہاراجہ گولیار کی حیثیت سے ملنا چاہتے ہیں تو مَیں اُن کا استقبال کروں گا۔ جلوس کی شکل میں لاؤں گا اَور اُن کے شایانِ شان ملاقات کروں گا۔ مہاراجہ گوالیار نے جواب دیا مَیں اُن سے چچا کی حیثیت سے ملنا چاہتا ہوں۔ مہاراج نے شال اوڑھ کر ننگے بدن کو ڈھانپ لیا۔ اکھاڑے کے قریب تخت پر بیش قیمت قالین اَور زردوزی تکیے رکھوائے، اُس پر مہاراجہ گوالیار

کو بٹھایا اَور خود بھی بیٹھ گئے۔

مہاراجہ گوالیار نے پوچھا: چچا جان آپ کی ریاست چھوٹی سی ہے، مگر سنتا ہوں کہ کوئی حاجت مند آپ کے در سے خالی نہیں جاتا اَور جس کو آپ دیتے ہیں، مالا مال کر دیتے ہیں، جب کہ میری اتنی بڑی ریاست ہے لیکن بجٹ بناتا ہوں تو خزانے میں روپیہ نہیں ہوتا۔

مہاراجہ رام سنگھ نے جواب دیا، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تم قسم قسم کے ٹیکس لگا کر غریب رعایا کا خون چوستے ہو، اَور اُن کی بد دعائیں لیتے ہو...... جبکہ مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ خدا نے مجھے غریبوں کی حاجت روائی کی غرض سے راجہ بنایا ہے۔ مَیں نے اُن کو دیتا ہوں اَور دعا لیتا ہوں۔ اِس وجہ سے میرے خزانے میں برکت ہے اَور ریاست میں خوشحالی ہے۔

مہاراجہ گوالیار اس جواب سے خوش ہوئے اَور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے رخصت ہو گئے۔

(بحوالہ ''اُردو ڈائجسٹ'' لاہور

شمارہ ستمبر ۱۹۷۸ء ص ۱۶۶)

مرتبہ عبدالمجید قریشی

(۴۷)

۔ مولوی نذیر احمد دہلوی کے پوتے اَور مشہور ادیب شاہد احمد دہلوی اپنی ذاتی زندگی میں ایک آزاد خیال، سیکولر آدمی تھے۔ اُنھوں نے مولوی نذیر احمد کا ایک بھرپور خاکہ لکھا ہے جو اُن کی کتاب ''گنجینۂ گوہر'' میں شامل ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''نواب افتخار علی خاں والی ریاست جاورہ کے بھائی نواب سرفراز علی خاں مرحوم بہت بیمار تھے۔ اُن کے لیے طبیبوں کی کیا کمی تھی؟ دنیا بھر کے علاج کرائے، مگر شفا نہ ہوئی۔ ایک دن اُنہوں نے مولوی نذیر احمد کو خواب میں دیکھا کہ اُن سے کہہ رہے ہیں: ''ہمارے قرآن کا ترجمہ چھپوالو، اچھے ہو جاؤ گے'' نواب صاحب نے میرے والد کو دلی خط لکھا اَور اس خواب کی روداد بیان کر کے ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مانگی۔ والد صاحب نے اجازت دے دی اَور ترجمۂ قرآن دو بڑی خوبصورت جلدوں میں ریاست جاورہ کے چھاپہ خانے سے شائع ہوا۔ خدا کی شان کہ نواب صاحب بالکل تندرست ہو گئے اَور جب اس واقعے کے کوئی بیس سال بعد مَیں اُن سے مِلا تو ستّرے بہتّرے ہو چکے تھے۔''

(۲۸)

وقار الدولہ، وقار الملک نواب مشتاق حسین کی پوری زندگی، خیر کے حوالے سے، مکافاتِ عمل کی بہت ایمان افروز مثال ہے۔

موصوف محترم ۱۸۴۱ء میں سنبھل (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر صرف چھ ماہ تھی جب اُن کے والد وفات پا گئے اُور اُن کی والدہ اُنہیں لے کر اپنے والدین کے پاس امروہہ چلی گئیں اُور یہیں اُنھوں نے پرورش پائی۔

چھ سال کی عمر میں قرآنِ پاک ختم کیا، عربی اور فارسی کی ضروری تعلیم حاصل کی اُور ۱۸۵۹ء میں یعنی انیس سال کی عمر میں دس روپے ماہانہ پر مدرّس کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن بعدازاں محکمہ عدالت میں میر منشی یا ہیڈ کلرک بن گئے۔ اس زمانے میں سر سید احمد خاں علی گڑھ میں صدر الصدور تھے اُور مشتاق حسین صاحب کو اُن کی ماتحتی میں کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ سر سید ان کی لیاقت اُور امانت و دیانت سے بے پناہ متاثر ہوئے اور اُن کا یہ تاثر مشتاق حسین صاحب کے لیے ترقی کا زینہ بن گیا۔

ہوا یوں کہ ۱۸۷۵ء میں موصوف محترم ایک انگریز کلکٹر مسٹر کالون کے ماتحت کام کر رہے تھے۔ نماز کا وقت آتا تو مشتاق حسین صاحب معمول کے مطابق دفتر سے اُٹھ کر مسجد میں چلے جاتے۔ کالون اعتراض کرتا اُور انہیں نماز پڑھنے سے منع کرتا۔ مشتاق حسین صاحب نے جواب دیا ''نماز مذہباً مجھ پر فرض ہے، مَیں اِسے چھوڑ نہیں سکتا۔ البتہ اس کی وجہ سے کام میں خلل واقع ہو تو آپ مجھ سے جواب طلب کر سکتے ہیں'' لیکن کالون بڑا ہی متعصب عیسائی تھا، اُسے نماز ہی سے بُغض تھا، اس لیے اس نے نماز کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

اس پر مشتاق حسین صاحب نے تحریری درخواست دی کہ یا تو ادائے نماز کے لیے تھوڑی سی غیر حاضری معاف کردی جائے، یا غیر حاضری کے وقت کی تنخواہ کاٹ لی جائے یا چھ ماہ کی رخصت دی جائے اور اگر اِن میں سے کوئی بھی صورت منظور نہ ہو تو اس درخواست کو میرا استعفا سمجھ لیا جائے اس طرح موصوف محترم بڑی بے تکلفی کے ساتھ پندرہ سال کی ملازمت سے دست بردار ہونے پر تیار ہو گئے، لیکن نماز میں تاخیر گوارا نہ کی، قصہ کوتاہ یہ کہ ظالم کالون نے یہ تینوں صورتیں قبول نہ کیں اور مشتاق حسین صاحب نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اُس وقت وہ اس محکمے سے ڈیڑھ سو روپے تنخواہ پا رہے تھے۔

اللہ نے اپنی عبادت کے لیے اپنے بندے کے اس اخلاص اور جذبے کی قدر یوں کی کہ سر سیّد احمد خاں کی سفارش پر حیدر آباد دکن کے وزیر اعظم سر سالار جنگ نے مشتاق حسین صاحب کو چار سو روپے ماہانہ کی تنخواہ پر محکمہ عدالت و پولیس میں باوقار ملازمت عطا کر دی۔ جہاں سے اپنی ایمان داری اور حق گوئی کی بنا پر ترقی کرتے کرتے صوبہ وارنگل کے گورنر بنا دیئے گئے۔ سر آسمان جاہ بہادر کی وزارتِ عظمیٰ کے دوران میں تو وہ پوری ریاست کے انتظامی امور کے کرتا دھرتا تھے۔ اس دور میں قدرتِ خداوندی نے انہیں وقار الدولہ، وقار الملک نواب مشتاق حسین خاں بہادر انتصار جنگ بنا دیا اور بے پناہ عزت و توقیر اُن کے حصے میں آ گئی۔

۱۸۹۲ء میں نواب وقار الملک نے حیدر آباد دکن کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ لے لی اور باقی عمر قوم کے تعلیمی و سیاسی و رفاہی امور کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ نواب محسن الملک کی وفات کے بعد وہ علی گڑھ کالج کے سکرٹری بن گئے اور انہی کے عہدِ نظامت میں اس کالج نے مسلم یونیورسٹی کی صورت اختیار کی۔ آخر وقت تک بھرپور ملی خدمات انجام دیتے ہوئے جنوری ۱۹۱۷ء میں وفات پائی۔

نواب وقار الملک اعلیٰ ترین انسانی اور اخلاقی خوبیوں کے حامل تھے۔ بے حد غریب پرور تھے۔ ملازموں کا بہت خیال رکھتے، یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کے وظائف مقرر کر رکھے تھے۔

غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کا انتظام کرتے اور مقروض لوگوں کے قرض ادا کرتے۔ اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے باوجود آپ نے محبت اور انکسار کا رویہ برقرار رکھا۔ دوسروں کو مصیبت اور مشکل میں دیکھ کر اشک بار ہو جاتے۔

کردار کی اِن اعلیٰ خصوصیات کی وجہ سے اللہ اُن کی دعاوں کو شرف قبولیت بخشتا تھا۔ چنانچہ یہ بڑا ہی ایمان افروز واقعہ ہے کہ وہ ایک بار بیمار ہوئے تو رُخصت لے کر آرام اور علاج کی خاطر کسی پہاڑی مقام پر چلے گئے۔ وہاں انہیں پتہ چلا کہ خشک سالی کی وجہ سے اُن کے صوبے میں صورتِ حال بہت نازک ہوگئی ہے اور بارش نہ ہونے کی وجہ سے فصلیں سوکھ رہی ہیں اور مویشی مر رہے ہیں۔ چنانچہ فوراً رخصت ختم کر کے اپنے صوبے میں آئے، سارے علاقے کا دورہ کیا اور پھر ایک جگہ ایک جھونپڑے میں بیٹھ کر دعائیں کرنے لگے اور زار زار رونے لگے۔ بمشکل دو گھنٹے گزرے تھے کہ گھٹائیں امنڈ کر آئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی حتیٰ کہ جس جھونپڑے میں بیٹھے ہوئے تھے، وہ ٹپکنے لگا اور آپ کا سارا لباس تر بتر ہو گیا۔

(یہ تحریر مشہور محقق اور مصنف مولانا غلام رسول مہر کے
ایک طویل مضمون کی روشنی میں مرتب کی گئی۔)

(۲۹)

ڈاکٹر ولیم لیٹنر (William Leitner) (۱۸۴۹-۱۸۹۹ء) انیسویں صدی عیسوی کے ایک نامور مستشرق تھے۔ ان کا تعلق ہنگری کے ایک یہودی خاندان سے تھا، مگر انہیں اسلامی تہذیب وثقافت اور اسلامی زبانوں سے گہرا لگاؤ تھا چنانچہ وہ عربی، فارسی، اُردو، ترکی سمیت تقریباً ساری اسلامی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ ۱۸۶۴ء میں ہندوستان چلے آئے اور لاہور میں اکیس سال تک مقیم رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام میں انہوں نے بنیادی کردار ادا کیا اور لمبے عرصے تک وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج کے پرنسپل اور ڈائریکٹر تعلیمات کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ ڈائریکٹر تعلیم کی حیثیت سے اُنہوں نے مختلف شہروں میں متعدد تعلیمی ادارے قائم کئے۔

۱۸۸۴ء میں ڈاکٹر لیٹنر انگلینڈ چلے گئے اور لندن کے نواح میں ایک خوش منظر قصبے ووکنگ میں رہائش اختیار کی۔ اس قصبے کے وسط میں رائیل ڈرامیٹک کالج کی عمارت تھی۔ ڈاکٹر لیٹنر نے یہ عمارت خرید لی اور عزم کرلیا کہ وہ اس جگہ پر مسجد کی تعمیر کریں گے۔ موصوف محترم کے مزاج، کردار اور عمومی رویّوں کے پیشِ نظر اُن کے جاننے والے اکثر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ اندرونِ خانہ دراصل حلقہ بگوشِ اسلام ہو چکے تھے، مگر کسی مصلحت کے تحت اُنہوں نے اس کا اعلان نہیں فرمایا تھا۔

اِسے حسنِ اتفاق ہی کہنا چاہیے کہ جن دنوں ڈاکٹر لیٹنر نے مسجد کے لیے جگہ خریدی اُن دنوں نواب آف بھوپال کی بیگم محترمہ شاہجہان اپنے بیٹے کے علاج کے سلسلے میں لندن آئی ہوئی تھیں۔ اس نوجوان شہزادے کو کوئی پیچیدہ مرض لاحق تھا اور وہ کسی علاج سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ لندن کے بہترین ڈاکٹر بیماری کی تشخیص کرنے میں ناکام رہے تھے اور انہوں نے شہزادے کو لا

علاج قرار دے دیا تھا۔ جس کی وجہ سے بیگم بھوپال بے حد پریشان تھیں۔

اسی ماحول میں ڈاکٹر لیٹنر نے بیگم بھوپال سے ملاقات کی، بیٹے کی بیماری کے حوالے سے اُن سے اظہارِ ہمدردی کیا اَور توجہ دلائی کہ مَیں نے ووکنگ میں ایک عمارت خریدی ہے اور اسے گرا کر وہاں مسجد تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ آپ براہ کرم اس کے لیے مالی تعاون فرمائیں۔

بیگم بھوپال ہندوستان میں ڈاکٹر لیٹنر کی تعلیمی خدمات سے بخوبی واقف تھیں اَور اُن کے دل میں موصوف کے لیے خصوصی قدر اَور احترام تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے مسجد کی تعمیر کے منصوبے کو سراہا اَور فوری طور پر ایک ہزار پونڈ کی رقم انہیں پیش کر دی۔ اس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم تھی اور اس سے بہت کشادہ، خوبصورت اَور شاندار مسجد تعمیر ہو گئی جو آج تک مسجد شاہجہان کے نام سے قائم ہے اَور ڈاکٹر لیٹنر اَور بیگم بھوپال کے لیے مستقل صدقۂ جاریہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ انگلینڈ کی سرزمین پر یہ پہلی مسجد تھی جو معرضِ وجود میں آئی۔

بے حد حیرت انگیز اَور ایمان افروز بات یہ ہے کہ جس روز بیگم بھوپال نے مسجد کی تعمیر کے لیے یہ خطیر رقم فراہم کی، ان کا بیٹا اسی روز سے شفایاب ہونا شروع ہو گیا اَور چند ہی روز میں اُس کی بیماری کے سارے آثار ختم ہو گئے اَور وہ مکمل تندرست ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر اُس کے سارے ہی معالج ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔

(یہ معلومات جناب سلطان محمود کے مضمون مطبوعہ ''نوائے وقت'' میگزین مورخہ ۳۱ر جنوری ۲۰۱۰ء سے اخذ کی گئی ہیں۔ سلطان محمود صاحب مشہور صحافی ہیں اَور لندن میں مقیم ہیں۔)

(۳۰)

سائے

ذیل کی فکر انگیز اور ایماں افروز تحریر مشہور کالم نویس، ادیب اَور دانشور جناب جاوید چودھری کی ہے اس کی اہمیت اَور افادیّت کے پیشِ نظر مصنّف کے شکریے کے ساتھ شاملِ کتاب کر رہا ہوں۔

☆☆☆

حاجی صاحب لان میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ گلاب کی کیاریوں سے اپنا سفر شروع کرتے، نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے چنبیلی کی قطار تک پہنچتے، رکتے، منہ کھول کر لمبے لمبے سانس لیتے اور کمر پر ہاتھ رکھ کر واپس گلاب کی طرف چل پڑتے۔

پچھلے آدھے گھنٹے میں یہ ان کا آٹھواں چکر تھا۔ ان کا مشہورِ زمانہ ڈنڈا امرود کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مَیں حیرت سے کبھی ڈنڈے کی طرف دیکھتا اور کبھی لقا کبوتروں کی طرح سینہ پُھلا کر واک کرتے حاجی صاحب پر نظر ڈالتا اور بے چین ہو کر ''لان چیئر'' پر پہلو بدلنے لگتا۔

مَیں حاجی صاحب کو پچھلے دس برس سے جانتا ہوں۔ حاجی صاحب دائم مریض ہیں۔ ان کا جگر سکڑ کر پندرہ فی صدرہ گیا تھا۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے ہر ہفتے پیٹ سے چار بوتل پانی نکلواتے تھے۔ ان کے گُردے تقریباً ناکارہ ہو چکے تھے۔ وہ ایک وقت میں آدھے سلائس سے زیادہ غذا نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے پھیپھڑوں میں اکثر پانی بھر جاتا تھا جس سے انھیں سانس لینے میں دقّت ہوتی تھی۔ نقاہت اس قدر تھی کہ ملازم انھیں اٹھا کر ٹوائلٹ لے جاتے تھے۔ معالجوں کی کوشش سے کبھی سال چھ مہینے بعد ان کی طبیعت ذرا سی دیر کے لیے سنبھل جاتی تو وہ چھڑی

(ڈنڈے) کی مدد سے اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ تین برس پہلے ایک بار جب وہ بالکل تن درست ہو گئے تو وہ چھڑی کا سہارا لے کر بیڈ سے کرسی تک چلے جاتے تھے۔

یہ حاجی صاحب میرے ایک قریبی دوست کے والد ہیں۔ خاندانی رئیس ہیں۔ چار ماہ قبل جب مَیں انھیں سلام کرنے گیا تو وہ لیٹ کر ریڈیو کی ناب گھمانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن رعشے کے باعث ناب اُن کی گرفت میں نہیں آ رہی تھی۔ مَیں نے ہاتھ بڑھا کر ناب گھمائی اور ان کی مرضی کا اسٹیشن لگا کر ریڈیو ان کے سرہانے رکھ دیا۔ ممنونیت سے حاجی صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جب کہ ان کی بے بسی دیکھ کر میرا حلق نمکین ہو گیا۔

چار ماہ بعد، جی ہاں صرف چار ماہ بعد ان کے گھر داخل ہوا تو حاجی صاحب کو سہارے کے بغیر لان میں چہل قدمی کرتے دیکھا۔ حیرت سے میرا منہ کھل گیا۔ مَیں لان چیئر پر بیٹھ گیا۔ حاجی صاحب نے دور سے ہاتھ ہلا کر مجھے خوش آمدید کہا اور خود اسی طرح واک کرتے رہے۔ دسواں پھیرا مکمل ہوتے ہی وہ مڑے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کرسیوں کے نزدیک آ گئے۔ مَیں ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ حاجی صاحب نے بازو آگے بڑھا کر مجھ سے ہاتھ ملایا، میری خیریت پوچھی اور اور پھر مسکرا کر میرے سامنے بیٹھ گئے۔ مَیں بھی بیٹھ گیا۔ حاجی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ گردن میں صحت مند لوگوں جیسا تناؤ تھا اور آواز میں راجپوتوں کی روایتی گھن گرج تھی۔ ملازم نے ان کے کاندھوں پر تولیہ ڈال دیا۔ حاجی صاحب نے رگڑ کر منہ صاف کیا اور ہنس کر بولے ''مَیں تمھاری پریشانی سمجھ رہا ہوں۔ تمھاری جگہ کوئی بھی ہوتا تو اس کا یہی ردِعمل ہوتا۔'' انھوں نے تولیہ واپس کیا اور اشارے سے چھڑی لانے کا حکم دیا۔ ملازم امرود کے پیڑ کی طرف چل پڑا۔

''لیکن یہ معجزہ ہوا کیسے، کوئی دوا، کوئی دعا، کوئی پیتھی، کوئی تھراپی، کس نے یہ کمال دکھایا؟'' مجھے اپنے سوال کے لیے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ حاجی صاحب مسکرائے تو ڈوبتے سورج کی کرنیں ان کے دودھ جیسے اُجلے دانتوں پر اُتر آئیں۔ پھر ملازم ان کی چھڑی لے آیا۔ انھوں

نے چھڑی کے دستے پر دونوں ہاتھ جمائے اور پھر ہاتھوں کے کوہان پر ٹھوڑی جما کر بولے:

''میرے ہاتھ ایسا نسخہ آ گیا ہے کہ اگر دنیا کو معلوم ہو جائے تو سارے ڈاکٹر بے روزگار ہو جائیں، سارے ہسپتال بند ہو جائیں اور سارے میڈیکل اسٹوروں پر تالے پڑ جائیں۔''

مَیں مزید حیران ہو گیا۔ حاجی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا، ''یار کا کا جی! میرے ملازم کی ماں مر گئی۔ یہ چھٹی پر گاؤں چلا گیا تو میرے بچوں نے عارضی طور پر مجھے چھ سات سال کا ایک بچہ دے دیا۔ یہ بچہ تازہ تازہ ہمارے گھر ملازم ہوا تھا۔ بچہ تھا لہٰذا اسے مجھے سنبھالتے ہوئے بڑی دقت ہو رہی تھی۔ ایک روز مَیں نے سوچا، پتا نہیں وہ کون سی مجبوری ہے جس نے اس معصوم کو مجھ جیسی لاش سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔ مَیں نے اس سے وہ مجبوری پوچھی تو پتا چلا کہ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سیلاب میں بہہ گئے تھے۔ ڈھور ڈنگروں اور زمین جائداد پر عزیز رشتے داروں نے قبضہ کر لیا اور خود وہ تین وقت کے کھانے اور دو کپڑوں کے عوض ہمارے گھر ملازم ہو گیا۔ بچے کی کہانی سن کر میرا دل پسیج گیا۔ مَیں نے بچے سے پوچھا: ''بیٹا تم پڑھو گے؟'' بچے نے ہاں میں گردن ہلا دی۔ مَیں نے اپنے منیجر کو بلوایا اور بچے کو شہر کے سب سے اچھے اسکول میں داخل کرانے کی ہدایت کر دی۔ تم یقین کرو اس روز مَیں نے تین سال بعد پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ مَیں اور میرے ڈاکٹر حیران رہ گئے۔ اگلے روز مَیں نے اس بچے کو ہوسٹل میں داخل کرا دیا۔ اس شام ملازم نے مجھے ٹوائلٹ لے جانے کے لیے اٹھایا تو مَیں سہارے کے بغیر پلنگ سے اٹھ گیا۔ ٹوائلٹ سے واپس آیا تو مَیں نے ملازم بلوائے اور انھیں کل تک ایسے پانچ بچے لانے کا حکم دے دیا جن کا اس دنیا میں کوئی نہ ہو۔ اگلے روز پانچ بچے آ گئے۔ مَیں نے انھیں بھی اسی اسکول میں داخل کرا دیا۔''

حاجی صاحب خاموش ہو گئے۔

''پھر کیا ہوا حاجی صاحب''۔ مَیں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''پھر یہ سب کچھ ہوا جو تمھارے سامنے ہے۔ مَیں اپنی ٹانگوں پر چل رہا ہوں، کھا پی رہا ہوں، قہقہے لگا رہا ہوں۔''

حاجی صاحب نے چھڑی گھاس پر پھینکی، کرسی سرکائی اور کمر پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مَیں بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ مسکرائے اور کھنکتی آواز میں بولے: ''تم بیٹھ کر چائے پیو، مَیں نے ابھی مزید دس پھیرے لگانے ہیں۔''

مَیں بیٹھ گیا۔ حاجی صاحب سینہ پُھلا کر گلاب کی کیاریوں کی طرف چل پڑے۔'' حاجی صاحب احتیاط سے چلیں کہیں گر نہ جائیں؟''مَیں نے ہانک لگائی۔ حاجی صاحب نے مڑے بغیر قہقہہ لگایا اور اسی طرح لقا کبوتروں کی طرح چلتے چلتے بولے:

''مَیں اب نہیں گروں گا۔ مَیں گر گیا تو ان چھے یتیم بچوں کو ہر مہینے ستر ہزار روپے کون دے گا۔ میں نہیں گروں گا۔ اب مَیں اس وقت تک نہیں گروں گا جب تک یہ بچے اپنے قدموں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔''

حاجی صاحب گلاب کی کیاریوں کے قریب رک گئے، میری طرف دیکھا اور ذرا اونچی آواز میں بولے:

''قدرت یتیموں کو چھاؤں دینے والے درختوں کے سائے لمبے کر دیا کرتی ہے۔''

(بہ شکریہ روزنامہ جنگ)

(۳۱)

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود اس امر کی اجازت عطا فرمائی ہے کہ "وَاَمَّا بنعمۃِ رَبِّکَ فَحَدِّث" (یعنی اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو) اس لیے اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی زندگی کے ایسے واقعات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جو مکافاتِ عمل کے حوالے سے فکر انگیز ہیں اور دلچسپ بھی۔ (فاروق)

میری زندگی پر توحیدِ خالص کی برکات

مَیں جس خاندان میں پیدا ہوا اُور جس ماحول میں پلا بڑھا وہاں جہالت اُور بدعات و خرافات پورے عروج پر تھیں۔ میرے والد اُور والدہ دونوں چٹے ان پڑھ تھے، قرآن ناظرہ تک پڑھے ہوئے نہیں تھے۔ میرے والد محترم ۔مہر پیراں دتہ۔ کے نام ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہاں پیروں کی کس قدر اہمیت وحیثیت تھی۔ ہمارے گاؤں کے اردگرد چند میل کے فاصلے میں دس مختلف مقابر اور بزرگوں کی درگاہیں تھیں اور ہر مقبرے اُور درگاہ کو گویا عبادت کدے کی حیثیت حاصل تھی۔ بچہ پیدا ہوتا تو اسے نزدیکی مقبرے یا درگاہ میں لے جایا جاتا اُور قبر کی پائنتی کی طرف اُس کا ماتھا ٹکایا جاتا، شادی کے لیے بارات گاؤں سے رخصت ہوتی تو دولہا کے لئے لازم تھا کہ وہ قبر کا طواف کرے اور صاحبِ قبر کے پاؤں کی طرف سجدہ کرے۔ کوئی بیمار ہو جاتا تب بھی مریض کو قبر پر لے جایا جاتا تھا۔ وہ قبر کو سجدہ کرتا تھا اُور اسے وہاں کی مٹی کھلائی جاتی تھی۔

بھینس بچہ جنتی اور دودھ دینا شروع کرتی تو پہلا باقاعدہ دودھ درگاہ پر چڑھایا جاتا تھا۔ کوئی بھی فصل تیار ہوتی خصوصاً سبزیاں اور پھل تو سب سے پہلے مقبرے کا حصہ نکالا جاتا تھا۔

میرے اُس ماحول میں پیروں کی حیثیت اُور اہمیت کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص لازماً کسی نہ کسی پیر کا مرید تھا۔ یہ بات سند کی حیثیت رکھتی تھی کہ جس کا پیر نہیں اُس کا نہ نکاح ہے نہ جنازہ ہے۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ میرے والد گرامی بیک وقت چار درگاہوں سے وابستہ تھے۔ وہ ''حضرت شیر گڑھ'' کی درگاہِ عالیہ کے مرید تھے۔ وہ پیر نادر شاہ سے بیعت تھے اُور نہر والے پل کے پاس تارک الدنیا بزرگ سے بھی گہری ارادت رکھتے تھے اُور ہر جمعرات کو وہاں لازماً حاضری دیتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں پیر گیارھویں والے کی نمائندگی ماسٹر عبدالمجید بھٹی اور عبدالرشید بھٹی کرتے تھے۔ یہ دونوں بھائی جو قریبی قصبے میں اسکول ماسٹر تھے، پابندی کے ساتھ ہر پندرہ روز کے بعد گاؤں آتے تھے اُور مختلف تحائف کا نذرانہ وصول کر کے ''بغداد شریف پہنچاتے تھے''۔

سیالکوٹ شہر ہمارے گاؤں سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے اُور وہاں ہمارے کئی رشتے دار تھے، میری ایک خالہ بھی وہیں رہتی تھیں۔ اس طرح والدہ محترمہ وہاں جاتی رہتی تھیں اور انتہائی باقاعدگی کے ساتھ ''حضرت امام صاحب'' بھی حاضری دیتی تھیں۔ ایک مرتبہ مجھے ساتھ لے کر والدہ محترمہ تکیہ ملک شاہ بھی تشریف لے گئی تھیں جو سیالکوٹ کے قریب اگوکی ریلوے سٹیشن کے پاس واقع ہے۔ قریبی درگاہوں پر بھی وقتاً فوقتاً ضرور حاضری دی جاتی تھی۔

یہ بات بڑی ہی حیرت انگیز، عبرت ناک اُور مضحکہ خیز ہے کہ توحیدِ خالص کے شہرہ آفاق علمبردار سید عبدالقادر جیلانیؒ کو ہمارے ماحول میں غوث الاعظم پیر گیارھویں والے کے نام سے باقاعدہ معبود کا درجہ دے دیا گیا تھا اُور اللہ تعالیٰ کی بجائے عام لوگ انہیں سے استمداد کرتے تھے۔ قرآن کے بیان کے مطابق کفارِ عرب مصیبت کے وقت اپنے جعلی معبودوں سے صرفِ نظر کر کے صرف اللہ کو پکارنے لگتے تھے، لیکن ہمارے دیہات کے مسلمان مصیبت اُور پریشانی کے وقت بھی گیارھویں والے پیر اور غوث الاعظم کی دہائی دیتے تھے۔ برملا کہا جاتا ''لے یارویں والے داناں تے ڈبی ہوئی تر جائیں گی'' یعنی ڈوبتے وقت گیارھویں والے کو پکارو گے تو وہ تمہیں بچالے گا۔ جاہل مائیں بچوں سے ناراض ہو کر بد دعا دیتیں تو اکثر کہا کرتیں ''تینوں لے یارویں

والا"یعنی گیارھویں والا پیر تیری جان نکال لے۔

ہر گھر میں مرغیاں بچے نکالتی تھیں اور ہر مرغی کے خاندان میں ایک بچہ گیارھویں والے کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اس حکایت سے ہر خاص و عام واقف تھا کہ بغداد والے پیر نے جو بیٹا ایک خاندان کو عطا کیا تھا، وہ جوان ہونے پر فوت ہوگیا تو اُس کی ماں کی شکایت پر پیر صاحب شدید غضب ناک ہوئے، انہوں نے ملک الموت کو پکڑلیا، اُس سے روح واپس کرنے کا مطالبہ کیا اَور اس کے انکار پر فرشتے کو ایسا تھپڑ رسید کیا کہ اُس کی ایک آنکھ ناکارہ ہوگئی۔ میرا بڑا بھائی بڑے وثوق سے کہا کرتا تھا کہ ملک الموت ایک آنکھ سے کانا ہے اَور یہ پیر غوث الاعظم کے غصے کا نتیجہ ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

بہ ہر حال یہ تھی وہ فضا جس میں مَیں نے شعور کی آنکھیں کھولیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ چار پانچ سال کی عمر میں جب مجھے خسرہ نکلا تھا تو مجھے "حضرت لکھ داتا" کی علامتی قبر پر لے جایا گیا تھا، وہاں سجدہ کرایا گیا تھا اَور مٹی کھلائی گئی تھی......لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر کس زبان سے ادا کروں کہ گیارہ بارہ سال کی عمر ہی میں مَیں نے اس ماحول کے خلاف بغاوت کردی اَور بغاوت کی یہ لے پھر بڑھتی ہی چلی گئی۔ مَیں چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ گرمیوں کی ایک دوپہر کو بڑ کے ایک گھنے درخت کے نیچے بہت سے مرد اور بزرگ عورتیں چارپائیوں پر بیٹھے تھے اَور ایک نوجوان پنجابی کا ایک منظوم قصہ مخصوص ترنّم کے ساتھ پڑھ رہا تھا۔ قصہ یوں تھا کہ بغداد کی ایک عورت منّت مانتی ہے کہ مَیں اپنے بیٹے کی شادی کروں گی تو پیر گیارھویں والے کو بکرا نذر کروں گی......لیکن بے چاری کسی وجہ سے بھول گئی اور اُس نے بکرا نذر نہ کیا۔

تب پیر صاحب ناراض ہوگئے اَور جب اُس عورت کا بیٹا دولہن کو لے کر کشتی پر دریا پار کر کے اپنے گھر کی طرف آرہا تھا تو پیر صاحب نے کشتی ڈبودی اَور سب باراتی دولہا، دولہن سمیت پانی میں غرق ہوگئے۔

اس ادھیڑ عمر بیوہ عورت کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو وہ چیختی چلاتی دریا کے کنارے پر پہنچی

اَور آہ وزاری کرنے لگی۔ اس کا یہ واویلا ایک دن نہیں، ایک مہینہ نہیں، ایک سال نہیں، بلکہ بارہ سال تک جاری رہا...... تب اتنی طویل مدت گزرنے کے بعد پیر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا، عورت کی توبہ قبول ہوگئی۔ پیر صاحب نے اُسے معاف کر دیا اَور فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ روحیں واپس کرو جو بارہ سال پہلے تم نے قبض کی تھیں، مچھلیوں کو حکم دیا کہ بارہ برس پہلے تم نے میرے جو بندے کھالئے تھے، وہ بھی اپنے پیٹوں سے باہر نکالو اَور اس طرح پیر گیارھویں والے نے بارہ سال کے بعد پوری کی پوری بارات اُس مائی کے حوالے کر دی۔ اس قصے کا نام تھا ''معجزہ حضرت پیر غوث الاعظم''

حاضرین مرد وزن اس قصے کو سن کر کانپ رہے تھے، سہمے سکڑے خوفزدہ نظر آ رہے تھے کہ مَیں نے نعرہ مار دیا ''پیر بڑا ظالم سی، فیر کی ہوگیا سی جے مائی بھل گئی سی۔ پیر نے اونہوں بارہ سال ناجائز پریشان کیتا''...... میری اس بات پر پوری محفل میں سناٹا چھا گیا، قصہ خواں نے گانا روک دیا...... سب خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے اَور قریب بیٹھے ہوئے دو آدمیوں نے میری کمر پر دو دھولیں بھی جما دیں...... بدبخت لعنتی کتے، تمہیں ناک صاف کرنا آیا نہیں اَور بکواس کرنے لگے ہو پیر دستگیر، حضرت غوث الاعظم کے خلاف...... توبہ کرو، کانوں کو ہاتھ لگاؤ، ورنہ غرق ہو جاؤ گے، برباد ہو جاؤ گے...... لیکن میں نے نہ توبہ کی، نہ کانوں کو ہاتھ لگایا اَور اُس محفل سے اُٹھ کر گھر آ گیا۔

اس صورتِ حال سے میری والدہ خصوصاً بہت پریشان ہوئیں۔ وہ پیروں اور درگاہوں کی شدت سے عقیدت مند تھیں اَور اس حوالے سے گھر میں مختلف رسموں کی کارفرمائی تھی: جمعرات کا ختم انتہائی باقاعدگی سے ہوتا، گیارھویں بھی اہتمام سے بٹتی اَور مختلف مقابر اَور پیر خانوں پر نذرانے بھی پابندی سے پیش کئے جاتے...... لیکن جب مَیں نے پرائمری اسکول کے بعد اسلامیہ ہائی اسکول سمبڑیال میں داخلہ لیا تو اللہ نے شاید اسی جذبۂ توحید کی برکت سے مجھے کتاب سے وابستہ کر دیا اَور مجھے مطالعے کا گویا جنون سا ہو گیا۔ اسکول گاؤں سے ڈھائی میل دور تھا۔ یہ فاصلہ پیدل ہی طے کرنا ہوتا تھا اَور مَیں یہ سفر مطالعہ کرتے ہوئے گزارتا تھا۔ پھر اُردو اَور عربی کے اُستاد

مولوی محمد نذیر صاحب. قاسمی جامع مسجد میں جمعے کی تقریر بھی فرماتے تھے اُور مَیں جمعہ پابندی سے وہیں پڑھتا تھا اُور اُن کی تقاریر مکمل صورت میں اُور توجہ سے سنتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ توحیدِ خداوندی کے راستے پر میرا سفر بڑھتا ہی چلا گیا اُور ہمہ جہت مطالعے کی وجہ سے میری معلومات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

شاید توحید ہی کی بدولت اللہ نے مجھ پر یہ فضل فرمایا کہ مجھے عمل کی توفیق عطا فرمادی اُور یہ میری مستقل عادت بن گئی کہ جو بھی اچھی بات مجھ تک پہنچتی، مَیں اُسے اپنے عمل کا حصّہ بنا لیتا۔ چنانچہ نویں جماعت میں پہنچا تو مَیں نے پیر پرستی اُور قبر پرستی کے خلاف علانیہ بغاوت کردی اُور جمعراتوں، گیارھویوں اُور غیر اسلامی رسوم و رواج کے خلاف مہم چلادی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گھر کی اُور گاؤں کی فضا میں ایک زلزلہ سا آ گیا۔ والدہ محترمہ نے شدید ترین انداز میں رَدِّعمل کا اظہار کیا، منجھلے بھائی نے اُن کا ساتھ دیا اُور والد صاحب سے اصرار کیا کہ یہ گمراہ ہوگیا ہے، وہابی ہوگیا ہے۔ پیروں، فقیروں کا مخالف ہے، اس لئے اس کی تعلیم ختم کردی جائے، لیکن میری بڑی بہن نے جو کم عمری ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں اُور بے حد عبادت گزار تھیں، انہوں نے میرے خیالات کی مکمل تائید کردی۔ والد صاحب کو سمجھایا، وہ بھی صورتِ حال کو سمجھ گئے اُور اس طرح حیرت انگیز طور پر میری تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ توحید کی برکت سے مَیں نہ صرف آٹھویں جماعت کے ورینکلر فائنل کے امتحان میں اسکول میں اوّل رہا بلکہ دسویں جماعت کے آرٹس گروپ میں پہلی پوزیشن لے کر کامیاب ہوگیا۔

اُور پھر گھر کے متعدد افراد کی مخالفت کے باوجود والدِ گرامی نے بہت ہی محدود وسائل کے باوجود مجھے کالج میں داخلہ دلادیا، لیکن جب مَیں نے ایف اے پاس کرلیا تو دونوں بڑے بھائیوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا۔ انہوں نے والد صاحب سے اس شان کے ساتھ علیحدگی اختیار کرلی کہ گھر کی ہر چیز کو دو حصوں میں تقسیم کرلیا۔ مویشی، حویلی اُور زراعت کا دوسرا سامان۔ بس یہ مہربانی کی کہ والدین کو سر چھپانے کے لئے دو کمرے عطا کردیئے۔

تاہم اللہ کا شکر ہے کہ مَیں نے بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا مجموعی اعتبار سے میں نے ۶۷ فیصد نمبر حاصل کئے جبکہ انگریزی میں ۲۰۰ میں سے میرے ۱۲۰ نمبر تھے جو غیر معمولی بات تھی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ توحید پر کاربند ہو جانے کا کرشمہ تھا کہ دسویں جماعت ہی میں بغیر کسی کی معمولی رہنمائی کے مَیں نے مضمون نگاری شروع کر دی اَور میری تحریریں مرحوم صادق قریشی کے پندرہ روزہ سرکاری رسالے ''ہم لوگ'' میں چھپنے لگیں۔ مَیں جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ کے مجلّہ کا تین سال تک مدیر بھی منتخب ہوتا رہا۔

مَیں نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا تو والد صاحب نے ہاتھ اٹھا دیئے۔ انہوں نے فرمایا: دیکھ رہے ہو گھر کی کیا صورتِ حال ہے؟ تمہارے دونوں بڑے بھائی الگ ہو گئے ہیں اَور مَیں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ چاہوں بھی تو کوئی کام نہیں کر سکتا کہ مویشیوں پر انہوں نے قبضہ کر لیا ہے، اس لئے اب نوکری کر لو اَور گھر چلانے کی فکر کرو۔ میرے والد ایک غریب کسان تھے۔ اُن کی ایک مرلہ بھی اپنی زمین نہیں تھی۔ آٹھ دس ایکڑ ٹھیکے پر لے کر کاشت کرتے تھے، لیکن چونکہ ماحول کی عام روایت کے برعکس وہ پکے نمازی تھے، خیر پسند تھے اَور خلقِ خدا کی خدمت میں سرگرم رہتے تھے، اس لئے اللہ نے ان کی کمائی میں خاص برکت عطا فرما دی تھی۔ اندازہ کیجیے کہ ہمارے کھیت گاؤں سے عین متصل تھے، اُن میں سبزیاں بھی کاشت کی جاتی تھیں اَور عام لوگ کھیتوں میں گھس کر سبزیاں، گنے اَور خربوزے توڑ لیتے تھے، لیکن والد صاحب نے مستقل عادت بنا لی تھی کہ وہ کسی بھی ضرورت مند کو یہ چیزیں حاصل کرنے سے منع نہیں کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی تاکید کی ہوئی تھی کہ کھیت میں گھسنے والے کسی فرد کو آواز نہ دیں۔ اس وسعتِ قلبی اَور حوصلہ مندی کا صلہ اللہ نے انہیں یہ دیا تھا کہ فصل خوب افراط سے ہوتی تھی اَور غلے کو اَور سبزیوں کو کبھی کسی حوالے سے نقصان نہیں پہنچتا تھا۔ افسوس کہ اُن کے دونوں بڑے بیٹوں نے اس صالح روایت کو قائم نہ رکھا اَور طرح طرح کے مسائل میں مبتلا [illegible]۔

مَیں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ وہ مزید دو سال انتظار کر لیں تاکہ میں ایم اے

کرلوں۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے یہ مہلت عطا کر دی، مَیں نے اُن سے وعدہ کیا کہ مَیں مزید تعلیم کے لیے اُن پر ذرہ بھی بوجھ نہیں بنوں گا۔ چنانچہ مَیں نے دو دوستوں سے آٹھ سو روپے قرض لیا۔ ایک سے پانچ سو، دوسرے سے تین سو اَور ستمبر ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور میں ایم اے اُردو کی کلاس میں داخلہ لے لیا۔ زعم یہ تھا کہ بی اے میں میرے بہت اچھے نمبر ہیں اَور اُردو میں مَیں نے ۲۰۰ میں سے ۱۳۸ نمبر حاصل کئے ہیں، اس لئے مجھے کوئی سکالرشپ مل جائے گا، مگر افسوس کہ معلومات کی کمی اَور اناڑی پن کی وجہ سے مجھے کوئی وظیفہ نہ ملا۔ سہگل فاؤنڈیشن کا اشتہار چھپا اَور مَیں نے درخواست دی، لیکن مجھے وظیفہ دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا گیا کہ ہم سائنس سٹوڈنٹس کو وظیفے دیتے ہیں، آرٹس والوں کو نہیں دیتے، لیکن اس ادارے کے ایک اہلکار نے مجھے بتایا کہ تمہارے نمبر اتنے اچھے ہیں کہ اگر تم کوئی سفارش لے آؤ، تو تمہیں وظیفہ مل سکتا ہے۔

اب لاہور میں میرا تعارف یا صادق قریشی (مرحوم) سے تھا جو محکمہ زراعت کے شعبہ اطلاعات میں افسر تھے اَور چند سال پہلے ایک پندرہ روزہ رسالہ ''ہم لوگ'' نکالا کرتے تھے جس میں تین سال تک میرے مضامین شائع ہوتے رہے یا ''اُردو ڈائجسٹ'' کے الطاف حسن قریشی صاحب سے تھا جن کے رسالے میں بی اے کے دوران میرے تین مضامین شائع ہوئے تھے۔ میری ان سے سیالکوٹ میں ملاقات ہوئی تھی، انہوں نے میری تحریر کی بڑی تعریف کی تھی، نوّے روپے کا چیک دیا تھا اَور لاہور میں ملاقات کی دعوت بھی دی تھی۔

چنانچہ میں سہگل فاؤنڈیشن کے سلسلے میں سفارش کے لئے الطاف حسن قریشی صاحب سے ملا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ ہاں فاؤنڈیشن کے سکرٹری میرے جاننے والے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بات کرنے کے لئے فون کا ریسیور اُٹھایا۔ نمبر ڈائیل کرنے ہی والے تھے کہ پھر ریسیور فون پر رکھ دیا اَور کہنے لگے ''چھوڑو، یہ سرمایہ دار پیسہ دے کر خواہ مخواہ احسان جتاتے رہتے ہیں...... آپ ہمارے ہاں ''اُردو ڈائجسٹ'' میں کام کریں۔ دوپہر کے بعد پارٹ ٹائم آ جایا کریں۔ ہم آپ کو آپ کی ضرورت کے مطابق تنخواہ دے دیا کریں گے۔

اُور اس طرح اللہ نے اپنے فضل سے میرے تعلیمی اخراجات کا انتظام فرما دیا۔ اُس زمانے میں (۶۶-۱۹۶۴ء) میں مُجھے ۱۲۵ روپے مل جاتے تھے، جو میری ضروریات کے لئے کافی ہوتے تھے۔ یوں بحمد اللہ تعالیٰ حیرت انگیز طور پر میں نے ایم اے اُردو کا امتحان پاس کر لیا۔

اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایم اے کا امتحان دیا ہی تھا کہ اسلامیہ کالج سمبڑیال کے بانی اُور مالک شفقت چیمہ صاحب ایک روز میرے پاس لاہور آئے۔ فرمایا بستر اُٹھاؤ اُور صبح میرے پاس کالج پہنچو اُور وہاں اُردو پڑھاؤ۔ ڈھائی سو روپے تنخواہ دوں گا۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں ابھی گورنمنٹ کالجوں میں بھی لیکچرار کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ہی ہوا کرتی تھی۔ میرا گاؤں سمبڑیال سے صرف تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص فضل فرمایا اُور گھر کے بالکل قریب ایک باعزت روزگار عطا کر دیا۔ مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ ساری آسانیاں اُور کامرانیاں مجھے توحیدِ خالص سے وابستگی ہی کی وجہ سے حاصل ہو رہی تھیں۔

یہ جولائی ۱۹۶۷ء کی بات ہے، کالج میں تعطیلات تھیں۔ سیالکوٹ میں میرے ایک بہنوئی نے کوئٹہ کے سفر کا قصد کیا۔ وہاں اُس کے ایک قریبی دوست رہتے تھے۔ مَیں بھی اُن کے ساتھ چل پڑا، لیکن میرا وہاں جی نہ لگا اُور مَیں نے تین چار دن کے بعد ہی واپسی کا پروگرام بنالیا اُور لاہور ریلوے سٹیشن سے اُتر کر سیدھا گوالمنڈی چوک میں ''پھول بلڈنگ'' میں پہنچا۔ اُس زمانے میں اس بلڈنگ میں اسلامی جمعیت طلبہ کا دفتر تھا اُور خیال یہ تھا کہ چھٹیوں کی وجہ سے میرے کلاس فیلو اُور دوست رفیع الدین ہاشمی سرگودھا سے آئے ہوں گے شاید اُن سے ملاقات ہو جائے۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے دفتر میں ایک نوجوان سے میں نے رفیع الدین ہاشمی کا معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ وہ آئے تھے اُور ''ایپلائی'' کر کے چلے گئے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کہاں اپلائی کیا ہے تو وہ مخلص نوجوان پریشان ہو گیا۔ کہنے لگا آپ کو نہیں معلوم کہ پبلک سروس کمیشن نے لیکچررز کی بھرتی کے لئے درخواستیں طلب کی ہیں اُور پرسوں اُس کی آخری تاریخ ہے۔ اُس نے بتایا کہ درخواست فارم ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کے دفتر سے ملے گا۔

میں رکشے پر بیٹھا، ڈائریکٹر آف ایجوکیشن پہنچا، وہاں سے فارم لیا اُور سید ھالاری اڈے چلا گیا۔ وہاں سے سیالکوٹ کی بس لی اُور شام تک گاؤں پہنچ گیا۔ اپنی دستاویزات کو جو اٹھارہ کی تعداد میں تھیں، ترتیب دیا۔ صبح ڈسکہ جا کر اُن دستاویزات کی نقول ٹائپ کرائیں۔ وہیں سول ہسپتال کے انتہائی نیک دل میڈیکل سپرنٹنڈنٹ سے تصدیق کرائیں اُور دوسرے دن صبح لاہور پہنچ کر آخری روز درخواست فارم ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں جمع کرا دیا۔ یہ سب کچھ انتہائی حیرت انگیز طور پر خالص اللہ تبارک وتعالیٰ کے اپنے پروگرام کے تحت انجام پایا۔ سوچتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ اللہ ربّ العزت خود مجھے شعبۂ تدریس میں لانا چاہتے تھے اُور اس کے لئے اُنہوں نے انتظام بھی فرمایا اُور سہولتیں بھی فراہم کیں۔

اپریل ۱۹۶۸ء میں ڈیڑھ سال کی ملازمت کے بعد اسلامیہ کالج سمبڑیال کے پرنسپل نے مجھے فارغ کر دیا۔ دراصل کالج مالی بحران میں مبتلا ہو گیا تھا اُور اس زمانے میں میری تنخواہ سب سے زیادہ تھی...... چنانچہ مَیں لاہور میں ''اُردو ڈائجسٹ'' کے مدیر منتظم ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی صاحب سے ملا اُور انہوں نے مئی ۱۹۶۸ سے مجھے ایک مترجم کی حیثیت سے ''اُردو ڈائجسٹ'' کے ادارے میں شامل کر لیا تنخواہ چار سو روپے مقرر ہوئی۔ اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے بے روزگاری کی آزمائش سے بال بال بچا لیا اُور ایک باوقار صحافتی اُور علمی ادارے کے ساتھ وابستگی کا اعزاز بھی عطا فرما دیا۔

نئی ملازمت کا آغاز ہوئے پانچ چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ نومبر ۱۹۶۸ء میں پبلک سروس کمیشن کی طرف سے انٹرویو کا بلاوا آ گیا۔ یہ میری ملازمت کا عبوری دور تھا اُور مالکان کے اصول خاصے کڑے تھے۔ اس دوران میں کوئی چھٹی کرنا مصلحت کے سخت خلاف تھا۔ پھر مالکان کی یہ پالیسی تھی کہ اگر اُنہیں پتہ چل جاتا کہ ادارتی عملے کا کوئی رُکن کسی اور ادارے میں ملازمت کی کوشش کر رہا ہے، تو اُسے فوری طور پر فارغ کر دیتے تھے۔ چنانچہ مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا تھا۔ مجھے ہرگز یہ ظاہر نہیں کرنا تھا کہ مَیں کسی دوسری ملازمت کے لیے کوشش کر رہا ہوں اس دوران

میں مُجھے کوئی چھٹی بھی ہرگز نہیں کرنی تھی۔

چنانچہ میں نے ہمیشہ کی طرح اپنے مالک سے رابطہ مزید مضبوط کرلیا۔ خوب دعائیں کرتا کہ کہ باری تعالیٰ آسانی فرما دیجیے اَور کامیابی عطا کر دیجیے۔ حتیٰ کہ اسی انتظار اَور اضطراب میں انٹرویو کی تاریخ آ گئی۔ مَیں اللہ کو حاضر ناظر جان کر حلفاً بیان کر رہا ہوں کہ مَیں نے انٹرویو کے لئے کوئی معمولی سی تیاری نہ کی تھی۔ تیاری کر بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ پبلک سروس کمیشن کے انٹرویوز کا اسلوب کیا ہوتا ہے۔ پھر میرے پاس ایم اے کے نصاب کی کوئی ایک کتاب بھی نہ تھی کہ ساری کتابیں اسلامیہ کالج سمبڑیال کے پرنسپل نے لے لی تھیں اَور واپس نہیں کی تھیں۔ کلاس نوٹس میرے ایک عزیز نے اپنے کسی دوست کے لیے حاصل کئے تھے اَور مستقلاً دبا لئے تھے۔

انٹرویو دسمبر کی کسی تاریخ کو تھا۔ رمضان کا مہینہ تھا اَور جمعے کا دن تھا۔ وقت صبح آٹھ بجے تھا۔ مَیں نے حسبِ عادت گھر سے نکلنے سے پہلے دو نفل ادا کئے، پھر خوب دعائیں کیں اَور درود شریف پڑھتا ہوا رکشے پر پبلک سروس کمیشن کے دفتر پہنچ گیا۔ باہر انٹرویو دینے والوں کی فہرست تھی۔ اُن میں انگریزی کے حروفِ تہجی کے اعتبار سے پہلا نام میرا تھا۔ (ABDUL GHANI) نام پکارا گیا تو مَیں اندر داخل ہوا۔ ایک بڑی میز کے گرد انٹرویو لینے والے تشریف فرما تھا۔ اُن میں کوئی بھی میرا شناسا چہرہ نہ تھا۔ یونیورسٹی میں جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی، اُن میں سے وہاں ایک بھی نظر نہ آیا۔

خیر انٹرویو شروع ہوا، ایک صاحب نے پوچھا کہ یہ جو لمبی چوڑی فہرست آپ نے اپنے مطبوعہ مضامین کی لگا رکھی ہے، تو یہ بتایئے کہ ادب اور صحافت کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

میں نے اپنی سمجھ کے مطابق جواب دیا، لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ جواب کمیشن کے معیار کے مطابق نہ تھا۔

پھر اُس صاحب نے پوچھا: مولانا محمد علی جوہر کا ایک اخبار تھا، اس کا نام کیا تھا؟

میں نے جواب دیا: مولانا جوہر کا ایک اخبار نہیں تھا دو ہفت روزہ اخبار تھے: اُردو اخبار کا نام تھا ہمدرد اور انگریزی کا نام تھا، کامریڈ۔

پھر ایک صاحب نے پوچھا: آپ کو شاعر کونسا پسند ہے؟ مَیں نے جواب دیا: ایک نہیں بلکہ دو اُور میں فیصلہ نہیں کر پایا کہ ترجیح کس کو دوں؟ غالب اُور اقبال۔

اسی صاحب نے پھر دریافت کیا: میرؔ کیوں پسند نہیں ہے؟ مَیں نے برجستہ جواب دیا: ''میر کو پسند کرنے کی میری عمر نہیں ہے''۔

بس انٹرویو ختم ہوگیا۔ چیرمین بورڈ نے کہا: آپ جاسکتے ہیں، مَیں اٹھ کر باہر آ گیا۔ میرا کوئی بھی تاثر نہیں تھا نہ حیرت کا نہ تشویش کا...... اس لئے کہ مجھے کوئی علم یا اندازہ نہ تھا کہ انٹرویو میں کتنا وقت لگتا ہے، یہ تو بڑے لمبے عرصے کے بعد پتہ چلا کہ انٹرویو میں آدھ آدھ پون پون گھنٹہ صرف ہوجایا کرتا ہے اُور بورڈ کے ارکان اُمیدواران کی معلومات اُور علمیّت کو خوب خوب کھنگالتے ہیں اُور انہیں خوب زِچ کرتے ہیں۔

باہر نکلا تو بہت سے امیدواران کھڑے تھے، انھوں نے مجھے گھیر لیا اُور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی، لیکن مَیں بہت عجلت میں تھا۔ مَیں نے کسی کے سوال کا جواب نہ دیا۔ ہجوم میں سے راستہ نکالا۔ رکشہ لیا اُور سیدھا اُردو ڈائجسٹ کے دفتر واقع سمن آباد پہنچ گیا۔ ابھی نو نہیں بجے تھے، دفتر نو بجے شروع ہوتا تھا اُور حاضری کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ مَیں نو بجے سے پہلے اطمینان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اُور سکون سے کرسی پر براجمان ہوگیا اس طرح کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوئی تھی کہ یہ پبلک سروس کمیشن کے دفتر میں انٹرویو دے کے آیا ہے۔

ستمبر ۱۹۶۹ میں اسی انتظامیہ کی نگرانی میں ہفت روزہ ''زندگی'' کا اجراء ہوا، تو میری خواہش پر مجھے ''زندگی'' کے ادارے سے وابستہ کردیا گیا اُور یہاں زندگی کے انوکھے تجربات سے سابقہ پیش آیا۔ یہاں مجھے روزانہ چودہ گھنٹے ڈیوٹی دینی پڑتی تھی۔ صبح نو بجے سے رات گیارہ بجے تک اُور چونکہ جمعرات کو دو کاپیاں یعنی سولہ صفحے پریس میں بھجوانے ہوتے تھے، اس لئے اِس روز ڈیوٹی

بڑھ کر اٹھارہ گھنٹے ہو جاتی یعنی صبح کے تین بجے تک۔ زندگی مشین سے بھی زیادہ مصروف ہو گئی۔ ہفتہ وار چھٹی بھی عملاً ختم ہو گئی کہ ''زندگی'' کے دفتر میں اُردو ڈائجسٹ کے برعکس اتوار کے بجائے ہفتہ وار چھٹی جمعہ کو کر دی گئی۔ مَیں جمعرات کی شب تین بجے دفتر سے رہائش گاہ پر پہنچتا۔ گیارہ بجے تک نیند پوری کرتا، پھر نمازِ جمعہ کی تیاری کرتا اَور نماز کے بعد بعض مسوّدات کو ٹھیک کرتا تاکہ دوسرے روز وہ کاتبوں کے حوالے کیے جا سکیں...... سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ لاہور میں ہوتے ہوئے اپنے روحانی اور علمی مرشد مولانا مودودیؒ کی عصری محفلوں کی برکات سے محروم تھا۔

اس طرح روز و شب کی شدید ترین آزمائش تھی جس میں مَیں گھر گیا تھا۔ چنانچہ جمعرات کو شب کے ڈیڑھ دو بجتے تو مَیں وضو کرتا، اپنے کمرے میں مصلّٰی بچھاتا، دو نفل ادا کرتا اَور پھر اللہ سے خوب دعائیں کرتا: ''باری تعالیٰ مَیں بہت کمزور بندہ ہوں، مجھ پر رحم فرمائیے، آسانی مہیّا کر دیجیے اَور اس آزمائش سے نجات عطا کر دیجیے'' اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے حیرت انگیز طور پر ہمیشہ کی طرح میری دعائیں قبول فرما لیں اَور انٹرویو کے ڈیڑھ سال کے بعد مئی ۱۹۷۰ء میں مجھے پبلک سروس کمیشن کی طرف سے چٹھی موصول ہوئی جس کی رو سے مجھے لیکچرار اُردو کی مستقل اسامی پہ منتخب کر لیا گیا تھا۔ یہ ویسٹ پاکستان پبلک سروس کمیشن کا آخری بیچ تھا اَور اس میں چاروں صوبوں کے امیدواران نے انٹرویو دیئے تھے جن میں اُردو والوں کی تعداد کم از کم ایک ہزار تھی جبکہ اُردو کی اسامیاں صرف ۴۲ تھیں جن میں سے بیس عارضی اَور بائیس مستقل تھیں۔ عمر کی حد (Age Limit) چالیس سال تھی جس کے نتیجے میں پرائیویٹ کالجوں میں پڑھانے والے ایسے کثیر لوگوں نے بھی انٹرویو دیئے تھے جو تین تین مضامین میں ایم اے تھے، جبکہ مَیں نے صرف اُردو میں اَور وہ بھی سیکنڈ ڈویژن میں ایم اے کیا ہوا تھا...... لیکن بحمد اللہ تعالیٰ میرا انتخاب مستقل اسامی پر ہو گیا...... اَور یہ بے حد منفرد اَور نادر واقعہ تھا اَور مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ دیگر کامیابیوں کی مانند یہ کامرانی مجھے توحیدِ خالص کی برکت سے میّسر آئی تھی۔ یقیناً اس میں میرے والد صاحب اَور بڑی بہن کی دعاؤں کا بھی عمل دخل تھا۔

☆☆☆

قدرتی طور پر اس غیر متوقع اطلاع سے مجھے بے حد خوشی ہوئی اور اطمینان بھی کہ تدریس شعبہ میرا محبوب شعبہ تھا چنانچہ تقرری کے احکامات حاصل کرنے کے بعد میں نے ۲۸ ستمبر ۱۹۷۰ کو گورنمنٹ کالج شکر گڑھ سے زندگی کے نئے باب کا آغاز کیا اور تازہ جوش و جذبے اور مشنری سپرٹ کے ساتھ مَیں نئی شارعِ حیات پر گامزن ہو گیا۔

کالج کے پرنسپل جناب ہمایوں مرزا تھے۔ موصوف خوبصورت شخصیت کے حامل اور بڑے ہی خوش اخلاق انسان تھے۔ عزت اور محبت سے پیش آتے اور انہیں مل کر بہت خوشی ہوتی، مگر افسوس کہ ان سے رفاقت کا عرصہ بہت مختصر رہا۔ اس وقت تک کالج انٹرمیڈیٹ کی سطح تک تھا، لیکن جلد ہی اعلان ہو گیا کہ کالج کو ڈگری سطح تک اپ گریڈ کر دیا گیا ہے اور چونکہ ہمایوں مرزا صاحب اٹھارویں گریڈ میں تھے اس لیے وہ ڈگری کالج کے پرنسپل نہیں رہ سکتے تھے چنانچہ یکم جنوری ۱۹۷۱ء سے ان کا تبادلہ ہو گیا اُور ان کی جگہ گورنمنٹ کالج لاہور سے خ۔م۔ قریشی صاحب تشریف لے آئے۔ ان کا تعلق شعبہ انگریزی سے تھا۔

سیاسی اعتبار سے یہ دور پاکستان کی تاریخ کا نازک ترین دور تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی تھی اور اگرچہ وہ فی الحال برسرِ اقتدار نہیں آئی تھی مگر اس کے اثرات سماجی، تہذیبی اور اخلاقی سطح پر صاف محسوس کیے جا رہے تھے۔ گورنمنٹ کالج شکر گڑھ بھی ان اثرات سے محفوظ نہ تھا۔ یہاں ذہنی اور نظریاتی اعتبار سے پیپلز پارٹی سے وابستہ اساتذہ کی تعداد چھ تھی۔ دو کا تعلق شعبہ انگریزی سے تھا اُور باقی کا سیاسیات، معاشیات، بیالوجی اور سائیکالوجی سے تھا۔ ان میں ایک فرد قادیانی بھی تھا جو پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبۂ نفسیات قاضی اسلم کی وجہ سے قادیانی ہو گیا تھا اور اسے گولڈ میڈلسٹ اور ریکارڈ ہولڈر قرار دیا گیا تھا۔

یہ سب حضرات اس طبقے کی روایت کے مطابق بڑے منہ پھٹ اور بدزبان تھے۔ یا وہ

گوئی اور لچر گفتگو میں یہ ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے تھے چنانچہ سٹاف روم میں یہ لوگ اودھم مچائے رکھتے۔ مختلف علما کو یہ علانیہ تضحیک کا نشانہ بناتے۔ داڑھی کا مذاق اڑانے سے گریز نہ کرتے، تاریخِ اسلام کا مختلف حوالوں سے استخفاف کرتے اور برملا کہتے کہ دنیا میں سارے فساد کی جڑ مذہب ہے، آج تک جتنی جنگیں ہوئی ہیں، جہاں بھی خون ریزی ہوئی ہے، سب مذہب کے حوالے سے ہوئی ہے۔ وہ علانیہ کہتے کہ جب تک اس ملک میں مولوی موجود ہے، ترقی کا کوئی عمل آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کارل مارکس، ماؤزے تنگ، کمال اتاترک اور جمال عبدالناصر کی تعریف میں رطب اللسان رہتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا رویہ بڑا ہی تکلیف دہ تھا۔ یہ حضرات اسلامی تعلیمات کا برملا انکار کرتے تھے۔ جاوید اکرام کہا کرتا کہ ٹوکرے میں سے ایک آلو نیچے گر کر گندا ہو جائے تو سارے ٹوکرے کو دھونے کی کیا تک ہے۔ چنانچہ بیوی سے ملنے کے بعد مکمل غسل کرنا ایک لایعنی حرکت ہے۔ غلام صابر برملا کہتا کہ عقل اور سائنس کے اس دور میں خدا کی کوئی ضرورت نہیں رہی اور جو چیز مشاہدے میں نہ آتی ہو، عقل اس کا احاطہ نہ کرتی ہو، اسے کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

گورنمنٹ کالج شکر گڑھ میں اساتذہ کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان میں دو حافظِ قرآن تھے، دو اسلامیات کے اساتذہ تھے۔ ان کے علاوہ بھی راست فکر، باعمل حضرات موجود تھے، لیکن عجیب بات ہے کہ یہ سب حضرات ان سے کنی کتراتے تھے، کسی کو نہ ٹوکتے نہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے۔ وہ شاید ان کی غنڈہ گردی سے خوفزدہ تھے یا پارٹی کی قوت اور سیاسی اثر سے ڈرتے تھے۔ بہر حال متذکرہ لوگ بے مہار مست اونٹ کی طرح سٹاف روم اور کالج میں دندناتے پھرتے۔ ان کی ترکتازیوں پر کوئی انہیں ٹوکنے والا نہیں تھا۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ اس صورتِ حال میں اللہ نے مجھے ان لوگوں کا سامنا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ میں اس زمانے میں بے ریش تھا، لیکن دینِ حق اسلام کے بارے میں مکمل شرحِ صدر رکھتا تھا۔ میں نے اسے شعوری اور عقلی اعتبار سے قبول کیا تھا اور اس کی

مخالف ساری تحریکوں اور دیگر مذاہب کے کھوکھلے پن سے بخوبی واقف تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ سوشلزم کیا ہے، اس کے بانیان اور قائدین کا کردار کیا ہے اور پاکستان میں جو لوگ سوشلزم کے حامی اور چیمپئین ہیں، ان کا کچا چٹھا کیا ہے؟ چنانچہ اللہ کے بھروسے پر مَیں نے فیصلہ کرلیا کہ مجھے ان لوگوں کا مقابلہ کرنا ہے اور کالج کی فضا میں یہ اپنی حرکتوں اور گفتگوؤں سے جو زہر گھول رہے ہیں، مجھے اس کا تدارک کرنا ہے، مگر بدقسمتی سے یہ لوگ کسی اخلاقی ضابطے، کسی دلیل یا منطق کے قائل نہ تھے، اس لیے ان سے بات کرنا بیکار تھا، تاہم چونکہ سردار احمد قادیانی اکثر فارغ رہتا تھا، اس لیے وہ ہمہ وقت سٹاف روم میں موجود رہتا اور خصوصاً مولانا مودودی کو سان پر چڑھائے رکھتا۔ ایک روز مَیں نے اس سے دو بدو بات کی اور جب کہ سٹاف روم میں خاصے لوگ موجود تھے، مَیں نے اس سے کہا کہ دیکھو سردار اگر آپ علما اور اسلامی عقائد کے خلاف باتیں کرنے سے باز نہ آئے تو سن لیں کہ مَیں اِسی جگہ غلام احمد قادیانی کے پنجابی اور انگریزی الہاموں پر بحث کروں گا اور محمدی بیگم کے قصے سناؤں گا...... میرا یہ کہنا تھا کہ اس کے چہرے کا سیاہی مائل رنگ مزید گہرا ہوگیا، اس کا منہ لٹک گیا اور وہ کم از کم میری موجودگی میں خاموش رہنے لگ گیا...... میرا حربہ کامیاب رہا تھا۔

تاہم مَیں نے مناسب جانا کہ دیگر حضرات اور ان کے نظریات کا تعاقب مجھے کلاس روموں میں کرنا چاہیے۔ مَیں اردو زبان کا استاد تھا اور ضروری معلومات بھی رکھتا تھا، اس لیے یہ کام میرے لیے مشکل نہ تھا۔ لٹریچر کے استاد کو یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اگر معلومات، سلیقہ اور جذبہ رکھتا ہو تو کسی شعر، کسی مصرعے، محاورے یا ضرب المثل کے حوالے سے وہ دنیا جہاں کی باتیں کرسکتا ہے...... اس تناظر میں بحمد اللہ اسلام کی آفاقی اور اخلاقی قدروں کا حوالہ تو مَیں دیتا ہی رہتا تھا، لیکن اب مَیں نے اسلام کی مخالف تحریکوں خصوصاً سوشلزم پر بھی تنقید شروع کردی اور جہاں موقع پاتا، انسانی تاریخ کے اس سب سے بڑے طاغوت کو آڑے ہاتھوں لیتا اور اس کے علمبرداروں اور حامیوں کے بھی تار و پود بکھیر کر رکھ دیتا، ملکی سطح پر مَیں کسی جماعت یا شخصیت کا نام

نہیں لیتا تھا، اس کے بجائے مَیں نے کچھ استعارے اور اصطلاحات گھڑلی تھیں اور انہی کا سہارا لے کر مَیں مختلف عصبیات کے تضادات کو واشگاف کرتا تھا، لیکن اشارے اتنے واضح ہوتے کہ سارے ذہین طلبہ بات سمجھ جاتے اور محظوظ بھی ہوتے تھے۔ اس حوالے سے میرے بات کرنے کا اسلوب مثال کے طور پر اس طرح ہوتا تھا۔ ایک روز مشہور ادیب فرحت اللہ بیگ کی ''کہانی'' پڑھاتے ہوئے جب لفظ کھٹمل آیا تو مَیں نے ایک لڑکے سے پوچھا: ''جانتے ہو کھٹمل کیا ہوتا ہے''؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں...... مَیں نے بتایا کہ یہ ایک کیڑا ہوتا ہے، پرانے بستروں اور چارپائیوں کی درزوں میں پلتا ہے۔ دن بھر اپنی کمین گاہ میں چھپا رہتا ہے، رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے، سونے والا سو جاتا ہے تو یہ اپنی پناہ گاہ سے نکلتا ہے اور سونے والے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر اس کا خون چوستا ہے...... گویا اپنی سرشت کے اعتبار سے بالکل سوشلسٹ واقع ہوا ہے۔ سوشلسٹوں کا بھی یہی طریقِ واردات ہے۔ جب مسلمان اعلیٰ اخلاقی قدروں کو چھوڑتے ہیں، بے عملی اختیار کرتے ہیں اور غفلت کی نیند سو جاتے ہیں تو یہ بھی منفی نظریات کے اندھیروں سے نکلتے ہیں اور ان کے ایمان کا خون پی جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ مَیں نے یہ طریقِ کار اختیار کیا کہ جمعہ کے روز جب کہ پیریڈ پون گھنٹے کے بجائے نصف گھنٹے کا ہوتا تھا، مَیں کورس نہیں پڑھاتا تھا بلکہ سوال و جواب کی محفل برپا کرتا تھا۔ طلبہ کو مکمل آزادی تھی کہ وہ کورس سے ہٹ کر جس موضوع پر چاہیں، سوال کریں۔ سیاسی، تاریخی، مذہبی، جغرافیائی، سائنسی، مختلف شخصیات اور ملکی تحریکوں کے بارے میں۔ اور مَیں دلائل کے ساتھ ان کے جواب دیتا تھا۔ میرے اس طریقِ کار کو بے حد پسند کیا گیا۔ طلبہ کی معلومات میں اضافہ ہوا اور ان کے اندر اعتماد پیدا ہوا چنانچہ حالانکہ مَیں بے حد نازک عقائد پر کُھل کر بات کرتا تھا، لیکن کبھی بھی طلبہ نے کسی منفی ردِعمل کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ ان کا تقاضا ہوتا تھا کہ آدھ گھنٹے کا وقت کم ہے، اسے مزید بڑھایا جائے۔

لیکن شکر گڑھ کالج میں میرے ایک شاگرد پرویز عنایت ملک نے ہمیشہ ہی مخالفانہ انداز

اختیار کیا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کا پرستار تھا، چنانچہ جب بھی مَیں سوشلزم یا سوشلسٹوں کے خلاف بات کرتا تو یہ فوراً رجسٹر کھولتا، میرے الفاظ نقل کر لیتا اور پھر کالج میں اپنے ہم خیال اساتذہ اور پیپلز پارٹی کے مقامی حلقوں تک پہنچا دیتا۔ یہ لے اس قدر بڑھی کہ ہر ماہ ضلع سیالکوٹ کے تحصیل ہیڈ کوارٹرز پر پی پی پی کے جو اعلیٰ سطحی اجلاس ہوتے تھے جن میں ضلع بھر کے ایم این اے اور ایم پی اے بھی شامل ہوتے (۱۹۷۰ء میں ضلع سیالکوٹ میں پی پی پی نے قومی اور صوبائی نشستوں پر سو فیصد کامیابی حاصل کی تھی) ان میں باقاعدگی کے ساتھ میرا معاملہ زیرِ بحث آتا اور بعض حضرات کی طرف سے اصرار ہوتا کہ یہ شخص پی پی پی اور قائدِ عوام کا شدید ترین مخالف ہے، اس لیے اسے ملازمت سے برطرف کیا جائے لیکن اللہ کا کرنا یہ کہ شکر گڑھ ہی سے پی پی کے رکنِ پارلیمنٹ مرحوم ملک سلیمان ان کو ڈانٹتے کہ ایک معمولی لیکچرار تمہارا کیا بگاڑ لے گا۔ تم اتنے کمزور نہیں ہو کہ سترھویں گریڈ کے ایک استاد سے خوفزدہ ہو جاؤ۔ اس طرح یہ معاملہ دب جاتا اور اس پر کوئی کارروائی نہ ہوتی۔ یہ بات مجھے کئی سالوں کے بعد ایک ملاقات میں خود ملک سلیمان صاحب نے سنائی تھی۔

اس کالج میں مجھ سے پہلے اردو کے ایک ہی استاد تھے۔ ان کا تعلق ملتان سے تھا۔ حیدر آباد یونیورسٹی سے وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور دیانت اور فرض شناسی سے چنداں دلچسپی نہیں رکھتے تھے، اس لیے اکثر کالج سے غائب رہتے تھے۔ پرنسپل اور طلبہ پریشان ہوتے، لیکن انہیں کسی کی پروانہ تھی۔ کہا کرتے زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ میرا تبادلہ ہو جائے گا اور وہ مقام بہر حال شکر گڑھ سے بہتر ہو گا چنانچہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مَیں نے انہیں تجویز دی کہ وہ ٹائم ٹیبل میں تبدیلی کرا دیں اور اپنے پیریڈ اس وقت رکھوائیں جب میرے پیریڈ نہ ہوں اور پھر جب بھی وہ چھٹی کرنا چاہیں، مجھے ایک دن پہلے بتا دیا کریں۔ مَیں ان کی کلاسیں بھی لے لیا کروں گا۔

اس طرح مَیں نے دو کی بجائے چار کلاسیں لینی شروع کر دیں۔ اب پورا کالج میرا مخاطب تھا اور مَیں نے نظریات اور دعوتی حوالے سے اپنی مہم تیز تر کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طویل وقفے کے بعد ۱۹۷۲ء میں جب کالج میں یونین کے پہلے الیکشن ہوئے تو اسلامی جمعیت طلبہ کا پورا پینل

کامیاب ہو گیا اور میرے منع کرنے کے باوجود کالج کے سامنے نوتعمیر دکانوں میں سے ایک دکان میں جمعیت کا دفتر بنا دیا گیا اور اس پر جمعیت کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔

یہ صورتِ حال مخالفین کے لیے سخت پریشان کن تھی چنانچہ پی پی پی کے حامی اساتذہ پرنسپل خ۔م۔قریشی کے کان بھرنے لگے اور قریشی صاحب میری تحریری جواب طلبیاں کرنے لگے۔لکھا ہوتا کہ آپ صدرِ مملکت اور حکمران جماعت پر تنقید کرتے ہیں اور جماعتِ اسلامی اور مولانا مودودی کی حمایت کرتے ہیں، اس طرح آپ سیاست میں ملوث ہو رہے ہیں، اس لیے کیوں نہ آپ کے خلاف انضباطی کارروائی کی جائے۔

مَیں نے تحریری طور پر بھی اور زبانی بھی قریشی صاحب کو بتایا کہ مَیں کلاس روم میں کسی کا بھی نام نہیں لیتا نہ بھٹو کا، نہ پیپلز پارٹی، نہ جماعتِ اسلامی کا، نہ مولانا مودودی کا......لیکن چونکہ مَیں ایک مسلمان استاد ہوں اور دعوت و تبلیغ کو فرضِ عین سمجھتا ہوں، اس لیے مَیں اپنی گفتگوؤں کے دوران اسلام کی حقانیت کی بات کرتا ہوں اور خلافِ اسلام تحریکوں کا بھی تعارف کرا دیتا ہوں اور میرے نزدیک پاکستان میں یہ طرزِ عمل اختیار کرنا ہرگز خلافِ قانون نہیں ہے بلکہ ایک استاد کے حوالے سے مستحسن عمل ہے۔

لیکن قریشی صاحب میرے جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔وہ وقفے وقفے سے بار بار میری جواب طلبی کرتے حتیٰ کہ جب انہوں نے میری پہلی سالانہ خفیہ رپورٹ لکھی، تو میرے خلاف چند سخت جملے لکھ دیئے (یہ جذباتی ہے، مشتعل مزاج ہے، اپنی رائے کو دوسروں پر ٹھونستا ہے۔اس کی کارکردگی بھی اوسط درجے کی ہے وغیرہ) اس کا انکشاف بارہ سال کے بعد ۱۹۸۳ء میں ایک کلرک نے کیا جب مَیں دیال سنگھ کالج لاہور میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا۔

سوءِ اتفاق کہ بعد کے پرنسپلوں نے قریشی صاحب کی اس الزامی رائے کو من وعن اختیار کیے رکھا۔چنانچہ قریشی صاحب کے بعد انیس شیخ پرنسپل بن کر آئے تو حالانکہ مَیں دو کی بجائے چار پیریڈ پڑھاتا تھا، کلاس میں دیر سے جانا یا چند منٹ بھی کلاس پہلے چھوڑنا میرے نزدیک بدترین

اخلاقی عمل تھا اور مَیں چھٹیاں بھی بہت کم کرتا تھا۔ پھر ان کے دور میں مَیں نے کالج میگزین کا ضخیم نمبر مرتب کر کے شائع کیا اور اس پر خاص محنت کی، لیکن انہوں نے بھی میرے بارے میں مخالفانہ ریمارکس لکھے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ ان کی ہر جمعرات داتا صاحب پر گزرتی تھی اور اس حوالے سے وہ توحید پرستوں کے لیے خوشگوار تاثرات نہیں رکھتے تھے۔

شکرگڑھ میں میرے تیسرے پرنسپل حافظ محمد اجمل تھے۔ یہ غالی بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے تھے، چنانچہ یہ بھی میری جواب طلبی کرتے رہے اور سالانہ رپورٹ میں انہوں نے بھی قریشی صاحب کی تقلید کی، البتہ اللہ بھلا کرے قاری غلام صادق صاحب کا، وہ میرے وہاں چوتھے پرنسپل تھے اور انہوں نے خدا خوفی سے کام لیتے ہوئے میری رپورٹ ٹھیک لکھی اور مجھے ایک محنتی، فرض شناس استاد قرار دیا۔

بھٹو ہی کے دورِ حکومت میں یعنی اکتوبر ۱۹۷۴ء میں میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں ہو گیا۔ یہاں پانچ سال تک تدریسی خدمات انجام دیتا رہا۔ یہاں خوش قسمتی سے تین سالوں میں میری رپورٹیں مثبت تھیں جبکہ دو رپورٹیں خراب تھیں۔ اس طرح نو رپورٹوں میں سے پانچ میرے خلاف اور چار میرے حق میں تھیں اور ترقی کے ضمن میں یہ تناسب بڑا ہی خطرناک تھا یعنی اس صورت میں ترقی کے امکانات صفر کے برابر تھے۔

لیکن بے حد عجیب و غریب اور پُر اسرار بات یہ ہوئی کہ جب دسمبر ۱۹۷۹ء میں تقریباً تین سو لیکچرار حضرات کی اٹھارویں گریڈ میں پروموشن ہوئی تو ان میں میرا نام بھی شامل تھا جو ظاہری حالات کے تناظر میں ناممکنات میں سے تھا، لیکن ایسا ہو گیا اور مجھے اور سارے جاننے والوں کو غیر معمولی اچنبھا ہوا۔ لوگوں نے پوچھا کہ ایسا کیسے ہو گیا تو مَیں نے وضاحت کی کہ اللہ تعالیٰ میں اور مختلف پرنسپلوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ پرنسپل مجھے نقصان پہنچانا چاہتے تھے جبکہ اللہ کو میری ترقی اور نفع مطلوب تھا۔ ظاہر ہے اس صورت میں وہی ہونا تھا جو اللہ کو منظور تھا۔ پروموشن کے بعد میرا تبادلہ دیال سنگھ کالج لاہور میں ہو گیا میں یہاں مارچ ۸۰ء سے اکتوبر ۹۳ء تک یعنی تیرہ سال سے

زائد عرصے تک اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ملازمت کا یہ دور بھی بڑا ہی پُر خطر بلکہ ہنگامہ خیز تھا۔ اس کی داستان بھی حیرت انگیز ہے۔

۱۹۹۳ء کے آغاز کی بات ہے ایک روز مَیں کالج لائبریری کے اوپر ایک کمرے میں سال اول آرٹس گروپ کی کلاس لے رہا تھا جب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ مَیں باہر نکلا، دیکھا تو خ۔م۔ قریشی تھے۔ شکر گڑھ میں میرے پہلے پرنسپل۔ بائیس سال کے طویل عرصے کے بعد ان سے ملاقات ہورہی تھی اور اب ان کی ظاہری شخصیت میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی۔ اب ان کے چہرے پر داڑھی تھی...... مکمل سفید داڑھی، کمر میں جھکاؤ آگیا تھا اور چہرے پر افسردگی جیسے کھنڈ گئی ہو۔ بڑے تپاک سے ملے، کہنے لگے آپ کی کلاس میں میرا بیٹا پڑھ رہا ہے...... عمر قریشی۔ اسے بلا کر مجھ سے تعارف کرایا، کہنے لگے میری تین بیٹیاں ہیں۔ چوتھے نمبر پر یہ بیٹا ہے اکلوتا بیٹا۔ اور پھر اسے کمرے کے اندر بھیج کر فرمایا، میرا یہ بیٹا ذہنی اعتبار سے کچھ پس ماندہ ہے، نارمل نہیں ہے۔ بڑی مشکلوں سے اس نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک کیا ہے، ذرا اس کا خاص خیال رکھیے...... اور مَیں اللہ کی بے نیازی پر کانپ اٹھا...... اکلوتا بیٹا اور وہ بھی ابنارمل۔ یہ لڑکا کلاس میں مکمل خاموش رہتا تھا۔ مَیں نے اسے نہ کبھی مسکراتے ہوئے دیکھا نہ کسی شوخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیسا کہ ذہین بچوں کا انداز ہوتا ہے اور حالانکہ مَیں نے طلبہ کو سوالات کرنے کی عام اجازت دے رکھی تھی اور میری کلاس کا ماحول بڑا دوستانہ ہوتا تھا مگر اس نوجوان نے کبھی بھی اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ نہ کچھ پڑھتا ہے، نہ سوچتا ہے اور نہ اعتماد نام کی کسی چیز سے بہرہ ور ہے۔ صورتِ حال پر غور کر کے دل کی عجیب کیفیت ہوئی۔

مجھے جستجو تھی کہ قریشی صاحب کے ساتھ یہ دردناک حادثہ کیوں گزرا ہے کہ اس کے پیچھے یقیناً ٹھوس وجوہ کا سلسلہ کارفرما ہے۔ اللہ تعالیٰ تو بے حد رحیم و کریم ہیں۔ وہ تو اپنے بندوں پر کوئی بہت بڑی مصیبت کبھی بھی بلاوجہ نازل نہیں کیا کرتے۔ اکتوبر ۹۳ء میں دیال سنگھ کالج سے میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور میں ہوگیا تو یہاں آکر یہ عقدہ حل ہوگیا۔

قریشی صاحب شکر گڑھ کے بعد اس کالج میں بھی پرنسپل کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے اور بد قسمتی سے انہوں نے یہاں کی فضا میں کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ وہ انتقامی ذہنیت رکھتے تھے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اساتذہ کو سخت تنگ کرتے تھے، وہ مختلف مضامین کے اساتذہ سے مطالبہ کیا کرتے کہ دو پہر کے بعد ان کے گھر جا کر ان کی بیٹیوں کو پڑھایا کریں اور جو شخص کسی مجبوری کی وجہ سے معذرت کرتا، اس کے دشمن بن جاتے...... مثال کے طور پر اردو کے استاد معراج نیر صاحب کی بیگم جڑانوالہ (فیصل آباد) میں لیکچرار تھیں اور انہوں نے بھی وہیں رہائش اختیار کی ہوئی تھی چنانچہ وہ روزانہ صبح بس کا سفر طے کر لاہور پہنچتے اور اپنے تدریسی فرائض انجام دے کر شام کو واپس چلے جاتے۔ پہلے پرنسپل نے ان کی اس مجبوری کے پیشِ نظر انہیں رعایت دے رکھی تھی اور ان کے پیریڈ ان کی سہولت کے مطابق ذرا تاخیر سے لگائے تھے۔ خ۔م۔ قریشی صاحب پرنسپل بن کر آئے تو انہوں نے معراج نیر صاحب سے مطالبہ کیا کہ دو پہر کے بعد میرے گھر پر آ کر میری بیٹی کو اردو پڑھا دیا کریں۔ انہوں نے دور دراز سفر کا عذر کیا۔ اس پر قریشی صاحب بگڑ گئے اور ان کا پہلا اور آخری پیریڈ لگوا دیا بلکہ پابند کر دیا کہ وہ زیرو پیریڈ میں آیا کریں اور اسمبلی کا بھی انتظام کیا کریں اور ان کی منت سماجت اور دیگر رفقا کی پر زور سفارش کے باوجود قریشی صاحب نے اپنے روّیے میں کوئی نرمی پیدا نہ کی۔ پتہ چلا کہ قریشی صاحب بڑے ہی بے رحم افسر تھے۔ وہ کسی کے ساتھ رعایت یا رحم کے قائل نہ تھے...... تب ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ نبی کریمؐ کی مشہور حدیث ہے۔ لَا یُرْحَمُ مَنْ لَا یَرْحَمُ یعنی جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ ظاہر ہے پھر قریشی صاحب پر رحم کیوں کیا جاتا، چنانچہ خلقِ خدا کے ساتھ ان کا جو بے نیازانہ بلکہ سنگدلانہ رویہ تھا، اس کے نتیجے میں انہیں اللہ نے تا زیست شدید ترین اذیت کے حوالے کر دیا...... کتنے ہی اساتذہ کی بددعائیں ان کے لیے زندگی بھر کا وبال بن گئیں۔

عمر قریشی کے حوالے سے میرا پرنسپل خ۔م۔ قریشی کے ساتھ مستقل رابطہ قائم ہو گیا، وہ کئی سال پہلے ریٹائر ہو چکے تھے اور عموماً گھر ہی پر رہا کرتے تھے۔ ان کا گھر سائنس کالج کے راستے ہی

میں تھا، اس لیے گاہے گاہے مَیں ان سے ملتا رہتا تھا۔ کوئی تین سال پہلے کی بات ہے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ ان کا جوانسال داماد جو سعودی عرب میں ڈاکٹر تھا، وفات پا گیا ہے۔ مَیں تعزیت کے لیے گیا تو ڈرائنگ روم میں عمر قریشی کے ساتھ اس کی والدہ آ گئیں، وہ نقاب میں تھیں۔ اظہار افسوس کے بعد مَیں نے قریشی صاحب کا پوچھا کہ وہ کہاں ہیں اور ان کی صحت کیسی ہے تو ان کی بیگم نے بتایا کہ قریشی صاحب کا کوئی حال نہیں۔ ان کا حافظہ مکمل طور پر ختم ہو گیا ہے حتیٰ کہ حیرت انگیز طور پر وہ یہ تک بھول گئے ہیں کہ کھانا منہ میں لے کر چبایا کیسے جاتا ہے چنانچہ اب کوئی چیز انہیں کھلانی ہو تو ان کی نواسیاں سامنے بیٹھ جاتی ہیں کھانا کھانے لگتی ہیں اس طرح کچھ دیر کے بعد انہیں یاد آ جاتا ہے کہ لقمہ کیسے چبایا جاتا ہے اور وہ بصد مشکل کھانا کھا لیتے ہیں۔ موصوف کی بیگم نے بتایا کہ گھر میں داماد کی وفات کی صورت میں اتنا بڑا سانحہ ہو گیا ہے، لیکن انہیں اس حادثے کی کوئی خبر نہیں ہے۔ محترمہ بڑی افسردگی کے ساتھ کہنے لگیں، میری آرزو ہے کہ عمر کو کوئی روزگار مل جائے اور اس کی شادی ہو جائے...... مگر افسوس اس آرزو کی تکمیل سے پہلے ہی چند مہینوں میں بیگم قریشی چل بسیں اور تقریباً ایک سال کے بعد قریشی صاحب راہی ملکِ عدم ہو گئے...... اب عمر قریشی گھر میں بیوہ بہن اور اس کی تین بچیوں کے ساتھ اکیلا رہ رہا ہے اور خدا ہی جانتا ہے کہ وہ اپنے باپ کے اعمال کا خمیازہ کس انداز میں بھگتتا رہے گا۔

☆☆☆

جیسا کہ مَیں گزشتہ صفحات میں بتا چکا ہوں کہ دسمبر ۷۹ء میں سترھویں گریڈ سے اٹھارویں میں میری ترقی صرف نو سال کے بعد اس حالت میں ہوگئی کہ میری پانچ رپورٹوں پر پرنسپلوں نے منفی رائے تحریر کی تھی۔ اب میری انتہائی خواہش تھی کہ میرا تبادلہ لاہور میں ہو جائے۔ اس کا ایک سبب لاہور کی علمی اور ثقافتی اہمیت تھی لیکن اصل وجہ رہائش کی اس سہولت سے فائدہ اٹھانا تھا جو میرے مالک نے حیرت انگیز طور پر میرے لیے وہاں مہیا کر دی تھی۔ حسبِ عادت اس کے لیے میں نے بہت دعائیں کیں۔ اس زمانے میں گوجرانوالہ میں دو جیّد علمائے دین موجود تھے۔ مولانا محمد چراغ

صاحب اور مولانا معین الدین خٹک صاحب۔ دونوں بے مثال اور غیر معمولی دینی کردار کے حامل تھے، علم وتقویٰ اور للّٰہیت میں فرد تھے۔ یہ میری بے حد خوش نصیبی ہے کہ مجھے دونوں کی محبت حاصل تھی۔ مَیں نے اس ضمن میں دونوں سے دعا کی درخواست کی۔ دوسری جانب پنجاب لیکچررز ایسوسی ایشن کے صدر اور میرے بہت مخلص دوست افضل حسین علوی نے یقین دلایا کہ وہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں ایڈجسٹ کرائیں گے۔ ڈائریکٹوریٹ آف ایجوکیشن میں چودھری عبد السلام اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے، انہوں نے اطمینان دلایا کہ میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور ہی میں ہوگا۔

لیکن جب مختلف تبادلوں کی فہرست جاری ہوئی تو میرے نام کے سامنے گورنمنٹ کالج شیخو پورہ لکھا ہوا تھا۔ وقتی طور پر پریشان ہوا اور سٹپٹایا بھی لیکن یہ سوچ کر کہ اس میں یقیناً اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی، مَیں نے شیخو پورہ میں جائن کر لیا۔ پتہ چلا کہ گورنمنٹ کالج شیخو پورہ کے تقریباً ساٹھ فیصد اساتذہ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ روزانہ ٹرین کے ذریعے شیخو پورہ آتے ہیں اور ان کا یہ سفر بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال سے جاری ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ اب یہاں ٹِک کر سکون سے بیٹھ جاؤ، لاہور کے خواب دیکھنا بند کر دو کہ یہاں سے تبادلہ نہیں ہوا کرتا۔

مَیں نے پروگرام کے مطابق رہائش لاہور ہی میں اختیار کی۔ شیخو پورہ جانے کے لیے مَیں روزانہ بس کا سفر اختیار کرتا۔ گھر (نزد ملتان روڈ چونگی) سے راوی پل تک تقریباً پون گھنٹہ صرف ہوتا اور وہاں سے میانوالی، جھنگ کی بس لے کر کالج پہنچتا، اس طرح یہ سفر تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے میں طے ہوتا۔ دوپہر کو واپسی بھی اسی طرح ہوتی۔ یوں روزانہ کم از کم میرے چار گھنٹے سفر میں کٹ جاتے۔ وقت کا ضیاع الگ تھا اور ذہنی کوفت الگ تھی...... تب مَیں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ باوضو سفر طے کرتا۔ تسبیح ہاتھ میں رکھتا۔ آدھا سفر اللہ کی حمد وثنا اور مسنون اذکار میں بسر ہوتا اور باقی نصف نبی اکرمؐ پر درود پڑھتے ہوئے گزار دیتا...... اور گاہے گاہے دعائیں بھی کرتا جاتا کہ باری تعالیٰ مَیں بہت کمزور بندہ ہوں۔ یہ روزانہ کا سفر لمبے عرصے تک طے نہیں کر سکتا، اپنا فضل فرمائیے اور لاہور میں تبادلے کا انتظام کر دیجیے۔

مَیں نے ۲۳ جنوری ۸۰ء کو شیخوپورہ میں جائن کیا تھا۔ ڈیڑھ ماہ گزرا تھا کہ مارچ کے اوائل میں تنظیم اساتذہ پاکستان کے اہتمام میں پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال میں ایک مذاکرہ ہو رہا تھا۔ مَیں بھی تنظیم کے ایک رکن کی حیثیت سے سامعین میں شامل تھا۔ مذاکرہ ختم ہوا تو اسلامیہ کالج سول لائنز کے شیخ رفیق صاحب نے بتایا کہ دیال سنگھ کالج کے پروفیسر فضل کریم تمہیں تلاش کر رہے ہیں، ان سے مل کر جانا..... فضل کریم صاحب سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ دیال سنگھ کالج میں شعبۂ اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر صوفی صدیق صاحب ریٹائر ہو گئے ہیں..... کل کالج آؤ میں آپ کو ڈی او لے دوں گا۔ پھر کوشش کر کے تبادلہ کرا لینا۔

اور دوسرے دن شعبہ اردو کے ایک بااثر استاد کی شدید مخالفت کے باوجود مجھے فضل کریم صاحب کی کوشش سے ڈی او لیٹر مل گیا یعنی پرنسپل نے لکھ دیا کہ شعبۂ اردو میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی ہے اور مجھے اس شخص کے یہاں تبادلے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

لیکن باخبر دوستوں نے بتایا کہ ڈی او لیٹر مل جانے کے باوجود دیال سنگھ کالج میں میرا تبادلہ آسان نہیں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ میرے ساتھ ترقی پانے والوں میں لاہور ہی کے دو افراد کو گورنمنٹ کالج لاہور میں ایڈجسٹ کیا گیا تھا، لیکن پرنسپل نے انہیں قبول نہیں کیا اور اب وہ سرگرداں ہیں کہ کسی طرح اُن کا تقرر لاہور میں ہو جائے۔ ان میں ایک میرے ایم اے کے کلاس فیلو آغا حیدر علی بھی ہیں جو گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ میں ہیں۔ وہاں کے پرنسپل عبدالمجید اعوان صاحب اب ڈائریکٹر لاہور ڈویژن بن گئے ہیں.... چنانچہ اعوان صاحب کو جونہی پتہ چلے گا کہ دیال سنگھ کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کی جگہ خالی ہوئی ہے، وہ وہاں پر فوراً آغا حیدر علی کا تبادلہ کر دیں گے اور تم دیکھتے رہ جاؤ گے، اس لیے تبادلے کی درخواست ڈائریکٹر صاحب کے پاس ہرگز نہ لے کر جانا۔

چنانچہ مَیں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور خوب دعائیں کرتے ہوئے سیکرٹریٹ کا رخ کیا۔ ایک واسطے سے متعلقہ سیکشن آفیسر جناب اقبال ناصر تک رسائی حاصل کی اور ان سے اپنی

مشکل بیان کی۔ ان صاحب نے کمال مہربانی فرمائی۔ درخواست اور ڈی او ڈائریکٹر صاحب کے نام تھے۔ انہوں نے مجھ سے وہیں بیٹھے بیٹھے سیکرٹری تعلیم کے نام اردو میں درخواست لکھوائی اور فائل تیار کر کے بھجوا دی...... اور تیسرے دن مجھے تبادلے کے احکامات مل گئے۔ الحمد للہ رب اللعالمین والصلوۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم۔ یہ وقعہ بظاہر بے حد محال تھا۔ ناممکن کی حد تک مشکل کہ ایک تو میں ڈائریکٹر تعلیم کو بائی پاس کر کے سیکرٹری تعلیم کو درخواست دے رہا تھا۔ دوسرے سیکرٹری تعلیم فوجی تھے، بریگیڈیئر اور وہ تین سال سے قبل کسی کی تبادلہ درخواست پر غور ہی نہیں کرتے تھے لیکن حیرت انگیز طور پر میرا تبادلہ صرف پونے دو ماہ میں ہو گیا اور مَیں ۱۵ / مارچ ۸۰ء کو شیخو پورہ سے دیال سنگھ کالج لاہور میں آ گیا...... مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ اعجاز تھا مولانا محمد چراغ صاحبؒ اور مولانا معین الدین خٹکؒ کی دعاؤں کا یہ دونوں بزرگ اللہ کے ولیِ کامل تھے اور اللہ اپنے دوستوں کی دعائیں رد نہیں کرتا۔

دیال سنگھ کالج کاروباری اور رہائشی علاقے میں گھرا ہوا شہر کے قلب میں واقع، نقشے کے اعتبار سے بڑی ہی بے ہنگم عمارت کا تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کے بالکل سامنے نسبت روڈ جیسی مصروف شاہراہ ہے۔ مشرقی جانب دل محمد روڈ ہے، وہ بھی خاصی مصروف ہے، مغرب میں ایک گندا نالہ ہے اور اس کے ساتھ ایک سڑک ملحقہ آبادی کی خدمت کرتی ہے۔ قریب ہی تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر لکشمی چوک ہے۔ جو شہر کا پُر شور اور مصروف ترین چوک ہے۔ کالج کے تینوں اطراف میں ورکشاپیں ہیں جن کے شور سے کالج کے طلبہ اور اساتذہ اس قدر مانوس ہو چکے ہیں کہ اگر کبھی کسی وجہ سے اس موسیقی میں تعطل واقع ہو جائے تو ایک ناگواری اجنبیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

تعلیمی معیار کے اعتبار سے دیال سنگھ کالج کا درجہ خاصا پیچھے ہے یعنی لاہور کے کالجوں میں تقریباً چھٹے نمبر پر۔ ایم اے او کالج اور دیال سنگھ کالج تقریباً ایک ہی سطح پر شمار ہونے چاہیں، چنانچہ اس کالج میں عموماً وہ طلبہ داخلہ لیتے ہیں جنھیں لاہور کے پانچ اچھے کالجوں میں داخلہ نہیں ملتا......

لیکن اس ادارے کی ہمیشہ سے یہ کیفیت نہیں تھی۔ تقسیم سے قبل تعلیمی اعتبار سے یہ کالج گورنمنٹ کالج سے کسی طرح کم نہ تھا اور بہت لائق اور بے حد مخلص پرنسپلوں کی اسے سربراہی کا اعزاز حاصل تھا۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد بتدریج اس کا معیار گرتا چلا گیا۔ اس کا بنیادی سبب مخلوطِ تعلیم کے ماحول میں ایک شخص کا پرنسپل بننا تھا جو اگرچہ اپنے نام کے ساتھ سیّد لکھتا تھا، اگرچہ بہت اچھا شاعر تھا اور غیر معمولی صلاحیتوں کا نقاد بھی۔ لیکن ایک انسان اور استاد کے ناطے وہ بڑا ہی ناکام اور آخری حد تک بے عمل تھا۔ ثقہ روایات کے مطابق وہ عین دفتری اور تعلیمی اوقات میں اپنی مکروہ سرگرمیاں جاری رکھتا اور جو بدنصیب لڑکیاں اس کی نخچیر بنتیں، کلرک اور دیگر استاد انہیں بلیک میل کرتے اور اس طرح کالج ایک قحبہ خانہ بن گیا۔ اور بدنام ہوتا چلا گیا...... یہ حقیقت بڑی عبرت ناک ہے کہ اللہ کی قدرت نے اس شخص سے اس کی بدعملی کا انتقام اس کی اپنی اولاد کے حوالے سے، بڑی ہی بھیانک صورت میں لیا...... چنانچہ شام کو اس کے ہم مشرب دوستوں کی جو محفل مجیٹھیہ ہوسٹل میں جمتی تھی، اس میں اس کی ناموس کے بخیے ادھڑ جاتے تھے۔ یہ انکشاف اس کے ہم مشرب و ہم مسلک انگریزی کے ایک سینئر استاد نے کیا، وہ ان محفلوں کا عینی شاہد تھا اور آخری عمر میں اپنے تصورات اور سرگرمیوں سے تائب ہو گیا تھا۔

اس بدنام پرنسپل کے بعد کالج سے مخلوط تعلیم ختم کر دی گئی، مگر تعلیمی اعتبار سے کالج سنبھل نہ سکا بلکہ مزید ابتری کی صورت یہ پیدا ہوئی کہ کسی سبب سے یہاں اشتراکی نظریات کے اساتذہ جمع ہوتے چلے گئے اور ان کے زیر اثر کالج تعلیمی اور اخلاقی اعتبار سے پستیوں میں گرتا چلا گیا اور پیپلز پارٹی کے پہلے دور میں نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ لوگ اسلام، پاکستان اور اسلامی شعائر کے خلاف علانیہ ہرزہ سرائی کرنے لگ گئے، کلاسوں میں بھی اور سٹاف روم میں بھی۔ یہ تھی وہ صورتِ حال جس میں یہاں میرا تبادلہ ہوا اور جیسا کہ بعد میں اندازہ ہوا حالات گورنمنٹ کالج شکر گڑھ سے بھی گھمبیر تھے۔ وہاں صرف چند افراد تھے جو منفی سرگرمیوں میں مصروف تھے، مگر یہاں تو خاصی بڑی تعداد بدزبان اور بدطینت افراد پر مشتمل تھی...... اور اس کا تجربہ اور مشاہدہ مجھے جلد ہی ہو گیا۔

ہوا یوں کہ ایک روز مَیں سٹاف روم میں بیٹھا ایک کتاب کے مطالعے میں مصروف تھا۔ میرے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے ایک صاحب نے کہا کہ مجھے کل روزے کی حالت میں سفر کرنا پڑا جس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ ادھیڑ عمر آدمی فوراً بولا: تجھے کس بیوقوف نے کہا تھا کہ روزہ رکھو، اسلام کی کون سی تعلیم میں عقل کا عمل دخل ہے؟ اب دیکھو ابو بکر صدیقؓ نے ناحق ہزاروں لوگوں کو مروا دیا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ زکوٰۃ نہیں دینا چاہتے تھے اور یہ ان کا حق تھا کہ وہ جس چیز کو چاہتے اختیار کرتے جسے چاہتے اختیار نہ کرتے۔ خلیفہ کو کیا حق تھا کہ ان پر جبر کرتا، ظلم کا اور بے انصافی کا سلوک روا رکھتا۔

گفتگو کا یہ انداز میرے لیے انوکھا تو نہ تھا لیکن تکلیف دہ ضرور تھا۔ مَیں نے کتاب بند کی اور اُس شخص سے پوچھا:

''آپ کا تعارف کیا ہے؟''

''میرا نام منیر ہے اور میں یہاں میتھ کا پروفیسر ہوں'' اس نے جواب دیا۔

''کیا آپ نشہ بھی کرتے ہیں؟'' مَیں نے دریافت کیا۔ اس پر وہ بوکھلا گیا اور غصہ سے کہنے لگا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میرا مطلب ہے کہ یہ جو آپ نے ابھی یادہ گوئی کی ہے، یہ کالج کے سٹاف روم میں ایک پبلک مقام پر ہوش و حواس رکھنے والا، کوئی نارمل آدمی ہرگز نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی بکواس لوگ چنڈو خانوں میں کرتے ہیں یا دکانوں کے تھڑوں پر اور وہ لوگ کرتے ہیں جن کی کھوپڑیاں بالکل خالی ہوتی ہیں...... ورنہ آپ کو احساس ہونا چاہیے تھا کہ آپ کے اردگرد سب اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہیں، استاد ہیں اور مختلف نظریات کے حامل ہیں، آپ کو کچھ عقل سے کام لینا چاہیے تھا''۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ دین بیزار لوگ خواہ کتنے بڑبولے کیوں نہ ہوں اور وہ خواہ کتنے پُرشور انداز میں باتیں کیوں نہ بگھارتے ہوں، لیکن اندر سے وہ بڑے ہی بزدل ہوتے ہیں اور چند

طاقتور فقرے ان کی سٹی گم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ شخص فوراً ہی خوفزدہ ہوگیا۔ اسے شاید اس سے پہلے اس نوعیت کا تجربہ نہیں ہوا تھا اور اس کی بدتمیزی اور منہ پھٹ ہونے کی وجہ سے کوئی اسے ٹوکتا نہیں تھا، چنانچہ مَیں نے اسے سختی سے ڈانٹا اور رگیدا تو وہ گھگھیانے لگا اور مدافعت پر اتر آیا۔

''یہ کہاں کا اسلام ہے کہ دوسروں کے لیے بکواس اور یاوہ گوئی کے الفاظ استعمال کیے جائیں''۔

''آپ الفاظ کی بات کرتے ہیں، میرا جی چاہتا ہے کہ اینٹ مار کر آپ کا سر پھوڑ دوں......اور یاد رکھوا گر آئندہ میری موجودگی میں آپ نے گفتگو کا یہ انداز اختیار کیا، تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا''۔

میری اس دھمکی پر وہ مزید سہم گیا اور بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا اور واقعی اس کے بعد اس کی زبان گنگ ہوگئی......دوسرے لوگوں کو بھی اندازہ ہوگیا کہ انہیں اب محتاط رہنا ہوگا۔

ہمارے اس کالج کے شعبۂ اردو میں ایک صاحب تھے محمد اسلام خان۔ بڑے ہی سادہ مزاج اور دہقانی طبیعت کے مالک تھے۔ اس لیے غیر سنجیدہ حضرات کے مذاق کا نشانہ بنے رہتے تھے اور بدطینت دین بیزار لوگ ان کے نام کے حوالے سے اپنے خبثِ باطن کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے......مذکورہ بالا واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ سردیوں کا موسم تھا۔ جن لوگوں کے پیریڈ نہیں تھے وہ باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سوءِ اتفاق سے وہاں شعبہ سیاسیات کا صدر طالب ترمذی بھی تھا اور پروفیسر اسلام خاں بھی۔ طالب ترمذی دہریہ تھا اور کسی مذہب یا فرقے کو نہیں مانتا تھا۔ وہ پھکڑ باز آدمی تھا اور گالی گلوچ کا ماہر۔ فکر و عمل کے اسی اسلوب نے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی تھی۔ اس کی بیوی ڈاکٹر تھی اور اس سے بہت ہی برا سلوک کرتی تھی۔ وہ بیٹے کی نعمت سے محروم تھا، ایک ہی بیٹی تھی۔

بہر حال اس روز ترمذی اسلام کے خلاف کچھ زیادہ ہی انتقامی احساس میں مبتلا تھا۔ اس نے محمد اسلام خان کو نشانہ بنا کر گالیاں بکنی شروع کر دیں۔ ''اسلام یہاں فساد کی جڑ ہے۔ ساری خرابیاں اسی کی وجہ سے ہو رہی ہیں۔ اسلام کی ماں کی......اسلام کی بہن کی''۔

ظاہر ہے یہ صورتِ حال بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ مَیں کھڑا ہوگیا اور مَیں نے کہا ''ترمذی صاحب، مَیں آپ کے اس روّیے پر سخت احتجاج کرتا ہوں۔ آپ ایک سینئر پروفیسر ہیں اور سید کہلاتے ہیں لیکن آپ تو انسانیت سے بھی عاری ہیں۔ نمک حرام ہیں۔ ایک مسلمان ملک میں رہتے ہیں اور اسلام کے خلاف بکواس کرتے ہیں''۔

میری ان باتوں سے ترمذی بھڑک اٹھا۔ وہ کھڑا ہوگیا۔ مجھے ماں بہن کی گالیاں دینے لگا اور کرسی اٹھا کر میری طرف بڑھا...... تب مَیں نے بھی کرسی اٹھالی۔ مَیں نے کہا مَیں تمہیں گالی نہیں دوں گا لیکن تمہارا سر پھوڑ دوں گا۔ تم لوگوں نے اس کالج کو گوردوارہ بنا رکھا ہے۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا تمہیں اپنی زبانیں بند کرنی ہوں گی''۔

میری جوابی کارروائی سے ترمذی نے کرسی رکھ دی اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ متعدد لوگ کھڑے ہوگئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کرادیا۔ مَیں بھی خاموش ہوگیا اور سارا واقعہ لکھ کر مَیں نے پرنسپل کو دے دیا۔ مَیں نے درخواست کی تھی کہ ترمذی اور اس کے ہم خیال ساتھیوں کو سمجھایا جائے کہ وہ دوسروں کے جذبات کا لحاظ کیا کریں اور سٹاف روم میں یا برسرِ عام اسلام اور اسلامی شعار کے خلاف بدزبانی نہ کیا کریں ورنہ مَیں ان کا کچا چٹھا اخبارات میں دے دوں گا اور نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

پرنسپل این اے حامد نے میری درخواست کے نتیجے میں اسی روز کالج کونسل کا اجلاس بلالیا۔ موصوف مذہبی ذہن کے آدمی تھے۔ نماز روزے کے پابند تھے۔ لیکن پیر پرست تھے۔ اس لیے اسلام پسندوں سے بغض رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ میری شکایت پر غور اور تحقیق کرنے کی بجائے کالج کونسل کے اجلاس میں میری گزشتہ خفیہ رپورٹیں پڑھ کر سنانی شروع کردیں اور بھرپور تاثر دیا کہ یہ شخص تو عادی ہنگامہ پسند ہے، شرارتی ہے، جھگڑالو ہے وغیرہ۔

تاہم اس ناخوشگوار واقعے کا اور میری درخواست کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کالج کے دین بیزار پروفیسر حضرات محتاط ہوگئے، انہوں نے اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی کا سلسلہ بند کردیا اور دو تین

سال سکون میں گزر گئے۔

1984ء کی بات ہے (افسوس میری کچھ ڈائریاں ادھر ادھر ہو گئی ہیں، اس لیے حتمی تاریخ لکھنے سے قاصر ہوں) مَیں ایک روز سال دوم آرٹس کی کلاس میں گیا، تو لڑکے پریشان اور خوفزدہ نظر آئے، انہوں نے بتایا کہ پروفیسر صدیقی جو انہیں سیاسیات پڑھاتے ہیں، برملا کہتے ہیں علامہ اقبال شرابی تھا بلکہ مذہبِ اسلام ہے ہی عیاشی کا مذہب، پیغمبرِ اسلام نے ایک چھ سالہ لڑکی سے شادی کر لی اور حضرت حسن نے اسی شادیاں کی تھیں...... مَیں نے لڑکوں سے تکرار کے ساتھ پوچھا کہ کیا واقعی صدیقی صاحب نے یہ باتیں کی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ تو گزشتہ ایک ڈیڑھ سال سے ان باتوں کو دہراتے رہتے ہیں۔ سارے اسلامی رہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ صاف کہتے ہیں کہ اصل فریڈم فائٹر تو گاندھی اور نہرو تھے، آزادی کے لیے اصل قربانی تو بھگت سنگھ نے دی تھی، باقی تو سب فراڈ ہے۔

مجھے یہ سب کچھ سن کر چنداں تعجب نہ ہوا۔ پروفیسر صدیقی واقعی بہت ہی گھٹیا اور کمینی ذہنیت کا آدمی تھا، پرلے درجے کا منہ پھٹ، غیر سنجیدہ اور اوباش، چنانچہ مَیں نے اسے کبھی منہ نہیں لگایا تھا لیکن میرے ساتھ اس کا روّیہ بڑا ہی خوشامدانہ تھا۔ کہا کرتا ہم تو علماء کے خاندان سے ہیں، دیوبند کے ناظمِ اعلیٰ قاری طیب میرے عزیزوں میں سے ہیں، لیکن میری غیر موجودگی میں وہ کُھل کھیلتا اور ہر طرح کی یاوہ گوئی کرتا رہتا۔

بہر حال جب ثابت ہو گیا کہ پروفیسر صدیقی نے واقعی یہ باتیں کی ہیں تو مَیں نے یہ ساری باتیں لکھوا کر لڑکوں سے دستخط لے لیے اور اس تحریر کو سٹوڈنٹس یونین کے حوالے کر دیا جو اسلامی جمعیتِ طلبہ کے نام سے منتخب ہوئی تھی...... نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے روز کالج میں ہڑتال ہو گئی اور یہ ہڑتال تین دن تک جاری رہی...... قصہ کوتاہ یہ کہ صدیقی نے طلبہ کے بھرے اجلاس میں لاؤڈ سپیکر پر معافی مانگی، معذرت کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ ان حالات میں جب کہ پرنسپل واضح طور پر صدیقی کی حمایت کر رہا تھا اور صوبے میں سوار خاں جیسے سیکولر جرنیل کی حکومت تھی اور کچھ ہو بھی

نہیں سکتا تھا......تاہم اس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ کالج کا دین بیزار طبقہ مزید ہراساں ہو گیا اور انہوں نے کلاسوں میں یا شاف روم میں اسلام کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کرنا بند کر دیا۔ یوں ۱۹۸۴ء میں جب کئی سالوں کے وقفے سے کالج یونینوں کے انتخاب ہوئے تو کالج کی تاریخ میں پہلی بار اسلامی جمعیتِ طلبہ کا مکمل پینل کامیاب ہو گیا۔ ورنہ اس سے قبل یہاں ہمیشہ پی ایس ایف اور بائیں بازو کی طلبہ تنظیموں ہی کا غلبہ رہتا تھا اور سیاسی فضا کی اس تبدیلی نے بھی مخالفین کو پریشان اور خوفزدہ کر دیا تھا۔

غالباً ۱۹۸۶ء کی بات ہے ضیاء الحق شہید نے شاید کسی بین الاقوامی دباؤ کے تحت کالج یونینوں پر پابندی لگا دی، بائیں بازو کے اساتذہ بظاہر جمہوریت اور انسانی حقوق کی بہت باتیں کرتے تھے اور ضیاء الحق کے شدید مخالف تھے لیکن وہ اس فیصلے پر بے حد خوش ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب تعلیمی اداروں کے اندر ان پر کوئی دباؤ نہیں رہے گا اور وہ اپنی سرگرمیوں میں مکمل آزاد ہوں گے۔ حالانکہ جن دنوں یعنی ۸۰ء اور ۸۲ء میں جب مَیں نے ان پر گرفت کی تھی، تو کالج میں یونین کا وجود نہ تھا، پھر بھی بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، یہ لوگ بہت مطمئن و مسرور تھے اور خوشی کا برملا اظہار بھی کرتے تھے۔

چنانچہ یونینوں پر پابندی کو چند ماہ ہی گزرے تھے کہ تھرڈ ائیر کے طلبہ نے مجھے بتایا کہ سروہ پروفیسر خان صاحب تو عجیب وغریب باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سائنسی اور عقلی اعتبار سے دیکھیں تو خدا کا کہیں وجود ہی نہیں ہے......پھر انہوں نے ایک روز کہا کہ خدا اور شیطان کا مقابلہ ہوا، دلائل شیطان کے مضبوط تھے، لیکن خدا دھاندلی سے جیت گیا۔ انہوں نے ایک مرتبہ یہ فلسفہ بھی بگھارا کہ یہ غلط ہے کہ بے دینی اور بے عملی ہو تو زوال آجاتا ہے اور دینداری اور نیکی ہو تو لازماً عروج حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اکبر بے عمل تھا، اسلام کا مخالف تھا، لیکن ملک نے خوب ترقی کی۔ جبکہ بہادر شاہ ظفر بڑا عبادت گزار تھا، مصلّے پر بیٹھا رہتا تھا، لیکن اس کی حکومت اور مسلمانوں کو زوال آگیا۔

پروفیسر خان شعبۂ انگریزی کے صدر تھے اور وائس پرنسپل بھی تھے۔ ان کے حوالے سے یہ باتیں سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ وہ بھی اگرچہ دہریے تھے، لیکن بظاہر باوقار آدمی تھے اور ان سے اس چھچھورے پن کی توقع نہیں تھی......

یہ وہ دور تھا کہ جب پنجاب کی صوبائی حکومت مختلف کالجوں میں ایم ایس ایف کو پلانٹ کر رہی تھی اور دیال سنگھ کالج بھی ان کا ہدف تھا۔ اس مقصد کی خاطر مختلف وقتوں میں دوسرے کالجوں سے لڑکے آتے رہتے تھے اور جمعیت سے وابستہ طالب علموں کی پٹائی کر کے اور دہشت پھیلا کر چلے جاتے تھے۔ کئی مرتبہ انہوں نے اساتذہ سے بھی بدتمیزی کی بلکہ ایک روز پرنسپل کا بھی گریبان پکڑ لیا۔ کالج میں لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ تیزی سے بگڑتا جا رہا تھا۔

اس صورتِ حال میں پرنسپل نے اساتذہ سے فرداً فرداً مشورہ کرنا چاہا اور اس کے لیے انہوں نے ایک روز سائنس کے اساتذہ کا اپنے دفتر میں اجلاس بلایا اور دوسرے روز انگریزی، اردو، اسلامیات، عربی فارسی وغیرہ کے پروفیسر حضرات کو بلا لیا اور ایک ایک شخص سے الگ الگ مشورہ طلب کرنے لگے۔

میری باری آئی تو مَیں نے پرنسپل سے درخواست کی کہ براہِ کرم میری بات کو سکون سے سنا جائے اور جب تک مَیں بات مکمل نہ کرلوں مجھے ٹوکا نہ جائے۔ پرنسپل نے میری درخواست مان لی تو مَیں نے کہا سر، لاء اینڈ آرڈر کا بہت گہرا تعلق ہے اخلاقیات سے، اخلاقی قدروں سے اور اخلاقی قدروں کا بہت قریبی واسطہ ہے مذہبی اور روحانی تعلیمات سے چنانچہ جس معاشرے میں دینی اور اخلاقی تعلیمات کا احترام ہوگا وہاں اخلاقی قدروں کو بھی فروغ ملے گا اور اخلاقی قدریں مضبوط ہوں گی،، تو لاء اینڈ آرڈر کے مسائل کو حل کرنا ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔

''لیکن سر'' مَیں نے دکھ اور کرب سے تلخ ہو کر کہا ''اسی کالج میں ایسے لوگ ہیں جو روحانی اور مذہبی قدروں کو مجروح کر رہے ہیں اور کلاسوں میں ان کے خلاف بدگمانیاں پھیلا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کے ایک بزرگ پروفیسر نے یہ اور یہ باتیں کی ہیں اور اسے حیا نہیں آئی

کہ وہ ایک استاد ہے، ایک مسلمان ملک میں رہتا ہے اور خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔ میری درخواست ہے کہ آپ ایسے لوگوں کو لگام دیں اور ان سے باز پرس کریں"۔

جب مَیں یہ بات کر رہا تھا تو پروفیسر خان وائس پرنسپل کی حیثیت سے پرنسپل کے بالکل ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میری باتوں سے اور میرے لہجے سے وہ سخت پریشان ہو رہے تھے۔ انہوں نے سر کو گھٹنوں میں دبا رکھا تھا اور بار بار پہلو بدلتے تھے۔

پرنسپل نے یا کسی دوسرے شخص نے میری باتوں پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ اجلاس ختم ہو گیا۔ دوسرے دن مَیں کالج گیا اور کلاس سے فارغ ہو کر سٹاف روم میں آیا تو پروفیسر خان سٹاف روم کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھے تھے اور بہت گھبرائے ہوئے، شدید ٹینشن کی حالت میں تھے۔ انہوں نے مجھے آواز دے کر اپنے پاس بلایا۔ مَیں بیٹھ گیا تو بڑے ہی دکھ اور کرب سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولے "کل آپ نے مجھے بہت ذلیل کیا ہے، میری بہت انسلٹ کی ہے۔ سارے لوگوں کے سامنے آپ نے مجھے جوتے مارے ہیں، آپ کو یہ حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی"۔

مَیں نے جواب دیا 'خان صاحب، مَیں نے آپ کے ساتھ بہت رعایت کی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ آپ نے خدا اور اسلام کے خلاف جو کچھ کہا ہے، مَیں اسے خط کی صورت میں مرتب کرتا اور لاہور کی تمام مسجدوں کے خطیب حضرات کو پوسٹ کر دیتا۔ یہی خط اخبارات میں چھپوا بھی دیتا...... پھر آپ کا گھر سے باہر نکلنا محال ہو جاتا اور آپ کے چودہ طبق روشن ہو جاتے...... مجھے بتایئے کہ آپ نے جو گوہر افشانی کی ہے یہ کسی بھی طور سے مناسب ہے؟ آپ کو یہ فضول باتیں کرتے ہوئے ذرا بھی خیال نہیں آیا"۔

"پھر اس صورتِ حال کا حل کیا ہے، وہ بڑی ہی دل گرفتگی سے بولے "اس کا حل یہ ہے خان صاحب" مَیں نے زور دے کر کہا کہ "آپ اپنے منصب اور عمر کا لحاظ کریں اور اسلام اور تاریخِ اسلام کے خلاف باتیں کرنا چھوڑ دیں"۔

پروفیسر خان نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، کہنے لگے "مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ مَیں نہ سٹاف روم

میں، نہ کلاسوں میں اس طرح کی کوئی بات نہیں کروں گا"۔ "اور مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا احترام ملحوظ رکھوں گا اور کبھی بھی آپ کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بنوں گا"۔ میں نے ان کا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر مَیں نے چائے منگائی، ہم دونوں نے مل کر پی اور وہ مطمئن ہو کر کلاس میں چلے گئے۔ اس طرح وہ کالج جس کے ماحول میں نظریاتی اور عملی اعتبار سے ایک تکلیف دہ آلودگی رچ بس گئی تھی خاصا صاف ہوگیا۔ اب نہ کوئی سٹاف روم میں بیٹھ کر دین کے خلاف بدزبانی کرتا نہ کلاس روموں میں اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑایا جاتا بلکہ حالات میں مثبت پیش رفت یہ ہوئی کہ میری تجویز اور اصرار پر صبح اسمبلی میں درسِ قرآن کا نظام بہتر شکل اختیار کر گیا......

ضیاء الحق شہید نے کالجوں میں بھی صبح درسِ قرآن لازمی کر دیا تھا لیکن دیال سنگھ کالج میں وہ محض رسمی کارروائی تک محدود تھا۔ یعنی زیرو پیریڈ میں چند طلبہ جمع ہوتے، اسلامیات کے ایک استاد قرآن پاک کی چند آیات تلاوت کرتے اور ان کا لفظی ترجمہ پڑھ کر اسمبلی ختم کر دیتے۔

میرا تعلق حالانکہ شعبۂ اردو سے تھا لیکن مَیں نے پرنسپل سے درخواست کر کے درسِ قرآن کمیٹی میں شمولیت اختیار کر لی۔ پھر مَیں نے پرنسپل اور یونین کو قائل کر لیا کہ اسمبلی زیرو کی بجائے تیسرے پیریڈ میں ہونی چاہیے اور اس کا دورانیہ پندرہ منٹ ہونا چاہیے...... جب میری باری ہوتی (اور ہفتے میں دوبار مجھے موقع ملتا) تو مَیں ایسی آیات کا انتخاب کرتا جس کا تعلق روزمرہ اخلاقیات اور باہمی انسانی مراسم سے ہوتا تھا اور ان کی جدید ترین معلومات کی روشنی میں تشریح کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ (پریشان اور بددل ہو کر) اسلامیات کے دونوں استاد اس فریضے سے پیچھے ہٹ گئے اور مَیں ہی اللہ کی توفیق سے اس کام کو نپٹاتا رہا۔

لیکن پرنسپل این اے حامد عجیب ذہنیت کے آدمی تھے، وہ دیانت دار اور فرض شناس تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند بھی تھے، لیکن "اسلام پسندوں" کے خلاف ان کے دل میں ایسی گانٹھ پڑ گئی تھی، جو کسی طرح سلجھتی ہی نہیں تھی اور مجھ سے وہ اس لیے بھی پریشان تھے کہ مَیں نے مختلف وقتوں میں، اُن کے خیال میں اپنے رفقائے کار سے چپقلش کی صورت پیدا کر دی تھی، کسی مصلحت سے

کام نہیں لیا تھا اور کالج کی فضا کو خراب کرنے کی کوشش کی تھی...... چنانچہ میری فرض شناسی اور تعاون کی ہر صورت کے باوجود پرنسپل میری سالانہ رپورٹ 1980 سے 1985ء یعنی چھ سال تک خراب کرتا رہا۔ Average لکھتا رہا اور منفی تاثر کا اظہار کرتا رہا نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں گریڈ میں جو Move over مجھے 1985ء میں ملنا تھا، وہ ڈیفر ہوگیا اور تین سال کی تاخیر سے 1988ء میں ملا۔

میں نے 10-08-91 کو پنجاب سروسز ٹریبونل میں اس کے خلاف اپیل دائر کردی۔ تین سال مقدمہ چلا اور اللہ کے خاص فضل سے 18-07-94 کو فیصلہ میرے حق میں ہوگیا......لیکن مَیں اس وقت سخت گھبرایا جب 30-11-94 کو مجھے سپریم کورٹ کے رجسٹرار کی طرف سے نوٹس موصول ہوا کہ گورنمنٹ نے سروسز ٹریبونل کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی ہے، آیئے اور اس کا جواب دیجیے...... سچی بات ہے کہ یہ نوٹس موصول ہونے کے بعد مَیں چکرا کر رہ گیا۔ میرے بہت ہی محدود وسائل ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مَیں سپریم کورٹ میں مقدمہ بازی کرسکوں۔ سروسز ٹریبونل کے مقدمے پر میرے کم از کم پانچ ہزار روپے خرچ ہوگئے اور تین سال کا عرصہ بیت گیا تھا، لیکن سپریم کورٹ کا تو نام ہی خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ میرا تاثر یہ تھا کہ سپریم کورٹ کے تو معمولی مقدمے کے لیے وکیل لاکھوں روپے مانگتے ہیں اور چھ چھ ماہ کی تاریخ پڑتی ہے...... ''خدایا اب کیا ہوگا؟'' مَیں اس نئی صورتِ حال کا مقابلہ کیسے کرسکتا ہوں؟ یہ معاملہ تو بالکل ہی میرے بس سے باہر ہے۔ مَیں تو اس کی ہرگز استطاعت نہیں رکھتا''۔

تب مَیں نے حسبِ معمول اللہ سے اپنا رابطہ استوار کرلیا، مَیں نے بار بار دعائیں کیں۔ ''باری تعالیٰ یہ مقدمہ میری طاقت سے باہر ہے، میرے تو وسائل بے حد محدود ہیں، مَیں کیسے اس کو نپٹا سکوں گا۔ اپنے خاص فضل سے میری مدد فرمایئے اور اس مسئلے کو حل فرما دیجیے''۔ مَیں بار بار، دن میں کئی مرتبہ اسی نوعیت کی دعائیں کرتا اور وضاحت میں اس طرح کا اسلوب اختیار کرتا

''باری تعالیٰ آپ جانتے ہیں کہ مَیں نے اپنے سرکاری فرائض دیانت داری سے انجام دینے کی کوشش کی ہے، مَیں نے کلاسیں عبادت سمجھ کر پڑھائی ہیں، کلاس میں بروقت پہنچتا رہا ہوں، مَیں نے کبھی طلبہ کا وقت ضائع نہیں کیا اور کورس ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے اخلاق کی تعمیر سے بھی کوتاہی نہیں برتی۔ مَیں لائبریری کمیٹی کا چیئرمین تھا، ضیاء الحق کے دور میں پچاس پچاس ہزار روپے لائبریری کو گرانٹ ملتی تھی اور ساری خریداری میں ہی کرتا تھا، لیکن مَیں نے کسی کتب فروش سے کمیشن لینا تو دور کی بات ہے کبھی ڈائری تک کا بھی مطالبہ نہیں کیا...... پھر میری یہ ڈیوٹی نہیں تھی، یہ اسلامیات والوں کا کام تھا لیکن مَیں کئی برس تک صبح اسمبلی میں درسِ قرآن بھی دیتا رہا...... چنانچہ مَیں نے اپنی استطاعت کے مطابق اپنے فرائض میں کسی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کیا۔ لیکن اس سب کچھ کے باوجود پرنسپل میری رپورٹیں خراب کرتا رہا جس کے نتیجے میں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور پرنسپل صرف اس لیے ناراض تھا کہ مَیں نے کالج کے اندر ان لوگوں کو لگام دی، ان کے منہ بند کئے جو آپ کے، آپ کے دین کے اور آپ کے برگزیدہ بندوں کے خلاف بدزبانی کرتے تھے، اس کے سوا میرا کچھ بھی قصور نہیں تھا''۔ اس موقع پر لاڈ سے اور اپنے مزاج کے برعکس تھوڑی سی شوخی سے کام لیتا اور عرض کرتا: ''باری تعالیٰ ساری صورتِ حال آپ کے سامنے ہے، میرا اس میں کوئی بھی قصور نہیں۔ چنانچہ یہ جو کچھ ہوا ہے آپ کی وجہ سے ہوا ہے...... آپ ہی اس کی تلافی فرمائیے اور اسے حل کر دیجیے۔ مجھ میں تو اس مقدمے کا مقابلہ کرنے کی ہرگز استطاعت نہیں ہے۔ میں تو صرف آپ کے فضل و کرم کا طلبگار ہوں''۔

مَیں کم و بیش روزانہ اللہ کے حضور یہ عرضداشت پیش کرتا اور بھول ہی گیا کہ مجھے بروقت سپریم کورٹ میں حاضر ہونا ہے۔ اسی حیص بیص میں دو ہفتے گزر گئے اور جب مَیں پندرہ دسمبر کے بعد اپنے وکیل چوہدری غلام قادر مرحوم کے پاس یہ نوٹس لے کر گیا (جنہوں نے سروسز ٹریبونل میں میرا مقدمہ جیتا تھا) تو وہ سخت حیران اور برہم ہوئے۔ انہوں نے مجھے یوں گھور کر دیکھا جیسے میرا دماغ چل گیا ہو اور پھر ڈانٹنے لگے۔ ''ڈاکٹر صاحب یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے، سپریم کورٹ کا معاملہ ہو

اور اس قدر بے نیازی اور تساہل...... حد ہوگئی، حد ہوگئی۔ یوں لگتا ہے کہ آپ کو اپنے نفع نقصان کا احساس ہی نہیں ہے۔ دو ہفتے گزار دیئے آپ نے، اس قدر سستی، اس قدر لاپرواہی۔ مَیں نے کسی موکل کو اپنے مقدمے کے سلسلے میں اور وہ بھی سپریم کورٹ کے معاملے میں اس قدر، بے پروا نہیں دیکھا''...... وکیل صاحب واقعی بہت پریشان تھے، انہوں نے اپنے منشی کو سپریم کورٹ کے رجسٹرار کے دفتر میں بھیجا اور وہ ایک ورق لے آیا، جس پر لکھا تھا۔ Put this case in the next week یعنی اس مقدمے کو اگلے ہفتے میں پیش کریں اور اس ورق پر لکھی ہوئی تاریخ کے مطابق وہ ہفتہ بھی گزر گیا تھا۔ تب وکیل صاحب مزید برہم ہوئے۔ وہ بلند آواز میں کہنے لگے: ''ڈاکٹر صاحب، سب کچھ برباد ہوگیا، ستیاناس ہوگیا...... ظاہر ہے کیس کسی جج کی عدالت میں ضرور لگا ہوگا اور ہماری غیر حاضری کی وجہ سے خارج ہوگیا ہوگا...... چلیے کل آیئے، اس کی نقل منگائیں گے، دیکھیں گے کیا ہوا ہے۔''

اور دوسرے روز مَیں چودھری غلام قادر صاحب کے دفتر میں گیا اور منشی فیصلے کی نقل لایا تو پتہ چلا کہ 94-12-12ء کو دو ججوں نے (جسٹس فضل الٰہی خاں اور جسٹس فضل کریم) نے مقدمے کی سماعت کی تھی۔ حکومت کی طرف سے تین اٹارنی پیش ہوئے تھے جبکہ میری جانب سے کوئی بھی موجود نہ تھا لیکن جج صاحبان نے گورنمنٹ کی اپیل مسترد کر دی تھی اور سروسز ٹریبونل کا فیصلہ برقرار رکھا تھا...... اللہ تبارک وتعالیٰ نے اعلان فرما دیا تھا کہ تم کہتے تھے کہ یہ جو کچھ ہوا ہے میری وجہ سے ہوا ہے تو دیکھ لو، مَیں اس ذمہ داری کو قبول کرتا ہوں اور میرا فیصلہ یہ ہے۔ وکیل چودھری غلام قادر فیصلے کی نقل پڑھ کر سکتے میں آ گئے۔ حیرت سے فضا میں گھورتے رہے اور پھر مسکرا کر انہوں نے مجھے مبارک باد دی۔ مَیں نے اسی وقت مٹھائی کا ڈبہ منگایا اور ان کی خدمت میں پیش کر کے گھر آ گیا۔ اس فیصلے کے نتیجے میں میری ڈھائی ہزار روپے ماہانہ تنخواہ بڑھ گئی اور پچھتر ہزار روپے واجبات کی صورت میں حاصل ہوئے۔ **الحمد لله ربّ اللعلٰمین والصلوٰة والسلام علیٰ رسولهٖ الکریم ط**

باب : ۲

کون کہتا ہے، خدا نہیں ہے

(۱)

سپریم کورٹ کے ایک فاضل اور بزرگ وکیل سے میری بہت اچھی شناسائی ہے۔ بہت محبت اور شفقت سے پیش آتے ہیں اور اچھا ادبی اور علمی ذوق رکھتے ہیں۔

کچھ عرصہ قبل موصوف محترم سے ملاقات ہوئی تو پوچھا آج کل کیا کر رہے ہیں۔ مَیں نے بتایا کہ ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے کتاب مرتب کرنے کا ارادہ ہے تو فرمایا۔ ایک انتہائی عبرت ناک اور لرزہ دینے والا واقعہ میرے پاس بھی ہے اُور میری درخواست پر اُنہوں نے جب اس کی تفصیلات سنائیں تو مَیں اللہ کی صفتِ انتقام پر مبہوت رہ گیا اُور جب بھی اس کا تصور کرتا ہوں، واقعتاً کانپ اُٹھتا ہوں۔

موصوف محترم نے بتایا کہ اُن کے علاقے میں جاگیرداروں کا ایک خاندان ہے۔ خاندان کا سربراہ فوج میں بریگیڈیر تھا، لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد وہ سارا وقت زمینوں کی نگرانی اُور نگہداشت میں صرف کرتا تھا۔ اُس کے دو محبوب مشاغل تھے: فارغ وقت میں مرسیڈیز کار پر سیر کرتا اُور ہر وقت دو ڈھائی لاکھ کی رقم پاس رکھتا اُور نوٹوں کو گنتا رہتا۔

ایک روز دوپہر کو وہ ڈیرے پر گیا۔ سارے نوکر، مزارع خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اُسے ایک مزارع پر غصہ آ گیا۔ اُس نے ڈنڈا پکڑا اُور اُس کی پٹائی شروع کر دی۔ اُس بے چارے نے جان بچانے کی خاطر بھاگ کر ایک جھونپڑے میں پناہ لے لی اُور اندر سے کنڈی لگا لی...... جاگیردار ظالم نے باہر سے کنڈی لگائی اُور جھونپڑے کو آگ لگا دی۔

جھونپڑا لکڑیوں سے اَور گھاس پھوس سے ہی تو بنا ہوا تھا، فوراً ہی آگ بھڑک اُٹھی اور سارا جھونپڑا الاؤ کی صورت اختیار کر گیا۔ کسی مائی کے لال میں جرأت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر مداخلت کرتا، چنانچہ وہ غریب جھونپڑے کے اندر جل کر بھسم ہو گیا۔ کس کی مجال تھی کہ وہ ایک جاگیردار اَور ریٹائرڈ بریگیڈیئر کے منہ آتا، اُس کے خلاف کہیں فریاد کرتا یا قانون کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ کچھ دن اس واقعے کا قرب وجوار میں سرگوشیوں کے انداز میں چرچا ہوا اَور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ چند ہی ہفتوں کے بعد متذکرہ جاگیردار کے گھٹنوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ پہلے سوجن اَور درد اَور پھر مکمل فالج۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس شخص کے لیے ایک انچ بھی حرکت کرنا ممکن نہ رہا۔ ملازم ہی اسے اٹھا کر بستر پر لٹاتے اور ملازم ہی ٹائیلٹ میں لے جاتے شب وروز اسی طرح گزرتے رہے۔ زندگی اس جاگیردار بریگیڈیئر کے لیے وبال بن گئی۔

مئی کا مہینہ تھا۔ گندم پک گئی تھی اَور زمینوں پر تھریشر لگے ہوئے تھے۔ اُس نے گھر میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ بہت دن سے مَیں باہر نہیں گیا۔ تھریشر بھی کام کر رہے ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ مُجھے باہر لے جایا جائے، ہواخوری بھی ہو جائے گی، گندم نکلتے ہوئے بھی دیکھ لوں گا اَور طبیعت بھی بہل جائے گی۔

چنانچہ ملازموں نے اُسے اٹھا کر اُس کی پسندیدہ مرسیڈیز کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔ اُس نے دو ڈھائی لاکھ کے نوٹ جیب میں ڈالے اور ڈرائیور اُسے لے کر چل پڑا۔

جاگیر کا رقبہ چونکہ بہت وسیع تھا اس لیے گاڑی کو تھریشروں کی طرف جاتے ہوئے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ لیکن ایک مقام پر جا کر گاڑی رُک گئی۔ آگے گنے کے کھیت تھے، تھریشر دوسری جانب برسرِ کار تھے اَور گاڑی کا مزید آگے جانا ممکن نہ تھا۔ جہاں گاڑی جا کے رُکی وہاں سے گنے کاٹے جا چکے تھے اَور ہر طرف گنوں کے خشک پتے کثرت سے بکھرے ہوئے تھے۔

دیہاتی ماحول سے آشنا لوگ جانتے ہیں کہ گنوں کے خشک پتے جنہیں عرفِ عام میں ''چھوئی'' کہا جاتا ہے، کس قدر آتشیں مزاج کے حامل ہوتے ہیں اَور گڑ تیار کرنے والے کسان

انہیں چولہوں میں جلاتے اور انہیں کی آگ سے گڑ تیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، گنے کے کھیت کا کچھ حصہ کٹا ہوا تھا اور ہر طرف چھوئی بکھری ہوئی تھی۔ وہیں گاڑی جا کر کھڑی ہوگئی۔

ڈرائیور نے جاگیردار کو بتایا کہ سر تھریشر کماد کی دوسری جانب کام کر رہے ہیں اور اُدھر گاڑی لے جانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ اب کیا حکم ہے؟ کیا کیا جائے؟

جاگیردار نے کہا: کوئی بات نہیں، تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو، اے سی چل رہا ہے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، تم جاؤ اور جا کر دیکھو کہ تھریشروں پر کام کی کیا رفتار ہے، کتنی گندم سے غلہ نکل آیا ہے اور کتنی باقی ہے۔ مَیں تمہارا یہیں انتظار کرتا ہوں۔

چنانچہ ڈرائیور چلا گیا اور فوراً ہی کماد کے دوسری طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اب قرائن یہ ہیں کہ جاگیردار نے ماچس جلا کر سگریٹ سلگایا اور جلتی ہوئی ماچس باہر پھینک دی۔ مئی کا مہینہ تھا، غضب کی دھوپ تھی، گاڑی کے نیچے اور چاروں جانب ''چھوئی'' بکھری ہوئی تھی اور یہ چھوئی تو آگ پکڑنے کا بہانہ مانگتی ہے، چنانچہ فوراً ہی ''چھوئی'' نے آگ کا پُرجوش استقبال کیا، گاڑی کے چاروں طرف الاؤ بھڑک اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جاگیردار دو ڈھائی لاکھ کی رقم اور بے حد قیمتی مرسیڈیز کار سمیت جل کر کوئلہ ہوگیا اور کوئی بھی اُسے اللہ، جبار و قہار کے غضب سے بچا نہ سکا۔

محترم وکیل صاحب نے بتایا کہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ جھونپڑا تھا جس میں ایک بے یار و مددگار، غریب مزارع کو جلا کر بھسم کیا گیا تھا۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

...... ❀❀❀ ......

پروفیسر صدیق قمر صاحب گورنمنٹ کالج عارف والا میں اُردو کے اُستاد ہیں۔ بہت اچھا علمی ذوق رکھتے ہیں۔ چند سال پہلے وہ اقبالیات میں ایم فل کر رہے تھے اور اسی سلسلے میں میرے پاس تشریف لائے تھے (۲۰۰۴-۰۳-۳۰)۔ میری درخواست پر اُنہوں نے ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے چند چونکا دینے والے واقعات سنائے تھے۔ جو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

(۲)

مظلوم کی بددعا......قدرتِ خداوندی کا فوری فیصلہ

یہ واقعہ جون ۲۰۰۰ء کا ہے۔

قبولہ کے قریب ''لاہوریوں کا چک'' کے نام سے ایک گاؤں ہے۔ وہاں ایک زمیندار نے 25 ایکڑ خربوزے کاشت کر رکھے تھے۔ خربوزے پکنے شروع ہوئے تو گاؤں کا ایک یتیم لڑکا جس کی عمر دس بارہ سال تھی، مربعے میں چلا گیا اور اُس نے ایک خربوزہ توڑ لیا۔

مربعے کے مالک نے لڑکے کی یہ حرکت دیکھ لی۔ اُس نے ملازم کو دوڑایا کہ لڑکے کو پکڑ کر لاؤ......اور پھر لڑکے کی خوب پٹائی کی......لیکن اُس کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا اور اُس نے نوکروں کو حکم دیا کہ لڑکے کو درخت کے ساتھ باندھ دو۔ اُس نے اعلان کیا کہ یہ لڑکا کل بارہ بجے تک درخت کے ساتھ اسی طرح بندھا رہے گا۔ مَیں اصل میں اس کو پورے علاقے کے لیے عبرت بنا دینا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ کوئی میرے مربعے میں داخل نہ ہو۔

عام لوگوں نے بھی زمیندار کو سمجھایا کہ بچہ ہے معاف کر دو، مگر اُس نے کسی کی نہ سُنی۔ لڑکے کی بیوہ ماں آئی، اس نے زمیندار کی منتیں کیں، ہاتھ جوڑے، اپنا دوپٹہ اُتار کر اُس کے پاؤں پر رکھا، ہر طرح کا جرمانہ ادا کرنے کی پیش کش کی، مگر اُس ظالم کا دل نہ پسیجا، اُس نے سختی کے ساتھ ہر

التجارڈ کر دی اُور نہایت تکبّر کے ساتھ اعلان کر دیا کہ لڑکے کو معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مَیں اس کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا اُور یہ لازماً کل بارہ بجے تک درخت سے اسی طرح بندھا رہے گا۔ بے چاری بیوہ عورت زار زار روتی ہوئی چلی گئی۔

پروفیسر صدیق قمر صاحب نے بتایا یہ تقریباً ایک ڈیڑھ بجے کا وقت تھا۔ شدید گرمی پڑ رہی تھی اُور آسمان بالکل صاف تھا۔ بادلوں کا دور دُور تک نشان نہ تھا کہ اچانک سیاہ رنگ کی ایک بدلی فضا میں نمودار ہوئی اُور اس مربعے پر چھا گئی اُور پھر اس میں سے موٹے موٹے اولے برسنے شروع ہو گئے۔ اولوں کا وزن معمول سے اتنا زیادہ تھا اُور اُن کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اُنہوں نے مربعے کو تہس نہس کر دیا، پودوں کی جڑیں تک اُکھڑ کے رہ گئیں۔

ایک ظالم اُور متکبّر آدمی کی سزا کا یہ عمل ڈیڑھ دو گھنٹے تک جاری رہا اُور عصر سے پہلے پہلے یہ عمل مکمل ہو گیا...... علاقے کے ہزاروں لوگوں نے خدا کے اس جیتے جاگتے قہر کو قریب کھڑے ہو کر دیکھا۔

بالکل درست فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ مظلوم کی بددعا سے بچو کہ اس کے اُور خدا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔

......❀❀❀......

(۳)

گوجرانوالہ میں میرے بہت قابلِ احترام دوست پروفیسر حافظ محمد ارشد صاحب نے ایک دردناک واقعہ سنایا۔

یہ ۹۸-۱۹۹۷ کی بات ہے۔ مَیں اُن دنوں سول لائینز میں رہا کرتا تھا۔ ایک دوپہر کو مَیں ظہر کے بعد سو رہا تھا کہ باہر ایک خاتون نے دردناک لہجے میں مجھے آوازیں دیں۔ مَیں اُٹھ کر باہر آیا تو دیکھا کہ ساتھ والی گلی کی ایک بیوہ عورت ہے جو حافظۂ قرآن بھی تھی اَور بچوں کو قرآنِ پاک پڑھایا کرتی تھی، وہ شدّت سے رو رہی تھی اَور میرے گھر کے سامنے واویلا کر رہی تھی...... مَیں نے پوچھا کیا بات ہے تو اُس نے بتایا کہ میرے گھر کے قریب ایک لڑکے نے میرے بیٹے کو ٹکر ماردی ہے اور اُس کی ناک کی ہڈی توڑ دی ہے۔ مَیں تھانے میں گئی تھی، لیکن پولیس والوں نے میری بات نہیں سنی اَور کیس درج نہیں کیا۔ اُس کی وجہ یہ ہے کہ ٹکر مارنے والے لڑکے کا خاندان بہت بااثر ہے، اُن کی وزیرِاعلیٰ سے رشتہ داری ہے۔

حافظ صاحب نے بتایا مَیں نے اُس خاتون کو صبر کی تلقین کی کہ جب صورتِ حال یہ ہے تو تھانے والے میری بات بھی نہیں سنیں گے، اس لیے معاملہ خدا پہ چھوڑ دو۔ وہی انصاف کرے گا اَور یہ ظلم ضرور رنگ لائے گا۔

اس واقعے کو صرف تین دن گزرے تھے۔ ٹکر مارنے والے نوجوان کے محلے ہی میں کسی لڑکی سے تعلقات تھے۔ یہ آدھی رات کو اس کی چھت پر چڑھ کر اس کے صحن میں اُترا، تو گھر والوں نے چور چور کا شور مچا دیا۔ پولیس کے لوگ اتفاق سے قریب ہی گشت پر تھے، وہ شور سُن کر گھر کے سامنے آ گئے۔ یہ لڑکا بھی شور سے پریشان ہو کر دوبارہ چھت پر آ گیا اور اس نے باہر کی طرف

جھانکا۔ عین اُس وقت گلی میں کھڑے ہوئے تھانیدار نے نشانہ لے کر گولی چلا دی جو اس کے سینے میں لگی اَور یہ چکرا کر گلی میں آ گرا اَور عین اُس جگہ پر تڑپ تڑپ کر مر گیا جہاں اُس نے بیوہ عورت کے بیٹے کو ٹکر ماری تھی اَور جہاں اس کا خون گرا تھا۔

اللہ نے فوری طور پر ایک مظلوم کی فریاد سن لی اَور ظالم کو کڑی سزا دے دی۔ خاص بات یہ ہے کہ جو پولیس ظالم کے خلاف مقدمہ درج کرنے پر تیار نہ تھی، وہ اُسی پولیس کے ہاتھوں کیفرِ کردار کو پہنچا۔

(۴)

یہ عجیب و غریب عبرت ناک واقعہ مشہور صحافی اور کالم نگار رفیق ڈوگر نے نوائے وقت کے شمارہ ۲۷ دسمبر ۱۹۹۷ء میں لکھا تھا۔ افسوس میں وہ کالم تو محفوظ نہ کر سکا، لیکن اس کے سارے ضروری نکات میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لئے تھے جو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

رفیق ڈوگر صاحب لکھتے ہیں کہ وہ بہاولپور کے لال سوہانڑا پارک کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں پارک کے انچارج ڈاکٹر جہانگیر غوری بھی موجود تھے اور چولستان ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے افسر آبادکاری شارق منصور انصاری بھی......ڈاکٹر جہانگیر غوری نے بتایا:

ایک مسافر بس پارک کے اندر سے گزرنے والی سڑک پر دوڑتی جا رہی تھی اور اُس کے اندر ایک عورت انتہائی خوفزدہ آواز میں بار بار چلا رہی تھی کہ میرے کپڑوں میں ایک سانپ ہے۔ میرے کپڑوں میں ایک سانپ ہے۔ سارے مسافر اس آواز پر دم بخود اور ہراساں تھے اور ڈرائیور کو توجہ دلا رہے تھے کہ وہ بس روکے لیکن ڈرائیور بس دوڑائے جا رہا تھا حتیٰ کہ بس لال سوہانڑا کے سٹاپ پر جا رکی۔

لوگ جلدی سے باہر نکلے، سب سے پہلے وہ عورت باہر آئی ایک آدمی نے اسے اپنی چادر دی۔ اسے اوڑھ کر عورت نے جونہی شلوار اتاری، اس میں سے ڈیڑھ دو فٹ لمبا گہرے سیاہ رنگ کا سانپ نکلا اور نہایت تیزی سے دوڑتا ہوا سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک آدمی کی ٹانگ سے لپٹ گیا اور اسے کاٹ لیا، وہ شخص فوراً ہی نیچے گر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے آناً فاناً مر گیا۔

یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا کہ بس سٹاپ پر کھڑے ہوئے خصوصاً بس سے اترنے والے لوگ ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے اور کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر زہریلا سانپ

اتنی دیر تک ایک عورت کی شلوار میں موجود رہا، لیکن اس نے اسے کوئی گزند نہیں پہنچایا، جبکہ اس نے آزاد ہوتے ہی ایک شخص کو کاٹ لیا اور موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اب سب لوگوں کو جستجو ہوئی کہ مرنے والا بدنصیب کون ہے؟ اس کے کپڑوں کی تلاشی لی گئی، لیکن کوئی کارڈ یا تحریر نہ ملی۔ پاس ہی ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی اور اس کے ساتھ ایک تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ سب لوگوں کا دھیان اسی طرف گیا کہ یہ موٹر سائیکل مرنے والے آدمی کی ہے چنانچہ جب تھیلے کا منہ کھولا گیا تو دیکھنے والے دہشت زدہ ہو گئے کہ اس میں کسی عورت کے کٹے ہوئے بازو تھے جن کے ساتھ سونے کے کڑے نظر آ رہے تھے۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ اس بدبخت شخص نے سونے کے لالچ میں پہلے ایک عورت کو قتل کیا اور پھر اس کے بازو کاٹ کر تھیلے میں بند کر لیے اور ایک پُراسرار سانپ کی صورت میں اللہ کے قہر نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ چنانچہ جس نے بھی مکافاتِ عمل کا یہ زندہ منظر دیکھا وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا اور استغفار پڑھنے لگا۔

رفیق ڈوگر صاحب نے لکھا کہ شارق منصور انصاری نے بتایا کہ مَیں اس زمانے میں اس علاقے کا مجسٹریٹ تھا۔ میرے ہی حکم سے مرنے والے کا پوسٹ مارٹم ہوا تھا اور لاش ورثا کے حوالے کی گئی تھی، لیکن کوشش کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ جس بدنصیب عورت کے یہ بازو کاٹ کر لایا تھا، وہ کہاں کی رہنے والی تھی اور اس کے ساتھ یہ حادثہ کیوں پیش آیا تھا۔

...... ❀ ❀ ❀ ......

(۵)

رُسوا کن سزا

راؤ یعقوب میرے پرانے دوست ہیں۔ کسی زمانے میں ہم دونوں ایک سیاسی ہفت روزے میں اکٹھے کام کرتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ 1970ء میں مَیں لیکچرار بن کر سرکاری ملازمت میں چلا گیا اُور یعقوب صاحب اسلام آباد کے ایک علمی، مذہبی ادارے میں گزٹیڈ آفیسر بن گئے جہاں سے وہ 1999ء میں بیسویں گریڈ سے ریٹائر ہوئے۔ موصوف بہت اچھے قلم کار ہیں اُور کئی وقیع انگریزی کتابوں کا انہوں نے خوبصورت اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ آجکل وہ علاقہ اقبال ٹاؤن کے سامنے ملتان روڈ پر لاہور کی ایک معروف بستی میں رہائش پذیر ہیں۔

موصوف نئے نئے لاہور منتقل ہوئے تھے کہ ایک روز اخبار میں پڑھا کہ راؤ یعقوب کا بیٹا جو ایک سال پہلے ہندوستان میں گرفتار ہو گیا تھا، رہا ہو کر آ گیا ہے۔ افسوس بھی ہوا اُور حیرت بھی کہ یہ کیا واقعہ ہے؟ ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑا ہی عجیب قصہ سنایا۔ کہنے لگے:

میرے سسرال ہندوستان کے ضلع اعظم گڑھ میں ہیں۔ تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، مَیں اسلام آباد ہی میں تھا جب میری بیگم نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ بھائی سے ملے بہت لمبا عرصہ ہو گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ انتظام کر دیں اُور مَیں جیتے جی اس سے ملاقات کر آؤں۔ میرا ایک بیٹا یوسف قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد میں پڑھتا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ مَیں بھی امی کے ساتھ جاؤں گا۔ ماموں سے مِل بھی آؤں گا اُور ہندوستان کی سیر بھی کر آؤں گا۔ چنانچہ مَیں نے بھی یہ سوچ کر بیٹے کی تجویز سے اتفاق کیا کہ بیگم کو تنہا سفر نہیں کرنا چاہئے اُور دونوں ماں بیٹے کے پاسپورٹ اُور ویزوں کا انتظام کر دیا۔ وہ دونوں ایک دن ہوائی جہاز سے ہندوستان چلے گئے۔

لیکن یہ کیا......؟ وہ آج گئے اور دوسرے ہی روز شام کو ہوائی جہاز سے واپس اسلام آباد

آ گئے۔ ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔ خیال آیا کہ شاید کسی شک کی بنا پر ہندوستان والوں نے دلی سے آ گے نہیں جا۔ دیا۔ لیکن ایسا ممکن نہ تھا کہ ہم نے بھارتی سفارت خانے سے قواعد وضوابط کے مطابق با قاعدہ ویزہ حاصل کیا تھا۔ بیگم کا برا حال تھا، اس کی رورو کے آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ کیا حادثہ ہوا ہے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس نے ہچکیوں کے ساتھ بتایا کہ آپ کے بیٹے نے وہاں ضد اُور ہٹ دھرمی کی انتہا کر دی۔

بیگم نے بتایا کہ میرے بھائی جس گاؤں میں رہتے ہیں وہاں بجلی نہیں ہے، وہ بڑا ہی پس ماندہ علاقہ ہے۔ پھر سب لوگوں نے بھینسیں پال رکھی ہیں۔ گھر کے ساتھ ہی مویشیوں کا باڑہ ہے اُور گوبر، سبزے اُور گندے پانی کی کثرت کی وجہ سے گاؤں میں مچھر بڑی کثرت سے ہیں۔ اُور خوب پلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ رات کو جب ہم سوئے تو یوسف پر تو مچھروں نے گویا یلغار کر دی۔ گاؤں کے لوگ تو اس صورتِ حال کے عادی تھے، مگر یوسف کے لیے یہ بالکل نیا، بڑا ہی تکلیف دہ تجربہ تھا۔ ساری رات مچھر اُسے کاٹتے رہے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہ سکا۔ جاگتا رہا اُور روتا رہا اُور صبح ہوتے ہی اس نے چیختے ہوئے یہ اعلان کر دیا کہ وہ اس گاؤں میں مزید ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہرے گا اُور لازماً آج ہی واپس جائے گا۔ وہ بار بار چلّا رہا تھا اُور اس مطالبے کی تکرار کئے جا رہا تھا۔ البیہ یہ ہوا کہ اس کے ماموں کا بارہ تیرہ سالہ بیٹا قریبی ندی میں مچھلیاں پکڑنے گیا اُور ڈوب کر مر گیا۔ اب میت صحن میں پڑی تھی، سارا گاؤں اظہارِ غم کے لیے جمع ہو گیا تھا بلکہ قرب و جوار کے رشتہ دار بھی اکٹھے ہو گئے تھے، لیکن یہ لڑکا اس انتہائی سوگوار فضا سے مکمل بے نیاز مسلسل بآوازِ بلند چیختا جا رہا تھا کہ مَیں یہاں ہرگز نہیں ٹھہروں گا اُور ابھی واپس جاؤں گا۔ سارے رشتہ دار اسے منانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ماں نے اس کی منتیں کیں، اپنا دوپٹہ اس کے قدموں پر رکھ دیا۔ ماموں نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے کہ مجھے معاف کر دو۔ مَیں آج کوئی نہ کوئی ضرور انتظام کر دوں گا۔ شہر سے مچھر دانی لے آؤں گا اُور مچھر والا تیل بھی خرید لوں گا۔ بس تھوڑا صبر کرو، حوصلے سے کام لو، میری بہن کئی سالوں کے بعد آئی ہے، اسے چند روز میرے پاس

رہ لینے دو اَور اب تو ہمارے گھر پر قیامت ٹوٹ پڑی ہے، اس کا ہی کچھ لحاظ کرو، آج ہی واپسی کی ضد نہ کرو۔

لیکن آفرین ہے اس لڑکے پر کہ اُس نے کسی کی منت سماجت اَور آہ وزاری کی پروانہ کی۔ ماں کا دوپٹہ اٹھا کر دور پھینک دیا اَور ماموں کے اشک آلود ہاتھوں کو جھٹک دیا اَور ایک ہی ہٹ پر قائم رہا کہ مَیں یہاں ہرگز نہیں رُکوں گا اَور آج ہی واپس جاؤں گا اَور ہر قیمت پر جاؤں گا...... چنانچہ تنگ آ کر، زچ ہو کر ماموں نے کمال ایثار سے کام لیا، بیٹے کا جنازہ مؤخر کیا اَور بہن اور بھانجے کو ساتھ لے کر خود علی گڑھ گیا اَور دونوں کو ٹرین پر بٹھا دیا۔ یہ دلّی آ گئے اَور شام کی فلائیٹ سے واپس اسلام آباد پہنچ گئے۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا کہ اس صورت حال نے مجھے غم اَور غصّے کی شدید ترین کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں اَور بیٹے سے کیا سلوک کروں؟ وہ جوان تھا، بے حد ضدی اَور اکھڑ مزاج تھا۔ سختی کرتا تو پتہ نہیں وہ کیا کر گزرتا۔ زجر و توبیخ کا وہاں کوئی فائدہ نہ تھا۔ چنانچہ بے بسی کے عالم میں مَیں بے اختیار رو پڑا اَور دیر تک روتا رہا۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا: اس واقعے کو دو سال گزرے، میرے اس بیٹے نے قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد سے ایم بی اے کا کورس مکمل کر لیا اَور ایک بین الاقوامی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم ہو کر اس کے لاہور آفس کا مینجر بن گیا۔

یہ ملازمت حاصل ہوئے بمشکل ایک سال گزرا تھا کہ اس کمپنی نے دلّی میں ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد کرانے کا پروگرام بنایا اَور اپنے لاہور آفس کو پابند کیا کہ وہ بھی اپنا ایک مندوب سیمینار میں شرکت کے لیے بھجوائے چنانچہ راؤ یوسف اس میں شمولیت کے لیے تیار ہو گیا۔ راؤ یعقوب صاحب نے بتایا کہ جب میرے بیٹے نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ ہماری کمپنی کا دلّی میں سیمینار ہے اَور مَیں اس میں شرکت کے لیے جا رہا ہوں تو مَیں نے اسے لعن طعن کی کہ

اب تم کس منہ، سے ہندوستان جاؤ گے۔ پہلے تم نے کیسا کارنامہ انجام دیا تھا تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ میں وہاں ماموں کے گاؤں تھوڑی جانا ہے؟ خدا کی پناہ کہ مَیں دوبارہ وہاں کبھی جاؤں...... مَیں دلی جاؤں گا، وہاں ہوٹل میں ٹھہروں گا، سیمینار اٹنڈ کروں گا۔ دلی اَور آگرہ کی سیر کروں گا اَور واپس آ جاؤں گا۔

مَیں نے اسے کہا کہ دیکھو احتیاط کرنا، فراڈ بہت ہو رہے ہیں کسی پرائیویٹ منی چینجر سے کرنسی تبدیل نہ کرانا۔ کسی بنک یا رجسٹرڈ منی چینجر ہی سے رقم تبدیل کرانا۔ مگر بدقسمتی سے اس نے میرے مشورے اَور نصیحت کی پروانہ کی۔ وہ لاہور سے سمجھوتا ایکسپریس پر سوار ہوا تو ٹرین میں ایک منی چینجر آ گیا۔ اس نے جھانسا دیا کہ مَیں عام بنکوں کے مقابلے میں زیادہ ہندوستانی کرنسی دوں گا۔ چنانچہ میرے بیٹے نے اسے ایک ہزار کا پاکستانی نوٹ دے کر ہندوستان کے سو سو کے نوٹ حاصل کر لیے۔

واہگہ سے آگے ہندوستان کی سرحد شروع ہوئی۔ راؤ یوسف بارڈر کراس کر کے اٹاری پہنچا اَور ریلوے بکنگ آفس پر دلی کا ٹکٹ لینے کے لیے ایک سو روپے کا نوٹ متعلقہ کلرک کو دیا تو اس نے ٹکٹ دینے کی بجائے نوٹ کو جعلی قرار دے دیا اَور فوراً ہی پولیس بلالی۔ راؤ یوسف کو گرفتار کر لیا گیا اَور ہتھکڑی لگا کر حوالات پہنچا دیا گیا۔

راؤ یعقوب صاحب نے بتایا: دوسرے روز مجھے امرتسر سے فون آیا، مَیں سردار بھگت سنگھ وکیل بول رہا ہوں۔ آپ کا بیٹا راؤ یوسف جعلی کرنسی کے کیس میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ حوالات میں ہے، آیئے اور اس کی ضمانت کرالیجیے۔

یعقوب صاحب نے بتایا: آپ میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ صدمے سے برا حال ہوا لیکن ظاہر ہے بیٹے کا معاملہ تھا بیٹھا تو نہیں جا تا تھا۔ مَیں اسلام آباد میں تھا اَور صحافتی حلقوں میں میرے وسیع مراسم تھے۔ مَیں نے بھاگ دوڑ کر کے ہندوستان کا ایمرجنسی ویزہ حاصل کیا۔ زرِ مبادلہ میں ایک لاکھ روپے کا انتظام کیا اَور دوسرے ہی روز ہوائی جہاز سے دلی پہنچ گیا۔ وہاں

سے پہلے اعظم گڑھ گیا، اپنی بیگم کے بھائی کو ساتھ لیا اور امرتسر پہنچ گیا۔ وہاں بھگت سنگھ وکیل سے ملا۔ پہلے ہی روز میرے ساٹھ ہزار روپے خرچ ہو گئے، خدا کا شکر ہے بیٹے کی ضمانت ہو گئی اور ضمانت اسی ماموں نے دی جس کے گھر میں راؤ یوسف نے مزید ایک دن بھی ٹھہرنا گوارا نہ کیا تھا۔

عدالت نے اپنے فیصلے میں لکھا کہ اگرچہ ملزم کو ضمانت پر رہا کیا جا رہا ہے، لیکن جب تک مقدمے کا فیصلہ نہیں ہو گا وہ ہندوستان سے باہر نہیں جا سکتا...... اس طرح راؤ یوسف کو گیارہ مہینے تک انتہائی ذلیل و خوار ہو کر ماموں کے اُسی گھر میں رہنا پڑا جہاں تین سال پہلے اس نے سنگدلی اور سفاکی کی انتہا کر دی تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس گاؤں میں وہ ذہنی اور عملی طور پر کس اذیّت اور ذلت کی کیفیت میں مبتلا رہا ہو گا...... عجیب بات یہ ہے کہ اِن تین سالوں میں گاؤں میں مثبت انداز کی کوئی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اللہ نے حیرت انگیز طور پر اپنی صفتِ انتقام کا کرشمہ دکھا دیا تھا۔

...... ❀❀❀ ......

(۶)

اللہ کی پکڑ

ذیل کا سچا واقعہ ماہنامہ ''اُردو ڈائجسٹ'' میں شائع ہوا تھا۔ وہاں سے ماہنامہ ''سوئے حرم'' لاہور نے اخذ کیا۔

لیڈی ڈاکٹر کرنل ''ش'' آج بھی پاک فوج میں خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ دل کی انتہائی سادہ اور اپنے پیشے میں بے پناہ مہارت رکھتی ہیں۔ وہ علم دوست اور ادب پرور شخصیت بھی ہیں۔ ان کی زندگی کا یہ عجیب واقعہ اللہ کی گرفت کا عکاس ہے۔ واقعہ ان ہی کی زبانی سنیے:۔

میرے والد صاحب نے دوسری شادی اس وقت کی جب مَیں کالج کے دوسرے سال میں زیر تعلیم تھی۔ میرے دونوں چھوٹے بھائی بالترتیب کالج اور سکول میں پڑھ رہے تھے۔ وہ اس طرح اچانک شادی کر کے نئی امی کو گھر لے آئے کہ ہم سب عجیب صدمے اور دکھ سے دوچار ہو گئے۔ ابا جی نے معلوم نہیں اچانک یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ امی سمیت ہم سب گھر والوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی اور ابو ایک عدد نو بیاہتا بیوی کے مالک بن گئے۔ وہ لڑکی عمر میں مجھ سے چند سال ہی بڑی ہو گی۔

ابو کی اس حرکت نے ہمیں پریشان کر دیا بلکہ گھر میں ایک عجیب سوگواری اور بٹوارے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ امی تو جیسے مٹی یا برف کا خاموش تودہ بن گئیں۔ مجازی خدا سے شکوہ کیا نہ شکایت، نہ لڑیں، نہ جھگڑیں، جیسے اپنے سارے حقوق سے یکدم دستبردار ہو گئی ہوں۔ ابا جی کے اس اچانک فیصلے نے ہمیں اور ہماری ماں کو رشتے داروں اور گلی محلے والوں کی نظروں میں بھی تماشا بنا دیا۔ ہمارے پاس ان کے سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ خیر ہم تو تنہائی میں آنسو بہا لیتے تھے لیکن امی جیسی چپ تھیں، ویسی ہی رہیں۔ انہوں نے اپنے اندر کے اُبال اور ملال کو کبھی ظاہر نہیں

کیا۔ ابا جی اپنی نئی دلہن کے ساتھ اوپر والے کمرے میں منتقل ہو گئے۔ یہ غنیمت تھا کہ اپنا گھر تھا اور اوپر کی منزل میں بھی دو کمرے تھے، ورنہ شاید ماحول اور بھی بدتر ہو جاتا۔

ہم بچوں کے ساتھ ابا جی کا رویّہ پہلے کی طرح شفیق اور مہربان رہا لیکن پتا نہیں کیوں وہ سیڑھیوں پر چڑھتے اترتے ہوئے بہت بیگانے لگنے لگے۔ ایک غیر محسوس دیوار تھی جو ان کے اور ہمارے درمیان حائل ہو گئی۔ رفتہ رفتہ ہم نے یہ حادثہ قبول کر لیا اور اس عورت کو بھی جو سوتیلی ماں کے روپ میں ہمارے سامنے آئی۔ وہ اکثر نیچے اُتر آتی اور ہم بچوں کے ساتھ خوب مزے مزے کی باتیں کرتی۔ وہ حُسنِ اخلاق سے آراستہ تھی۔ اس سے گھل مل کر ہمارا غصہ، رنج اور کوفت دور ہونے لگی۔ ہم بہن بھائی مل کر کبھی اس واقعے کو موضوع گفتگو بنا لیتے، تو سوچتے، پتا نہیں اس سانحے کے پیچھے زیادہ قصوروار کون ہے؟ ابا جی جو بغیر بتائے، چپ چاپ دوسری بیوی لے آئے یا امی جو ابا سے ہمیشہ کھنچی کھنچی رہتی تھیں، ہم نے ہمیشہ ان دونوں کے درمیان ایک عجیب سی سرد جنگ محسوس کی تھی۔

خیر قصہ کوتاہ، مَیں اصل واقعے کی طرف آتی ہوں۔ ہم سب بچوں نے چند برس بعد تعلیم مکمل کر لی۔ اس دوران ابا جی سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ بعدازاں جمع شدہ اور سرکار کی طرف سے ملنے والی رقم کے ذریعے ابا جی نے ہماری شادیاں کر دیں اور ہم سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو گئے۔

اس دوران اللہ تعالیٰ نے ابا جی کو دوسری بیوی سے تین بچوں سے نوازا۔ گویا ہمیں تین سوتیلے بہن بھائی عطا ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری شادیوں کے بعد گھر میں جو خلا پیدا ہوا، اسے کم از کم ابا جی نے ہرگز محسوس نہیں کیا۔ رہی ہماری ماں، وہ اپنے دکھ، اپنی تنہائی، اپنے ساتھ ہی بٹاتی رہیں۔ اس نے اپنے اکلاپے کے دکھ میں ہمیں کبھی شریک نہیں کیا، یا ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے سینے پر صبر کی سِل رکھ کر زبان پر خاموشی کے تالے لگا دیے۔

ابا جی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد پہلے کی طرح خوشحال نہیں رہے تھے۔ اوپر سے

تین چھوٹے بچوں کی کفالت کا بوجھ بھی آن پڑا۔ مَیں اس وقت تک پاک فوج میں ملازمت حاصل کر چکی تھی۔ میری تنخواہ اور مراعات دونوں چھوٹے بھائیوں سے زیادہ تھیں۔ میرے شوہر گو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے لیکن ان کی جدی پشتی کافی زمین تھی۔

ابا جی نے ایک دن اپنی معاشی پریشانی کے بارے میں مجھے آگاہ کیا اور بتایا کہ ان کی پنشن بہت قلیل ہے۔ کٹ کٹا کر چند ہزار روپے ملتے ہیں۔ اتنی تھوڑی رقم سے پانی، بجلی، گیس کے بل، گھر کا ٹیکس اور دوسرے اخراجات کا بار اٹھانا ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ میرے بھائیوں کی تنخواہیں ہی ان کی سفید پوشی کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ چونکہ بحیثیت ڈاکٹر میری مالی حیثیت سب سے مستحکم ہے، اس صورت میں مجھے ان کی مالی مدد کے لیے کچھ رقم ضرور بھجوانی چاہیے۔ ایک باپ بیٹی سے مانگتے ہوئے جس طرح شرمسار، محجوب اور دکھی ہو جاتا ہے، وہ دکھ مَیں نے اُس دن ابا جی کی لرزتی آواز میں محسوس کیا۔ مَیں نے ان سے کہا: آپ فکر نہ کریں۔ آپ نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے اور میرے اخراجات برداشت کیے ہیں، اب مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔'' یوں میں ہر ماہ اپنی بچت کے مطابق انہیں پانچ چھ ہزار روپے بھجوانے لگی۔ ان کی زندگی کی گاڑی قدرے ہمواری سے چل پڑی۔ میرے شوہر بہت نیک انسان ہیں۔ انہوں نے رقم بھجوانے پر بالکل اعتراض نہیں کیا۔

مَیں پاک فوج میں رہنے کے باعث شہر شہر تقرر کا لطف اٹھانے لگی۔ تاہم بچوں کے ساتھ ہماری ضروریات میں بھی دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ اچھا گھر، اچھی تعلیم، اچھی کار اور مستقبل کے لیے خطیر رقم کمانا ہمارا مقصدِ حیات بن گیا۔ کچھ رقم جمع ہونے پر ہم نے اسلام آباد اور لاہور میں اچھی جگہوں پر پلاٹ خرید لیے۔

انہی دنوں ابا جی حملۂ قلب کے سبب انتقال کر گئے۔ اس وقت ہمارے سوتیلے بھائی اتنے چھوٹے تھے کہ بڑا بیٹا صرف دس برس کا تھا۔ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ مَیں نے وہ رقم روک دی جو ابا جی کی زندگی میں انہیں بھجواتی تھی۔ شاید یہ سوچ کر کہ وعدہ تو ابا جی کے ساتھ تھا ان کے بچوں کے ساتھ تو نہیں۔ پھر یہ رقم میری محنت کی کمائی ہے۔ چھ سات ہزار کم تو نہیں ہوتے، میں

کیوں سوتیلے بہن بھائیوں پر اتنی رقم خرچ کروں؟ آخر سوتیلی ماں کے اپنے خاندان والے بھی تو ہیں، ان بچوں کے نانا، نانی، ماموں وغیرہ ہوں گے اب یہ ان کا فرض ہے کہ ان بچوں کی کفالت کریں۔ اباجی کی وفات کے بعد میری امی بڑے بیٹے کے پاس چلی گئیں تھیں۔ گویا اس گھر کی ذمہ داری کا بوجھ مجھ پر نہ رہا۔ گو اپنے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرواتے ہوئے میرے ضمیر نے جھنجھوڑا، اس ڈاک خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے قدموں نے تھمنا چاہا جہاں سے میں منی آرڈر بھجواتی تھی، لیکن یہ کہتے ہوئے اندر کی آواز کو دبا دیا کہ میں نے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا، اب اس عورت کا فرض ہے کہ اپنے بچوں کا بوجھ خود اٹھائے، کہیں چھوٹی موٹی ملازمت کر لے۔ بہر حال دوسرا مہینہ شروع ہو گیا۔ شاید قدرت نے میری نیت اور عمل کا پھل مجھے اسی وقت دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس بار بھی میرا رقم بھجوانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پہلی تاریخ کو تنخواہ ملی، تو حسب معمول چیک کاٹ کر ملازم کو دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلا آیا اور بتایا کہ میرے اکاؤنٹ میں تنخواہ جمع ہی نہیں ہوئی۔ میں دوسرے روز دفتر گئی تو معلوم ہوا کہ میں پچھلے کئی مہینوں سے کرایہ مکان کی مد میں جمع شدہ رقم سے زیادہ نکلوا چکی ہوں، اس لیے تنخواہ کئی ماہ کٹتی رہے گی۔ یہ دفتر والوں کی غلطی تھی، لیکن اس کا خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا۔

گھر لوٹی تو ایک اور بُری خبر میری منتظر تھی۔ میرے شوہر زمینوں پر گئے ہوئے تھے، وہاں ان کا کسی سے جھگڑا ہو گیا اور مخالف گروہ کا آدمی زخمی ہو گیا چوٹ اس قدر شدید تھی کہ وہ زندگی اور موت کی دہلیز پر جا پہنچا۔ مخالف گروہ والے اثر و رسوخ رکھتے تھے، انہوں نے فوجداری مقابلے کی ایف آئی آر کٹوا دی۔ پولیس وارنٹ گرفتاری لائی اور میرے شوہر کو پکڑ کر لے گئی۔

یہ خبر سن کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ شوہر کی ضمانت، مقدمہ ختم کروانے، مخالف لوگوں کے ساتھ صلح نامے اور علاج معالجے پر اچھی خاصی رقم لگ گئی۔ گاؤں میں میرے دس پندرہ دن شدید دوڑ دھوپ میں گزرے۔ آخر خدا خدا کر کے سارے مرحلے طے ہوئے۔ گھر لوٹی تو میری چھوٹی بیٹی اچانک تیز بخار میں پھنکنے لگی۔ میں خود ڈاکٹر تھی، جب تشخیص نہ کر سکی، تو اسے

فوجی ہسپتال لے جا کر ماہرِ خصوصی کو دکھایا۔ اس نے ادویہ لکھ دیں۔ مگر بچی کا بخار نہیں اترا۔ دوائیوں کے باعث بچی سوگئی۔ اگلی صبح مَیں دفتر چلی گئی، بچی کی دیکھ بھال کے لیے گھر میں ملازمہ موجود تھی۔ مَیں فون کرکے اس کی خیریت دریافت کرتی رہی۔ ڈھائی بجے کے قریب جب مَیں ڈیوٹی سے واپس لوٹی تو بچی نے ''ماما'' کہا اور میری آنکھوں کے سامنے بیہوش ہوکر گر پڑی۔ مَیں اسے کار میں لیے بھاگی بھاگی اسپتال پہنچی۔ اس لمحے بیٹی کا بخار ۱۰۴ درجہ سے بھی تجاوز کر چکا تھا۔ اسے جلدی جلدی ٹیکے لگائے گئے اور سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی گئیں۔ کچھ بخار اترا لیکن شام کو پھر چڑھ گیا۔ مزید برآں اسے تشنج کے دورے بھی پڑنے لگے۔ میرے خدا ہم سے ایسی کون سی خطا ہوگئی کہ ہمیں چاروں طرف سے غم کی آندھی نے گھیر لیا ہے؟ مَیں نماز پڑھ کر روتے روتے اونچی آواز سے دعا مانگتے ہوئے اللہ سے پوچھنے لگی، اس ذاتِ کریم سے شکوہ کناں ہوگئی۔ تب ہی ذہن میں ایک خیال دھماکے کی طرح گونجا اور میری روح تک زخموں سے چور ہوگئی۔

مَیں مجرم تھی، اپنے والد صاحب کی مجرم اور اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کی مجرم۔ والد صاحب سے کیا ہوا وعدہ ایفا نہیں کیا اور سوتیلے بہن بھائیوں کو مشکل وقت میں تنہا چھوڑ دیا۔ اللہ جانے وہ بچے بھوک کے مارے کیسے بلکتے ہوں گے؟ وہ عورت ان کے کھانے پینے کا خرچہ کیسے پورا کرتی ہوگی؟ اللہ کی پکڑ کے احساس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ مَیں معافی کے لیے اللہ کے حضور میں جھک گئی۔ مَیں نے یتیم بچوں کے صرف چھ سات ہزار روپے روکے تھے اور میرے چھ سات لاکھ روپے لگ گئے۔ میری بیٹی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوگئی اور میرے شوہر پھانسی چڑھتے چڑھتے بچے۔ اگر وہ آدمی مرجاتا تو سیدھا قتل کا مقدمہ بن جاتا۔ ایک کے بعد دوسرے دکھ اور آزمائش نے میرے اوسان خطا کر دیے تھے۔

اگلی صبح مَیں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کو رقم بھجوائی بلکہ پچھلے ماہ کا بھی حساب کر کے چودہ ہزار روپے بھجوا دیے۔ چند دن بعد دفتر سے اطلاع آئی کہ آپ کی تنخواہ بحال کر دی گئی ہے، اب یہ رقم تنخواہ میں سے آہستہ آہستہ کاٹی جائے گی۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ

نے میری بیٹی کو شفایاب کر دیا تھا۔ الحمدللہ دوبارہ اسے تشنج کے دورے بھی نہیں پڑے۔ میرے شوہر کے ساتھ مخالف کی صلح بھی پائیدار ہو چکی ہے۔

آج مَیں جو کچھ بھی کماتی ہوں، اس میں میرے سوتیلے بہن بھائیوں کے علاوہ ناداروں، غریبوں اور ضرورت مندوں کا بھی حصہ ہے۔ اللہ کے فضل سے میری کمائی میں بہت برکت ہے۔ مَیں سوچتی ہوں کہ یہ برکت، یہ فضل، یہ کرم، یہ دولت کی ریل پیل صرف اسی وجہ سے ہے کہ مَیں اللہ کے بندوں پر بھی خرچ کر رہی ہوں۔ میرے سوتیلے بہن بھائی بہت اچھے ہیں، سوتیلی والدہ بھی بہت باہمت خاتون ہیں، مَیں زندگی کے ہر مرحلے پر ان کی مدد کرتی رہوں گی، ویسے ہی جیسے ایک سگا باپ بچوں کی کرتا ہے۔ ابا جی یہ ذمے داری میرے سپرد کر گئے تھے اور یہ ذمے داری نبھانے ہی میں میری نجات اور میری ساری خوشیاں پوشیدہ ہیں۔ (بشکریہ: اردو ڈائجسٹ)

......❀❀❀......

(۷)

خدا کی لاٹھی

ذیل کی کہانی ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' کے شمارہ مارچ ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی تھی اور بہت سے واقعات کی روشنی میں گمان یہ ہے کہ یہ سو فیصد سچا واقعہ ہے۔ اسے محترمہ شاہدہ ناز قاضی نے تحریر فرمایا ہے۔ ان کے شکریے کے ساتھ شاملِ کتاب کر رہا ہوں۔

بس بہاولنگر سے چل پڑی تھی اور خراب راستے پر لڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھی۔ دیہاتی، بھیڑ بکریوں کے ساتھ ٹھنسے ہوئے تھے۔ عورتوں نے بڑی بڑی چادروں کی بکلیں مار رکھی تھیں۔ نیم برہنہ بچے روئے جا رہے تھے۔

اکتوبر کا مہینہ تھا اس لیے موسم خاصا خوشگوار تھا...... میں اپنی زمینوں سے واپس آ رہا تھا...... کچھ دور چل کر کنڈکٹر نے مجھے آواز دی: ''بابو جی! یہ سیٹ خالی ہے آپ اِدھر آ جائیں'' اور مَیں بکریوں، گٹھڑیوں اور انسانوں کے درمیان سے راستہ بناتا وہاں جا پہنچا۔ مجھ سے اگلی سیٹ پر ایک بُوڑھا اور دو جوان لڑکے بیٹھے تھے...... بابا کی عمر پچاس پچپن کے قریب ہوگی۔ سفید دھوتی، سفید کُرتا اور سر پر بڑا سا پگڑ۔ سفید داڑھی نے اُسے بہت باوقار بنا دیا تھا۔ اُس کے ساتھ بیٹھے دونوں لڑکے ماحول سے بے خبر باتوں میں مگن تھے۔ وہ بہت اونچی آواز میں کوئی واقعہ ایک دوسرے کو سُنا رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔

جب بھی میری نظریں سامنے کی جانب اُٹھتیں مَیں نے بابا کو کھڑکی کے دُھندلے شیشے سے باہر ہی جھانکتے پایا۔

اچانک بس ایک سٹاپ پر رُکی اور وہ دونوں شریر اور باتونی لڑکے اُتر گئے...... اور کچھ

دوسرے لوگ جو کھڑے تھے وہ آ کر اس سیٹ پر براجمان ہو گئے...... کنڈکٹر ٹکٹ تقسیم کرنے آ گیا تھا اور سب کو ٹکٹ کاٹ کر دینے لگا...... بابا نے بھی ٹکٹ لیا...... اور اُسی وقت بابا کے ساتھ بیٹھے شخص نے اپنی جیبوں پر ہاتھ مار کر کہا: ''ہائے میرے پیسے...... ہائے میں لُٹ گیا۔ بس روکو...... میری جیب کٹ گئی ہے۔ کسی نے میری جیب سے پانچ سو روپے نکال لیے!''

''بھائی جی اپنے پاس ہی دیکھو۔ غلط فہمی تو نہیں ہو گئی!''

''مَیں...... مَیں غلطی کروں...... جس کا پیسہ نکل گیا وہ غلطی نہیں کر سکتا...... مَیں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں...... ابھی ابھی تھوڑی دیر پہلے میری جیب میں رقم تھی...... اَب ٹکٹ لینے لگا ہوں، تو جیب بالکل خالی......!'' وہ بہت اُونچی آواز میں بول رہا تھا۔

''کسی تھانے کے آگے بس روکو جی! پولیس والے خود تلاشی لے لیں گے۔ کوئی نہ اُترے بس سے...... چلو اُستاد!''

''مَیں تو اس گاؤں میں اُتروں گا''۔ بس میں سے کوئی منمنایا۔

''ہرگز نہیں اگلے اڈے تک سب کو جانا پڑے گا!'' کنڈکٹر نے فیصلہ سُنا دیا۔

''پُورے پانچ سو تھے۔ سو سو کے پانچ نوٹ!'' وہ شخص بول رہا تھا۔

بس میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ کنڈکٹر نے سب کھڑکیاں بند کروا دی تھیں...... لوگ اپنی اپنی جیبیں ٹٹول رہے تھے کہ کہیں وہ بھی کسی جیب تراش کا شکار نہ ہو گئے ہوں: نامعلوم چور کو صلواتیں سُنا رہے تھے...... ہر شخص دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''ابھی پتا چل جائے گا جی، کس نے میرے نوٹ نکالے ہیں، میرے نوٹوں کے کونوں پر نیلی سیاہی کا نشان ہے۔ ابھی پتا چل جائے گا......! چور بچ کے کدھر جائے گا۔''

''مل جائے تو سو جوتے لگاؤ چور کو!''

''ہو سکتا ہے جس نے جیب کاٹی ہو وہ پچھلے اسٹاپ پر ہی اُتر گیا ہو!''

''نہیں جی! ابھی تھے میرے پاس...... جب اسٹاپ سے بس چلی ہے تو مَیں نے ٹکٹ کے

لیے خود دو روپے اُوپر والی جیب میں رکھے تھے!''

''بابو جی آپ فکر نہ کریں...... چور بچ کے نہیں جا سکتا!''

وہ شخص جس کے روپے چوری ہوئے تھے۔ اپنے حلیے سے کسی دفتر کا کلرک معلوم ہوتا تھا...... کاٹن کی بوشرٹ اور معمولی کپڑے کی پینٹ، اُس کی عمر تیس پینتیس سال کے قریب ہوگی۔ ایسے محنت کش اور سفید پوش طبقے کے فرد کے پانچ سو رُوپے گم ہو جانے کا مطلب تو ایک ماہ کی تنخواہ کا صفایا ہوتا ہے...... شاید یہ اُس کی تنخواہ ہوگی...... بے چارہ! مَیں نے افسوس کے انداز میں سوچا۔

ذرا دیر بعد بس تھانے کے آگے رُک گئی...... ڈرائیور اُتر کر تھانے میں چلا گیا...... سب لوگ ایک عجیب سا سسپنس لیے شیشوں سے جھانک رہے تھے۔

ڈرائیور تھانے سے برآمد ہُوا، تو اُس کے ساتھ دو سپاہی اور تھانے دار صاحب تھے...... کنڈکٹر دروازے کی چٹخنی لگائے بڑے محتاط طریقے سے کھڑا تھا۔ پولیس والے آگئے، تو سواریوں کو ایک ایک کر کے اُتارا گیا...... ہر شخص کی اچھی طرح تلاشی لی گئی۔ دو سپاہی بس کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے...... اور وہ شخص جس کے پیسے چوری ہوئے تھے سپاہیوں کے ساتھ کھڑا اُنہیں اِس حادثے کی رُوداد سُنا رہا تھا۔

عورتوں نے اپنی تلاشی لینے پر احتجاج کیا تھا۔ اس لیے تھانیدار نے فیصلہ کیا پہلے مردوں کی تلاشی لی جائے اور پھر ایک عورت سب عورتوں کی تلاشی لے! سامان بھی چیک ہوگا اور پوُری بس بھی۔ مبادا کسی نے روپے بس میں اِدھر اُدھر پھینک دیے ہوں!

ایک ایک کر کے مرد اُتر رہے تھے اور تلاشی دے رہے تھے جب میری باری آئی تو سپاہی نے مجھے پہچان لیا، کیونکہ میرا تعلق بھی پولیس ہی کے ایک شعبے سے ہے۔ تھانے دار بولا! ''ہمیں آپ پر تو شک ہو ہی نہیں سکتا!''

مَیں نے اُس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اُس کی تسلی کے لیے تلاشی بلاتفریق ہونی چاہیے!'' چنانچہ مجھے بھی ٹٹولا گیا۔ میرے بعد وہ بابا جی اُترے اور ان کی تلاشی شروع ہوتے

ہی شور اُٹھا۔ ''یہ...... یہ رہے میرے پیسے!''

سپاہی نے بابا کو گریبان سے پکڑ کر اُس کے منہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا ''او بڈھے تجھے شرم نہ آئی جیب کاٹتے، شکل مومنوں کی اور کرتوت شیطانوں کے''۔

''ہائے میں مَر جاں اِس بڈھے خبیث نے رقم نکالی تھی!'' ایک خاتون نے افسوس کیا۔

''خدا کی قسم یہ روپے میرے ہیں۔ مَیں نے آج ہی بکر منڈی میں بکریاں بیچیں تو یہ رقم ملی ہے''۔

''بکواس کر رہا ہے فراڈیا!''

''اوئے بڈھے چٹی داڑھی ہی کی لاج رکھنی تھی!'' سپاہی نے بابا کو جھنجھوڑ کر ڈانٹا۔ اُس کی پگڑی کُھل کر پیروں میں آ رہی تھی۔

اِدھر اُدھر سے بھی کافی لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور وہ سب اپنی اپنی بولی اور اپنے اپنے لہجے میں بُوڑھے کو لعن طعن کر رہے تھے۔

''دیکھیں جی یقین نہیں آتا کہ یہ بُوڑھا جیب کترا بھی ہو سکتا ہے''۔

''مومنوں جیسی شکلوں والے ہی تو دھوکہ دیتے ہیں جی!''

''دیتے ہیں دھوکہ یہ بازی گر کُھلا''...... کسی نے گرہ لگائی......

''توبہ توبہ پیر قبر میں اور یہ حرکتیں......!''

بابا کی پگڑی زمین پر گھسٹ رہی تھی...... اتنی ذلت اور اتنی رُسوائی کاش لوگ بُرے کام ہی نہ کیا کریں۔ مَیں سوچ رہا تھا۔ بابا نے اگر بڑھاپے میں اتنی صفائی سے جیب کاٹی ہے، تو جوانی میں کیا عالم ہوگا: ہو سکتا ہے وہ اپنے پیشے کا اُستاد ہو۔

ہر شخص کو بابا کے چور ہونے کا یقین تھا، لیکن اُسے اَب بھی اصرار تھا...... کہ وہ روپے اُسی کے ہیں۔ اُس کے زرد چہرے پر بے بسی چھا رہی تھی۔

تھانے دار نے بٹوہ چھین کر رقم اُس کے اصل مالک کو لوٹا دی، اُس آدمی نے تھانے دار،

سپاہیوں اور کنڈکٹر کا شکریہ ادا کیا اور پانچ پانچ کے دو نوٹ سپاہی کی طرف بڑھا دیے۔ ''حوالدار جی! چائے پانی کے لیے!''

دوسرا سپاہی بابا کو بے دردی سے دھکیلتا ہُوا تھانے کی طرف لے چلا۔ اُس نے اپنی شہادت کی اُنگلی اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور بے چارگی سے پکارا:

''یااللہ...... تو اِنصاف کر......!''

''چل چل...... ڈرامے نہ کر بڈھے! اندر چل تیرا پچھلا ریکارڈ بھی دیکھیں گے!''

وہ شخص جس کے روپے چوری ہوئے تھے۔ تانگے پر جا بیٹھا تانگہ چل پڑا۔ سب مطمئن تھے کہ حق دار کو اُس کا حق مل گیا، لیکن تانگہ ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ مخالف سمت سے آتے ہوئے ایک تیز رفتار تانگے سے اس زور سے ٹکرایا کہ سواریاں اُچھل کر اِدھر اُدھر بکھر گئیں۔ چیخ و پکار کا شور اُٹھا اور سب کی نظریں اُس کی طرف اُٹھ گئیں۔ یہ حادثہ ایسا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سب منہ پھاڑے دیکھتے رہ گئے۔

وہ آدمی جو ابھی ابھی روپے لے کر مسرور و شاداں تانگے میں سوار ہُوا تھا بُری طرح چیخ رہا تھا۔ دوسرے تانگے کا بانس اُس کے سینے میں کھُب گیا تھا۔ خون اُس کے سینے سے اُبل کر اُس کے کپڑوں پر پھیل رہا تھا۔ مَیں دوڑ کر اُس کے پاس پہنچا تو اُس نے ڈوبتی لڑکھڑاتی آواز میں کہا:

''باباجی کو بُلاؤ:''

لوگ بابا کو لینے تھانے کی طرف دوڑ پڑے اور ذرا دیر بعد ہی اُسے لے آئے۔ زخمی نے اُسے دیکھا تو خُون تھوک کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا...... ''باباجی۔ مَیں سب کے سامنے آپ سے معافی مانگتا ہوں''۔ مجھے معاف کر دو! یہ پیسے آپ کے ہی تھے...... مَیں نے بڑا گناہ کیا کہ آپ پر یہ الزام لگایا، جب آپ نے ٹکٹ لینے کے لیے بٹوہ کھولا تو مَیں نے نوٹ گن لیے تھے اور ان پر نشان بھی دیکھ لیے تھے''۔

بابا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موتی ٹوٹے...... اور اُس شخص کی گردن ایک طرف

لُڑھک گئی۔

خدا کی بے آواز لاٹھی اتنی جلد کرشمہ دکھاتی ہے، مجھے یقین نہ آرہا تھا، لیکن چند لمحوں میں جو واقعات رونما ہوئے تھے اُن کی سچائی سے انکار ممکن نہ تھا۔

یہ واقعہ عبرت کا سامان بن کر دل پر ثبت ہوگیا۔ آج بھی مجھے اُس شخص کی چالاکی، بابا کی سادہ لوحی اور خدا کا انصاف یاد آتا ہے تو نگاہیں بے اختیار آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہیں اور دل اطمینان سے لبریز ہو جاتا ہے کہ کمزور شخص بھی بے سہارا نہیں ہے۔

(۸)

ڈاکٹر جُمعہ اَور ڈاکٹر شبّیر کا عبرت ناک انجام

''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے کراچی کے ڈاکٹر جُمعہ کا ذکر مختلف محفلوں میں اس تواتر سے سُنا کہ مجھے اس کی ثقاہت پر یقین آ گیا، لیکن کوئی ٹھوس شہادت سامنے نہیں آ رہی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ ''نوائے وقت'' کے سنڈے میگزین (۱۹رجولائی ۲۰۰۹ء) میں فلوریڈا، امریکہ میں مقیم ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی نے اپنے کالم میں اس جانب اشارہ کیا۔ اُنہوں نے لکھا کہ لیاقت میڈیکل کالج جامشورو، حیدرآباد سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد انہیں ۱۹۶۸ء میں جناح ہسپتال کراچی میں ڈاکٹر جُمعہ کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل ہُوا۔ ڈاکٹر جُمعہ اس زمانے میں کراچی ہی میں نہیں بلکہ پاکستان بھر میں واحد نیوروسرجن تھے۔ وہ دماغی امراض اَور حادثات کے بے حد ماہر اَور لائق سرجن تھے اَور بقول ڈاکٹر شبیر احمد ''وقت لینے کے لیے لوگ اِن کے پاؤں پڑا کرتے تھے (چنانچہ) اُن کی مہارت، تجربے اَور اہمیت نے انہیں سخت مزاج بنا دیا تھا۔ (لیکن) پھر ایک روز خدا کا کرنا یہ ہُوا کہ اُن کا اپنا فرزند موٹر سائیکل کے حادثے میں سخت زخمی ہو گیا۔ اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی اَور وہ بے ہوش تھا۔ سخت دماغ باپ نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنے بیٹے کی سرجری شروع کی، لیکن وہ اس کی جان نہ بچا سکے''۔

ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی چونکہ ڈاکٹر جُمعہ کے ایک نومشق معاون یا شاگرد تھے، اس لیے اُنہوں نے موصوف کے بارے میں خاصا نرم اَور رعایتی انداز اختیار کیا، ورنہ زبان زدِ خاص و عام جو بات ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر جُمعہ انتہائی سفاک، بداخلاق اَور بے رحم سرجن تھا۔ وہ پیسے کا پجاری تھا اَور انسانی اخلاقیات سے قطعی عاری تھا۔ سنا یہ ہے کہ وہ اپریشن کے لیے مریض کی کھوپڑی کھول کر پھر

مریض کے لواحقین سے سودے بازی کرتا تھا اُور زیادہ سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرتا تھا جو اس نازک موقع پر متعلقہ لوگوں کو دینی پڑتی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک رات ایک خدا ترس آدمی نے سڑک پر ایک نوجوان کو بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا۔ اُس کی موٹر سائیکل پاس گری ہوئی تھی۔ اس شخص نے اس نوجوان کو اپنی گاڑی میں ڈالا اُور ڈاکٹر جُمعہ کے کلینک پر لے گیا اُور ڈاکٹر صاحب سے مل کر اُس نے بتایا کہ مَیں نے ایک خوبصورت نوجوان کو سڑک پر بے ہوش پڑے ہوئے دیکھا، کوئی گاڑی والا اُس کی موٹر سائیکل کو ٹکر مار کر چلا گیا تھا۔ مَیں اُسے اٹھا کر آپ کے پاس لے آیا ہُوں، براہِ کرم اُسے جلد دیکھیے، ہوسکتا ہے، آپ کی کوشش سے اس کی جان بچ جائے۔

لیکن ڈاکٹر جمعہ نے حسبِ عادت کمال بے نیازی سے کہا: صاحب میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ مَیں ایسے ہی مریضوں کو بے مقصد دیکھتا رہوں...... مَیں پچاس ہزار روپے فیس لوں گا، نہیں ہے تو جایئے، اُسے کسی دوسرے ہسپتال میں لے جایئے۔

اس شخص نے بڑی آزردگی سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، اتنی بڑی رقم تو مَیں نہیں دے سکتا، یہ لڑکا میرا عزیز نہیں ہے، مَیں تو محض انسانی ہمدردی کے تحت اُسے آپ کے پاس لایا ہوں، آپ اُسے دیکھ تو لیں۔

لیکن ڈاکٹر جُمعہ نے انکار کر دیا کہ مَیں مریض کو نہیں دیکھ سکتا، پہلے رقم طے کیجیے اُور ادائیگی کیجیے، پھر مَیں مریض کو دیکھوں گا۔

اس خدا ترس آدمی نے بالآخر ڈاکٹر جُمعہ سے وعدہ کرلیا کہ وہ چالیس ہزار روپے (۶۹ـ۱۹۶۸ میں) ادا کر دے گا، تب ڈاکٹر اپنے دفتر سے باہر نکلا اُور لاؤنج میں سٹریچر پر خون میں لت پت بے ہوش نوجوان کو دیکھا تو اُس کی چیخیں نکل گئیں، اُس نے بُری طرح سر پیٹ لیا۔ یہ نوجوان اُس کا اپنا ہی لختِ جگر...... اکلوتا بیٹا...... تھا۔ بہ ہر حال اپنے نوجوان بیٹے کا ڈاکٹر نے بہتے آنسوؤں اُور لرزتی انگلیوں کے ساتھ آپریشن کیا، لیکن وہ جانبر نہ ہوسکا اُور اُس کی نظروں کے

سامنے، اُس کے ہاتھوں میں دم توڑ گیا۔

اس طرح اللہ کی بے نیازی نے ایک سفاک، بے رحم اَور زر پرست ڈاکٹر کو اس کی زندگی ہی میں نقد اَور کڑی سزا دے دی۔

درست فرمایا مولانا ظفر علی خاں نے

نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی
ڈر اُس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اُس کا

☆☆☆

اپنے اسی مضمون میں ڈاکٹر شبیر احمد صاحب نے امریکہ میں مقیم ایک اَور نیوروسرجن کا ذکر کیا ہے جو وہاں جا کر دولت اَور عورت کے چکر میں اس بُری طرح گرفتار ہوا کہ اپنی زبان، تہذیب اَور مذہب سب کچھ بھول گیا اَور بڑے ہی دردناک انجام سے دوچار ہُوا۔

ڈاکٹر شبیر احمد لکھتے ہیں کہ منیر عباسی لیاقت میڈیکل کالج میں ان کا کلاس فیلو تھا۔ یہ ۱۹۶۳ء میں حیدرآباد بورڈ میں اوّل آیا تھا اَور بہت ذہین اَور لائق نوجوان تھا۔

منیر عباسی نے ایم بی بی ایس سے فارغ ہو کر نیورو سرجری میں تخصص (Specialisation) کیا اَور پھر امریکہ چلا گیا۔ وہاں اس نے نیوروسرجری میں کمال حاصل کیا اَور بڑی شہرت اَور دولت پائی۔ اُس نے میساچوسٹس میں ایک محل نما مکان خرید لیا۔ بقول ڈاکٹر شبیر احمد ''منیر اپنا ذاتی ہوائی جہاز اُڑا کر امریکہ بھر میں نیوروسرجری کرتا۔ دماغ کے مشکل ترین آپریشن کرنا اُس کا خاص شوق تھا۔ دماغی امراض، فالج، کینسر، جمے ہوئے خون وغیرہ کے آپریشن کے معاملات میں اس نے بلند مقام حاصل کیا۔ یہاں تک کہ اُس نے سپرمین کرسٹوفر ریوز کا بھی معائنہ کیا تھا''۔ ڈاکٹر شبیر احمد کے بقول منیر عباسی کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ وہ امریکہ کے سابق

صدر جان ایف کینیڈی کے بیٹے جان ایف کینیڈی جونیئر کا قریبی دوست بن گیا۔

لیکن ڈاکٹر شبیر احمد صاحب کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر منیر عباسی اس دولت وحشمت کے نتیجے میں بہک گیا، وہ دولت اور عورت کا رسیا ہو گیا۔ اُس نے یکے بعد دیگرے تین امریکی لڑکیوں سے شادیاں کیں اور تینوں کو طلاق دے دی اور قانونی جھگڑوں نے اُس کی دولت کا بیشتر حصہ غارت کر دیا حتیٰ کہ اُسے اپنا شاندار گھر اور ہوائی جہاز فروخت کرنا پڑے اور وہ ایک اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ڈاکٹر شبیر احمد کے بقول اس کی ذہانت زندگی کی تعمیر میں کچھ کام نہ آ سکی۔ غلط فیصلوں نے اُسے پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ وہ کسی معاملے پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کے قابل نہ رہا۔

ڈاکٹر شبیر احمد لکھتے ہیں: ۲۹ر جولائی ۲۰۰۱ء کو شام پانچ بجے وہ ایک آپریشن کر کے (کرائے کے) ایک جہاز پر واپس میساچوسٹس آ رہا تھا۔ اس نے جہاز رن وے پر اُتار لیا تھا، لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا ہوا ہوائی جہاز بے قابو ہو گیا اور ایئر پورٹ کی عمارت سے جا ٹکرایا۔ دماغ کے ماہر سرجن کو دماغ پر چوٹ لگی اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔

کاش ذہین اور لائق لوگ اپنے انجام کا بھی کچھ خیال کر لیا کریں۔

(۹)

اُس نے ظلم پر کمر ہی باندھ لی تھی

رانا آصف ڈسکہ کا ایک معروف وکیل تھا، لیکن وکالت سے زیادہ اُس کی شہرت ایک قبضہ گروپ کی تھی۔ وہ اس جستجو میں رہتا تھا کہ کونسے رہائشی یا کمرشل پلاٹ کا مالک خاندانی یا مالی اعتبار سے کمزور ہے یا اُس کی ملکیت کے معاملے میں کہیں جھول ہے۔ جونہی اُسے اس کا سراغ ملتا، وہ محکمہ مال کے متعلقہ اہلکاروں سے مل کر اپنے نام کے کاغذات تیار کراتا اور پھر جبراً اُس پر قبضہ کر لیتا۔

محمد خاں چیمہ موترہ اڈہ (گوئنکی سیالکوٹ روڈ) سے تعلق رکھتے تھے۔ نیم خواندہ آدمی تھے، لیکن دینِ حق کے لئے گہری محبت اَور قلبی وابستگی رکھتے تھے۔ شاید جماعتِ اسلامی کے رکن بھی تھے، اُن کے اخلاص اَور دین کے ساتھ اُن کی گرمجوشی کا مَیں خود عینی شاہد ہوں۔ وہ ایک فقیر منش آدمی تھے، اُنہیں نہ اپنے لباس کی پروا تھی، نہ جوتے، نہ خوراک کی......بس ہمہ وقت ایک ہی فکر تھی کہ وہ مولانا مودودیؒ کی نئی اَور پرانی کتابیں خریدتے اَور ڈسکہ کے اساتذہ، طلبہ اَور وکلاء میں تقسیم کرتے رہتے۔

محمد خاں چیمہ کی موترہ اڈہ پر عین سیالکوٹ روڈ کے کنارے پانچ ایکڑ زمین تھی۔ چار کنال میں تو اُنہوں نے ایک دینی مدرسہ بنوادیا اَور باقی پر رانا آصف کی نظریں جم گئیں۔ محمد خاں چیمہ صاحب تبلیغی مہمات کے سلسلے میں ڈسکہ کچہری میں بھی جاتے رہتے اَور وکلاء سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ آصف رانا کو جب پتہ چلا کہ چیمہ صاحب کی ملکیت میں ساڑھے چار ایکڑ بے حد قیمتی کمرشل زمین ہے، تو اس نے اس پر قبضہ کرنے کی ٹھان لی، چنانچہ جب بھی محمد خاں چیمہ کچہری

آتے تو رانا آصف اُن کی خوب پذیرائی کرتا، خوب تواضع کرتا اَور جماعتِ اسلامی اَور مولانا مودودی کی تعریفوں کے پل باندھ دیتا......اس طرح اُس نے محمد خاں چیمہ کے دل میں گھر کرلیا اَور رفتہ رفتہ انہیں قائل کرلیا کہ وہ چار ایکڑ زمین رانا آصف کو دے دیں اَور اس کے بدلے میں وہ انہیں ایک قریبی گاؤں میں بیس ایکڑ زرعی زمین دے دے گا۔

مخلص مسلمان سادہ دل تو ہوتا ہی ہے، چنانچہ محمد خاں چیمہ صاحب اپنی سادہ لوحی اَور بے خبری کی وجہ سے اُس کی باتوں میں آگئے اَور اُنہوں نے زمین کا تبادلہ کرلیا۔ یہ زمین بنجر تھی اَور ایک دورافتادہ گاؤں میں دلدلی علاقے کے قریب واقع تھی۔ رانا آصف نے اُن کے ساتھ صریحاً دھوکا دہی کی واردات کرڈالی تھی۔

رانا آصف نے موترہ اڈہ والی بے حد قیمتی زمین قانونی طور پر قبضہ میں لے کر جلد ہی سیالکوٹ کے ایک صنعت کار کے ہاتھ چار کروڑ میں بیچ دی۔ رجسٹری ہوگئی، رانا نے قیمت وصول کرلی، لیکن وہ صنعت کار سخت پریشانی میں مبتلا ہوگیا جب چند ہی روز کے بعد رانا آصف کے بیٹے نے زمین کی خریداری کے خلاف حقِ شفع کا مقدمہ دائر کردیا۔ رانا آصف کا بیٹا بھی وکیل تھا اَور اپنے باپ کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔

متعلقہ صنعت کار رانا آصف سے ملا اَور شکایت کی کہ جب کہیں بھی کوئی شک کا پہلو موجود نہ تھا اَور ہر چیز شفاف تھی، تو اس کے بیٹے نے شفع کا مقدمہ کیوں دائر کردیا ہے۔ رانا آصف نے کمال ڈھٹائی سے جواب دیا ''دراصل میرا بیٹا پجارو مانگتا ہے، اُسے پجارو لے کردے دیجیے، وہ مقدمہ واپس لے لے گا''۔ چنانچہ مذکورہ صنعت کار کو مجبور ہوکر چالیس لاکھ روپے خرچ کرکے ایک نئے ماڈل کی زیرو میٹر پجارو رانا آصف کے حوالے کرنی پڑی۔ اس فتحِ مبین پر دونوں باپ بیٹا خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے۔

غیر معمولی دولت کے بے پناہ نشے میں سرشار ہوکر رانا آصف نے سمبڑیال روڈ ڈسکہ پر دو کنال میں شاندار کوٹھی تعمیر کرائی اَور اُس میں منتقل ہوگیا۔ اُس کی کوٹھی کے عقب میں ایک غریب

بیوہ کا پانچ مرلے کا پلاٹ تھا۔ رانا نے سرکاری اہلکاروں سے مل کر اُس کی ملکیت کے کاغذات تیار کرائے اُور بڑی ہی آسانی سے اُس پر قبضہ کرلیا اُور اُس پر چار دیواری کر کے وہاں موبائل فونز کے دو ٹاور تعمیر کرا دیئے جن کا کرایہ اُسے چالیس ہزار روپے ماہانہ وصول ہونے لگا۔

کہا جاتا ہے کہ جب رانا آصف نے غریب بیوہ عورت کے پلاٹ پر زبردستی قبضہ کیا، تو اس عورت نے بہت واویلا کیا اُور اپنا دوپٹہ پھیلا کر بددعا دی کہ اللہ کرے اس پلاٹ میں تمہارے بیٹے کی قبر بنے۔

انہی دنوں کی بات ہے کہ رانا آصف نے جی ٹی روڈ پر کامونکے سے ذرا آگے ایک سی این جی سٹیشن کے قریب ایک پلاٹ کا سودا کیا اُور وہاں سی این جی سٹیشن بنانے کا پروگرام بنالیا۔ پڑوس کے سی این جی اسٹیشن کے مالکان نے اس کا بُرا منایا اُور رانا آصف کو وارننگ دی کہ وہاں سی این جی اسٹیشن نہ بنائے، ورنہ اس کا انجام اچھا نہیں ہوگا، لیکن رانا نے اُن کی دھمکی کو چنداں اہمیت نہ دی اُور اپنے پروگرام پر عمل کرتا رہا...... تا آنکہ تقریباً ایک سال پہلے اُس کا اکلوتا بیٹا اپنی پجارو میں سمبڑیال جا رہا تھا جب کسی دشمن نے اس پر نہراپر چناب کے قریب اندھا دھند فائرنگ کردی اور پجارو کے اندر ہی اُسے گولیوں سے چھلنی کردیا اُور مظلوم بیوہ عورت کی بددعا انتہائی دردناک صورت میں اس طرح پوری ہوئی کہ رانا آصف کی بیوی کے اصرار پر ان کے اکلوتے بیٹے کی قبر اسی پلاٹ میں ٹاوروں کے نیچے تیار ہوئی۔

رانا آصف اس قدر شقی القلب اُور بے حس تھا کہ اکلوتے بیٹے کی انتہائی ہولناک موت کے بعد بھی اُس نے صورتِ حال سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔ وہ سوگ کے دنوں میں بھی بے تکلف دوستوں کے ساتھ چہلیں کرتا رہتا اُور لطیفے سنتا اُور سناتا رہتا تھا۔ نرمی، گداز اُور خوفِ خدا گویا اُس کی سرشت ہی میں نہ تھے۔

اُور اکتوبر 2009ء کی بات ہے۔ وہ زمین کے مقدمے ہی کے سلسلے میں حافظ آباد گیا تھا، اس نے اپنی پجارو میں سفر کیا تھا اُور دو گارڈ اُس کے ساتھ تھے۔ وہ حافظ آباد کے بار روم میں

براجمان تھا، اس کے دونوں گارڈ باہر بیٹھے ہوئے تھے اُور وہ بے فکری کے ساتھ دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا تھا کہ اچانک ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ سیدھا رانا آصف کے پاس گیا اُور اس کی کنپٹی پر گولی مار کر چشم زدن میں باہر بھاگ گیا۔ گارڈ اندر آئے، تو رانا خون میں لت پت تڑپ رہا تھا فوراً ہی اُس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

مزید خوفزدہ کر دینے والی بات یہ ہے کہ رانا کی بیوی کی خواہش پر اُس کی قبر بھی بیوہ عورت والے پلاٹ میں بیٹے کے پہلو میں بنائی گئی...... مظلوم عورت نے ایک قبر کے لئے بددعا کی تھی، اللہ کے غضب نے باپ کو بھی وہیں گاڑھ دیا اور ایک کی بجائے دو قبریں بنا دیں۔ قرآن پاک کا فیصلہ کس قدر اٹل ہے اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْد۔ بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ اُور رانا آصف کا انجام اس کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

(۱۰)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۲۷-۵-۱۹۸۹

آج پروفیسر ظفر حجازی صاحب کی معیّت میں پروفیسر فروغ احمد صاحب[۱] سے ملاقات کی۔ موصوف خاصے کمزور ہو گئے ہیں۔

اُنہوں نے بتایا کہ بنگال کے قاضی نذر الاسلام نے کبھی پاکستان کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اُس نے ساری زندگی کلکتہ میں بسر کی اَور بنگلہ دیش بننے کے بعد ڈھاکا آیا تھا اَور وہیں فوت ہُوا۔

پروفیسر صاحب (جو قیامِ پاکستان کے وقت بہار سے ہجرت کر کے ڈھاکا چلے گئے تھے اَور ۱۹۷۱ء تک وہیں مقیم رہے تھے) نے ایک عجیب بات سنائی۔ فرمایا کہ نذر الاسلام برطانوی فوج میں میجر تھا۔ اُس نے ایک نظم لکھی جس میں یہ بکواس کی کہ اگر خدا مجھے کہیں مل جائے تو میں اُس کے سینے پر بیٹھ کر اس سے پوچھوں گا کہ تو نے یہ دنیا کیوں بنائی تھی جس میں ظلم اَور بھوک کے سوا اَور کچھ نہیں۔

پروفیسر صاحب نے بتایا کہ یہ نظم لکھنے کے فوراً بعد نذر الاسلام گونگا ہو گیا اَور بولنے کے قابل نہ رہا۔ اب اُس کی زبان سے آوازیں تو نکلتی تھیں، مگر وہ بے معنی اَور نا قابلِ فہم ہوتی تھیں...... بقیہ ساری زندگی اس کی اسی حالت میں گزری۔

۱؎ معروف شاعر، محقق اَور نقاد، قائداعظم کالج ڈھاکا میں اُردو کے پروفیسر تھے۔

(۱۱)

مائیکل جیکسن

''دنیائے موسیقی کا دیوتا، ارب پتی موسیقار...... ۱۹۷۸ء میں جبکہ اس کی عمر ۱۹ سال تھی، اُس کا پہلا سولو البم ''آف دی وال'' لانچ ہوا تو اس کی ایک کروڑ کاپیاں فوراً ہی فروخت ہو گئیں اور مائیکل جیکسن کو بے پناہ شہرت اُور دولت حاصل ہوئی۔

اس زمانے میں ایک نجومی نے اُسے بتایا کہ وہ ستر سال تک زندہ رہے گا تو وہ بڑا برہم ہُوا اُور کہنے لگا ''مَیں تمہیں ڈیڑھ سو سال تک زندہ رہ کر دکھاؤں گا۔'' اُور پھر اس نے راک، فنک اُور سول میوزک میں کمال حاصل کرلیا۔ اُسے شہنشاہِ موسیقی، کنگ آف میوزک کہا جانے لگا اور ۱۹۸۲ء میں اُس کا دوسرا البم ''تھرلر'' ریلیز ہوا تو اس نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے اُور ایک ماہ میں اس کی ساڑھے چھ کروڑ کاپیاں فروخت ہو گئیں تو مائیکل جیکسن میں غرور اُور دیر تک زندہ رہنے کی ہوس پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔

وہ آبائی طور پر سیاہ فام تھا، مگر اُس نے ''گورا'' بننے کے لیے پلاسٹک سرجری اُور سکن بلیچنگ شروع کرادی۔ امریکہ اُور یورپ کے ۵۵ چوٹی کے پلاسٹک سرجنز کی خدمات حاصل کیں حتیٰ کہ ۱۹۸۷ء تک اُس کی ساری شکل وصورت، جلد، نقوش اُور حرکات وسکنات مکمل طور پر تبدیل ہو گئیں۔ ۱۹۸۷ء میں اُس کی تیسری البم کی بھی تین کروڑ کاپیاں بک گئیں اُور وہ دنیا کا مقبول ترین اُور امیر ترین موسیقار بن گیا۔

اب اُس کے احساسِ کمتری اُور غرور نے مزید پیش قدمی کی۔ اُس نے اپنے خاندان اُور پرانے دوستوں سے قطع تعلق کرلیا اُور مکمل طور پر مصنوعی زندگی کے گرداب میں پھنس گیا۔ اب اُس کی انتہائی خواہش تھی کہ اُسے ہر صورت میں طویل عمر حاصل ہو اُور وہ کم از کم ڈیڑھ سو سال تک

ضرور زندہ رہے۔اس کے لیے اُس نے عجیب وغریب حرکتیں کیں۔ مثلاً وہ رات کو آکسیجن ٹینٹ میں سوتا تھا۔وہ جراثیم،وائرس اور بیماریوں سے بچنے کے لیے دستانے پہن کرلوگوں سے ہاتھ ملاتا تھااور ملاقاتوں سے پہلے منہ پر ماسک چڑھالیتا تھا۔خوراک کے سلسلے میں وہ غیر معمولی احتیاط سے کام لیتا تھا،اُس کی خوراک کا روزانہ لیبارٹری ٹیسٹ ہوتا تھااور بارہ ڈاکٹر ہمہ وقت اُس کے قریب رہتے تھےاور روزانہ اُس کے جسم کے ایک ایک حصّے کا معائنہ کرتے تھے۔اُس کا سٹاف اُسے روزانہ مخصوص ورزشیں بھی کراتا تھا۔

مائیکل جیکسن نے اپنے لیے فالتو پھیپھڑوں،گردوں،آنکھوں،دل اور جگر کا بندوبست بھی کر رکھا تھا،اس سلسلے میں اُس نے متعدد ڈونرز کا انتظام کرلیا تھا،اوران کے تمام اخراجات وہ اٹھا رہا تھااور جونہی کسی عضو کی ضرورت پڑتی،اِن ڈونرز نے اعضا اسے فراہم کردینے تھے...... چنانچہ اُسے یقین تھا کہ وہ ڈیڑھ سوسال تک زندہ رہے گا،لیکن 25 جون 2009ء کو حیرت انگیز واقع ہوا،رات کو اُسے سانس لینے میں دشواری پیش آئی،اس کے ملازم ڈاکٹر فوراً حاضر ہو گئے،انہوں نے فوری طور پر ملک کے بہترین ڈاکٹروں کو بلالیا،اور یہ سب اسے موت سے بچانے کے لیے اپنی سی کوشش کرتے رہے،اُسے ہسپتال لے گئے،مگراُسے کوئی بھی موت سے نہ بچاسکا اور تیس منٹ کی کشمکش کے بعد وہ دم توڑ گیا۔موت نے اسے پچھاڑ دیا اور وہ صرف پچاس سال کی عمر میں زندگی ہار گیا......ڈیڑھ سوسال تک زندہ رہنے کا خواب دھرے کا دھرا رہ گیا۔

(یہ تحریر مشہور کالم نگار جاوید چودھری کے ایک کالم مطبوعہ روزنامہ ایکسپریس کی مدد سے مرتب کی گئی ہے)

(۱۲)

یونس مغل صاحب نے بتایا تقریباً پندرہ سال پہلے کی بات ہے سول ہسپتال ڈسکہ کا ایم ایس بھٹی نام کا ایک ڈاکٹر تھا۔ بہت مغرور اُور بے حس آدمی تھا۔ کوئی مریض کتنا زخمی اُور تکلیف میں مبتلا کیوں نہ ہوتا، ڈاکٹر بھٹی چنداں پروانہ کرتا۔ مریض کے لواحقین اُسے توجہ دلاتے، لجاجت سے درخواست کرتے کہ مریض کی حالت نازک ہے، ذرا جلدی تشریف لائیں، مگر ڈاکٹر بھٹی ٹس سے مس نہ ہوتا۔ کمال بے نیازی سے کہتا: پھر کیا ہو گیا ہے کوئی آسمان تو نہیں گر رہا، قیامت تو نہیں آ رہی، بس تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں، ذرا صبر کرو، حوصلے سے کام لو۔

کچھ عرصے کے بعد کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ماڈل ٹاؤن ڈسکہ میں ایک اسکول کی چھت گر گئی، تین چار لڑکے ہلاک ہو گئے۔ بہت سے زخمی ہوئے۔ زخمی لڑکوں کو سول ہسپتال لایا گیا۔ اب ایک قیامت کا سماں تھا، پندرہ بیس لڑکے زخموں سے چور چار پائیوں پر تڑپ رہے تھے، لوگ شور مچا مچا کر بڑی عاجزی کے ساتھ ڈاکٹر بھٹی سے اپیل کر رہے تھے کہ وہ دفتر سے باہر نکلیں اُور زخمیوں کو دیکھیں، لیکن وہ اپنی روایتی بے حسی کا مظاہرہ کرتا رہا، حتیٰ کہ بیس منٹ کے بعد وہ اطمینان کے ساتھ دفتر سے برآمد ہوا اُور زخمی لڑکوں کے پاس آیا تو اُس کا کلیجہ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ زخمیوں میں اُس کا اپنا بیٹا بھی شامل ہے۔ اب اُس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ اچانک بہت متحرک ہو گیا۔ شور مچا مچا کر اپنے عملے کو بلاتا رہا، لیکن وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا اُور قدرتِ خداوندی کا کوڑا حرکت میں آ گیا تھا، چنانچہ ڈاکٹر بھٹی کی نظروں کے سامنے اُس کا بیٹا تڑپ تڑپ کر مر گیا اُور وہ اپنی بے حسی پر ماتم کرتا رہ گیا۔

(۱۴)

چودھری عظیم نے بتایا میری بیٹی بشریٰ کی شادی ہوئی۔اس کا خاوند والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ کسی دوسرے شہر میں ملازم تھا۔والدین بوڑھے تھے،ان کی خواہش تھی کہ کم از کم اُن کی بہو ان کے پاس رہے اَور بیٹا وقتاً فوقتاً آ کر انہیں مل جایا کرے مگر بشریٰ اس پر راضی نہ ہوئی۔ وہ اپنے خاوند کے پاس ہی رہنا چاہتی تھی،اس نے اسے مجبور کیا کہ جس شہر میں اس کی ملازمت ہے وہاں مکان کرائے پر لیا جائے اَور وہیں رہائش اختیار کی جائے......والدین نے بہت ترلے منتیں کیں، مگر بشریٰ کسی طرح اُن کے پاس رہنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

عظیم صاحب نے بتایا: اللہ نے بشریٰ کو دو بیٹے عطا کئے دونوں جوان ہوئے، ملازم ہوئے، ان کی شادیاں ہوئیں۔ بشریٰ نے بہت زور دیا کہ کم از کم ایک بہو اس کے پاس رہے، مگر دونوں نے اپنے خاوندوں کے پاس رہنے پر اصرار کیا۔اب بشریٰ گھر میں اکیلی ہے اَور اُسے تنہائی کے صدمے سے کینسر ہو گیا ہے۔

(۱۴)

پروفیسر احسان الحق چیمہ صاحب یقیناً غیر معمولی انسان ہیں۔ وسیع المطالعہ، صاحبِ فکر اَور صاحبِ نظر...... متعدد کتابوں کے مصنّف، فردِ دردمند ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے یعنی 26-8-09 کو اُن سے طویل ملاقات ہوئی۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ بصیرت کو خاصی جلا ملی۔ ان کے دو مشاہدات نقل کر رہا ہوں:

☆☆☆

میرا بیٹا ڈاکٹر سہیل احسان چیمہ (ایم بی بی ایس) بچوں کے امراض کا ماہر ہے۔ پہلے انگلینڈ میں مقیم تھا، اب کینیڈا چلا گیا ہے اَور وہاں ٹرانٹو میں SICK KID ہسپتال میں کنسلٹنٹ ہے۔

1995 میں وہ انگلینڈ سے پاکستان آیا ہوا تھا۔ مَیں، ڈاکٹر سہیل اَور اس کی والدہ تینوں فیصل آباد جا رہے تھے۔ اُن دنوں میرے پاس سوزوکی افکس 1984 ماڈل تھی۔ ظاہر ہے گاڑی پرانی تھی، اس زمانے میں موٹروے کا وجود بھی نہ تھا اَور مَیں ڈرائیو کر رہا تھا...... چنانچہ ڈاکٹر سہیل بار بار چلّا اٹھتا کہ ابو آج مروا دیں گے، ہم زندہ سلامت فیصل آباد نہیں پہنچ سکیں گے، لیکن مَیں اُسے دلاسا دیتا کہ فکر نہ کرو۔ ہمیں انشاء اللہ کچھ نہیں ہوگا۔ قرآن کے فرمان کے مطابق اللہ کے فرشتے میری حفاظت کر رہے ہیں۔ سورہ حٰم السجدہ میں ہے: اِنَّ اللّٰہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تو عَدُوْنَ (آیت ۳۰) یعنی جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا رب ہے اَور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے، یقیناً اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اَور ان سے کہتے ہیں کہ "نہ ڈرو، نہ غم کرو اَور خوش ہو جاؤ اُس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے...... چنانچہ بیٹے کی ساری چیخ پکار کے باوجود ہمارا یہ سفر بڑے سکون اَور خیریت سے گزرا اَور راستے میں کوئی پریشانی یا مشکل پیش نہ آئی۔

فیصل آباد میں ملاقاتوں سے فارغ ہو کر جب ہم واپسی کے لیے تیار ہوئے تو میرا بیٹا ڈاکٹر سہیل جلدی سے اگلا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا اب مَیں گاڑی چلاؤں گا...... لیکن بمشکل پندرہ سولہ کلومیٹر کا فیصلہ ہی طے کیا تھا کہ یکا یک کار کا بونٹ کھل کر اوپر اچھلا اور زور سے شیشے سے ٹکرایا۔ اللہ کا شکر ہے شیشہ ٹوٹنے سے بچ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر یہی حادثہ ہوا اور تیسری بار پھر، اللہ نے ہر بار حیرت انگیز طور پر شیشہ بچا لیا اور گاڑی کسی خوفناک حادثے سے محفوظ رہی، ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا...... تب مَیں نے بیٹے کو احساس دلایا کہ دیکھ لو، مَیں سٹیئرنگ پر بیٹھا تھا، تو اللہ کے وعدے کے مطابق فرشتے میری حفاظت کر رہے تھے لیکن اب تم گاڑی چلا رہے ہو تو فرشتے پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ مَیں نے اُسے تحدیثِ نعمت کے طور کہا کہ مَیں گاڑی میں نہ ہوتا تو تمہارا اور تمہاری ماں کا آج حشر ہو جاتا۔

بیٹے نے کہا دراصل آپ نے فیصل آباد جاتے ہوئے فرشتوں کو تھکا دیا تھا...... مَیں نے جواب دیا: واپسی پر میرے فرشتے گاڑی سے اتر گئے تھے، لیکن تمہارے فرشتوں کو تمہاری حفاظت کا حکم نہیں ملا تھا۔

(۱۵)

پروفیسر احسان الحق چیمہ صاحب نے بتایا:۔

مَیں نے 1965ء میں حیدر آباد میں 130 ایکڑ زمین خرید لی اَور کاشت کاری شروع کردی۔ 1968ء میں مَیں نے وہیں سے ایل ایل بی کرلیا اَور پریکٹس شروع کردی، مگر 1970ء میں لاہور آ گیا۔

حیدر آباد میں چودھری محمد صادق سے تعارف ہوا۔ یہ آرائیں تھے اَور ہزار گیارہ سو ایکڑ کے مالک تھے۔ شریف اَور خوفِ خدا رکھنے والے آدمی تھے...... انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔

بتایا کہ ایک مرتبہ میرے پاس ایک کسان آیا، وہ بھی آرائیں تھا۔ اس نے کہا کہ مَیں سبزیاں اگانے کا ماہر ہوں۔ اگر آپ مجھے زمین مہیا کریں تو مَیں بہت اچھی سبزیاں اگاؤں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ منافع میں دس آنے میرے ہوں گے اَور چھ آنے آپ کے۔

مَیں نے منظور کرلیا اَور اُسے زمین کا ایک قطعہ دے دیا۔ اس نے زمین پر خوب محنت کی اَور وہاں ٹنڈے کاشت کئے۔ ایک روز مَیں اُن کھیتوں میں گیا تو حیران رہ گیا۔ ٹنڈوں کی فصل خوب لہلہا رہی تھی اَور پودوں پر پھول ہی پھول تھے۔ تب میرے ذہن میں خیال آیا کہ یہ تو بہت بھرپور فصل ہے، اس سے تو بہت ہی منافع ہوگا اَور منافع کا زیادہ حصّہ یہ مہر لے جائے گا، اس لیے مجھے یہ معاہدہ ختم کردینا چاہیے اَور کسان سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ یہ دس آنے اور چھ آنے والی تقسیم غلط ہے۔ منافع دونوں کا برابر یعنی آٹھ آٹھ آنے ہونا چاہیے۔

یہ سوچ کر مَیں گھر آ گیا اَور فیصلہ کرلیا کہ مَیں کل مہر سے (یعنی کسان سے) بات کروں گا...... مگر جب مَیں دوسرے روز یہ ارادہ لے کر دوبارہ اُن کھیتوں کی طرف گیا تو یہ دیکھ کر حیران

پریشان رہ گیا کہ ساری کی ساری فصل مرجھا گئی ہے۔ پودوں کا حُسن اَور لہلہاہٹ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

مَیں نے مہر سے اس زوال کا سبب پوچھا تو وہ کہنے لگا کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کی نیّت میں فتور آ گیا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ میرے دل کی حالت تو ٹھیک ہے، آپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

تب مَیں نے اعتراف کیا کہ کل فصل کا جوبن دیکھ کر میری نیّت خراب ہو گئی تھی اَور مَیں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دس آنے اَور چھ آنے والا معاہدہ ختم کر دوں گا اَور منافع برابر برابر ہوگا اور آج مَیں نے تم سے اس کا اظہار کرنا تھا۔

اس پر اس کسان نے اپنا مختصر سامان لپیٹا اور یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گیا کہ اس صورت میں ہم دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے۔

☆☆☆

(۱۶)

رائے صلاح الدین گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ، لاہور میں میرا شاگرد تھا (2000-01) میں اس کے والد کی موڑ کھنڈا تحصیل ننکانہ صاحب میں اَسّی ایکڑ زرعی زمین ہے۔ چونکہ والدین کا بڑا بیٹا ہے، اس لیے تعلیم سے فارغ ہو کر اب وہ خود زمین کی نگرانی کرتا اَور کاشت کراتا ہے۔ اس نے بتایا (26-5-07 کو) کہ ایک سال قبل یعنی 2006ء میں قدرتی آفات کی وجہ سے پیداوار نسبتاً کم ہوئی، تو مَیں نے عشر کی ادائیگی مَیں تساہل سے کام لیا بلکہ اپنے خیال میں خدا سے نظریں بچا کر ساری رقم ہی جو پیداوار کے حساب سے تیس ہزار بنتی تھی، پی گیا۔

دو ہی دن کے بعد مَیں موٹر سائیکل پر زمینوں کی طرف جا رہا تھا۔ ایک جگہ سڑک پر ایک کوچ کھڑی تھی۔ مَیں اُس کے پاس سے گزرنے لگا تو یکا یک ایک آدمی کوچ کے آگے سے دوڑتا ہوا میرے سامنے آ گیا اَور موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا۔ اس کے نتیجے میں مَیں گر گیا اَور میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

مجھے ہسپتال لے جایا گیا، علاج پر میرا ٹھیک تیس ہزار روپے خرچ ہُوا۔ کئی ہفتوں کی معذوری اَور تکلیف اَور پریشانی اس کے علاوہ تھی۔

(۱۷)

مَیں جب بھی ڈاکٹر قریشی صاحب کے احوال پر غور کرتا ہوں، مجھے بے اختیار علامہ شبلی نعمانی اَور مولانا الطاف حسین حالی یاد آ جاتے ہیں اَور مجھے یقین ہونے لگتا ہے کہ دونوں کا شمار بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے اولیا میں سے تھا۔

اس واقعے کا پس منظر ایک حدیث قدسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس نے میرے ولی سے بُغض رکھا، اس نے میرے خلاف اعلانِ جنگ کیا...... بدقسمتی سے ڈاکٹر قریشی صاحب نے تحقیق اور تنقید اَور غیر جانبداری کے جوش میں اِن دونوں بے مثال بزرگوں کے خلاف خوب لکھا۔ ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' میں اول الذکر کی غیر معمولی کردارکشی کی اَور ''مطالعہ حالیؔ'' میں ثانی الذکر کو جی بھر کے تنقید کا نشانہ بنایا...... نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت بری طرح اللہ کی ناراضگی میں گھر گئے۔ تقریباً بارہ سال پہلے فالج میں مبتلا ہو کر بستر پر مقیّد ہو گئے اَور وفات تک شدید ترین آزمائش سے دوچار رہے...... ایک قدم حرکت نہیں کر سکتے تھے، کروٹ نہیں بدل سکتے تھے اَور چار پانچ سال سے تو لقوے کی وجہ سے ان کا چہرہ بھی بگڑ گیا تھا۔

پتہ چلا کہ انسانی حوالے سے بھی ڈاکٹر قریشی کا روّیہ چنداں قابل تعریف نہ تھا۔ ایک صاحب نے جو اُن کے ادارے میں کمپوزر تھے، بتایا کہ بارہا اُن کے گھر پر جانے کا اتفاق ہوا، وہ گرمی میں پانی تک پلانے کے روادار نہ تھے۔ پیاس لگتی اَور مَیں پانی طلب کرتا تو کہتے باہر جا کر ٹونٹی سے پی لو۔ مَیں گلاس مانگتا تو فرماتے ہاتھوں سے کام لو، بُک بنا کر پی لو۔

ڈاکٹر صاحب، دائیں بازو' سے تعلق رکھنے کے باوجود نمازوں کے معاملے میں بہت غیر سنجیدہ تھے، شاید پڑھتے ہی نہیں تھے۔ مَیں ایک باراُن کی عیادت کے لیے گیا اَور نماز کے لیے مسجد میں جانے لگا تو انہوں نے شدید معذوری کے باوجود میری اس حرکت کا تمسخر اُڑایا۔

موصوف محترم کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک لے پالک بیٹی تھی گویا اس طرح ڈاکٹر صاحب کی زندگی عبرت کا انتہائی خوفناک نمونہ بن گئی تھی۔

(۱۸)

''اللہ نے اسے مکہ اَور مدینہ میں داخل نہ ہونے دیا''

مَیں ساڑھے تیرہ سال یعنی 1980 سے 1994 تک لاہور کے معروف تعلیمی ادارے گورنمنٹ دیال سنگھ کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتا رہا ہوں۔ اس دوران میں مکافاتِ عمل کے حوالے سے یوں تو کئی مشاہدات ہوئے، لیکن ایک واقعہ بہت ہی حیرت انگیز اَور عبرت ناک ہے۔

اس کالج کے شعبہء انگلش میں ایک لیکچرار تھا: ماجد خان (اصل نام کچھ اَور تھا) یہ اصلاً دہریہ تھا اَور دہریوں کی ساری خصوصیات کا حامل تھا یعنی پرلے درجے کا غیر سنجیدہ، پھکڑ باز، باتونی، دینی شِعار کا برملا مذاق اُڑاتا اَور علما کو سان پر چڑھائے رکھتا۔ بدعقیدہ اَور بدزبان ہونے کے ساتھ ساتھ بدعمل بھی تھا۔ میری موجودگی میں تو وہ یاوہ گوئی کی جرات نہیں کرتا تھا، لیکن فرصت اَور گفتگو کا کوئی موقع وہ دین اسلام کے خلاف خبثِ باطن کا اظہار کئے بغیر جانے نہیں دیتا تھا۔ ماجد خان نے بعد میں ایف سی کالج میں تبادلہ کرا لیا تھا۔ رہائش اس کی وحدت کالونی کے سرکاری فلیٹوں میں تھی۔

ماجد خان کا بڑا بھائی امریکہ میں مقیم تھا۔ والدہ اِس کے پاس وحدت کالونی میں رہتی تھی۔ والدہ کی خواہش پر اس کے امریکہ والے بھائی نے اسے رقم بھجوادی اَور مطالبہ کیا کہ والدہ کو سعودی عرب لے جا کر عمرہ کرالاؤ۔

ماجد خان نے سٹاف روم میں بیٹھ کر یہ بات اپنے حلقے کے لوگوں کو خود سنائی کہ ''مجھے عمرے وغیرہ سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ مَیں نے سوچا کہ میرا کیا خرچ ہوتا ہے۔ رقم بھائی نے بھجوائی ہے۔ اس کا مطالبہ ہے تو مَیں والدہ کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔ مفت کی سیر ہو جائے گی۔''

چنانچہ ماجد خان اپنی والدہ کو لے کر حجاز کے لیے روانہ ہو گیا، لیکن عجیب وغریب بات یہ ہوئی کہ جدہ پہنچتے ہی وہ بیمار ہو گیا، اس کی قوّت سلب ہو گئی اَور چلنا تو درکنار، ہلنے جلنے کے قابل نہ

رہا اَور علاج کے لیے اُسے مجبوراً ایک ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ لیکن اللہ کی شان دیکھئے کہ کوئی علاج کارگر نہ ہُوا اَور اس کی بیماری بڑھتی ہی چلی گئی۔ ماں نے دوچار روز انتظار کیا اَور پھر وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مکہ مکرمہ چلی گئی۔ وہاں آٹھ دس روز قیام کر کے مدینہ پہنچ گئی اَور وہاں بھی ایک ہفتہ ٹھہر کر واپس جدہ آ گئی۔ اس سارے عرصے میں ماجد خان علالت کی حالت میں ہسپتال میں پڑا رہا......اَور پھر ماں کے ساتھ واپس پاکستان آ گیا۔

اللہ نے ایک بدعمل، گستاخ اَور بدتمیز آدمی کو اپنے مقدس شہروں میں داخلے سے زبردستی روک دیا تھا۔

باب: ۳

نمازوں میں غفلت کرنے والوں کا انجام

قرآنِ پاک، سورہ ماعون کی مشہور آیت ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ط

کم و بیش سب اُردو مفسرین نے اس آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ تباہی ہے، ہلاکت ہے، بربادی ہے اُن نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا مودودیؒ کے الفاظ بڑے جامع ہیں: ''کبھی پڑھتے ہیں اور کبھی نہیں پڑھتے۔ پڑھتے ہیں تو اس طرح کہ نماز کے وقت کو ٹالتے رہتے ہیں اور جب وہ بالکل ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے تو اُٹھ کر چار ٹھونگیں مار لیتے ہیں۔ یا نماز کے لیے اُٹھتے ہیں تو بے دلی کے ساتھ اُٹھتے ہیں اور بادلِ نخواستہ پڑھ لیتے ہیں جیسے کوئی مصیبت ہے جو اُن پر نازل ہوگئی ہے''۔

کہا جاتا ہے کہ اس آیتِ گرامی میں منافقین کے طرزِ عمل کی عکاسی کی گئی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وطنِ عزیز کے مسلمان معاشرے میں اس طرح کی مثالیں جا بجا اور کثرت سے نظر آتی ہیں اور اگر سنجیدگی سے اور دقتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور دینی معلومات رکھنے والے راست فکر مسلمان بھی نمازوں کے معاملے میں غفلت اور بے نیازی میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اَمر خاصا تشویش ناک ہے کہ وطنِ عزیز پاکستان میں ایک اندازے کے مطابق کم و بیش دس فیصد لوگ نماز پڑھتے ہیں اور ان میں سے نوے فیصد نماز کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتے یعنی اُس کی روح یا خشوع یا جدید اصطلاح میں QUALITY کی پرواہ نہیں کرتے اور صرف رکعتوں کی تعداد پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ نمازیوں کی غالب اکثریت محض ایک رسم پوری کرتی ہے اور اسے ایک مصیبت سمجھ کر اِس سے بڑی ہی تیز روی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتی

ہے گویا مولانا مودودی کے الفاظ میں ورزش کا ایک عمل پورا کر کے فارغ ہو جاتی ہے۔

بد قسمتی سے یہ لوگ اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بے روح نمازوں کے حوالے سے سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے اَور اس ضمن میں سخت وعیدیں فرمائی ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے ذیل کی احادیث:

۱- جو شخص نماز کے آداب اَور حقوق کی پروا نہیں کرتا، خشوع کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا، تو وہ نماز پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر اس کے منہ پر مار دی جاتی ہے۔ تب یہ نماز پڑھنے والے کے لیے بد دعا کرتی ہے ضَیَّعَکَ اللّٰہُ کَمَا ضَیَّعْتَنِی۔ یعنی جس طرح تو نے مجھے ضائع کیا ہے ویسا ہی اللہ تجھے برباد اَور ضائع کرے۔

۲- ایک شخص مسجد کی طرف جاتا ہے، وہاں نماز پڑھتا ہے اَور اس کی نماز خدا کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

۳- بعض نمازیں جنت کا دروازہ کھولنے کی بجائے دوزخ کا دروازہ کھولتی ہیں۔

چنانچہ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو دنیاوی اعتبار سے طرح طرح کے مسائل اَور مصائب میں گھر جاتے ہیں۔ گویا وہ قرآن وسنت کی وعیدوں کے عین مطابق صحت، معاش اَور گھریلو حوالے سے تباہی اَور ہلاکت سے دوچار ہیں۔

یہ امر بے حد تشویش ناک ہے کہ نمازی حضرات کی غالب اکثریت زبانِ حال سے گویا اللہ پر احسان کرتی ہے اَور اس خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ جیسی بھی نماز پڑھیں گے اللہ پابند ہے کہ اُسے قبول کرے اَور اُنہیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے...... حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ٹوک لفظوں میں فرمایا ہے کہ ''یقیناً آدمی نماز ختم کر لیتا ہے، لیکن اُس کا ثواب مختلف لکھا جاتا ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بہترین انداز میں، خضوع وخشوع کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کو نماز کا پورا اجر وثواب ملتا ہے، مگر بے توجہی کے ساتھ پڑھنے والوں کو گھٹتے گھٹتے نماز کا صرف دسواں حصہ مل پاتا ہے۔

اُور یہ امر چنداں قابلِ تعجب بھی نہیں کہ نماز دین کا اہم ترین بنیادی رُکن ہے اُور کفر و اسلام کے درمیان امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ سیدنا عمر فاروقؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ نماز کے رکوع و سجود وغیرہ پورے نہیں کرتا، جلدی جلدی نماز کو ختم کر رہا ہے تو فرمایا لَقَدْ طَفَّفْتَ یعنی تو نے اللہ کے حق میں کمی کر دی۔ (بحوالہ معارف القرآن جلد ۸ ص ۶۹۴) نماز کے معاملے میں غفلت اُور تساہل کا مظاہرہ کرنے والے، نماز کو رواروی میں اُور عجلت سے پڑھنے والے دراصل اللہ کے حضور بے ادبی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اللہ کی بے پایاں نوازشات کا لحاظ نہیں کرتے اُور شکر کا روّیہ اختیار نہیں کرتے، اس لیے ان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا غصہ طاری ہوتا ہے اُور آخرت سے پہلے دنیا میں بھی انہیں مختلف قسم کی پریشانیوں، بیماریوں اُور مسائل و مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میرے ذاتی مشاہدے میں اس نوعیت کی جو مثالیں آئی ہیں وہ بڑی ہی عبرت ناک ہیں۔

(۱)

میرے ایک جاننے والے ہیں۔ پروفیسر راؤ حسین علی بہت عالم فاضل، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، بڑی شہرت اُور عزت کے حامل ہیں، لیکن صحت اُور گھریلو حالات کے اعتبار سے بے چارے ہمیشہ ہی پریشان رہے ہیں۔ اُن کی صحت کبھی بھی اچھی نہیں رہی، لیکن حقیقت پسند اُور حوصلہ مند آدمی ہیں، اس لیے کڑا پرہیز کرتے ہیں اُور جی رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے پیٹ کا دوبار آپرشن ہو چکا ہے، خشکی کی وجہ سے اُن کی لمبی آنت سکڑ گئی تھی اُور وہ بڑی دیر تک سخت تکلیف میں مبتلا رہے تھے۔ پھر دو ہی مرتبہ وہ سڑک کے حادثے کی لپیٹ میں آئے۔ پہلی بار اُن کا کولہا ٹوٹ گیا اُور وہ کم از کم تین ماہ تک شدید تکلیف کی حالت میں بستر پر مقیّد رہے۔ دوسری بار انہیں پھر حادثہ پیش آیا اُور وہ کئی ہفتوں تک صاحبِ فراش رہے۔

پروفیسر راؤ کی بیگم بھی سدا کی بیمار ہیں۔ انہیں شوگر ہے، بلڈ پریشر ہے، پتّے میں پتھریاں ہیں اُور گائٹی کا کوئی مسئلہ بھی ہے، گویا گھریلو حوالے سے وہ سخت مسائل میں مبتلا ہیں۔

پروفیسر صاحب کے تین بیٹے ہیں۔ لائق کوئی بھی نہیں۔ بڑا بیٹا انٹر سے آگے نہیں پڑھ سکا وہ نفسیاتی مریض ہے۔ عمر تینتیس چونتیس سال ہوگئی ہے۔ لیکن اس کا کوئی روزگار نہیں تاحال شادی بھی نہیں ہوئی۔ اُن کی تین بیٹیاں ہیں، تینوں اپنے گھروں میں آباد ہیں، لیکن اُن میں سے ایک ایک طلاق کی تکلیف دہ آزمائش سے بھی دوچار ہو چکی ہے۔

پروفیسر راؤ حسین علی کو پڑوسی بھی اچھے نہیں ملے۔ اُن کے گھر کا نقشہ ایسا ہے کہ پڑوس میں جب گھر بنا تو وہ روشنی اَور ہوا سے مکمل محروم ہوگئے اَور پہلی اَور دوسری منزل تاریکی میں ڈوب گئی۔ اب اُن کے گھر میں دن کو بھی شبِ دیجور کا عالم ہوتا ہے جس کی وجہ سے علاوہ دیگر اُلجھنوں کے اُن کا بجلی کا خرچ بہت بڑھ گیا ہے۔

سوچتا ہوں کہ تقدیر نے پروفیسر صاحب کی یہ دُرگت کیوں بنائی ہے اَور وہ مختلف حوالوں سے مسائل کی یلغار سے کیوں دوچار ہوگئے ہیں۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے جس کا اظہار مَیں بعض دیگر مقامات پر بھی کر چکا ہوں کہ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ یہاں اتفاق سے کچھ نہیں ہوتا اَور ایک خدا پرست انگریز نے بڑی ہی فکر انگیز اَور ایمان افروز بات کی ہے کہ Chanre is the hidden will of God. یعنی جس کو ہم اتفاق کہتے ہیں وہ دراصل اللہ کے کسی مخفی منصوبے کا حصہ ہوتا ہے۔ اَور نبی اکرم ﷺ نے برملا، دوٹوک الفاظ میں فرمایا کہ جو تم نیکی کرتے ہو اس کا اجر اللہ تعالیٰ قیامت کے لیے محفوظ کر لیتا ہے، لیکن جو گناہ کرتے ہو اس کا خمیازہ دنیا ہی میں بیماریوں اَور دیگر مصائب کی صورت میں بھگت لیتے ہو" (بحوالہ تفہیم القرآن جلد ششم ص ۴۲۵)

اس تناظر میں دیکھیں تو میرے مشاہدے کے مطابق پروفیسر صاحب کے مزاج اَور روّیے کی چند عمومی کمزوریاں ہیں جو اللہ کی ناراضگی کا سبب بن گئی ہیں اَور وہ مختلف نوعیت کے مسائل میں مبتلا ہوگئے ہیں...... اِن کمزوریوں میں پہلی کمزوری اُن کی نمازوں میں غفلت اَور تساہل ہے۔ وہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے ہیں اَور ہم دونوں کا مسجد کا راستہ ایک ہی ہے۔ اس لیے مَیں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ فجر اور عصر کی نمازیں عموماً مسجد میں نہیں پڑھتے اَور باقی تینوں نمازوں میں

بھی تاخیر سے جاتے ہیں اُور آخری رکعتوں ہی میں شامل جماعت ہوتے ہیں......مزید اُن کی بدنصیبی یہ ہے کہ اکیلے میں نماز پڑھتے ہوئے بھی وہ غیر معمولی عجلت سے کام لیتے ہیں اُور رکوع و سجود میں توقف سے کام نہیں لیتے۔ میرے نزدیک اُن کی یہ کمزوری اُن کے لیے وبال اُور اللہ کی غیر معمولی ناراضگی کا سبب بن گئی ہے اُور وہ طرح طرح کے مسائل میں گھر گئے ہیں۔

پروفیسر صاحب کی دوسری کمزوری جس نے میرے نزدیک انہیں اللہ کی ناراضگی میں مبتلا کردیا ہے وہ خلقِ خدا سے اُن کی بے نیازی اُور بے حسی ہے۔ اُن میں مردم بیزاری اُور سرد مہری کا عنصر بہت نمایاں ہے وہ اپنے دوستوں اُور ملنے والوں کو بڑی بے تکلفی سے مختلف فرمائشیں کردیتے ہیں اُور اُن کے ذمہ مختلف کام لگا دیتے ہیں، لیکن شکرگزاری اُور قدر افزائی کا جوہر اُن میں خاصا کم ہے اُور خود غرضی نمایاں ہے۔

موصوف پہلی بار سڑک کے حادثے کا شکار ہوئے جس کے نتیجے میں اُن کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ وہ عبرت کا ایک سبق آموز واقع ہے...... ہوا یوں تھا کہ 6 ستمبر 1990ء کو پروفیسر صاحب کے تقریباً پڑوس میں (درمیان میں صرف دو مکان واقع ہیں) ایک بزرگ وفات پا گئے تھے جو موصوف کے ایک قریبی دوست کے بڑے بھائی بھی تھے۔ صبح نمازِ فجر کے بعد اعلان ہوا کہ فلاں صاحب وفات پا گئے ہیں، اُن کی نمازِ جنازہ دس بجے ہوگی، اس کے بعد بھی دو بار مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے جنازے کا اعلان ہوتا رہا، لیکن پروفیسر صاحب نے پروانہ کی، موٹر سائیکل نکالی ایک بیٹے اُور ایک بیٹی کو ساتھ لیا اُور مال روڈ پر فوجی پریڈ دکھانے کے لیے چل پڑے۔ ٹھیک دس بجے قریبی پارک میں نماز جنازہ کی صف بندی ہو رہی تھی جب ایک لڑکا بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اُور بتایا کہ راؤ حسین علی کا ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے۔ ان کا کولہا ٹوٹ گیا ہے اُور انہیں اُور اُن کے بچوں کو زخم بھی آئے ہیں، وہ اس وقت میو ہسپتال کی ایمرجنسی میں ہیں۔ مَیں بھاگم بھاگ وہاں پہنچا اُور انہیں خاصی تکلیف میں پایا بہرحال اس حادثے کے بعد وہ تقریباً تین ماہ تک بستر علالت پر پڑے رہے، لیکن افسوس کہ وہ اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتے اُور کسی حادثے سے عبرت حاصل نہیں کرتے۔

کاش انہیں مولانا مودودی کے اس مقولے کی صداقت پر یقین ہوتا جو موصوف محترم نے حکیم محمد شریف کے نام ایک مکتوب میں رقم فرمایا تھا۔''ایک بات اصولی طور پر سمجھ لیجئے کہ جو شخص خدا اور خلقِ خدا کے ساتھ اپنا معاملہ درست رکھے اور خدا کی راہ میں اس کی خلق کی بھلائی کے لیے کام کرے، خدا اُس کے ساتھ کبھی بُرا معاملہ نہیں کرتا۔''

(۲)

پروفیسر مکرّم حسین گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں میرے کولیگ تھے۔ کیمسٹری پڑھاتے تھے۔ بہت محنتی اور دیانت دار آدمی تھے۔ محنت ہی کے بل پر وہ ایم ایس سی کر کے لیکچرار بن گئے تھے ورنہ گھریلو حالات کی وجہ سے وہ ایف ایس سی کے بعد ایک فیکٹری میں ملازمت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

موصوف دین کا سچا درد رکھنے والے، ایک راست فکر اور باخبر مسلمان تھے۔ وہ جدید ترین سائنسی اور عقلی حوالوں سے دینی تعلیمات کی توثیق اس ایمان افروز انداز میں کرتے کہ وجد جھوم اُٹھتا...... لیکن حیرت انگیز طور پر موصوف نمازوں کے معاملے میں غیر معمولی غفلت سے کام لیتے تھے اور مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کے تو شاید قائل ہی نہ تھے۔ بس گھر ہی میں بے وقت نماز پڑھ لیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ فرض ادا ہو گیا ہے۔

قرآنِ پاک اور حدیثِ نبویؐ کی وعیدوں کے عین مطابق پروفیسر مکرم اللہ کی ناراضگی کی لپیٹ میں آ گئے...... اُن کی ملازمت کے ابھی کم از کم پندرہ سال باقی تھے کہ گورنمنٹ نے گولڈن شیک ہینڈ کی ایک اسکیم کا اعلان کیا اور ساتھ ہی ٹرانسپورٹ کے حوالے سے اے سی کوچز کم قیمت میں فراہم کرنے کی نوید سنائی۔

پنجابی کی ایک ضرب المثل ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لاٹھیوں سے نہیں پیٹتا، وہ انسان کی عقل پر پردہ ڈال دیتا ہے چنانچہ شاید نمازوں سے تساہل اور اللہ سے بہت ہی بے نیازی کا نتیجہ تھا کہ پروفیسر صاحب نے ملازمت سے فراغت حاصل کر لی اور ایک کوچ کے لیے رقم جمع کرا دی، مگر کچھ ایسا ہوا (تفصیل مجھے یاد نہیں) کہ اُن کی رقم خاصی ڈوب گئی، انہیں بہت نقصان ہوا، کوچ بھی نہ ملی۔

پھر یوں ہوا کہ اُن کی اہلیہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوگئی اَور پھر بے چاری کم از کم دس سال پہلے وفات پا گئی۔ اللہ مُجھے معاف کرے، متعدد مثالوں کی روشنی میں میرا یہ نقطہ نظر ہے کہ بیویاں نہ بلاوجہ بیمار ہوتی ہیں نہ طبعی عمر سے پہلے مرتی ہیں بلکہ خدا اَور خلقِ خدا سے خاوندوں کا روّیہ ہوتا ہے جس کی اُنہیں سزا ملتی ہے اَور بیوی کی بیماری یا موت کی صورت میں وہ شدید ترین مسائل میں مبتلا کر دیئے جاتے ہیں۔

بیوی کی وفات کے بعد پروفیسر مکّرم مزید حوصلہ ہار بیٹھے اَور ڈیپریشن نے اُنہیں کئی جسمانی عوارض میں مبتلا کر دیا پہلے شوگر ہوئی، پھر بلڈ پریشر جان کا روگ بن گیا اَور بعد میں شیاٹیکا کی تکلیف نے اُن کی زندگی اجیرن کر دی...... اب وہ گھر کے اندر ہی مقید ہو کر رہ گئے ہیں اَور جسمانی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی امراض سے بھی دوچار ہیں۔

چند دن پہلے یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ انہوں نے ایک بیٹی کی شادی کی تھی۔ لیکن پانچ سال کے بعد اُس کے خاوند نے اُسے طلاق دے دی ہے۔

لوگ عام طور پر نمازوں کے معاملے کو خاصا ہلکا سمجھتے ہیں یعنی ان کی باقاعدگی اَور معیار کو چنداں اہمیت نہیں دیتے حالانکہ قرآن و حدیث کے مستند احکامات کی روشنی میں ایسا کرنا بے حد نقصان دہ ہے اَور یہ امر مختلف نوعیت کے مسائل و مصائب کا سبب بن جاتا ہے۔ میرے نزدیک پروفیسر مکرم کی جملہ پریشانیوں کا سبب بھی نمازوں کے معاملے میں اُن کی بے نیازی اَور تساہل کے سوا کچھ نہیں ہے...... کاش وہ اس کا بروقت احساس کر لیتے، کاش وہ قول و فعل کے تضاد میں مبتلا نہ ہوتے۔

(۳)

مَیں دیال سنگھ کالج میں تھا جب وہاں پروفیسر ظہور احمد صاحب تبدیل ہو کر آئے۔ اُن سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ دھیمے مزاج کے باوقار اَور مدبّر انسان تھے۔ بہت خوش اخلاق تھے۔ عربی اُن کا مضمون تھا۔

مگر یہ دیکھ کر مجھے بہت تعجب اَور دُکھ ہوا کہ وہ نمازوں کے معاملے میں بہت تساہل کرتے تھے۔ کالج اوقات میں صرف ظہر ہی کا وقت آتا تھا، قریب ہی مسجد تھی، الحمدللہ ثم الحمدللہ جونہی وقت ہوتا، مَیں مسجد میں چلا جاتا، اَور باجماعت نماز ادا کرتا، مگر ظہور صاحب سٹاف روم میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف رہتے، نماز کا احساس اُنہیں بالکل مضطرب نہیں کرتا تھا۔

ظہور صاحب کا گھر کالج کے قریب ہی تھا اَور عام نمازیں انہیں اسی مسجد میں پڑھنی چاہیں تھیں۔ لیکن کئی بار ایسا ہوا کہ کسی کام کی وجہ سے مجھے عصر اَور مغرب کی نمازیں اسی مسجد میں پڑھنے کا اتفاق ہوا، مگر ظہور صاحب کبھی بھی مسجد میں نظر نہیں آئے، یوں لگتا ہے کہ وہ نماز کی پروا کرتے ہی نہ تھے، حالانکہ راسخ العقیدہ مسلمان تھے اَور اسلامی فکر کی حامل اساتذہ کی ایک تنظیم کے مرکزی رہنما بھی تھے۔

شاید اس کوتاہی اَور ایک فرضِ عین سے مسلسل تغافل برتنے کا نتیجہ تھا کہ پروفیسر ظہور کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے: پہلے موٹاپا ہوا، پھر شوگر ہو گئی جس کا شدید اثر بینائی پر پڑا...... اَور پھر وہ دل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے...... اَور اسی عارضے نے انہیں پچپن سال کی عمر میں ایک روز قبر میں پہنچا دیا۔ بالکل درست ہے قرآن پاک کا یہ فرمان کہ ”اللہ لوگوں پر ظلم وزیادتی نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں۔ (یونس/۴۴)

(۴)

گورنمنٹ کالج شکرگڑھ میں درآنی صاحب میرے کولیگ تھے۔ بظاہر رائیٹسٹ یعنی اسلام پسند تھے، لیکن بہت بے عمل اُور غیر سنجیدہ تھے۔ پھکو بازی میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے تھے اُور نمازوں کی چنداں پروانہ کرتے تھے...... پہلی بیوی سے اُن کی چار بیٹیاں اُور ایک بیٹا تھا اُور بیٹا ذہنی طور پر غیر متوازن تھا، وہ شاید میٹرک بھی نہ کرسکا۔ باپ نے اُسے دکان بنا کردی۔ مگر اُس میں بھی کامیاب نہ رہا۔

درآنی صاحب کی عمر تقریباً پچاس برس تھی جب اُن کی بیگم فوت ہوگئی...... انہوں نے دوسری شادی کی، اُس سے بھی ایک بیٹی پیدا ہوئی، لیکن نئی بیوی سے نباہ کرنے میں انہیں دشواری پیش آ رہی ہے اُور اُن کا رہا سہا سکون بھی غارت ہوگیا ہے۔

(۵)

میاں اکرم علی کے بیٹے میاں جاوید کی زندگی بھی عبرت کا عجیب نمونہ ہے۔ اُس کے والد حکیم تھے اُور دینی مزاج کے دنیا دار آدمی تھے۔ وہ وسیع جائیداد کے مالک تھے۔ زرعی زمین، مارکیٹ، بہت سے رہائشی مکان اُور پلاٹ۔ اُن کے تین بیٹے تھے۔ میاں جاوید اُن میں سب سے بڑا تھا اُور باپ کی وفات پر اُسے بھی اچھی خاصی جائیداد مل گئی۔ اب اُس کا ایک بہت اچھی بستی میں ایک کنال کا کھلا گھر ہے۔ دکانیں ہیں، مارکیٹ ہے اس طرح بلا مبالغہ وہ کروڑ پتی آدمی ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر سکھ یا سکون نام کی کوئی چیز اسے حاصل نہیں ہے۔ اُس کے دو بیٹے اُور ایک بیٹی ہے۔ بڑا بیٹا تو متوازن فکر و عمل رکھنے کے باوجود بے عمل ہے لیکن چھوٹا بہت غیر ذمہ دار اُور نالائق ہے، تعلیم بھی ڈھنگ سے حاصل نہیں کر سکا۔ بیٹی ایم اے انگلش ہے، جاوید صاحب نے اُس کی شادی کی، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی اُور اُسے طلاق ہو گئی۔

میاں جاوید بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ شوگر اُسے بہت لمبے عرصے سے ہے اُور اب تو وہ دن میں دو بار انسولین لگاتا ہے۔ اس کے انگوٹھے عموماً زخمی رہتے ہیں، یہی سبب ہے کہ وہ شدید سردی میں بھی بند جوتا نہیں پہن سکتا اُور شدید گرمی میں گرد وغیرہ سے بچنے کے لیے اُسے باہر جاتے ہوئے جرابیں پہننی پڑتی ہیں۔ وہ بلڈ پریشر کا بھی مریض ہے اُور دل کا بھی۔ اُس کا جگر بھی ٹھیک نہیں ہے جس کے اثر سے اُس کے چہرے کا رنگ سیاہ ہوتا جا رہا ہے۔ گاہے گاہے اس سے سرِ راہ ملاقات ہوتی ہے تو وہ بے چارگی، بے بسی اُور پژمردگی کی تصویر نظر آتا ہے اُور مَیں اس کی حالت دیکھ کر کانپ جاتا ہوں۔ دولت اُور زندگی کی دوسری سہولتیں ایسے لوگوں کے لیے امتحان ہی نہیں بلکہ حسرت اُور دُکھ کا سبب بن جاتی ہیں۔ گھر میں ہر نعمت موجود ہو مگر انسان اُن سے فائدہ نہ اُٹھا سکے تو اللہ کی اس سے بڑی ناراضگی اُور کیا ہو سکتی ہے۔

مُجھے میاں جاوید کی ساری بدنصیبیوں، بیماریوں اَور پریشانیوں کا سبب اس کی بے عملی میں نظر آتا ہے کہ نبی اکرمُ ں اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ گرامی کے مطابق انسان جو گناہ کرتا ہے اُس کا وبال وہ دنیا ہی میں بیماریوں اَور مصیبتوں کی صورت میں بھگت لیتا ہے اَور میاں موصوف کا معاملہ بھی اسی نوعیت کا ہے...... بدقسمتی سے وہ مکمل بے عمل آدمی ہے حالانکہ اُس کے والد دینی مزاج کے حامل تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھےلیکن وہ مسجد کے قریب بھی نہیں پھٹکتا، جُمعہ کی نماز تک نہیں پڑھتا اَور ایک واقفِ حال کے بقول شراب تک کو منہ مار لیتا ہے اَور اس کے زیر اثر لوگوں نے اِسے بعض مواقع پر اپنی مارکیٹ کے باہر بے ہوش ہو کر گرتے ہوئے دیکھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کئی طرح کی خطرناک بیماریوں نے اُس سے زندگی کے سارے لُطف چھین لیے ہیں، مسرّت اَور سکون اُس سے بہت دُور ہو گئے ہیں اَور اولاد کے حوالے سے وہ شدید ترین مسائل میں مبتلا ہے۔ بالکل صحیح فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتابِ پاک نے کہ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ۔ یعنی تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اَور بہت سے قصوروں سے تو وہ ویسے ہی درگزر کر جاتا ہے۔

☆☆☆

(۶)

پروفیسر شیخ پرویز بھی میاں جاوید کی طرح بے عملی کی مکمل تصویر ہیں۔ اُن کے والد ایک دینی جماعت کے نمایاں اہلکار تھے بلکہ ایک اہم شعبے کے نگران تھے، لیکن وہ خود نفاق میں بہت بُری طرح مبتلا ہیں۔ والد کی روایت کو نبھانے کے لیے داڑھی بھی بڑھا رکھی ہے، مگر مسجد سے اُن کا تعلق بہت ہی کمزور ہے۔ نمازوں کی وہ سرے سے پروا کرتے ہی نہیں، صرف جُمعہ کے لیے مسجد میں آتے ہیں وہ بھی آخری وقت میں اَور ایک راہداری میں بیٹھے خطیب صاحب کی تقریر کے دوران گپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ بے عمل ہونے کے ساتھ ساتھ وہ مکمل غیر سنجیدہ بھی ہیں۔

مَیں نے اُن کی اس روش کے نتیجے میں انہیں ہر اعتبار سے مسائل اَور مصائب میں مبتلا دیکھا ہے۔ وہ لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار تھے۔ اٹھارویں گریڈ میں ترقی ہوئی تو اُن کا تبادلہ گوجرانوالہ میں ہوگیا۔ گزشتہ چھ سال سے وہ روزانہ گوجرانوالہ جارہے ہیں اور ساری کوششوں کے باوجود ان کا لاہور میں تبادلہ نہیں ہوسکا۔ اس سبب سے وہ شدید ترین مشقت جھیلنے پر مجبور ہیں۔ علی الصبح اُٹھتے ہیں مگر مسجد میں حاضری دیئے بغیر سفر پر روانہ ہوجاتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن تک ویگن کا سفر، پھر ٹرین پر گوجرانوالہ کا سفر اَور پھر گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن سے سیٹلائیٹ ٹاؤن میں گورنمنٹ کالج تک کا کم از کم دو کلومیٹر کا پیدل سفر۔ گویا وہ کولہو کا بیل بن گئے ہیں۔ دوپہر کو واپس آتے ہیں تو ایک پرائیویٹ کالج میں پڑھانے چلے جاتے ہیں اَور کہیں عشا کے قریب ہی گھر پہنچنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اس طرح اُن کی زندگی مشین میں ڈھل گئی ہے جس میں اُن کے پاس نہ خدا کے لیے وقت ہے نہ خلقِ خدا کے لیے۔

اِس روش کا نتیجہ یہ ہے کہ موصوف بھی میاں جاوید کی طرح کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ انہیں بھی شوگر بہت دیر سے ہے اَور دو سال پہلے انہیں شدید قسم کا ہارٹ اٹیک بھی ہوا تھا اَور کئی ماہ تک زیرِ علاج رہے تھے۔ بیگم اُن کی دائمی مریض ہے۔ ہائی بلڈ پریشر اَور معدے کی خرابی اُس کا مستقل آزار بنے ہوئے ہیں اَور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُن کے تین بیٹے ہیں جن میں سے ایک جسمانی اَور ذہنی اعتبار سے معذور ہے اَور باقی دونوں اپنی حرکتوں سے نفسیاتی عوارض میں مبتلا نظر آتے ہیں، یعنی باپ کی طرح باتیں بہت بگھارتے ہیں، لیکن مسجد میں بہت کم نظر آتے ہیں...... ساری تگ و دو اَور بھاگ دوڑ کے باوجود اُن کی ''معیشت'' تنگ نظر آتی ہے اَور وہ قرآن پاک کے اس فرمانِ مبارک کی تفسیر بن گئے ہیں کہ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا اَور جو میرے ذکر یعنی عبادات سے منہ موڑے گا اس کے لیے دنیا میں زندگی تنگ ہوگی۔

(۷)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق......اُور تجزیہ

۱۵؍اکتوبر ۱۹۹۶ء

آج دوپہر کو جب سے سروسز ہسپتال میں ا۔ب۔د کی عیادت کر کے آیا ہوں، سخت خوفزدہ ہوں، اللہ کی بے نیازی سے رہ رہ کر کانپ جاتا ہوں۔ بے چارے کا بہت ہی بُرا حال دیکھا: دائیں ٹانگ دو جگہ سے ٹوٹ گئی ہے، بایاں کولہا فریکچر ہو گیا ہے۔ بایاں بازو بھی شکستہ ہے، ریڑھ کی ہڈی بھی متاثر ہوئی ہے۔ چھوٹے بڑے بہت سے زخم اس کے علاوہ ہیں۔

حجازی صاحب بتا رہے تھے کہ گذشتہ برس اس کے نوعمر بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اُور اس سے پچھلے سال اس کی بیوی کا ٹخنہ فریکچر ہو گیا تھا۔

موصوف کالج پروفیسر ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اُور اسلامی ذہن کے دانشور ہیں، مگر عجیب وغریب منفی ذہنیت کے مالک ہیں......نمازوں کی طرف سے ہمیشہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں اُور اپنے سرکاری تدریسی فرائض کے معاملے میں بھی کمال درجے کے غیر سنجیدہ ہیں......اس کے علاوہ جذبۂ شکر سے عاری ہیں، کوئی اُن سے بڑی سے بڑی نیکی کر لے، وہ جواب میں ناشکری اُور بدخواہی ہی کا مظاہرہ کریں گے بالفاظ دیگر وہ بے مثال عقربی ذہنیت کے حامل ہیں اُور ہر قریب ہونے والے فرد کو وہ ڈنگ مارے بغیر رہ ہی نہیں سکتے......اندازہ کیجئے کہ میرے ایک دوست نے اُن کا رشتہ کرایا۔ بہت اچھے، دیندار اُور شریف الطبع خاندان سے اُن کا تعلق قائم کرایا اُور اس حوالے سے نہ پیسے کی پروا کی نہ وقت کی، مگر موصوف نے اپنے محسن کے خلاف بھی نیش زنی میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی اُور جہاں موقع ملا، اس کی کردار کشی کا فریضہ انجام دینے میں دریغ نہ کیا۔

شاید یہ اِسی ذہنیت اَور عمل کا نتیجہ ہے کہ ا۔ب۔د کو شدید ترین آزمائش کا سامنا کرنا پڑ
ہے......وہ تقریباً ڈھائی سال تک زیرِعلاج رہے بالفاظِ دگر اللہ نے انہیں مسجد کی برکات سے محرو
رکھا۔ بڑی مشکلوں سے اُن کی صحت بحال ہوئی، لیکن اب بھی قدرے لنگڑا کے چلتے ہیں اَور چھڑ
کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔

تشویش اَور حیرت کا پہلو یہ ہے کہ اس قدر غیر معمولی حادثے سے گزرنے کے بعد بھی اس
شخص نے نمازوں میں باقاعدگی اختیار نہیں کی اَور اس کی ذہنیت اَور عمل میں چنداں فرق واقع نہیں
ہوا۔

(۸)

جمیل خاں عجیب متضاد خوبیوں کے حامل تھے۔ایک دینی جماعت کے دیرینہ رُکن، کتابوں سے گہری محبت، ایک دینی تحریک کے بارے میں غیر معمولی معلومات......مگر نمازوں میں تساہل، خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے فرائض کے معاملے میں غیر ذمہ داری، غیر سنجیدگی اَور طنز، تمسخر اَور غیبت کے کلچر سے وابستگی۔

جمیل خاں اس جماعت کے ایک ادارے میں کام کرتے تھے اَور نمازِ ظہر میرے گھر کے قریب بڑی مسجد میں پڑھنے پر مجبور تھے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری بیشتر نمازیں تکبیر اولیٰ کے ساتھ ادا ہوتی تھیں۔جمیل خاں کی ایک مخصوص کھانسی اُن کے گلے سے اُس وقت برآمد ہوتی تھی، جب وہ مسجد میں داخل ہوتے تھے اَور یہ کھانسی پابندیِ وقت کے ساتھ فرضوں کی تیسری اَور چوتھی رکعت ہی میں سنائی دیتی تھی۔

وفات سے قبل جمیل خاں ارذل العمر کی حالت میں تھے۔صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔عرصے سے شوگر کے مریض تھے جس کے نتیجے میں نقاہت غیر معمولی حد تک بڑھ گئی تھی۔بصارت میں خاصا ضعف آ گیا تھا۔اس کے علاوہ دیگر بہت سے مسائل تھے۔تین بیٹوں میں سے کسی ایک کی بھی مناسب تعلیم نہیں ہوسکی تھی۔کوئی میٹرک بھی نہیں کرسکا نہ کوئی ہنر سیکھ سکا۔اس لیے تین میں سے دو بیکار ہیں۔تیسرا ایک پرائیویٹ ہسپتال میں معمولی ملازم ہے۔

دو بیٹیوں میں سے ایک کی ہنوز شادی نہیں ہوئی جبکہ اُس کی عمر پچیس برس سے تجاوز کرگئی ہے۔اپنا مکان تک نہیں ہے۔کوئی ڈھنگ کا کاروبار بھی نہیں اَور موصوف کم ازکم پانچ لاکھ کے مقروض ہیں۔

مَیں ایک روز جمیل خاں کی مزاج پرسی کے لیے گیا موصوف اپنی دکان جسے کباڑ خانہ کہنا ہی

درست ہے، کے سامنے ضعف اُور اضمحلال کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اپنے ناگفتہ بہ حالات پر تبصرہ کرنے لگے۔ اُن کے لہجے میں تقدیر کے بارے میں شکایت اُور شکوہ غالب آنے لگا تو مَیں نے دریافت کیا: جمیل صاحب آپ ماشاء اللہ ایک دینی جماعت کے باقاعدہ رُکن رہے ہیں چنانچہ، آپ سے زیادہ نماز اُور عبادت کی اہمیت سے کون باخبر ہے۔ آپ مجھے بتایئے کہ عمر بھر میں (جب یہ بات ہو رہی تھی تو جمیل خاں کی عمر کم از کم ستر سال ہوگی) آپ نے کتنی نمازیں تکبیرِ اولیٰ کے ساتھ پڑھی ہیں؟

مَیں کوئی ایک بھی نہیں پڑھ سکا'' جمیل خاں نے صاف بیانی سے کام لیا۔

تو پھر آپ تقدیر کا گلہ کیوں کرتے ہیں...... جیسا سلوک آپ نے اللہ سے روا رکھا، ویسا ہی اللہ کی تقدیر نے آپ کے ساتھ روا رکھا کہ حدیث قدسی ہے کہ مَیں اپنے بندے کے گمان کے مطابق اُس سے سلوک کرتا ہوں۔ جب آپ خوش فہمیوں کے سہارے کچھ خواب بُن رہے تھے، تو اس کا نتیجہ موجودہ صورت ہی میں برآمد ہو سکتا تھا۔

جمیل خاں کے پاس میرے اس تجزیے کا کوئی جواب نہ تھا۔

(۹)

عمران صاحب میرے عزیز ہیں۔ گذشتہ 25 سال سے جدّہ میں ملازمت کرتے ہیں۔ فارماسسٹ ہیں، اس لیے اچھی تنخواہ لیتے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے خاصی جائیداد بنالی ہے۔ لاہور کی ایک بہت اچھی بستی میں ایک کنال کا ڈبل سٹوری گھر ہے۔ کئی پلاٹ ہیں، بنک بیلنس ہے...... لیکن ساری دولت مندی کے باوجود انہیں سکون حاصل نہیں اُور سچی خوشی میسّر نہیں ہے...... وہ کم از کم پندرہ سال سے کمر اُور ٹانگوں کے درد میں مبتلا ہیں۔ وہ سکون کی نیند کو ترستے ہی رہے ہیں۔ بس دواؤں کے سہارے وقت گزار رہے ہیں۔

موصوف کے چار بیٹے ہیں۔ بڑے نے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے۔ عمران صاحب کی دلی تمنا تھی کہ اُن کا بیٹا ڈاکٹر بن جائے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہوگیا اُور اُس کا داخلہ اُنہیں بی فارمیسی میں کرانا پڑا۔

عمران صاحب کے دوسرے بیٹے نے بھی انٹر پری میڈیکل میں بہت ہی اچھے نمبر حاصل کیے، لیکن وہ بھی انٹری ٹیسٹ میں کامیاب نہ ہوا اُور اُسے ایک میڈیکل کالج کی سیلف فنانس سکیم کے تحت بہت بھاری اخراجات کے تحت داخلہ لینا پڑا۔

مَیں اکثر سوچتا تھا کہ عمران صاحب کو ذاتی صحت کے اُور بچوں کے حوالے سے متذکرہ مسائل کا سامنا کیوں کرنا پڑا ہے۔ وہ جدہ میں مقیم ہیں، بڑی ہی آسانی کے ساتھ وہ ہر جمعہ کی نماز بیت اللہ میں پڑھ سکتے ہیں وہاں وہ جو دعا بھی اخلاص، توجہ اُور عجز کے ساتھ مانگیں گے وہ لازماً قبول ہوگی...... پھر وہ مختلف بیماریوں میں کیوں مبتلا ہیں اُور اُن کے بیٹوں کو پے در پے ناکامیوں کا سامنا کیوں کرنا پڑا ہے؟

2004ء میں مجھے حج کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک جمعے کے روز عمران صاحب اپنی اہلیہ

اُور بچوں کے ساتھ ملاقات کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لائے اُور جُمعہ کی نماز ہم نے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوکر ادا کی پھر ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ عمران صاحب نے فرائض کے بعد جو سنتیں اُور نوافل ادا کیے، وَہ غیر معمولی عجلت اُور رواروی سے ادا کیے۔ وہ واقعی ٹھونگیں مار رہے تھے۔ اُن کا کوئی رکوع بھی معیاری نہ تھا نہ سجدوں میں کوئی جان تھی۔ ایک رسم تھی جو بے دلی کے ساتھ ادا ہو رہی تھی اُور ایک مصیبت تھی جس سے وہ جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بالکل ویسی ہی نماز تھی جس کے بارے مَیں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ ایک پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر نمازی کے منہ، پر ماردی جاتی ہے اُور اس طرح کی نماز پڑھنے والے کے لیے بددعا کرتی ہے کہ جیسا تم نے مجھے ضائع کیا، خدا تمہیں بھی اسی طرح ضائع کرے۔

یہی نہیں، پتہ یہ چلا کہ عمران صاحب جدہ میں رہتے ہوئے بیت اللہ شریف سے کمال بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں اُور تین تین مہینے گزر جاتے ہیں کہ اُنہیں یہاں حاضری دینے کی توفیق نہیں ہوتی۔ پھر مجھے نہ اُن کی بیماریوں پر کوئی تعجب رہا نہ اُن کے بیٹوں کی ناکامیوں پر...... ظاہر ہے جو طرزِ عمل اُنہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے روا رکھا ہے وہی سلوک اُن کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ورنہ اللہ رب العزت تو بے حد رحیم و کریم ہیں۔ وہ تو اپنے بندوں کو کسی مشکل اُور پریشانی میں مبتلا نہیں فرماتے اُور بندہ عجز کے ساتھ، اخلاص اُور یقین کے ساتھ جو دعا بھی کرتا ہے وہ بارگاہِ عالی میں قبول ہوتی ہے۔

(۱۰)

۲۰۰۴ء کے سفرِ حج میں ایک صاحب سے فون پر رابطہ ہوتا رہا۔ یہ ایک صحافی ہیں اور جدہ میں ایک اُردو ہفت روزے کے مدیر ہیں۔ مکہ مکرمہ میں مختلف مقامات پر مَیں نے اس رسالے کو دیکھا اور ورق گردانی کی تو چکرا کے رہ گیا......حرمین کے جوار میں رہتے ہوئے انہوں نے اس رسالے کو ایک روایتی سیاسی اور تفریحی حیثیت دے رکھی ہے۔ ہندوستانی فلمی اداکاراؤں کے انٹرویو اور ان کی تصویروں سے مزّین اس رسالے کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ اِسے مرتّب کرنے والا خوفِ خدا کا کوئی احساس رکھتا ہے یا کم از کم باوقار مشرقی تہذیب سے محبت رکھنے والا ہے۔

چونکہ اس صحافی سے میری بہت پرانی یاد اللہ ہے اور مَیں مجموعی اعتبار سے اِن کی تحریروں اور تجزیوں کا مدّاح ہوں، اس لیے مَیں نے انہیں مکہ سے فون کیا اور رسالے کے حوالے سے انہیں اصلاحِ حال کی توجہ دلائی۔ فون کے دوران وہ بار بار تکرار اور اصرار کے ساتھ کہتے رہے کہ حرم میں میرے لیے دعا ضرور کریں جس پر مَیں حیران ہوتا رہا کہ جو شخص خود بیت اللہ کے اس قدر قریب ہے اور جب چاہے یہاں حاضری دے سکتا ہے، وہ اس قدر اصرار کے ساتھ دعا کی درخواست کیوں کر رہا ہے۔

اللہ نے فضل فرمایا اور مجھے ۲۰۰۴ء ہی میں رمضان المبارک کا نصفِ اوّل حرمین میں گزارنے کا شرف حاصل ہوگیا۔ مَیں پروگرام کے مطابق پندرہ دن پورے کر کے واپسی پر ایک دن کے لیے جدہ میں اپنے عزیزوں کے ہاں ٹھہرا، تو موصوف سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے بتایا کہ ایک بیٹا ہے اور غالباً تین بیٹیاں ہیں۔ بیٹا سب سے چھوٹا ہے۔ بڑی بیٹی نے چند سال پہلے انٹر پری میڈیکل میں بہت اچھے نمبر حاصل کئے، مگر انٹری ٹیسٹ میں کامیاب نہ ہوسکی اور میڈیکل کالج میں داخلہ نہ ہوا......اُس نے دوسرے سال پھر ٹیسٹ دیا، مگر بدقسمتی سے وہ پھر فیل ہوگئی اور

ڈاکٹر بننے کا خواب پورا نہ ہُوا۔ مایوس ہو کر اُس نے بی ایس سی کیا اَور اب ماس کمیونیکیشن میں داخلہ حاصل کیا ہے۔

یہ صحافی دوست میری دعوت پر میرے عزیزوں کے ہاں تشریف لائے تھے۔ شام کو افطار وغیرہ میں دیر ہوگئی اَور نمازِ مغرب کی تینوں رکعتیں قضا ہوگئیں۔ ہم مسجد میں گئے اَور تینوں رکعتیں سلام کے بعد ہمیں کھڑے ہو کر انفرادی طور پر پڑھنی پڑیں۔ یہ صحافی صاحب میرے برابر میں کھڑے تھے اَور انہوں نے نماز کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس سے ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئیں۔ میرے عزیز عمران صاحب کی طرح یہ بھی نماز کا کترہ کرتے رہے اَور ٹکریں مارتے رہے۔ نہ پُر سکون قیام، نہ مکمل رکوع، نہ مکمل سجدے۔ میری ایک رکعت مکمل ہونے تک یہ تین رکعتوں سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے۔

اللہ کا قانون تو سب کے لیے یکساں اَور حتمی حیثیت رکھتا ہے۔ اَور جو لوگ فحاشی پھیلانے اَور نمازوں سے مذاق کا انداز اختیار کرتے ہیں، قرآن کی رو سے یقیناً اُن کے لیے ''ویل'' ہے، تباہی ہے، نامرادی ہے، ناکامی ہے، پھر اُن کی دعائیں کیسے قبول ہوں، اُن کی آرزوئیں کیسے پوری ہوں۔ کاش وہ غور کریں، کاش وہ سنجیدگی اختیار کریں۔

(۱۱)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۸/اگست ۲۰۰۰ء

آج صبح مَیں نے سستی اُور نالائقی کا مظاہرہ کیا۔ نہ الارم کی پروا کی نہ اذان کو اہمیت دی اُور سویا رہا اُور اس طرح نماز قضا ہو گئی۔

آج کل کالج میں اگرچہ چھٹیاں ہیں مگر سالِ اوّل کے داخلے ہو رہے ہیں اُور میری اس حوالے سے ڈیوٹی لگی ہوئی ہے چنانچہ ساڑھے نو بجے موٹر سائیکل پر کالج جا رہا تھا جب وحدت روڈ پر سید مودودی انسٹی ٹیوٹ کے سامنے موٹر سائیکل بند ہو گئی اُور کسی طرح سٹارٹ نہ ہوئی۔ دیکھا تو ٹنکی بالکل خالی تھی...... چنانچہ تیز ہوتی ہوئی دھوپ اُور حبس کے عالم میں موٹر سائیکل کو تقریباً ایک کلومیٹر تک پیدل کھینچ کر پٹرول پمپ تک پہنچا اُور پسینے میں شرابور ہو گیا۔

کالج تقریباً دس بجے پہنچا۔ شعبہ اُردو کے سامنے داخلہ حاصل کرنے والے طلبہ اُور اُن کے سرپرست خاصی بڑی تعداد میں جمع تھے۔ مَیں نے شرمندگی کے گہرے احساس تلے اُن سے معذرت کی، کمرے کا تالہ کھولا اُور اندر گیا تو یہ دیکھ کر سخت پریشانی ہوئی کہ کمرے کی بجلی خراب تھی۔

کمرے میں شدید حبس اُور گرمی تھی، لیکن اسی حالت میں داخلہ فارموں کی پڑتال کا کام شروع کر دیا۔ سوءِ اتفاق کہ سٹاف کا کوئی اُور ساتھی نہیں آیا تھا۔ مَیں فوراً ہی پسینے میں نہا گیا۔ میرے پاس تولیے والا رومال تھا، اُس سے بار بار پسینہ پونچھتا، لیکن پانی تھا کہ دھاروں کی صورت میں چہرے سر اُور جسم سے خارج ہوتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ رومال میں مزید پسینہ جذب کرنے کی گنجائش نہ رہی۔

مَیں ڈیڑھ گھنٹے تک اسی آزمائش میں مبتلا رہا۔ حتیٰ کہ ایک شخص نے توجہ دلائی کہ ساتھ

والے کمرے میں بجلی موجود ہے اور وہاں پنکھے چل رہے ہیں......تب اندازہ ہوا کہ بجلی ہمارے کمرے کے سوا سارے کالج میں موجود ہے۔ پنکھے چل رہے ہیں اور ٹیوبیں بھی روشن ہیں......غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناراضگی کا شاخسانہ ہے اور مَیں نے آج جو نماز میں بے پروائی اور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا تھا، یہ سرزنش اُسی حوالے سے ہو رہی ہے چنانچہ حادثاتی طور پر پٹرول کا ختم ہو جانا، گرمی میں موٹر سائیکل کو کھینچتے ہوئے ایک کلومیٹر تک پیدل چلنا اور صرف ہمارے ہی کمرے کی بجلی کا معطل ہونا سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

(۱۴)

اُسے غروراَور بداخلاقی لے بیٹھی

مَیں آج سے تقریباً تیس برس پہلے لاہور کی جس بستی میں آ کرآ باد ہُوا، چودھری اکرم وہاں پہلے سے مقیم تھے۔ موصوف ایک مڈل اسکول میں ٹیچر تھے۔ بہت خوش مزاج اَور شائستہ انسان تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اَور اُن کے خوبصورت چہرے پر متشرع داڑھی خوب سجتی تھی۔ آمنا سامنا ہوتا تو خوش دلی سے ملتے تھے...... یہ الگ بات ہے کہ اُنہوں نے اپنے بھائی کے ساتھ مل کر دس مرلے کا جو پلاٹ خریدا تھا، اُس پر بعد میں تنہا قبضہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی جو سوسائٹی کے ذمہ داران کی مداخلت سے کامیاب نہ ہوسکی۔

چودھری صاحب کے تین بیٹے تھے۔ اِن میں بڑے افضل صاحب کلّے بھورے (ALBINO) تھے یعنی مکمل سفید اَور سرخ رنگت اَور چندھیائی ہوئی آنکھیں۔ وہ بھی ایک اسکول میں ٹیچر تھے اَور چونکہ ڈسپنسر کا کورس کر کے شام کو ایک نواحی بستی میں پریکٹس بھی کرتے تھے، اس لیے ڈاکٹر افضل کہلاتے تھے۔ دوسرے دونوں افضل صاحب سے چھوٹے تھے۔ افضل کی عمر حالانکہ خاصی ہو چکی تھی، لیکن اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی اَور اُس کی مخصوص رنگت کی وجہ سے کوئی اُسے رشتہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ گزرا اَور باہم بے تکلفی پیدا ہوئی تو ایک مرتبہ اکرم صاحب نے مجھے کہا میرے بڑے بیٹے کو آپ نے دیکھا ہے۔ بے چارہ کلّا بھورا ہے، اس لیے اُسے کوئی لڑکی دینے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اُس کی عمر زیادہ ہو رہی ہے، اگر آپ مہربانی کریں اَور اپنے جاننے والوں میں اس کی شادی کرادیں تو مَیں آپ کا بہت ممنون ہوں گا۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ مَیں باقی دینی فرائض کے بعد تبلیغِ دین اَور خدمتِ خلق کو ایک مسلمان کے لیے بے حد ضروری سمجھتا ہوں اَور مَیں نے اس کے بے حد وحساب فیوض و برکات دیکھے ہیں، اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ اِن دونوں حوالوں سے ہرگز تساہل نہ کیا جائے۔ چنانچہ اکرم صاحب نے اپنے بیٹے کے رشتے کے لیے کہا، تو یاد آیا کہ سیالکوٹ کے خالد صدیقی صاحب نے مجھے اپنی بیٹی کے رشتے کے لیے کہہ رکھا ہے۔ خالد صدیقی میرے بہت اچھے دوست اَور وہاں ڈسٹرکٹ اکاؤنٹس آفس میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ باعمل مسلمان اَور نیک نہاد انسان تھے۔ چنانچہ مَیں نے سلسلہ جنبانی چلا دیا اَور تھوڑے ہی عرصے میں وہاں ڈاکٹر افضل کی شادی ہوگئی۔

مَیں نے بحمد اللہ تعالیٰ مختلف وقتوں میں چودہ پندرہ رشتے کرائے ہیں، لیکن یہ پہلی مثال تھی کہ کسی کو شکایت کا موقع ملا ہو یعنی شادی کے کوئی چار پانچ سال بعد ایک روز خالد صدیقی صاحب نے ملاقات پر کہا: آپ نے میری بیٹی کا رشتہ کرادیا، آپ کی بہت مہربانی، لیکن مجھے شکایت یہ ہے کہ میرا داماد افضل مکمل طور پر بے نماز ہے، صرف آٹھویں روز جمعے کی نماز پڑھتا ہے اَور بس......

مَیں یہ سُن کر سناٹے میں آ گیا۔ مَیں یہ تصور بھی نہیں کرتا تھا کہ ایک دیندار باپ کا بیٹا جو خود اسکول ٹیچر بھی ہے اَور مذہبی پہچان کی ایک بستی میں رہتا ہے، اس قدر بے حس اَور بے عمل بھی ہوسکتا ہے کہ دن میں کوئی ایک نماز بھی نہ پڑھتا ہو اَور اپنے آپ کو صرف جُمعہ کی نماز پر ہی ٹرخاتا ہو۔

کئی دِن مسلسل جائزہ لینے کے بعد مَیں نے اندازہ کیا کہ خالد صدیقی صاحب کی شکایت درست ہے۔ نمازِ جُمعہ کے سوا افضل ہفتے کے ساتوں دن کسی بھی نماز میں نظر نہیں آتا تھا۔ چلیے مان لیا کہ وہ ظہر، عصر اَور مغرب میں گھر سے باہر مصروف رہتا ہوگا، مگر فجر اَور عشا میں تو آسانی سے مسجد میں آ سکتا تھا، مگر حیرت انگیز طور پر وہ مسجد کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔

تب کوئی دو ہفتوں کے جائزے اور انتظار کے بعد ایک روز مَیں نے اُسے نمازِ جُمعہ کے بعد

پکڑ لیا۔ پوچھا کہ بھئی آپ عام نمازوں کے لیے مسجد میں کیوں نہیں آتے؟ تو وہ عادت کے مطابق قہقہوں کے ساتھ خوب ہنسا۔ کہنے لگا" بادشاہو! فقیر عام دنیا دار لوگوں کی طرح دکھاوے کی نماز نہیں پڑھتے۔ وہ بظاہر چلتے ہیں، پھرتے ہیں، کھاتے ہیں، پیتے ہیں، لیکن دراصل ہر وقت سجدے کی حالت میں رہتے ہیں۔ بس انہیں دیکھنے اَور پہچاننے والی آنکھ چاہیے"۔

مَیں نے عرض کی: بالکل ٹھیک ہے حضرت صاحب، مَیں آپ کی ولایت کا تو قائل ہو ہی گیا ہوں، لیکن اللہ نے مردوں کے لیے فرض قرار دیا ہے کہ وہ مسجد میں آ کر باجماعت نماز ادا کریں۔

اس پہلی گفتگو میں چودھری افضل نے میرے سوال اَور شکایت کو بالکل سنجیدگی سے نہیں لیا، قہقہے لگاتا رہا، بات کو مذاق میں ٹالتا رہا۔

دوسرے جمعے کو مَیں نے اُسے پھر قابو کر لیا اَور نمازوں کا پوچھا تو حسبِ معمول قہقہہ لگا کر کہنے لگا جناب کیوں نہیں پڑھوں گا، آپ کی نہیں مانوں گا تو کس کی مانوں گا۔ آپ تو میرے پیرو مُرشد ہیں، سرپرست ہیں، آپ نے تو میری شادی کرائی تھی۔

تو پھر مذاق میں کیوں ٹالتے ہو، وعدہ کرو کہ آئندہ پابندی سے نماز پڑھو گے اَور توجہ سے سنو کہ نماز ہر مسلمان پر فرضِ عین ہے۔ جو شخص مسلمان ہو کر نماز جان بوجھ کر چھوڑتا ہے، اُس کا تو ایمان ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یاد رکھو کہ نماز پڑھنے والے کو خود دنیاوی اعتبار سے بھی اس کی بے پناہ برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔ جبکہ نماز ترک کرنے والا اس کے وبال سے نہیں بچ سکتا۔

"بہت بہت شکریہ، آپ کو تبلیغ کا ثواب مل گیا۔" یہ کہہ کر اُس نے زبردستی جان چھڑائی اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا گھر کی طرف کھسک گیا۔ لیکن آفرین ہے اُس پر کہ میری کسی بات یا درخواست کا مطلق اثر نہ لیا اَور آئندہ جمعے تک وہ مسجد میں ایک نماز کے لیے بھی نہ آیا تب اگلے جُمعہ کو مَیں نے اُسے پھر پکڑ لیا اَور نمازوں کا ذکر کیا تو منہ بنا کر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا: دیکھیں جناب آپ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں؟ نماز پڑھنا یا نہ پڑھنا خالص میرا ذاتی معاملہ ہے اَور کسی

دوسرے شخص کو ہرگز حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں سے نمازوں کے بارے میں پوچھتا رہے اَور خدائی فوجدار بن جائے۔

''نہیں ڈاکٹر افضل صاحب، آپ کی بات درست نہیں ہے''مَیں نے اُسے بڑی نرمی اَور دلسوزی سے کہا''اسلام خالص ایک تبلیغی مذہب ہے اَور امر بالمعروف اَور نہی عن المنکر ہر مسلمان پر فرض ہے۔ ہر شخص پر واجب ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کا خیر خواہ ہو اَور اُس کا نقصان ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ مجھے نظر آرہا ہے کہ اگر آپ نے نماز کی پابندی اختیار نہ کی تو آپ کسی بہت بڑے نقصان سے دوچار ہو جائیں گے اَور آخرت میں بھی آپ کو شدید ترین پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے میرا خیر خواہانہ مشورہ ہے کہ آپ مہربانی فرما کر نمازوں کی پابندی شروع کر دیں۔ اسی میں آپ کی اَور معاشرے کی بھلائی ہے''۔

''ٹھیک ہے مَیں اس پر غور کروں گا لیکن آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا، کہ آپ ہر جُمعے کو مجھے پکڑ لیں اَور پولیس والوں کی طرح تفتیش شروع کر دیں۔ مَیں پھر کہوں گا کہ نماز پڑھوں یا نہ پڑھوں یہ خالصتاً میرا ذاتی معاملہ ہے'' یہ کہا اَور سنجیدگی سے ناراض ہو کر چلا گیا۔

اگلے دو جمعے چودھری افضل مسجد میں نظر نہیں آیا اَور اس دوران میں وہ حسبِ معمول عام نمازوں میں مسجد سے غیر حاضر رہا تو ایک اتوار کو مَیں بارہ بجے کے قریب اُس کے گھر چلا گیا۔ گھنٹی دی، وہ باہر آیا تو مُجھے دیکھ کر اُس کا موڈ یکدم خراب ہو گیا۔ غصے سے کہنے لگا: ''آپ کیسے تشریف لائے ہیں؟ کیا اب آپ گھر پر بھی مجھے چین نہیں لینے دیں گے''

''ڈاکٹر صاحب، میرے عزیز، مَیں آپ کا دشمن نہیں ہوں، آپ کا سچا خیر خواہ ہوں، مَیں تو آپ کی خیریت دریافت کرنے آیا ہوں، مَیں آپ کو پریشان کیوں کروں گا'' میں نے نرمی سے کہا۔

''نہیں آپ میری خیریت دریافت کرنے نہیں آئے، آپ مجھے کچوکے لگانے آئے ہیں۔ نماز کیوں نہیں پڑھتے، مسجد میں کیوں نہیں آتے۔ یاد رکھیں، آپ میرے سرپرست نہیں

ہیں۔ مَیں آپ کو سختی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ مجھ سے نماز کی بات ہرگز نہ کریں...... مَیں آپ کے کہنے پر نماز نہیں پڑھوں گا اَور کان کھول کے سن لیں، ہم جاٹ ہیں، وڑائچ ہیں اَور جاٹ ناں کرتا ہے تو پھر ہاں نہیں ہوا کرتی، بس۔ اب آپ چلے جائیں اَور کبھی اس موضوع پر مجھ سے بات نہ کریں‘‘۔

ظاہر ہے اب مزید گفتگو کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی، مَیں سر جھکا کر، کان لپیٹ کر گھر آ گیا اَور واقعی مَیں اس شخص سے اس قدر بددل اَور خوفزدہ ہوا کہ بعد میں اس سے کبھی بات کرنے کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔

اَور قارئینِ گرامی! یہ بات انتہائی لرزا دینے والی، رلا دینے والی ہے کہ چند ہی مہینے گزرے تھے کہ چودھری افضل وڑائچ شوگر کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ اُس وقت اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اُس کی چار بیٹیاں تھیں اَور صرف ایک بیٹا تھا۔ اس کا جسم موٹاپے کی طرف مائل نہیں تھا اَور وہ گوشت وغیرہ کا بھی عادی نہیں تھا...... لیکن اُسے شوگر ہو گئی اَور تھوڑے عرصے میں اس کا تناسب اتنا بڑھ گیا کہ وہ انسولین لگانے لگ گیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ شوگر کا اثر اس کے دل پر پڑا اَور دل میں اس قدر خرابی واقع ہو گئی کہ اُسے بائی پاس آپریشن کرانا پڑا اَور خوفزدہ کر دینے والی بات یہ ہے کہ وقفے وقفے سے اُسے تین بار بائی پاس کے مراحل سے گزرنا پڑا۔

معاملہ یہیں تک نہ رُکا، امراض نے مزید پیش قدمی کی اَور افضل وڑائچ کے گُردے متاثر ہو گئے۔ اِن میں پس پڑ گئی اَور پتھریاں بن گئیں۔ اِن کے آپریشن الگ ہوئے۔ ازاں بعد اُس کی بینائی میں ضُعف پیدا ہو گیا اَور بلڈ پریشر کی تکلیف مستقل نوعیت اختیار کر گئی۔ معدہ بھی اس کا اکثر خراب رہتا۔ مجھے اس کی بیماریوں کا اس لیے علم ہے کہ شوگر اَور دل کے حملوں کے بعد وہ خاصا نرم پڑ گیا تھا، نماز کی تو اُسے پھر بھی توفیق نہیں ملی تھی، لیکن ہومیوپیتھی کے حوالے سے وہ مجھ سے اکثر مشورہ کرتا رہتا تھا اَور اپنے امراض کی تفصیلات بتاتا رہتا تھا، لیکن چونکہ اُس نے مسجد کے حوالے سے اپنی روش میں چنداں تبدیلی نہیں کی تھی، اس لیے یوں لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی

بھی بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ آخر میں حیرت انگیز طور پر اُس کے گھٹنے بیکار ہو گئے تھے اَور وہ رکوع میں جھکنے اَور سجدہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس طرح گویا وہ مختلف قسم کے انتہائی خطرناک امراض کا مجموعہ بن گیا تھا اَور اُس کی پوری زندگی اذّیت اَور خوف کا امتزاج بن گئی تھی۔

افضل وڑائچ کم از کم دس سال تک اِن امراض میں مبتلا رہا۔ پہلے تو وہ اپنے پرنسپل سے درخواست کر کے میڈیکل رخصت پر چلتا رہا، لیکن جب اس کے لیے چلنا پھرنا بھی محال ہو گیا تو اُس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اَور پھر سسک سسک کر زندگی گزارتا رہا حتیٰ کہ مارچ ۲۰۰۸ء کی ایک رات کو پچپن سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ آہ کتنی سخت ہے اللہ کی پکڑ۔

باب: ۴

دینداروں کی بے عملیاں

دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ دینی تشخص رکھتے ہیں اَور پھر کسی حوالے سے بے اصولی کا مظاہرہ کرتے ہیں، خلقِ خدا سے اُن کا رویہ درست نہیں ہوتا یا کسی دینی مدرسے، مسجد یا تبلیغی حوالے سے پیسہ اکٹھا کرتے ہیں، لیکن خرچ کے ضمن میں بے احتیاطی کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں امانت اَور دیانت کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتے، وہ صحت اَور گھریلو حوالے سے بدترین حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔ میرے مشاہدے میں ایسے متعدد واقعات ہیں:۔

(۱)

پروفیسر مولانا ع۔س ضلع گوجرانوالہ کے ایک اہم قصبے میں ایک مسجد کے خطیب اَور کالج پروفیسر ہیں۔ انہیں دینی مدرسے کی تعمیر کے لیے کویت کے ایک ادارے نے ایک کروڑ بیس لاکھ روپے کی رقم عطیے میں دی۔ مدرسے کی تعمیر شروع ہوگئی، مگر اس دوران میں ایک خوفناک حادثہ ہوگیا۔ عمارت کے ایک حصے کی چھت گر گئی اَور موصوف اس کے نیچے دب کر شدید زخمی ہوگئے۔ ان کے جسم کے ہر حصے پر چوٹیں آئیں خصوصاً کمر شدید متاثر ہوئی جس کے اثر سے وہ کم از کم چار ماہ تک بستر پر پڑے رہے اَور اب بھی نیم معذوری کی زندگی گزار رہے ہیں۔

دردناک اَور عجیب بات یہ بھی ہوئی کہ مالی تعاون کرنے والے لوگ اِن سے کسی وجہ سے بدظن ہوگئے اَور اُنہوں نے مولانا موصوف کو عمارت اَور ادارے سے بے دخل کر دیا۔ اب یہ عمارت اَور ادارہ کسی اَور تنظیم کے قبضے میں ہے اَور مولانا حسرت سے انہیں دیکھتے اَور آہیں بھرتے رہتے ہیں۔

موصوف حالانکہ عالمِ دین ہیں، متعدد دینی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، لیکن اُن کے مزاج پر غیر سنجیدگی کا خاصا غلبہ دیکھنے میں آیا۔

اُن کے دو بیٹے اَور پانچ بیٹیاں ہیں۔ بیٹے لائق نہیں ہیں، بس اوسط درجے کی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔

(۲)

اکرم عثمانی (اصل نام نہیں ہے) کا تعلق سیالکوٹ سے تھا۔ بہت نیک، باعمل اور پارسا انسان تھے سرکاری ملازم تھے لیکن دینی تبلیغ کا شوقِ فراواں رکھتے تھے اور اس مقصد کی خاطر اُنہوں نے ایک ادارہ بھی بنایا ہوا تھا، کتابچے اور بروشر وغیرہ چھاپتے رہتے تھے اور اس مقصد کی خاطر لوگوں سے عطیات بھی وصول کرتے تھے۔

لیکن پُراسرار بات یہ ہے کہ دینی تبلیغ سے غیر معمولی اخلاص رکھنے کے باوجود موصوف اولاد اور صحت کے حوالے سے ہمیشہ ہی حوادث کا شکار رہے۔ اُن کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹی کا خاوند نشئی تھا، اس کے چار بچے تھے، لیکن طلاق ہوگئی۔ دوسری کا خاوند سخت بےعمل اور دینی تعلیمات کا کھلا باغی تھا۔ اس کے روّیے کے نتیجے میں وہ بہت سی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہوگیا اور عثمانی صاحب کی زندگی ہی میں فوت ہوگیا۔ تیسری بیٹی کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

عثمانی صاحب کا بڑا بیٹا شمس الدین حالانکہ میٹرک پاس تھا، لیکن عثمانی صاحب کے دینی کردار کی وجہ سے ایک امیر خاندان نے اُسے اپنی ایم اے پاس بیٹی کا رشتہ دے دیا۔ یہ لڑکی مقامی گورنمنٹ گرلز کالج میں لیکچرار تھی۔ صرف یہی نہیں شمس الدین کے سسرال نے اسے ایک کنال کا بنا بنایا گھر دے دیا اور بیس ہزار ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا۔ لیکن اس ساری قدر افزائی کے باوجود شمس الدین آوارگی اور بدکاری کے راستے پر چل پڑا اور ایک روز جب کہ اُس کی بیوی کالج گئی ہوئی تھی، اس نے اپنی نوعمر ملازمہ سے دست درازی کی، اس کے کپڑے پھاڑ دیئے اور اس نے باہر گلی میں نکل کر شور مچا دیا۔

محلے کے لوگ جمع ہوگئے، اُنہوں نے شمس کی بیوی کو اطلاع دی، وہ گھر آئی اور اُس نے اس صورتِ حال پر احتجاج کیا، تو شمس نے اُس کی خوب پٹائی کی اور جب اس کے سالوں نے اُس

سے باز پرس کی تو اُس نے کھڑے کھڑے بیوی کو طلاق دے دی۔ اُس وقت شمس کے چھ بچے تھے۔ یہ الگ کہانی ہے کہ بیوی کو طلاق دے کر شمس الدین کی دنیا اندھیر ہوگئی اَور عرصہ سات سال سے ذلت و رسوائی اَور بے بسی اُس...... کا مقدر بن گئی ہے۔ یہ امر بھی بہت عبرت ناک ہے کہ شمس الدین نے اپنی بیوی کو طلاق دی، تو اُس کے جلد بعد ہی اُس کی والدہ یعنی عثمانی صاحب کی اہلیہ چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہوگئی اَور ڈیڑھ دو سال تک اس لیے شدید ترین اذیت سہتی رہی کہ بدقسمتی سے اُس کا آپریشن بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ باخبر لوگوں نے بتایا کہ شمس کی والدہ کا اپنی بہو سے طرزِ عمل انصاف اَور رحم پر مبنی نہیں تھا اَور شمس نے جواُسے طلاق دی تو اس میں اس کی والدہ کی حوصلہ افزائی بھی شامل تھی......کینسر کی بیماری نے بیگم عثمانی کو سخت عذاب میں مبتلا کیے رکھا اَور وہ اسی بیماری میں چار سال پہلے وفات پاگئیں۔

عثمانی صاحب خود بھی سالہا سال تک کئی طرح کی خطرناک اَور تکلیف دہ بیماریوں میں مبتلا رہے۔ خصوصاً مقعد کی بیماری نے انہیں شدید اذیت بھی دی اَور رسوائی سے بھی دوچار کیا اسی کیفیت میں وہ چھ ماہ پہلے انتقال کر گئے۔

☆☆☆

(۳)

مولانا حافظ محمد اشرف (یہ اصل نام نہیں ہے) ایک سند یافتہ عالم دین تھے۔ بہت ملنسار اَور خوش اخلاق انسان تھے اَور گجرات کے کسی قصبے میں لڑکیوں کا دینی مدرسہ چلا رہے تھے۔

مولانا عربی پر خوب عبور رکھتے تھے، اس لیے عرب ممالک سے اپنے دینی مدرسے کے لیے خوب پیسہ سمیٹ کرلاتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مولانا موصوف مختلف وقتوں میں کئی حوادث میں مبتلا ہوئے۔ اُن کا نوعمر بیٹا قرآن حفظ کر رہا تھا جب مدرسے ہی میں اُسے کرنٹ لگا اَور وہ فوراً

ہی جاں بحق ہوگیا۔ایک بار رات کے وقت انہوں نے اپنے گھر کے باورچی خانے میں جونہی ماچس جلائی، ایک دھماکے کے ساتھ آگ بھڑک اُٹھی، مولانا کا چہرہ جھلس گیا اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ کئی ہفتے زیرِ علاج رہے۔

مولانا اشرف کئی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔شوگر، ان کی جان کا مستقل آزار بن گئی اور اسی نے عارضہ قلب کی صورت اختیار کر کے ایک روز صرف پچاس سال کی عمر میں اُنہیں قبر کی آغوش میں پہنچا دیا۔

☆☆☆

(۴)

شریف ڈار کی عمر باسٹھ سال ہے اور وہ بھی ایک دینی تحریک سے وابستہ ہیں۔وہ نوجوانی میں ناروے چلے گئے اور وہاں اُنہیں ملازمت مل گئی۔اُن کی عمر 45 سال تھی جب اُنہوں نے ایک ڈرامہ رچایا اور ظاہر یہ کیا کہ اُنہیں جسم میں شدید دردیں ہیں۔سنا ہے ناروے میں یہ اصول کارفرما ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم یا عام فرد کسی مرض میں مبتلا ہو جائے اور وہ مرض اُس کے فرائض میں مزاحم ہو رہا ہو اور متعلقہ فرد ٹھوس شواہد سے یہ بات ثابت کر دے تو اُسے ریٹائر کر دیا جاتا ہے اور اُس کی بھاری پنشن مقرر کر دی جاتی ہے۔چنانچہ شریف ڈار نے مختلف ڈاکٹروں کی تحریروں سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی بیمار ہیں اور مختلف نوعیت کی دردوں میں مبتلا ہیں...... چنانچہ ناروے کی حکومت نے اُن کا موقف تسلیم کر لیا اور اُنہیں ملازمت سے ریٹائر کر دیا گیا۔سنا ہے اُن کی گھر بیٹھے بٹھائے چالیس ہزار روپے پنشن مقرر ہو گئی۔

اب دیکھئے کہ اللہ نے اُن کے جھوٹ اور فریب کا کس طرح انتقام لیا۔اس واردات کے جلد بعد ہی وہ شوگر میں مبتلا ہو گئے اور شوگر نے اس قدر شدت اختیار کی کہ 48 سال کی عمر میں اُنہیں فالج ہو گیا اور وہ معذور ہو کر بستر پر پڑ گئے اور کئی سال تک اس تکلیف میں مبتلا رہے۔

فالج سے بمشکل افاقہ ہوا تھا کہ اُنہیں دل کی تکلیف ہوگئی اُور کچھ ہی عرصہ پہلے اُن کا اپریشن ہوا ہے جس پر ڈھائی تین لاکھ روپے خرچ آیا ہے۔ دل سے جو نالیاں سر کی طرف جاتی ہیں وہ دائیں طرف والی بند ہیں...... فی الحال بائیں طرف کا اپریشن ہوا ہے...... مَیں عیادت کے لیے گیا تو اُن کا بُرا حال تھا۔ سر میں چکر تھے اُور کھڑا ہونا بہت مشکل تھا۔ شوگر کا تناسب اب بھی بہت شدید ہے اُور ضعف کے ہاتھوں اُن کی زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی ہے۔

ڈار صاحب کی پانچ بیٹیاں اُور دو بیٹے ہیں۔ دو بیٹیوں کی شادیاں ہو سکی ہیں۔ باقی تینوں بھی جوان ہیں، مگر رشتے نہیں ملتے...... دو بیٹوں میں سے ایک ناروے میں ہے، دوسرا سپین میں۔ ڈار صاحب سارا دن یا بیماریوں سے لڑتے ہیں، یا جوان بیٹیوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ کس قدر دکھوں بھری زندگی ہے اس شخص کی۔

(۵)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۶ رجنوری ۲۰۰۵ء

آج صبح تقریباً دس بجے یونیورسٹی آف لاہور جاتے ہوئے رائے ونڈ روڈ پر میری موٹر سائیکل پھسل گئی، حالانکہ میں حسبِ معمول آرام سے اَور محتاط انداز میں جا رہا تھا۔ مَیں سڑک پر گر گیا۔ ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی، دونوں ہاتھوں پر خراشیں آئیں لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے حیرت انگیز طور پر مجھے بچالیا۔ نہ سخت چوٹ آئی، نہ زخم آیا نہ کوئی فریکچر ہوا۔ شلوار کے دونوں پائنچے اندر کی طرف سے اس طرح خراب ہوئے کہ عام لوگوں کو سرسری نظر سے مٹی اَور کیچڑ کے وہ داغ دکھائی نہیں دیتے تھے...... مَیں سڑک سے اٹھا، موٹر سائیکل اُٹھائی اَور سٹارٹ کی، تو وہ چل پڑی۔ مَیں یونیورسٹی گیا۔ لیکچر دیا اَور واپس آ کر ہسپتال سے انجکشن کرایا، خراشوں پر معمولی ڈریسنگ کرائی اَور گھر آ گیا...... البتہ موٹر سائیکل کی مرمت پر ڈھائی سو روپے خرچ ہو گئے۔

غور کیا کہ اس پریشانی اور نقصان کا سبب کیا ہو سکتا ہے تو فوراً ہی بات سمجھ میں آ گئی۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے مَیں نمازِ عصر کے بعد ڈرائنگ روم میں چائے پی رہا تھا جب مین گیٹ پر کسی نے زور زور سے دستک دینی شروع کی اَور یہ دستک تواتر اَور تسلسل کے ساتھ ہوتی ہی چلی گئی، اس میں کوئی وقفہ ہو ہی نہیں رہا تھا...... اتفاق سے اُس وقت میرے سوا گھر پر کوئی فرد بھی موجود نہ تھا۔ بیگم اَور بیٹی درسِ قرآن کی ایک محفل میں گئی ہوئی تھیں، دونوں بڑے بیٹے یونیورسٹی میں تھے اَور دونوں چھوٹے کھیلنے چلے گئے تھے۔

مَیں نے ڈرائنگ روم کے اندر سے بہت آوازیں دیں کہ تھوڑا انتظار کریں، مَیں چائے ختم کرلوں تو آتا ہوں لیکن میری آواز پر کوئی توجہ نہیں دی جارہی تھی اَور دروازہ تسلسل کے ساتھ پیٹا

جا رہا تھا۔

مَیں غصّے اَور جھنجھلاہٹ کے عالم میں اُٹھا، چائے وہیں چھوڑی اَور باہر آ گیا۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سات آٹھ سال کی ایک بچی بیٹھی ہوئی ہے اَور گیٹ کو مسلسل پیٹ رہی ہے۔ یہ بچی ایک غریب عورت کی تھی اَور وہ عورت وقتاً فوقتاً آتی رہتی تھی اَور مَیں حسبِ توفیق اُس کی خدمت کر دیا کرتا تھا۔ آج وہ خود نہیں آئی تھی اَور اُس کی نمائندگی یہ بچی بڑے اناڑی پن سے اَور بڑی بے رحمی سے انجام دے رہی تھی۔

مَیں نے باہر نکل کر جب اس بچی کو اس شوقِ فضول میں مصروف دیکھا تو میرا طیش بڑھ گیا، مَیں نے اُسے گالی دی: ''اُلو کی پٹھی یہ تم کیا کر رہی ہو، میری آوازیں تم سن کیوں نہیں رہی تھی اَور دروازہ بھلا اس طرح بھی کھٹکھٹایا جاتا ہے۔'' پھر اُسے میں نے ایک تھپڑ مارا اَور بازو سے پکڑ کر بُری طرح دھتکار کر بھگا دیا۔ وہ بے چاری حیران پریشان روتی ہوئی چلی گئی اَور دوسرے ہی روز مجھے سزا سنا دی گئی...... یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم اَور مہربانی ہے کہ اس نے مجھے کسی کڑے امتحان میں مبتلا نہیں کیا اَور معاملہ چند خراشوں اَور ڈھائی سو روپے کے جرمانے تک محدود رہا، ورنہ تو کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ٹانگ ٹوٹ سکتی تھی، کوئی گاڑی پیچھے سے آ کر مجھے کچل سکتی تھی اَور مَیں ہفتوں مہینوں تک کسی ہسپتال کے بیڈ پر مقیّد ہوسکتا تھا۔ میرے اللہ نے مجھے بہت ہلکی سزا دی، ڈانٹ پلائی کہ تم سمجھ بوجھ رکھنے والے عاقل وبالغ آدمی ہو، تم سے یہ توقع نہیں تھی، تم ایک نادان بچی کی بے عقلی پر اس قدر مغلوب الغضب ہوئے کہ اُسے بُرا بھلا بھی کہا اَور اس کی پٹائی بھی کر دی اَور میری بے پایاں عنایات اَور عفوودرگزر کا ذرا خیال نہ کیا......

مَیں سمجھتا ہوں کہ اس ہلکی سرزنش پر مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرتے رہنا چاہئے اَور آئندہ کے لیے اسے عبرت اَور نصیحت کا ذریعہ بنالینا چاہیے۔

(۶)

فاضل صاحب بہت ہی لائق اُور محنتی آدمی تھے جو عزم کر لیتے وہ پورا کر کے دم لیتے چنانچہ اُنہوں نے عربی پر کامل عبور حاصل کر لیا حتیٰ کہ اُنہیں سعودی عرب کے ایک اعلیٰ سرکاری ادارے میں باعزت ملازمت مل گئی اُور وہ اس حیثیت میں بیس بائیس سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے...... نتیجہ یہ کہ اُنہوں نے لاہور کی ایک معروف بستی میں دو کنال کا پلاٹ خریدا۔ دو منزلہ فراخ، شاندار گھر بنایا جس میں کم از کم دس مرلے کا پائین باغ تھا۔ اللہ نے اُنہیں رزق کی فراخی، فراوانی اُور دنیاوی عزت سمیت بے شمار نعمتیں عطا فرمادی تھیں۔

اولاد کے حوالے سے بھی وہ بہت خوش نصیب واقع ہوئے تھے۔ خدا نے اُنہیں پانچ بیٹے اُور تین بیٹیاں عطا فرمادیں۔ ساری اولاد لائق فائق تھی۔ چنانچہ پانچ بیٹوں میں سے تین ایم بی بی ایس ڈاکٹر بن گئے ایک نے انگلینڈ سے فزکس میں پی ایچ ڈی کر لی، ایک چارٹرڈ اکاونٹنٹ بن گیا اُور سب سے بڑا صرف بی ایس سی کر سکا اُور اُس نے ایک جنرل سٹور بنا لیا۔

لیکن حیرت انگیز طور پر فاضل صاحب نے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کو عربی یا اسلامیات کے قریب تک نہ پھٹکنے دیا نہ اُن کی دینی تربیت کی چنداں کوشش کی چنانچہ سب دنیا کمانے میں لگ گئے اُور نمازوں کی طرف سے بے عملی اُور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ دو ڈاکٹر بھائی تو لاہور سے باہر تھے۔ ایک امریکہ میں تھا، دوسرا کسی دوسرے شہر میں پریکٹس کرتا تھا، لیکن تین بھائی اسی شہر میں تھے اُور وہ میرے مشاہدے میں رہتے تھے۔ بڑا نمازوں کے معاملے میں تشویش ناک حد تک بے پروا تھا۔ موڈ بن جاتا تو مسجد میں چلا جاتا، ورنہ کئی کئی دن نظر نہ آتا۔ حتیٰ کہ جب فاضل صاحب سعودی عرب سے ریٹائر ہو کر پاکستان آ گئے اُور وہ سختی سے نمازوں کی پابندی کرتے تھے تب بھی اُن کا یہ بیٹا نمازوں کی باقاعدگی اختیار نہ کر پایا...... نتیجہ یہ کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی اس وعید

کی لپیٹ میں آ گیا کہ جو شخص جان بوجھ کر نماز چھوڑتا ہے اللہ اُس پر سے اپنی حفاظت اٹھالیتا ہے چنانچہ ایک روز جبکہ عین نمازِ ظہر کے وقت وہ موٹر سائیکل پر گھر کی طرف جارہا تھا، ایک گاڑی سے اس کی ٹکر ہوئی اَور وہ شدید ترین انداز میں حادثے کا شکار ہوگیا۔ اُس کے دونوں بازو اَور دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ کئی پسلیاں فریکچر ہوگئیں، اُس کی موٹر سائیکل ٹوٹ پھوٹ گئی، وہ بے ہوش ہوگیا اَور اُسے ٹکر مارنے والی گاڑی فرار ہوگئی۔

حادثے کے دوسرے روز مَیں محمود کی عیادت کے لیے جنرل ہسپتال گیا۔ اُف خدایا، مَیں اس کی حالت دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ اس کے پاؤں کی طرف بھی اَور ٹانگوں کی طرف بھی وزن بندھے ہوئے تھے۔ دونوں بازو اَور دونوں ٹانگیں جکڑی ہوئی تھیں اَور سارا بدن پٹیوں میں ملفوف تھا اَور وہ انتہائی اذیت اَور بے بسی کی حالت میں چت لیٹا ہوا تھا اَور اُس کی آنکھیں اشک فشانی میں مصروف تھیں۔ کم از کم ایک مہینے تک وہ اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ اب بھی اس کی یہ تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے تو مَیں خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔

کم و بیش دو سال تک محمود زیرِ علاج رہا اَور بمشکل چلنے پھرنے کے قابل ہو سکا۔ اس واقعے کو تقریباً پندرہ برس گزر گئے ہیں۔ وہ اب بھی لنگڑا کے چلتا ہے اَور اُس کا دایاں ہاتھ نیم مفلوج ہے۔

فاضل صاحب مکہ سے ریٹائر ہو کر آئے، تو عربی کا بہت بڑا کتب خانہ ساتھ لائے۔ اُن کے سامنے تحقیق اَور تصنیف و تالیف کا وسیع منصوبہ تھا، لیکن تقریباً ڈیڑھ سال ہی گزرا تھا کہ وہ ایک روز عارضۂ قلب سے وفات پا گئے۔ حالانکہ اُن کی عمومی صحت بہت ہی اچھی تھی۔ اُنہیں کوئی خطرناک بیماری لاحق نہ تھی اَور اُن کے چہرے کا سرخ و سفید رنگ کسی بھی عارضے کی چغلی نہیں کھاتا تھا۔

فاضل صاحب کے جس بیٹے نے سی۔ اے کیا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے وہ گردوں کے مرض میں مبتلا ہوگیا۔ کچھ ہی عرصے میں اُس کے دونوں گردے بیکار ہوگئے اَور گردے کی تبدیلی کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اس موقع پر گھر ہی میں مقیم اس کے ڈاکٹر بھائی نے کمال ایثار سے کام لیا اَور چارٹرڈ اکاونٹنٹ بھائی کو ایک گردہ دے دیا۔ اس طرح اُس کی زندگی کی گاڑی بھی چلنے لگی، لیکن دردناک

حادثہ یہ ہوا کہ تقریباً دو سال کے بعد ڈاکٹر بھائی کو ایک رات دل میں شدید تکلیف ہوئی۔ اُسے شیخ زید ہسپتال لے جایا گیا۔ وقتی طور پر اُس کی صحت سنبھل بھی گئی، لیکن بدقسمتی سے دوسرے دن دوپہر کو دوبارہ اٹیک ہوا اَور وہ خالقِ حقیقی سے جاملا۔ اُس وقت اُس کی عمر بمشکل چالیس سال تھی۔ اس کی بیوی کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ نہیں تھی اَور اُس کی ایک کمسن بیٹی اَور ایک بیٹا تھا۔

چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بھائی اس حادثے کے بعد کوئی پانچ برس تک صحت مند زندگی گزارتا رہا۔ وہ ایک بڑی کمپنی میں مینجر کے عہدے پر فائز تھا اَور بہت اچھی تنخواہ لے رہا تھا۔ مگر گذشتہ برس جولائی میں وہ بھی شدید بیمار ہوا اَور جوان بیوی اَور دو چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر راہیٔ ملکِ عدم ہوگیا۔ اس کی عمر بھی چالیس سال سے کم تھی۔ یہ ڈاکٹر سے چھوٹا تھا۔

چارٹرڈ اکاونٹنٹ کی وفات پر فاضل صاحب کے بیٹوں کے حوالے سے بعض بہت منفرد اَور حیرت انگیز مثالیں سامنے آئیں۔ یہ درست ہے کہ مَیں نے اِن میں سے کسی بھائی کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا، لیکن یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ غیر معمولی انداز میں سنگ دل ہیں اَور اِن کے آپس کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہیں۔ مثال کے طور پر جو صاحب (انہیں آصف کے نام سے موسوم کر لیجئے) فزکس میں پی ایچ ڈی ہیں اَور یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں، وہ سگے بھائی کی موت پر آٹھ گھنٹے کے بعد تقریباً ایک بجے تشریف لائے، حالانکہ وفات کا یہ حادثہ صبح پانچ بجے رونما ہو چکا تھا اَور وہ یہاں سے زیادہ سے زیادہ پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے تھے۔ ایک صاحب نے بات کی تو اُنہوں نے مکمل بے حسی کے ساتھ فرمایا: مَیں تو اب بھی بڑی مشکلوں سے نکلا ہوں۔ مصروفیت ہی بہت تھی اَور جنازہ پڑھنے کے تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلے گئے۔

اسی طرح جو ڈاکٹر بھائی باہر کے ایک شہر میں مقیم ہیں وہ آئے تو انہیں دیکھ کر مَیں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ خاصے کمزور تھے اَور اُن کے چہرے کا رنگ زردی مائل سیاہ ہو چکا تھا۔ پتہ چلا ہیپاٹائٹس کے مریض ہیں۔ یہ بھی جنازہ پڑھ کر اَور تھوڑی دیر ٹھہر کر عصر کے بعد واپس چلے گئے......
امریکہ والا بھائی تو آیا ہی نہیں، وہ ڈاکٹر کی وفات پر بھی نہیں آیا تھا۔

اَور مَیں سمجھتا ہوں کہ فاضل صاحب کے خاندان پر یہ جو وبال آیا: ایک بیٹا حادثے کا شکار ہو کر نیم معذور ہو گیا، دو عین جوانی میں زندگی ہار گئے اَور باقی اخلاص اَور محبت سے محروم ہیں اُس کا سبب یہ ہے کہ فاضل صاحب نے دین کا بھرپور ادراک رکھتے ہوئے بھی سب بیٹوں کو صرف دنیا کمانے کا سبق سکھایا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر اُن کے بیٹے ڈاکٹر بن گئے، اعلیٰ ڈگریوں کے حامل ہو گئے اَور اونچے عہدوں پر پہنچ گئے تو اُن کی زندگی ہر لحاظ سے مطمئن اَور پُرسکون گزرے گی اَور وہ دولت اور عہدوں کے سہارے بڑی دیر تک صحت مند اَور زندہ رہیں گے لیکن وہ بھول گئے کہ صحت، زندگی اَور مسرت وشادمانی کا تعلق اخلاص اَور عمل سے ہوتا ہے، اللہ کی سچی اطاعت اَور اُس کے بندوں کی خدمت میں مضمر ہوتا ہے۔ کاش وہ اس کا احساس کرتے، کاش وہ اس حقیقت کا ادارک کر لیتے۔

(۷)

شیخ عظیم صاحب ایک عالم دین کے بیٹے تھے۔ خود بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے وہ بہت اچھے انشا پرداز تھے، کامیاب مصنف تھے اُور تقریر اُور خطابت میں بھی اُنہیں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ اللہ نے اِن خوبیوں کی وجہ سے اُنہیں بہت عزت عطا فرمائی اُور اُنہیں اپنے معاشرے اُور ماحول میں ایک حیثیت حاصل ہوگئی جو قابلِ رشک تھی، لائقِ تحسین تھی۔

لیکن حیرت کی بات ہے کہ ذاتی اُور خانگی حوالے سے بدنصیبی عظیم صاحب کی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ سنا ہے اُن کی بیگم ایک خوش اخلاق، خوش مزاج اُور سلیقہ مند خاتون تھی اُور وہ مکمل صحت مند تھی کہ اُسے چند روز تک بخار ہوا اُور پھر وہ ایک دن یکا یک دم توڑ گئی۔ وفات کے وقت اُس کی عمر 34، 35 سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ اپنے پیچھے دو ننھے بیٹے یادگار چھوڑ گئی۔

اللہ مجھے معاف کرے، یہ میرا ذاتی نقطہ نظر ہے، کوئی قاعدہ کلیہ نہیں کہ بیویاں کم از کم جوانی کے دور میں نہ تو بلا وجہ بیمار ہوتی ہیں نہ بلا وجہ طبعی عمر سے پہلے مرتی ہیں، بلکہ یہ دراصل خاوندوں کے اعمال اُور روّیے ہوتے ہیں، جو اِن المیّوں کا سبب بنتے ہیں اُور خاوندوں کو شدید ترین پریشانیوں اُور مسائل کے گرداب میں پھینک دیتے ہیں۔

چنانچہ دو ننھے بچوں کی موجودگی میں بیگم کی وفات نے عظیم صاحب کی دنیا اندھیر کر دی اُور وہ غیر معمولی مسائل اُور پریشانیوں میں گھر گئے۔ کم از کم ایک سال تک تو ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ بیوی کی وفا شعاری، خوش مزاجی اُور سلیقہ مندی کو یاد کرتے اُور پھر بچوں کی بے بسی کو دیکھتے تو بے اختیار رو پڑتے، لیکن محض رونے ہی سے تو مسائل حل نہیں ہوا کرتے، چنانچہ خاندان اُور والدین کے تقاضے اُور مشورے سے وہ دوسری شادی پر آمادہ ہو گئے، اُور یوں بھی ان کی عمر ابھی چالیس سال ہی تو تھی، اُور اس زمانے میں دوسرے ساتھی کی ضرورت

قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔

چنانچہ ... صاحب اپنے ایک بااثر، ثروت مند دوست کے پُر اصرار مشورے کو ٹال نہ سکے اور اُنہوں نے اُن کے ایک عزیز کی بیٹی سے شادی کر لی۔ یہ لڑکی تیس بتیس سال کی تھی اور بدقسمتی سے بیوہ ہو گئی تھی۔ اُس کی گود میں دو سال کی ایک بچی بھی تھی۔ عظیم صاحب کے دوست نے اُنہیں قائل کر لیا تھا کہ وہ ایک نوجوان بیوہ کی سرپرستی کریں گے اور ایک کم عمر یتیم بچی کی پرورش کریں گے تو اُنہیں خصوصی اجر ملے گا اور سارے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔

لیکن عمل کی دنیا میں ایسا نہ ہوا۔ عظیم صاحب کی نئی بیگم سدا کی بیمار تھی، اُسے موٹاپا تھا اور گھٹنوں میں مستقل درد تھا۔ چنانچہ یہ شادی کر کے عظیم صاحب کو ذرا بھی سکون نہ ملا بلکہ عملی اور ذہنی اعتبار سے اُن کے مسائل میں اضافہ ہو گیا...... نتیجہ یہ ہوا کہ پنتالیس سال کی عمر سے پہلے اُنہیں شوگر کے مرض نے آلیا اور بمشکل پچاس سال کے ہوئے تھے کہ ایک روز اُنہیں سینے میں شدت کا درد شروع ہو گیا...... تشخیص ہوئی تو پتہ چلا کہ اُن کے دل کی تین رگیں بند ہیں اور ایک والو میں بھی خرابی ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک بڑے ہسپتال سے آپریشن کرایا۔ جس پر کم از کم چار لاکھ روپے خرچ ہو گئے۔

ان خطرناک بیماریوں کی وجہ سے اللہ کی کتنی ہی نعمتیں ہیں جن سے وہ محروم ہو گئے ہیں۔ نہایت مفید میٹھی چیزوں یعنی شہد، کھجور، آم وغیرہ سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ چاول اور گوشت نہیں کھا سکتے۔ نمکین چیزیں یعنی سموسے، پکوڑے وغیرہ ان کے لیے ممنوع ہیں۔ حتیٰ کہ حلوہ جو علماء کے گھرانوں کی خاص پسندیدہ ڈش ہے، وہ اِن سے دور ہے اور وہ مختلف مواقع پر بڑی حسرت سے کھانے والوں کو دیکھتے ہیں اور ٹھنڈی آہ بھر کر منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔

سوچتا ہوں کہ عظیم صاحب اِن غیر معمولی مسائل سے دوچار کیوں ہوئے؟ نہایت خطرناک بیماریوں نے اُن کا گھیراؤ کیوں کر لیا اور طرح طرح کی پریشانیاں اور محرومیاں اُن کا مقدر کیوں بن گئیں......؟ آپ کہیں گے یہ محض تقدیر کا چکر ہے، یہ محض اتفاق ہے...... لیکن میں اس نقطہ نظر کو

تسلیم نہیں کرتا اُور جیسا کہ بعض دیگر مقامات پر اس امر کا اظہار کر چکا ہوں کہ قرآن پاک اُور نبی اکرم ﷺ کے مستند فرمودات کی روشنی میں جن بُرے حالات سے ہمیں سابقہ پیش آتا ہے وہ ہمارے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔

اس حوالے سے قرآن پاک کا فیصلہ دوٹوک ہے (ترجمہ) ''اے انسان تجھے جو بھلائی حاصل ہوتی ہے، اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے۔ اُور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ تیرے اپنے کسب وعمل کی بدولت ہے۔'' (سورۃ النساء آیت ۷۹) اُور نبی اکرم ﷺ نے بھی واشگاف انداز میں فرمایا: تم جو نیکی کرتے ہو، اللہ اُس کا اجر قیامت کے لیے مخصوص کر لیتا ہے، لیکن تم جو گناہ کرتے ہو اس کا وبال تم بیماریوں اُور مصیبتوں کی صورت میں اسی دنیا میں بھگت لیتے ہو۔

اُور عظیم صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اُن کے گناہوں کا اُور جرائم کا وبال تھا۔ یہ شخص دینی شناخت رکھتا تھا اُور دینی شناخت کے ایک تعلیمی ادارے کا مالک بھی تھا۔ لیکن بدقسمتی سے یہ دولت سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا اُور عربی کا ایک مقولہ اس کے مزاج اُور کردار پر صادق آتا تھا کہ اثنان لاَیشبعَان طالب العلم وَ طالب المال یعنی دو آدمیوں کی حرص کبھی نہیں بھرتی، طالب علم کی اُور طالب المال کی...... اُور حالانکہ اس بدنصیب کا گہرا تعلق کتاب سے بھی تھا، لیکن قرآن ہی کے فرماں کے مطابق کہ ہم نے اُسے اوپر اٹھانا چاہا تھا مگر وہ زمین سے چپک کر رہ گیا (سورہ اعراف :۱۷۵-۱۷۶) اس نے علم اُور کتاب سے منہ موڑ کر دولت ہی کو اپنا معبود بنا لیا اُور اس کے حصول کے لیے ہر اُصول اُور قدر کو پاؤں تلے روند ڈالا......

مجھے پتہ چلا کہ جب علامہ اقبال ٹاؤن کی اسکیم کا آغاز ہوا تو وہاں سبزی منڈی میں دکانوں کے لیے پلاٹوں کی الاٹ منٹ کا یہ اصول بنایا گیا کہ صرف ان لوگوں کو پلاٹ دیئے جائیں گے جو زرعی زمین کے مالک ہوں گے اُور حالانکہ عظیم صاحب ایک مرلہ زرعی زمین کے مالک نہ تھے لیکن اُنہوں نے اپنے ایک زمیندار دوست سے زرعی زمین کی ملکیت کے جعلی کاغذات بنوائے اُور سبزی منڈی میں ایک پلاٹ الاٹ کرا لیا اُور اُن کے ضمیر میں کوئی کسک پیدا نہ ہوئی۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا عظیم صاحب پراپرٹی، ڈیلر بھی تھے۔ اُن کے ایک غریب دوست نے اُن سے ایک بستی میں پلاٹ خریدا، لیکن جب پانچ چھ سال کے بعد اُس نے وہاں تعمیر کرنی چاہی، تو پتہ چلا کہ یہ پلاٹ تو عظیم صاحب نے آگے کسی دوسرے خریدار کے ہاتھ بیچ دیا ہے...... اس پر خاصی ناگوار صورتِ حال پیدا ہوئی اَور اتنا عرصہ گزرنے کے بعد عظیم صاحب نے بڑی مشکلوں سے اصل رقم واپس کی حالانکہ اُس بستی میں پلاٹوں کی قیمت کئی گنا بڑھ چکی تھی۔

ایک غریب موچی نے سستے زمانے میں بازار میں ایک مرلے کا کمرشل پلاٹ خرید لیا اَور اُس پر دکان بنائی، مگر زمین کے مالک نے اُسے رجسٹری کر کے نہ دی۔ پندرہ بیس سال گزر گئے، موچی جب بھی رجسٹری کا مطالبہ کرتا، زمیندار ٹال دیتا۔ موچی نے تنگ آ کر عظیم صاحب سے بات کی کہ میری مدد کریں۔ عظیم صاحب غیر معمولی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ وہ بڑی آسانی سے اس غریب کی دادرسی کر سکتے تھے۔ مگر اُنہوں نے موچی کو پیش کش کی کہ دکان میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ مَیں جانوں اَور زمیندار جانے...... کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر لاچار ہو کر موچی نے وہ دکان عظیم صاحب کے ہاتھ فروخت کر دی۔ تین لاکھ کا سودا ہوا، عظیم صاحب نے اُسے پونے تین لاکھ ادا کیے۔ دکان کی رجسٹری اپنے نام کرالی اَور جلد ہی اُسے پندرہ لاکھ میں بیچ دیا۔ یہ ہے عظیم صاحب کا ذہنی اخلاق، یہ ہے غریب پروری اَور خدمتِ خلق کا جذبہ واقعی سچ کہا ہے کسی نے کہ ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔

اَور ایک قریبی علاقے کے بہت سے لوگوں سے تو عظیم صاحب نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ اُنہیں معتبر ذرائع سے پتہ چلا کہ اوڈھ قبیلے کے جو پچیس تیس خاندان گذشتہ پچاس برس سے ایک جگہ رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں تو اس زمین کا قانونی طور پر کوئی والی وارث نہیں ہے۔ دو لاولد میاں بیوی تھے، وہ بوڑھے ہو کر مر کھپ گئے، اُن کا کوئی قریبی رشتہ دار بھی نہ تھا...... نتیجہ یہ کہ غریب اوڈھوں نے جگہ خالی دیکھ کر وہاں رہائش اختیار کر لی اَور مکان بنا لیے۔

عظیم صاحب کو جب اس صورت حال کا علم ہوا تو اُنہوں نے اپنے اثر و رسوخ سے تحصیل دار

اَور پٹواریوں سے مل کر اس زمین کا انتقال اپنے نام کرالیا...... پھر پولیس کے ساتھ دوڈھائی سو افراد کولیا، بلڈوزر لئے اَور اچانک چھاپہ مار کر بہت ہی مختصر نوٹس پر قدیم مکینوں کے مکان گرادیئے اَور اس پر بزور قبضہ کرلیا۔ اُن کا سارا سامان پولیس والوں نے اَور عظیم صاحب کے آدمیوں نے لوٹ لیا۔ اس طرح شیخ عظیم نے دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً تیس کنال قیمتی جگہ پر قبضہ کرلیا۔ اُسے رہائشی پلاٹوں میں تقسیم کر کے فروخت کردیا اور کم از کم دس کروڑ روپے وصول کرلیے۔ تاہم اس معاملے میں بھی اُن کی ''دینی حِس'' بیدار رہی اَور اُنہوں نے وہاں سات مرلے میں ایک مسجد بھی بنوادی۔ جہاں پنج وقتہ نماز ہوتی ہے اور جمعہ بھی۔ میرا گمان ہے ان نمازوں میں بے خانماں، غریب اوڑھوں کی بحالی کے لیے دعائیں بھی کی جاتی ہیں۔ شیخ عظیم بہرحال ایک دردمند عوامی رہنما ہیں۔

ظاہر ہے اس کردار اَور روّیے کے ساتھ عظیم صاحب کو سکون اَور اطمینان کی نعمت کیسے حاصل ہوسکتی ہے۔ اس فضا میں تو بیماریوں کی یلغار ہونی چاہئے، بے اطمینانی، بے قراری اَور بے خوابی کی شدت ہونی چاہیے۔ چنانچہ مکافاتِ عمل کے عین مطابق عملی طور پر اس شخص کی زندگی حرام ہوکر رہ گئی، تفکرات اَور پریشانیاں اس کے ذہن پر اس طرح ہجوم کیے رہتی ہیں کہ اس کے دنوں کا چین اَور راتوں کی نیند حرام ہوئی رہتی ہے۔ چنانچہ سکون کے حصول کے لیے یہ دور دراز کے سفر کرتا ہے، امریکہ اَور یورپ کے خوبصورت مقامات کی خاک چھانتا ہے، پاکستان کے دلفریب پہاڑی مقامات کی سیاحت کرتا ہے اَور اس کا مقصد صرف اَور صرف سکون کی تلاش ہے حالانکہ یہ سعیِ لاحاصل ہے، اُسے سکون کبھی نہیں مل سکتا، ہرگز نہیں مل سکتا۔ یہ پکی بات ہے یہ حتمی بات ہے۔ خلق کو دکھ دینے والا، دولت کا بچاری کبھی خوش نہیں رہ سکتا، ہرگز نہیں رہ سکتا۔

(۸)

چودھری مشتاق جٹ بھی ایک دینی جماعت کے رُکن تھے بلکہ اس جماعت کے ایک اشاعتی ادارے کے منیجر تھے اَور اپنے علاقے کے میونسپل کونسلر بھی، لیکن مَیں نے اُن کے رویوں میں غیر سنجیدگی کو جاری وساری دیکھا۔ مجھے یاد ہے گوجرانوالہ میں ایک بہت بڑے اَور مثالی عالمِ دین وفات پا گئے۔ اُن کے جنازے میں شرکت کے لیے لاہور سے ایک تعزیتی گروپ روانہ ہوا اَور جونہی اُن کی گاڑی اس جماعت کے مرکز سے باہر نکلی، جٹ صاحب اَور ان کے ایک اَور ساتھی نے لطیفہ گوئی شروع کردی اَور زوردار قہقہے فلائنگ کوچ میں گونجنے لگے۔ آٹھ دس منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا اَور جب کسی طرح تھمنے میں نہ آیا، تو کچھ لوگوں نے اس روش پر احتجاج کیا اَور جٹ صاحب کو لعن طعن کی، تو وہ بادلِ نخواستہ خاموش ہونے پر مجبور ہو گئے۔

جٹ صاحب گھریلو سطح پر بظاہر پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ اُن کے دو بیٹے اَور تین بیٹیاں تھیں، سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اُن کی بیگم سنا ہے کہ ایک سلجھی ہوئی، باوقار خاتون تھی کہ جٹ صاحب کو اُن کی غیر سنجیدگی اَور بے عملی نے مسائل کی عجیب دلدل میں پھنسا دیا۔

ہوا یوں کہ تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں جٹ صاحب پر عشق کا بھوت سوار ہو گیا۔ وہ کونسلر تھے، کسی ذاتی کام کے سلسلے میں اُن کے پاس ایک جوان شادی شدہ عورت آئی جو بہت خوبصورت اَور چنچل تھی۔ وہ ایک غریب چھابڑی فروش مزدور کی بیوی تھی اَور اس کے بچے بھی تھے اس کی خوبصورت، دلکش شخصیت کا مجھے یوں اندازہ ہوا کہ ایک بار جٹ صاحب نے کسی سلسلے میں اُس کے کاغذات تصدیق کے لیے میرے پاس بھیجے تھے اَور اُن کاغذات پر خاتون کی رنگین تصویر چسپاں تھی...... بہ ہرحال جٹ صاحب اُس خاتون پر بری طرح ریجھ گئے۔ اُسے ورغلا کر خاوند

سے طلاق حاصل کرائی اور پھر اُس سے شادی کر لی۔

جٹ صاحب کی اس حرکت پر اُن کے خاندان میں بڑا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اُن کے لڑکوں نے گھر میں اُن کا داخلہ بند کر دیا اَور اُنہوں نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دی۔ جٹ صاحب نے اپنے دفتر کے قریب ایک بستی میں پانچ مرلے کا مکان کرائے پر لے لیا اَور نئی بیوی کے ساتھ وہاں براجمان ہو گئے۔ نئی بیوی کے ساتھ سات آٹھ سال کی ایک بچی بھی تھی۔

اس کے بعد حالات نے جو کروٹیں بدلیں اُس نے جٹ صاحب کے سارے بل نکال دیئے اَور اُن کی منافقت اَور بے عملی کی اُنہیں خوب خوب سزا ملی۔ چنانچہ اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ انہیں ملازمت سے جواب مل گیا۔ وہ بے روزگار ہو گئے اَور بالکل قلاش ہو گئے۔ تلافی کی خاطر اُنہوں نے ایک ڈرامہ رچایا اَور جگہ جگہ سارے حلقۂ احباب میں یہ بات پھیلائی کہ اُن کی بیوی کو کینسر ہو گیا ہے اَور اُس کے علاج پر اُن کا بے پناہ خرچ ہو گیا ہے اَور یہ کہ اس مقصد کی خاطر انہیں مالی امداد کی ضرورت ہے...... جٹ صاحب کی لاٹری نکل آئی اَور گلی کے ایک خاندان سے بیگم جٹ کی لڑائی ہو گئی۔ مقابلے میں بھی جٹ ہی تھے، اُن کے جوان لڑکے کو جوش آ گیا، وہ بندوق لے آیا اَور آتے ہی بیگم جٹ کی طرف فائر کر دیا۔

گولی بیگم جٹ کے کندھے کو چھیدتی ہوئی نکل گئی۔ وہ گر گئی، جٹ صاحب اُسے ہسپتال لے گئے۔ حملہ آور کے خلاف قتل کا مقدمہ درج ہو گیا اَور وہ گرفتار ہو گیا۔ تب صلح کی کوششیں رنگ لائیں اَور جٹ صاحب کو مخالفوں کی طرف سے دو لاکھ کی رقم مل گیا۔ اُن دنوں جٹ صاحب بہت خوش تھے، خوب چہکتے تھے، اُن کی زبان مخالفوں کو طنز و تمسخر کا نشانہ بناتی لیکن دل ہزار ہزار شکر بجالاتا تھا۔

بیگم جٹ کم و بیش دو ہفتے ہسپتال میں زیرِ علاج رہی، مگر جٹ صاحب ظاہر ہے ہمہ وقت تو اُس کے پاس ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ اس کا فائدہ اُن کی بیگم نے اٹھایا، اُسے ہسپتال میں جٹ صاحب سے بھی بڑا کوئی ''مہربان'' مل گیا اَور وہ ایک روز ہسپتال ہی سے اُس کی پناہ میں چلی گئی...... جٹ صاحب ایک بار پھر بے سہارا ہو گئے۔

جٹ صاحب چند ماہ پہلے وفات پا گئے ہیں۔ اُن کے آخری ایام بے بسی اُور کسمپرسی کا عجیب نمونہ تھے۔ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں کی مکمل تصویر تھے۔ ناداری اُور بے چارگی کے ساتھ جوان ہوتی ہوئی بیٹی نے بھی انہیں خوب ہلکان کئے رکھا اُور اسی اندوہناک کیفیت میں وہ ایک روز دم توڑ گئے۔

(۹)

مَیں نے جو اپنی زندگی میں چند بہت اچھے قاری دیکھے ہیں، اُن میں قاری کفیل صاحب سرِفہرست ہیں۔ مَیں جنوری ۱۹۸۰ء میں اس بستی میں مقیم ہوا، تو قاری صاحب مقامی مسجد میں نماز پڑھا رہے تھے اَور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ کم از کم پچیس سال تک میں نے موصوف کی امامت میں نمازیں ادا کیں۔ وُہ بہت خوش الحان قاری تھے، قرأت کے رموز سے خوب واقف تھے، اَور تکلّف اَور تصنّع سے پاک خوبصورت آواز میں سماں باندھ دیتے تھے، جس سے دل و دماغ ہی نہیں آنکھیں بھی فیض یاب ہوتی تھیں اَور میرے دل میں قاری صاحب کا بے حد احترام پیدا ہو گیا تھا۔ مختلف حوالوں سے اُن کی خدمت کر کے خوشی ہوتی تھی۔

لیکن اِن خوبیوں کے باوصف مَیں قاری صاحب کے گھریلو حالات اَور ذاتی روّیوں کو دیکھتا تو سخت پریشان ہوتا تھا۔ اُن کے تین بیٹے تھے جن میں سے ایک ذہنی طور پر معذور تھا جبکہ دوسرے دونوں بھی خوش اخلاق نہ تھے اَور انہیں احساس ہی نہ تھا کہ باپ کے کسی دوست سے یا بڑے آدمی سے بات کیسے کی جاتی ہے۔

قاری کفیل خاصے امیر آدمی تھے۔ اس بستی میں عرب ممالک سے اَور دنیا بھر سے لوگ آتے تھے اَور اُن کی اقتداء میں نماز پڑھتے ہوئے اُن کی قرأت سے متاثر ہو کر رازداری سے انہیں بھاری نذرانے دے جاتے تھے۔ اُس سے قاری صاحب نے ایک بہت اچھی نواحی بستی میں پانچ پانچ مرلے میں چار فلیٹ بنوا رکھے تھے۔ ایک اَور قریبی بستی میں اُن کا دس مرلے کا پلاٹ تھا۔ ایک اَور جدید بستی میں آٹھ دس دکانوں پر مشتمل اُن کی ایک مارکیٹ تھی اَور متعدد خالی پلاٹ بھی تھے۔ اُنھوں نے لڑکیوں کے لیے حفظ کا ایک ذاتی مدرسہ بھی قائم کر رکھا تھا اور وہ بچیوں سے اچھی

خاصی فیس وصول کرتے تھے، لیکن اُن کے لالچ اَور حُبِ زر کا یہ عالم تھا کہ کسی سے کوئی رعایت نہیں کرتے تھے۔ مَیں نے ایک یتیم بچی کی سفارش کی، مگر قاری صاحب نے بُرا منایا اَور فیس کے بغیر اس بچی کو پڑھانے سے انکار کردیا۔

قاری صاحب میں تنگ نظری بھی بہت تھی اَور شکر کے احساس سے وہ بالکل عاری تھے۔ مَیں نے جب اس بستی میں اقامت اختیار کی تو پہلے رمضان المبارک میں مَیں روزانہ رات کو تھرماس میں قاری صاحب کے لیے چائے لے جایا کرتا تھا تاکہ تراویح کے دوران وہ ضرورت کے تحت اسے نوش کرتے رہیں اَور تھکن محسوس نہ کریں...... دواؤں کے حوالے سے بھی مَیں ان کے سارے خاندان کی خدمت کرتا رہتا تھا، لیکن قاری صاحب نے میرے جذبات کی کوئی قدر نہ کی، رمضان کی آخری رات کو تھرماس گھر لے گئے جسے اُن کے بچوں نے توڑ دیا...... اَور جب ایک موقع پر میں نے اُن کی ایک ممدوح شخصیت سے اصولی اختلاف کیا، تو قاری صاحب نے میری کردارکشی میں اَور مجھے ذہنی اذیت دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

قاری صاحب میں اپنے ساتھیوں کے لیے حسد کا جذبہ بھی خاصا تیز تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو مسجد کا موذّن مقرر کرانا چاہتے تھے، اس کے لیے اُنہوں نے موجودہ موذّن کے خلاف سازش کی اَور اُسے رسوا کر کے اس منصب سے الگ کرادیا۔ تحفیظ القرآن کے ایک قاری اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے اُن کے برابر آرہے تھے، اُن کے خلاف بھی اُنہوں نے الزام تراشی کی مہم چلائی اَور مدرسے سے اُن کا بھی اخراج کرادیا۔

دیکھنے میں آیا ہے اَور اس سلسلے کی متعدد مثالیں میرے سامنے موجود ہیں کہ اگر ایک شخص دینی پہچان رکھتا ہو، مگر پھر خلقِ خدا سے بے اصولی کرتا ہو اَور دھاندلی کا ارتکاب کرتا ہو، تو وہ بہت جلد اللہ کی گرفت میں آجاتا ہے۔ قاری کفیل صاحب کے ساتھ بھی ایسا ہی حادثہ پیش آیا۔ پیسے سے غایت درجے کی محبت، غیر معمولی نوعیت کی خست، جذبہ شکر کا فقدان اَور حسد کا جذبہ رنگ لایا اَور قاری صاحب کا حافظہ تیزی کے ساتھ کمزور ہونے لگا۔ عام نمازیں تو وہ ٹھیک طرح سے پڑھا

لیتے تھے، لیکن تراویح میں وہ تسلسل کے ساتھ بھولنے لگے اَور پانچ چھ سال کے بعد وہ اس قابل نہ رہے کہ تراویح کی امامت کرا سکیں۔ مسجد کمیٹی کو متبادل انتظام کرنا پڑا...... اَور جب اُنہوں نے قاری ظہور بخش صاحب کے خلاف چغلی اَور الزام تراشی کی مہم چلائی اَور انکوائری کمیٹی کے سامنے حلفاً اِن الزامات کو دہرایا تو حیرت انگیز طور پر متعلقہ دفتر سے باہر نکلتے ہی اُن کا دماغ اُلٹ گیا، وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے اَور گھر آتے ہی اُن پر پاگل پن کا شدید دورہ پڑا۔ اُنہوں نے برتن توڑنے شروع کر دیے اَور بیوی بچوں کو مارنے لگ گئے۔ تب گھر والوں نے انہیں دماغی امراض کے ایک شفا خانے میں داخل کرا دیا جہاں وہ کئی ماہ تک زیرِ علاج رہے اَور جب شفایاب ہو کر گھر آئے، تو اُن کی یادداشت غیر معمولی حد تک کمزور ہو گئی تھی اَور وہ اس قابل نہیں رہے تھے کہ امامت کے فرائض انجام دے سکیں چنانچہ انہیں اس منصب سے فارغ کر دیا گیا۔

اب قاری صاحب اپنے ذاتی مکان میں ایک نواحی بستی میں رہتے ہیں۔ اُن کے دونوں بیٹے اسلام آباد میں مقیم ہیں اَور وہ خود اپنے معذور بیٹے کے ساتھ مکمل بیکاری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کبھی کبھی اس بیٹے کا ہاتھ پکڑے اس بستی میں آتے ہیں اَور بے بسی، بے چارگی اَور حسرت و یاس کی تصویر نظر آتے ہیں۔

(۱۰)

مولانا   اسلامیات اُور عربی کے فاضل ہیں اُور لاہور کے ایک بہت بڑے دینی مدرسہ میں اُستاد ہیں۔ میرے ایک عزیز دوست نے بتایا جو اُن کے ہم وطن اُور دور کے رشتہ دار بھی ہیں، کہ مولانا   کسی زمانے میں بہت غریب آدمی تھے، پرانی سی سائیکل پر مدرسہ میں آیا کرتے تھے، لیکن مدرسہ والوں نے انہیں بیرونِ ملک سفیر بنادیا۔ وہ فصیح عربی بولتے تھے اُور بات کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے، اس لئے وہ عرب ممالک سے مدرسہ کے لیے ڈھیروں دولت لاتے رہے اُور خود بھی بہت امیر ہوگئے۔ حتیٰ کہ اُنہوں نے گاڑی خرید لی اُور اپنا مکان بھی بنالیا۔

دولت نے ان کے مزاج میں بھی بہت تبدیلی کردی۔ اب وہ طلبہ پر سختی کرتے اُور معمولی باتوں پر انہیں کلاس سے نکال دیتے۔

زر پرستی اُور احساسِ برتری نے اپنے اثرات مرتب کئے اُور مولانا   شوگر کے مرض میں شدت کے ساتھ مبتلا ہوگئے حتیٰ کہ دن میں دو بار انہیں انسولین لگانی پڑتی۔ اُن کی بیگم موٹاپے کا شکار ہوگئی اُور اس کے گھٹنے بیکار ہوگئے۔ مولانا کے تین بیٹے ہیں۔ تینوں نالائق ہیں، کسی ایک نے بھی دینی یا دنیاوی تعلیم حاصل نہیں کی۔ اُن میں سے ایک کی حادثے میں ایک آنکھ ضائع ہوگئی، تینوں بے کار اُور آوارہ ہیں اُور باپ کے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔ میرے دوست نے بتایا کہ آزاد کشمیر میں مولانا کی چند ایکڑ زمین تھی اُور مکان بھی تھے۔ بدقسمتی دیکھئے کہ ۲۰۰۵ء کے زلزلے میں سب کچھ غارت ہوگیا مکان گر گئے اُور زمین برباد ہوگئی۔

میرے یہ دوست بہت مخلص، متقی اُور خداترس انسان ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ میری زمین بھی مولانا   کی زمین کے بالکل قریب تھی، لیکن حیرت انگیز طور پر وہ زلزلے میں نہ صرف محفوظ رہی، بلکہ وہاں پانی کا ایک چشمہ بھی جاری ہوگیا۔

(۱۱)

مکہ میں موجودگی کے باوجود اللہ نے اُسے حج کی سعادت سے محروم رکھا

حافظ افتخار میرا ایم اے کا کلاس فیلو تھا۔ ستمبر ۱۹۶۴ء سے اگست ۱۹۶۶ء تک ہم دو سال یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں اردو کے طالب علم کی حیثیت سے ایک ہی کلاس میں زیر تعلیم رہے۔ وہ حافظِ قرآن تھا اور ایک مکمل عالمِ دین کا پیکر اختیار کیے ہوئے تھا۔ خوب صورت چہرے پر گھنی متشرع داڑھی، سر پر جناح کیپ، اکثر شیروانی پہنے رکھتا۔ اللہ نے اسے ایک دلکش سراپا عطا کیا ہوا تھا، لیکن افسوس! حافظ وقار اور توازن سے بالکل محروم تھا۔ اس میں ذہانت اور حکمت کی شدید کمی تھی۔ اس کا مطالعہ بھی یک طرفہ تھا اور وہ غور و فکر کا عادی بھی نہیں تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ بچپن میں ایک مخصوص مذہبی فضا میں رہنے بسنے کی وجہ سے اس کے دماغ کی سوئی بس ایک ہی جگہ اٹک کر رہ گئی تھی اور اس میں ردوبدل کی گنجائش پیدا ہی نہیں ہوتی تھی۔

مثال کے طور پر حافظ افتخار مختلف نیک نام اور بے حد روشن کردار کی حامل شخصیات سے خدا واسطے کا بغض رکھتا تھا جبکہ منفی حیثیت کے حامل افراد سے گہری عقیدت کا اظہار کرتا تھا۔ مولانا مودودی پر بے رحمی سے تنقید کرتا جبکہ غلام غوث ہزاروی کی تعریف میں رطب اللسان رہتا۔ سید قطب کو برا بھلا کہتا اور جمال عبدالناصر کو عالم اسلام کا عظیم ہیرو قرار دیتا۔ یہ معاملہ یہاں تک پھر بھی قابل برداشت تھا، لیکن اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ وہ سیدنا علی مرتضیٰؓ اور حضرت حسینؓ کو بھی سان پر چڑھائے رکھتا اور ایک فرقے کی ضد میں ان انتہائی محترم شخصیات کے خلاف دشنام طرازی سے بھی دریغ نہ کرتا جبکہ امیر معاویہ اور یزید کی خوب خوب تعریف کرتا۔

تو میں عرض کر رہا تھا کہ حافظ افتخار عجیب متضاد خصوصیات کا حامل تھا اور چھچھورا پن تو اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ایک بار ہماری کلاس کے چند لڑکوں نے ایک طرح

مزاحیہ مشاعرے کا اہتمام کیا۔ قافیہ ردیف تھا: طرح دار مونچھیں، یار مار مونچھیں۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مشاعرے میں سراسر غیر سنجیدگی بلکہ پھکڑ پن غالب تھا، لیکن حافظ اپنی داڑھی اور ٹوپی سمیت اس میں کود پڑا اور اس نے بھی مونچھوں کی مدح میں ایک ''غزل'' کہہ ڈالی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے شعروں کی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ وہ شاعر تھا ہی نہیں بلکہ شعر پڑھتا تو صاف محسوس ہوتا تھا کہ وہ بے چارے شاعر کے خلاف انتقامی کارروائی کر رہا ہے۔ یعنی عمداً اس کی روح کو اذیت دے رہا ہے۔ سننے والوں کا ذوق الگ زخمی ہوتا تھا۔

چونکہ حافظ افتخار محنتی بھی نہیں تھا اور اسے اردو شعر و ادب سے قلبی مناسبت بھی نہیں تھی، نہ وہ لکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس لیے ایم اے اردو کے امتحان میں بہت کم نمبر لے کر کامیاب ہو سکا۔ چنانچہ پبلک سروس کمیشن نے جلد ہی یعنی جولائی ۱۹۶۷ء میں اردو کے لیکچررز کی اسامیوں کا اعلان کیا اور درخواستیں طلب کیں، تو مطلوبہ شرائط پوری نہ کرنے کی وجہ سے حافظ درخواست ہی جمع نہ کرا سکا۔

یونیورسٹی اور ینٹل کالج سے فارغ ہونے کے بعد حافظ افتخار سے میرا رابطہ منقطع ہو گیا۔ یوں بھی اس سے ملنے کو جی نہیں چاہتا تھا، لیکن ۱۹۶۸ء کی گرمیوں کی بات ہے، مَیں ماہنامہ ''اردو ڈائجسٹ'' میں کام کر رہا تھا۔ سمن آباد میں اس کا دفتر تھا۔ مَیں ایک روز دوپہر کو کھانے اور نماز کے لیے باہر نکلا تو سامنے سے حافظ کو آتے ہوئے دیکھا۔ سمن آباد کے نواح میں رسول پارک ہے اور وہیں حافظ کا گھر تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے۔ لیکن خلافِ معمول مجھے دیکھ کر اس نے کسی خوشی یا گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کیا بلکہ یوں لگا کہ وہ اس ملاقات سے کچھ پریشان ہو گیا ہے۔

حافظ افتخار قریب آیا۔ اس نے بے دلی سے مصافحہ کیا۔ میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ آج کل بے روزگار ہوں، ایم اے اسلامیات کا امتحان دے رکھا ہے اور نوکری کی تلاش میں ہوں۔ مَیں نے دیکھا کہ اس کی بغل میں تین چار کتابیں تھیں۔ پوچھا یہ کتابیں کیسی ہیں تو حافظ

پر پریشانی سے زیادہ ندامت بلکہ خوف کی کیفیت طاری ہوگئی اور اس کا چہرہ پسینے میں شرابور ہوگیا......اور اسکی وجہ اس وقت میری سمجھ میں آ گئی جب مَیں نے ہاتھ بڑھا کر کتابیں اس کی بغل سے اچک لیں۔ یہ کتابیں مولانا مودودی کی تھیں: اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی وغیرہ۔ مَیں نے چونک کر حافظ کی طرف دیکھا جو شدید شرمندگی کے احساس سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ ''حافظ صاحب! یہ مَیں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مودودی کے تو آپ سخت مخالف ہیں۔ ان کی کتابیں پڑھ کر آپ کا دھرم بھرشٹ تو نہیں ہو جائے گا۔''

''اصل میں یار وہ پنجاب اسمبلی میں ٹرانسلیٹرز کی کچھ اسامیاں نکلی ہیں۔ مَیں نے وہ ٹیسٹ کوالیفائی کرلیا ہے۔ اب انٹرویو ہے اور اس کے لیے ان کتابوں کو پڑھے بغیر چارہ نہیں تھا۔''

''تو یوں کہیے نا کہ مودودی کا جادو آپ کے سر پر چڑھ کر بولا ہے۔ ہے نا یہی بات، لیکن یہ بات آپ کے عقاید اور نظریات کے خلاف نہیں ہے؟'' مَیں نے تبصرہ کیا اور حافظ خلافِ عادت خاموش رہا اور سر جھکا کر اپنے راستے پر چل دیا۔

بعد میں سنا کہ حافظ کو پنجاب اسمبلی میں مترجم کی نوکری مل گئی اور جب اس نے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کرلیا تو اسے اسلامی نظریاتی کونسل میں ملازمت مل گئی اور وہ ۱۹۷۳ء میں لاہور سے اسلام آباد منتقل ہوگیا۔

۱۹۸۵ء یا ۱۹۸۶ء میں اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا تو مَیں مولانا محمد متین ہاشمی صاحب کو ملنے کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل کے دفتر بھی گیا۔ وہیں حافظ افتخار سے ملاقات ہوئی۔ مَیں نے پوچھا کیا ہو رہا ہے تو اس نے اپنے محکمے کے افسرانِ بالا کے خلاف شکووں کا دفتر کھول دیا۔ حالانکہ اب وہ گزیٹڈ افسر تھا اور اٹھارویں گریڈ میں تھا، لیکن اس کے منہ سے شکر کا ایک کلمہ بھی ادا نہ ہوا اور جب مَیں نے اسے نومسلموں کے بارے میں اپنی مقبولِ عام کتاب ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' ہدیۃً پیش کی تو اس نے سرسری نظر سے دیکھے بغیر اُسے قریبی ریک میں پھینک دیا اور شکریے یا تحسین کا ایک لفظ بھی اس کے لبوں سے برآمد نہ ہوا۔ سچی بات ہے کہ مَیں اس کی بداخلاقی سے

بڑا ہی بددل ہوا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آ گیا۔

اور پھر برسوں بیت گئے۔ بارہ تیرہ سال گزر گئے حافظ افتخار کے بارے میں کوئی خبر نہ سنی۔ اس سے رابطہ کرنے کی دل میں کوئی خواہش ہی نہیں رہی تھی، لیکن دسمبر ۱۹۹۸ء میں ایک روز اخبار میں خبر پڑھی کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں انیسویں گریڈ کے ایک افسر حافظ افتخار اچانک ہارٹ اٹیک سے وفات پا گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انکی عمر ۵۶ برس تھی۔

قدرتی طور پر مجھے حافظ کی موت کا بہت افسوس ہوا کہ اگرچہ کمزور ہی سہی، مگر اس سے ایک دیرینہ تعلق تو تھا۔ اب مجھے جستجو تھی کہ اس کی موت کن حالات میں واقع ہوئی اور اس کا ظاہری سبب کیا تھا؟ لیکن دور ونزدیک کوئی ایسا ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ جس سے میرے تجسس کی تسکین ہو۔ مگر حیرت انگیز طور پر میری ملاقات مجاہد لاہوری صاحب سے ہوگئی۔ حیرت انگیز طور پر اس لیے کہ شاید اللہ کی مشیت یہ چاہتی تھی کہ حافظ کے بارے میں مکمل معلومات مجھ تک پہنچ جائیں اور یہ کہانی مکمل ہو کر تاریخ میں محفوظ ہو جائے اور خلقِ خدا کے لیے عبرت وموعظت کا ذریعہ بن جائے۔

مجاہد لاہوری صاحب علمی دنیا میں چنداں محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ کم وبیش ڈیڑھ درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ معروف محقق ومترجم ہیں۔ چند سال پہلے اسلامی نظریاتی کونسل سے بیسویں گریڈ میں ریٹائر ہوئے ہیں اور ربع صدی تک (۱۹۷۳ء سے ۱۹۹۸ء) انہیں حافظ افتخار کے رفیقِ کار کی حیثیت سے ایک ہی ادارے میں خدمات انجام دینے کا موقع میسر آیا ہے۔ مجاہد صاحب سے میرا تعارف ۱۹۷۰ء سے ہے جب ہم دونوں ''اردو ڈائجسٹ'' اور ہفت روزہ ''زندگی'' سے وابستہ تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد مجاہد لاہوری صاحب نے لاہور میں مستقل اقامت اختیار کرلی ہے۔ حافظ کی وفات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک روز مجاہد صاحب سے ملاقات ہوگئی اور مَیں نے ان سے اس کی تفصیل معلوم کی، تو انہوں نے ایسے عجیب وغریب انکشاف کیے جو حافظ کے مزاج اور عمومی روّیے کے حوالے سے چونکا دینے والے تو نہ تھے، مگر لرزا دینے والے ضرور تھے اور بڑے

ہی عبرت ناک بھی۔

انہوں نے بتایا کہ وہ نہ صرف حافظ کے ساتھ ایک ہی ادارے میں کام کرتے تھے اور دونوں کی رہائش گاہیں بھی ہمیشہ قریب قریب رہیں بلکہ خاصا عرصہ تو وہ حافظ کے بالکل پڑوس میں مقیم رہے۔ اس طرح وہ اس شخص کے اجتماعی اور ذاتی روّیوں کے عینی شاہد ہیں۔ چنانچہ مجاہد صاحب کی زبانی اسلام آباد میں قیام کے دوران حافظ کی زندگی کی جو تصویر بنتی ہے، وہ کچھ یوں ہے:

حافظ کا باپ اس کے بچپن ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ یہ دو بھائی تھے۔ حافظ بڑا تھا۔ ماں نے اپنے محدود وسائل کے اندر رہتے ہوئے دونوں بیٹوں کی پرورش کی۔ اسے قرآن حفظ کرایا، اسکول کی تعلیم دلائی، لیکن کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کے سارے اخراجات اسکے قریبی رشتہ داروں نے برداشت کیے جو خاصے امیر تھے اور کینال پارک گلبرگ میں رہتے تھے۔ بلکہ حافظ کے گھرانے کی بیشتر کفالت اسی خاندان نے کی۔

بدقسمتی سے اس مخیّر خاندان کی اکلوتی بیٹی کی شادی کامیاب نہ ہوئی اور اسے طلاق ہو گئی۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ حافظ افتخار ان کی مطلقہ بیٹی سے شادی کر لے۔ حافظ کی والدہ نے اس خاندان کے دیرینہ احسانات کے پیش نظر اس تجویز سے اتفاق کیا، لیکن حافظ اڑ گیا اور اس نے شدت سے انکار کیا کہ وہ خوبصورت ہے، صحت مند ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور گزیٹڈ افسر ہے پھر ایک مطلقہ لڑکی سے شادی کیوں کرے۔ ''میں ایک سیکنڈ ہینڈ عورت کو بیوی کیوں بناؤں؟'' اس کا اصرار تھا اور یہ اصرار خاصی دیر جاری رہا لیکن جب لڑکی کے والدین نے لالچ دیا کہ وہ آٹھ دکانیں، دو قیمتی پلاٹ اور ایک مکان اپنی بیٹی کو جہیز میں دیں گے اور دو لاکھ روپے نقد بھی اسے عطا کریں گے تو حافظ مان گیا۔ شادی ہو گئی۔ وہ روزمرہ استعمال کے بھاری سامان کے ساتھ، جو قیمتی جائداد کے علاوہ اسکے سسرال نے مرحمت کیا تھا، اسلام آباد منتقل ہو گیا۔

لیکن اپنے محسن عزیزوں کی ساری داد و دہش کے باوجود حافظ افتخار نے کمال دغابازی اور بےوفائی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے مختارنامے پر بیوی کے دستخط کرا لیے اور دکانیں، مکان اور پلاٹ

اپنے نام منتقل کرالیے۔ اس نے دولاکھ کی رقم پر بھی قبضہ کرلیا اور پھر اپنی بیوی کو بہانے بنا بنا کر زدوکوب کرنے لگا۔ اسے طلاق کے طعنے دیتا، اس کی توہین وتذلیل کرتا اور باقاعدہ پٹائی کرتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ بیوی ننگے سر، ننگے پاؤں جان بچا کر باہر آجاتی اور سرِ عام حافظ کو خوب ملاحیاں سناتی۔ وہ چیخ چیخ کر بتاتی کہ حافظ نمک حرام ہے، یہ میرے والدین کے ٹکڑوں پر پلا ہے اور اب مجھ سے بدسلوکی کرتا ہے۔ جانوروں والا سلوک روا رکھتا ہے۔

اور پھر ایک روز حافظ نے اپنی بیوی کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ اپنے والدین کے گھر لاہور آگئی اور اس کا باپ اس صدمے سے جان ہار گیا۔ حافظ نے جلد ہی اسلام آباد میں ایک لیڈی لیکچرار سے نئی شادی رچالی۔

مجاہد لاہوری صاحب نے بتایا کہ حافظ کی پہلی بیوی کی والدہ کئی بار اسلام آباد آئی، وہ حافظ سے منتیں کرتی، ہاتھ جوڑتی کہ اگر وہ اس کی بیٹی کو بیوی کی حیثیت سے قبول نہیں کرتا تو اسے طلاق دیدے۔ لیکن حافظ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ طلاق نہیں دوں گا۔ کہا کرتا: میں اسے تر سا تر سا کر ماروں گا۔'' اس کی ماں بھی اسے بہت قائل کرتی کہ یہ ظلم نہ کرو۔ خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ لیکن حافظ غرور اور ضد میں اندھا ہو گیا تھا، اس پر نہ ماں کی نہ ساس کی، کسی کی التجائیں اثر نہ کرتیں۔ آخر میں اس نے طلاق کی یہ شرط عائد کی کہ پہلی بیوی دکانوں سے، مکان سے، پلاٹوں سے اور دولاکھ کی رقم سے دستبردار ہو جائے، وہ ان کی واپسی کا مطالبہ نہ کرے۔ لیکن بیوی کی والدہ نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا اور لاہور کی ایک عدالت میں خلع کا اور جائیداد کی واپسی کا مقدمہ دائر کردیا۔ یہ مقدمہ اسکی وفات تک زندہ رہا۔

اللہ نے حافظ کو دوسری بیوی کے ہاتھوں خوب ذلیل کرایا۔ وہ انیسویں گریڈ میں تھا جب ایک روز اس نے رمضان میں کچھ دوستوں کو افطار پر بلایا۔ مجاہد صاحب نے بتایا کہ جب میں نے دروازے پر گھنٹی دی تو حافظ نے اس حال میں دروازہ کھولا کہ اس نے گلے میں ایپرن پہن رکھا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ بیسن میں لتھڑے ہوئے تھے۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا کہ'' حافظ صاحب

یہ کیا؟ یہ آپ نے کیا حلیہ اختیار کر رکھا ہے؟'' تو سر اٹھا کر، گردن پھلا کر کہنے لگا: ''مَیں نے ماڈرن دنیادار لوگوں کی طرح گھر میں آمریت نافذ نہیں کی ہوئی۔ ہمارے گھر میں مکمل جمہوریت ہے اور ہم نے اپنے اپنے کام بانٹ رکھے ہیں۔ پکوڑے مَیں بنا رہا ہوں، آٹا بھی گوندھتا ہوں اور برتن بھی صاف کرتا ہوں۔ باقی کام میری بیگم کرتی ہیں اور مَیں حافظ کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک بار اس کی پہلی بیوی باہر سڑک پر برہنہ سر اس کو کوس رہی تھی اور مَیں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھر کے اندر لایا تھا تو اس نے مجھے بتایا تھا کہ آج حافظ نے مجھے جوتے پالش کرنے کا حکم دیا اور مَیں نے مصروفیت کا عذر کیا تو اس نے مجھے گھونسوں اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا اور دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔''

حافظ غیر معمولی سنگ دل اور سفاک تھا۔ اس نے ایک بار مجاہد صاحب کو بتایا: ''مجھے ماں کو ملے ہوئے آٹھ سال ہو گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں ایک شادی تھی، مَیں بھی اس میں گیا ہوا تھا۔ پتہ چلا کہ میری ماں صرف مجھے ملنے کے لیے وہاں آئی ہوئی ہے لیکن مَیں نے اسے ملنا پسند نہ کیا اور بہانہ بنا کر وہاں سے سٹک گیا۔'' اس کا سبب اس نے یہ بتایا کہ ایک تو میری ماں نے مجھے سیکنڈ ہینڈ عورت کے سر منڈھ دیا، دوسرے باپ کا مکان اور دوسری چیزیں چھوٹے بیٹے کو دے دیں، مجھے وراثت میں سے کوئی شے نہ دی۔ پتہ چلا کہ حافظ کا چھوٹا بھائی کم تعلیم یافتہ اور غریب آدمی تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ حافظ اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا ہے اور اس کے مالی حالات اچھے ہیں، مختصر سا مکان چھوٹے بیٹے کو دے دیا اور حافظ نے اسی کو ماں سے لاتعلقی کا بہانہ بنا لیا۔

اور پھر آخر کار اللہ کا کوڑا حرکت میں آ گیا۔ ماں، ساس اور بیوی کی بددعائیں اپنا اثر دکھانے لگیں۔ ۱۹۹۵ء میں وزارتِ مذہبی امور نے اسلامی نظریاتی کونسل کا ایک وفد حج پر روانہ کیا۔ اس میں مجاہد لاہوری اور حافظ افتخار دونوں شامل تھے۔ مجاہد صاحب نے بتایا کہ پہلے ہی دن جب ہم مکہ مکرمہ پہنچے اور عمرے اور طواف وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے ہوٹل میں آئے تو حافظ کو یرقان کا شدید ترین عارضہ لاحق ہو گیا۔

غیر معمولی اسہال اور مسلسل الٹیاں رکنے ہی میں نہیں آتی تھیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ

بستر سے لگ گیا اور ہلنا جلنا اس کے لیے محال ہو گیا۔ نتیجتاً اُسے جیاد ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا اور عجیب بات یہ ہے نہ حج کے اختتام بلکہ ہمارے وہاں قیام تک حافظ کی صحت بحال نہ ہوئی اور اللہ نے اس کی مکہ میں موجودگی کے باوجود اسے حج کی سعادت سے محروم رکھا، اپنے گھر کے طوافوں کی اجازت نہ دی اور وہ مدینۃ النبیؐ کی برکات سے بھی فیض یاب نہ ہو سکا۔ مجاہد صاحب نے بتایا کہ حج کے بعد ہماری مصروفیات ختم ہوئیں تو ہم نے حافظ کو سٹریچر پر ڈال کر جہاز پر سوار کرایا اور واپس آ گئے۔ اس طرح ایک حافظِ قرآن اور دینی تعلیمات سے باخبر شخص کو اس کی سنگ دلی، خیانت اور مسلسل بے اصولی کی جو کڑی سزا دی گئی شاید اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہ مل سکے۔

۱۹۹۷ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین اقبال احمد خان نے حافظ افتخار کو بیسویں گریڈ میں ترقی دے دی۔ لیکن اگست ۱۹۹۸ء میں جب ڈاکٹر ایس ایم زمان کونسل کے چیئرمین بنے تو کسی بات پر ناراض ہو کر انہوں نے حافظ کی انیسویں گریڈ میں تنزلی کر دی اور یہی حادثہ حافظ کی جان کا ویری بن گیا۔ اس کی صحت اس وقت تک بہت ہی اچھی تھی۔ وہ اپنی خوراک اور سیر وغیرہ کا بہت اہتمام کرتا تھا۔ اس کا رنگ سرخ وسفید تھا اور بظاہر اسے کوئی بھی بیماری لاحق نہ تھی۔ نہ شوگر، نہ بلڈ پریشر، نہ دل یا گردوں کی کوئی تکلیف۔ دسمبر ۱۹۹۸ء میں رمضان کی پہلی رات کو وہ تراویح پڑھا کر آیا تو حسبِ معمول دودھ پی کر سو گیا، لیکن رات کے دو بجے اسے سینے میں شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ وہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے قریبی ہسپتال میں پہنچا۔ مگر رات کے دو بجے کوئی ڈاکٹر ڈیوٹی پر موجود نہ تھا۔ ایک نرس ڈاکٹر کی تلاش میں نکلی، لیکن اس کے واپس آنے تک حافظ بنچ پر بیٹھے بیٹھے اوندھے منہ فرش پر گرا اور آنِ واحد میں دم توڑ گیا۔ ڈاکٹر آیا اور اس نے موت کی تصدیق کر دی۔

دوسری بیوی سے حافظ کی یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، چوتھا بیٹا تھا۔ مگر وہ صرف ڈیڑھ سال کا تھا جبکہ اولاد کی کوئی خوشی دیکھے بغیر حافظ آخرت کو سدھار گیا اور اپنے پیچھے عبرت کے کتنے ہی نقوش چھوڑ گیا۔ (اس مضمون میں مصلحتاً حافظ کا اصل نام نہیں دیا گیا تاکہ اس کی بیوی اور بچوں کو پریشانی نہ ہو)

(۱۲)

پروفیسر کاشمیری کا تعلق بھی ایک دینی تحریک سے تھا۔ خوبصورت شخصیت کے نستعلیق انسان تھے اُور لاہور کے ایک بڑے کالج میں پڑھاتے تھے۔ مجھے اُس کالج کے ہیڈ کلرک مرزا صاحب نے جو بعد میں دیال سنگھ کالج میں آ گئے تھے اُور اس طرح اُن سے کئی سال تک رفاقت رہی یہ بتایا کہ کاشمیری صاحب عجیب متضاد خصوصیات کے حامل تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے پابند، بہت بااصول مگر احساس برتری میں بہت بُری طرح مبتلا تھے۔ چھوٹے طبقے کو تو انسان ہی نہیں سمجھتے تھے یعنی نہ اُن کو سلام کرتے تھے نہ سلام کا جواب دیتے تھے۔

اس سلسلے میں مرزا صاحب نے ایک بہت ہی افسوس ناک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ اس کالج کے سٹاف روم کا چپراسی ایک نوجوان لڑکا تھا اُور بہت خوبصورت اُور بڑا ہی خوش اخلاق تھا۔ بے چارہ باپ کی وفات کی وجہ سے میٹرک سے آگے نہیں پڑھ سکا تھا اُور یہ حقیر ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا ورنہ اُس کا روّیہ بہت باوقار تھا وہ ایک خوددار نوجوان تھا، مالی تنگی کے باوجود کسی سے سوال نہیں کرتا تھا۔

مرزا صاحب نے بتایا کہ پروفیسر کاشمیری نے اپنی الماری میں شیشے کا ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ جب بھی ضرورت ہوتی وہ چپراسی کو وہ گلاس نکال کر دیتے اُور اسی میں پانی پیتے تھے۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ کاشمیری صاحب نے گلاس اس نوجوان کے حوالے کیا اُور اُسے پانی پلانے کا حکم دیا۔ انہوں نے پانی پی لیا تو اُس نوجوان نے اُسی گلاس میں پانی بھرا اُور خود بھی نوش کر لیا۔ پروفیسر صاحب نے اُسے اپنے گلاس میں پانی پیتے ہوئے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہ

شدت کے ساتھ سیخ پا ہو گئے۔ اُسے کھینچ کے تھپڑ مارا، اُسے خوب برا بھلا کہا، طعنے دیئے کہ تم نے جرات کیسے کی میرے گلاس میں پانی پینے کی اور گلاس اُٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ پروفیسر کاشمیری نے نوجوان چپراسی سے یہ سلوک سب کے سامنے روا رکھا۔ اس پر وہ لڑکا صدمے سے بے حال ہو گیا اور بے طرح سے رونے لگا اور بڑی دیر تک ہچکیاں لے کر روتا رہا۔ لوگوں نے اُسے بڑی مشکل سے چپ کرایا۔

لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دینداری کا دعویٰ کرنے والے، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اُستاد کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری۔ موصوف کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ چھوٹا بیٹا کوئی ڈیڑھ سال کا تھا۔ بہت پیارا، خوبصورت بچہ، سارے گھر میں دوڑتا پھرتا اور خوشیاں بکھیرتا رہتا۔ اس واقعے کو چند ہی روز گزرے تھے، پروفیسر صاحب کی بیگم گھر کے کاموں میں مصروف تھی، یہ بچہ اکیلا کھیل رہا تھا۔ بڑا بھائی اور بہن اسکول گئے ہوئے تھے اور کاشمیری صاحب کالج میں تھے...... پتہ نہیں کیا ہوا، فریج کا دروازہ کیسے کھل گیا اور پھر فریج کا نچلا حصہ کیسے خالی رہ گیا کہ یہ بچہ فریج میں داخل ہو گیا، دروازہ بند ہو گیا اور یہ اندر مقید ہو کے رہ گیا...... ماں کاموں سے فارغ ہوئی اس نے دیکھا ننھا کہیں نظر نہ آیا تو اُس نے گھر کے ہر کونے میں اُسے تلاش کیا، باہر گلی میں آ کر دیکھا، لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔ اُس نے جلدی سے خاوند کو فون کیا، پروفیسر صاحب بھاگم بھاگ گھر آئے، محلے دار بھی جمع ہو گئے اور سب نے اردگرد بہت بھاگ دوڑ کی، فوری طور پر مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اعلان کرایا، لیکن بچے کا کہیں سراغ نہ ملا...... اس جستجو میں کئی گھنٹے گزر گئے اور جب تھک ہار کر کاشمیری صاحب بیٹھے اور اُنہیں پیاس لگی اور فریج کھول کر پانی پینا چاہا تو ان کے لاڈلے، پیارے بیٹے کا جسم وہاں اکڑا پڑا تھا۔

پتہ نہیں اُس معصوم کی روح کب پرواز کر گئی تھی۔

غرور اور ظلم اور توہین و تضحیک کا جو انداز پروفیسر کاشمیری نے اپنے غریب چپراسی کے ساتھ اختیار کیا تھا، اُس کی دوسری سزا انہیں یہ ملی کہ وہ شوگر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور اُس نے

انہیں نچوڑ کر رکھ دیا۔

میرے تجزیے کے مطابق موصوف کو تیسری سزا یہ ملی کہ اللہ نے متذکرہ بیٹے کی حسرت ناک موت کے بعد انہیں مزید اولاد کی نعمت سے محروم کر دیا۔ حالانکہ متذکرہ حادثے کے وقت ابھی وہ جوان تھے چنانچہ اب اُن کا ایک بیٹا رہ گیا اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی اور اُسے سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اور وہ گذشتہ بیس برس سے بیوی بچوں سمیت بیرونِ ملک مقیم ہے۔ بیٹی کی شادی ہو گئی اور وہ کبھی کبھار ہی والدین کے گھر کا چکر لگاتی ہے...... چنانچہ بہت بوڑھے کاشمیری صاحب اپنی بیمار اور ضعیف بیگم کے ساتھ یک و تنہا رہتے ہیں اور عمر کے اس حصے میں اُن کا کوئی بھی پُرسانِ حال نہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے غریب اور بے نوا بندوں سے بدسلوکی کو برداشت کرتا ہی نہیں اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو بڑی دیر تک سزا دیتا ہے۔ العیاذُ باللہ العظیم۔

(۱۴)

مَیں پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا۔ عمر میری یہی کوئی گیارہ بارہ سال ہوگی جب ۱۹۵۴ـ۵۵ء میں سید اکرم حسین شاہ ہمارے علاقے میں وارد ہوئے اَور اُنہوں نے عام لوگوں سے بیعت کا سلسلہ شروع کیا...... قارئین کی اطلاع کے لیے ہمارے دیہات میں ایک بات مضبوط عقیدے کی طرح پھیلائی گئی ہے کہ جس کا مرشد نہیں، اس کا نکاح بھی نہیں اَور جنازہ بھی نہیں یعنی ہر مسلمان کو کسی نہ کسی پیر کا مرید بہرحال بننا چاہیے ورنہ وہ زمرۂ مسلمین سے خارج ہوجائے گا...... یہی سبب ہے کہ کم ازکم پنجاب اَور سندھ میں پیری مریدی کا کاروبار پورے عروج پر ہے اَور عجیب اَور افسوس ناک بات یہ ہے کہ یہ شعبہ واقعی محض مریدوں سے نذر نیاز اَور تحائف سمیٹنے تک محدود ہے اس میں رہنمائی یا ہدایت یابی کا عمل تقریباً مفقود ہے۔ چونکہ میرے والد سمبڑیاں کے ایک پیر کے مرید تھے اَور اُنہوں نے شیر گڑھ کے پیروں سے بھی بیعت کی ہوئی تھی، اس لیے وہ تو سید اکرم حسین شاہ کے حلقہء ارادت میں نہ آئے، لیکن اُنہوں نے اپنے بڑے بیٹے یعنی میرے بھائی کو شاہ صاحب کے حوالے کردیا اَور وہ کپڑوں کا ایک جوڑا، گُڑ اَور دو روپے ادا کرکے اُن کا مرید بن گیا۔ یاد رہے کہ ۱۹۵۴ـ۵۵ء میں دو روپے کی بڑی قدر و قیمت تھی اَور ایک غریب کسان کا بیٹا اَور دے بھی کیا سکتا تھا۔ گاؤں کے اَور بھی کئی لوگ موصوف کے مرید بن گئے اَور اُن کے ''کاروبار'' کا آغاز ہوگیا۔

سید اکرام حسین شاہ خوبصورت شخصیت کے مالک تھے۔ دلکش خدوخال جن پر معصومیت رقصاں رہتی۔ بوٹا سا لمبا قد، چھریرا جسم اَور سر پر سفید پگڑی۔ جو دیکھتا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا پھر وہ

بہت خوش اخلاق انسان تھے۔ ہر ایک سے مسکرا کر، خوش دلی سے ملتے اس لیے اُن کا حلقہء اثر پھیلتا چلا گیا۔ آغاز میں وہ سائیکل پر تشریف لایا کرتے۔ ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اُنہوں نے گھوڑا خرید لیا۔

شاہ صاحب ہر فن مولا تھے۔ نبض شناس تھے، طبابت بھی کرتے تھے اَور تعویذ گنڈے کا ہنر بھی خوب جانتے تھے۔ وہ مریض کی قمیض یا بنیان سونگھ کر مرض کی تشخیص کر دیتے تھے، اس لیے دیہاتی مرد اَور خصوصاً خواتین اُن کی بہت معتقد تھیں۔ دور دور سے مریض اُن کی طرف کھنچے چلے آتے، اُن کے کمرے میں لوگوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔

اُن کی شہرت کی خوشبو پھیلی اَور کام وسیع ہوا تو شاہ صاحب نے سیالکوٹ شہر میں بھی دفتر بنا لیا اَور ہفتے میں ایک دن وہاں جانے لگے۔ پھر مہینے میں ایک روز کے لیے لاہور بھی تشریف لے جاتے۔ جس گاؤں کو اُنہوں نے مستقر بنایا تھا، وہاں ایک مزار بھی بن گیا اَور اُس پر ہر سال جون میں عرس بھی ہونے لگا۔ یہ بات البتہ تحقیق طلب ہے کہ وہ اس گاؤں میں نووارد تھے اَور گجرات کے کسی علاقے سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ یہاں اُن کے کسی بزرگ کی قبر نہیں تھی۔ پھر مزار کس حوالے سے بنا؟ لیکن مزار تو ہمارے علاقے میں پہلے ہی کثرت سے تھے۔ سات آٹھ کلو میٹر کے علاقے میں کم از کم دس مزار تھے (اور ہیں) اِن میں اگر سید اکرم حسین شاہ صاحب نے ایک کا اضافہ کر دیا تو مجھے اس پر اس قدر حیران نہیں ہونا چاہیے تھا۔

بہ ہر حال شاہ صاحب موصوف کی ہمارے علاقے میں آمد اُن کے لیے بہت بابرکت ثابت ہوئی اَور اُن کی جملہ خوبیوں اَور مہارتوں کی وجہ سے واقعی اُن پر ہُن برسنے لگا اَور پچیس تیس سال کے اندر اندر وہ اس علاقے کے بڑے زمیندار بن گئے۔ اُنہوں نے تقریباً تین مربعے زمین خرید لی۔ اُس میں تین ٹیوب ویل لگوائے اَور دو ٹریکٹر خرید لیے۔ گاؤں کے قریب ہی وزیر آباد روڈ پر اُنہوں نے ایک مارکیٹ بھی بنا لی۔

شاہ صاحب کے پانچ بیٹے تھے۔ ان میں سے ایک ''پیدائشی ولی'' تھا یعنی مست ملنگ۔ اُس

کے جسم اَور ذہن کی نشو و نما مکمل نہیں ہوئی تھی۔ منہ سے رالیں بہتی رہتیں اَور وہ گندی نالیوں میں ہاتھ مارتا رہتا، لیکن شاہ صاحب کے مرید اُس پر واری صدقے جاتے، اُسے نذرانے اَور ہدیے سب سے زیادہ پیش کئے جاتے۔ باقی چار بھائیوں میں تصور حسین شاہ نیک سرشت اَور شریف آدمی تھے بہت کم گو تھے جیسے دنیا سے بے نیاز ہوں، اس لیے انہیں بھی مرید بہت مانتے تھے۔ اکرم حسین شاہ انہیں ہی اپنے جانشین کے طور پر متعارف کرا رہے تھے۔

لیکن اصل شہرت شاہ صاحب کے باقی تین بیٹوں کو حاصل ہوئی اَور ان میں وہ ساری خوبیاں تھیں جو علاقے کے دوسرے روایتی جاٹ زمینداروں کے بیٹوں میں ہو سکتی تھیں۔ ناجائز اسلحہ، مار دھاڑ، غنڈہ گردی بلکہ شراب اَور اغوا کی وارداتوں میں وہ کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے...... صاف لگتا تھا کہ شاہ صاحب نے عُرسوں سے، نذر و نیاز سے، تعویذ گنڈوں سے جو دولت اکٹھی کی تھی اَور جو جائیداد بنائی تھی وہ رنگ لا رہی ہے۔ یہی رنگ اُن کے ذہنی و جسمانی معذور بیٹے کی صورت میں نمایاں ہوتا ہوا نظر آتا تھا۔ چنانچہ میرے نقطہ نظر کے مطابق یہ اُن کی کمائی ہی کا اعجاز تھا کہ اُن کا ایک جوان بیٹا اُن کی نظروں کے سامنے وفات پا گیا۔ یہ ہیروئن کا رسیا تھا اَور اسی عارضے نے اُسے ہلاکت کے گڑھے میں پہنچا دیا۔ دوسرے دونوں بیٹوں......صفدر حسین شاہ اَور مکرم حسین شاہ نے پیر صاحب کی عزت کو چار چاند لگا دیئے اَور قبضہ گروپ کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلسل صدموں نے اَور جوان بیٹے کی موت نے سید اکرم حسین شاہ کو بیمار کر دیا۔ اَور ایک روز اُن پر فالج کا شدید حملہ ہوا، وہ ہلنے جلنے سے معذور ہو گئے۔

بیماری کے اس عالم میں پیر سید اکرم حسین شاہ نے اپنے بڑے بیٹے تصور حسین شاہ کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ علاقے کے معززین اَور بے شمار مریدین کی موجودگی میں اُن کی دستار بندی ہو گئی۔ سب نے اس انتخاب کی تعریف کی۔ تصور حسین شاہ والدین کے بڑے بیٹے ہی نہ تھے وہ بہت نیک، پارسا اَور خوش اخلاق انسان بھی تھے۔

لیکن صفدر حسین شاہ اَور اکرم حسین شاہ سے تصور حسین شاہ کی ''خلافت'' ہضم نہ ہوئی اَور

نامزدگی کو بمشکل ایک مہینہ گزرا تھا کہ ایک دن دونوں بھائیوں نے تصور حسین شاہ کو اس منصب سے دستبردار ہونے پر مجبور کردیا۔ یہ کلاشنکوفوں سے مسلح ہوکر بڑے بھائی کی مسندگاہ میں داخل ہوئے اور پسٹل پوائنٹ پر بڑے بھائی سے ایک دستاویز پر دستخط لے لیے چنانچہ اب اکرم حسین شاہ کے جانشین تصور حسین شاہ کی بجائے صفدر حسین شاہ بن گئے یہ بھائیوں میں تیسرے نمبر پر تھے اُور مکمل آزاد اسلوبِ حیات کے حامل تھے۔

اس واقعے نے پیر اکرم حسین شاہ کو شدید ترین صدمے سے دوچار کردیا۔ بیمار اُور معذور تو وہ پہلے ہی تھے، اب اُن پر فالج کا مزید حملہ ہوا، انہیں لقوہ ہوگیا۔ اُن کا چہرہ بگڑ گیا، وہ بولنے کی صلاحیت سے محروم ہوگئے اُور چند ہفتے اسی کیفیت میں مبتلا رہ کر ملکِ عدم کو سدھار گئے۔ رہے نام اللہ کا۔

(۱۴)

مَیں حکیموں کے ایک ایسے خاندان کو جانتا ہوں جس کا ہر بالغ اَور عمر رسیدہ فرد خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اس خاندان کے بڑے بھائی چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں اَور وہیل چیئر ہی پر مطب تک آتے جاتے ہیں۔ ان سے چھوٹے ڈاکٹر ہیں لیکن ساری ہی بیماریوں سے دوچار ہیں۔ شوگر کے اس قدر مریض کہ انسولین لگتی ہے۔ دل کا آپریشن ہو چکا ہے، بلڈ پریشر ہے۔ گردے متاثر ہیں اَور بینائی میں خطرناک حد تک ضعف آ چکا ہے۔ تیسرے نمبر والے بھائی باون ترپن برس کی عمر میں ہارٹ اٹیک سے آخرت کو سدھار گئے تھے، چوتھے نمبر والے بھی شوگر کے مریض ہیں...... اَور پانچویں کو بھی تقریباً سارے ہی امراض لاحق ہیں جن میں ان کے ڈاکٹر بھائی مبتلا ہیں۔ عبرت ناک بات یہ ہے کہ یہ پانچوں بھائی شعبہ طب سے وابستہ ہیں یعنی ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے۔ اَور باقی چاروں حکیم ہیں اَور باقاعدہ پریکٹس کرتے ہیں (ایک کے سوا جو وفات پا چکا ہے)

اِن حکماء حضرات کے والد غیر معمولی صلاحیتوں کے حکیم، جیّد عالم، اَور بے حد متقی اَور مخیر مسلمان تھے یہی سبب ہے کہ اللہ نے اُن کے ہاتھ میں خصوصی شفا عطا فرما دی تھی اَور اُن کے رزق میں بہت کشادگی بخش دی تھی...... لیکن افسوس کہ اُن کے بیٹوں نے باپ کی کسی خوبی کو اختیار نہ کیا۔ نہ للّٰہیت اَور عبادت گزاری، نہ اخلاص اَور محبت، نہ دنیا سے بے نیازی اَور خدمتِ خلق کا جذبہ اَور نہ محنت اور دیانت...... اس کے برعکس یہ سب بھائی پیسے سے محبت رکھنے والے اَور دنیا پرست انسان تھے۔ اندازہ کیجئے کہ باپ کو کتاب سے بے حد محبت تھی اَور اُن کا بہت بڑا ذاتی کتب خانہ

تھا، لیکن بیٹوں نے اُس کتب خانے میں شاید ایک کتاب کا بھی اضافہ نہ کیا ہوگا۔ ایک مرتبہ مَیں مشہور علمی و مذہبی ماہنامے ''آئین'' کی رکنیت سازی کی مہم چلا رہا تھا۔ سالانہ چندہ صرف ستر روپے تھا اُور الحمدللہ مَیں نے اٹھارہ خریدار بنالیے تھے، اس سلسلے میں مَیں خاصا لمبا سفر کرکے بڑے بھائی کے پاس پہنچا۔ اُنہیں رسالے کا خریدار بننے کی درخواست کی جو اُنہوں نے مسترد کردی اُور جائیداد کے مسئلے پر بھائیوں کے جھگڑے اُور اُن کی زیادتیوں کی شکایت کرتے رہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ستر روپے ادا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا اُور ذاتی تعلق کا بھی لحاظ نہ کیا...... حالانکہ موصوف ہر سال تین چار بار سعودی عرب جاتے تھے، سعودی شہزادوں اور شیوخ کو کشتے فراہم کرتے تھے اُور لاکھوں روپے سمیٹ کر لاتے تھے۔ چنانچہ میرے نقطہ نظر کے مطابق زراندوزی، خست اُور بے عملی نے اِن سب بھائیوں کو طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کردیا اُور زندگی اِن کے لیے وبال بن گئی...... تاہم سب سے چھوٹے بھائی حکیم کرامت اللہ کا معاملہ دوسروں سے انوکھا اُور زیادہ گھمبیر تھا۔

جیسا کہ اشارۃً بتا چکا ہوں، موصوف ساری ہی خطرناک بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ انہیں شدید نوعیت کی شوگر ہے، دل کی تکلیف ہے، بلڈ پریشر ہے، گردوں کے مریض ہیں، معدے کی خرابی میں مبتلا ہیں اُور ذہنی دباؤ سے اس شدت سے دوچار ہیں کہ افسردگی اُور پریشانی اِن کے چہرے پر کھنڈ گئی ہے۔ مَیں نے اُنہیں ایک ایسی محفل میں دیکھا جہاں مشہور خوش بیان شاعر عنایت علی خان اپنا کلام سنا رہے تھے اُور حاضرین اس سے خوب خوب لُطف اندوز ہو رہے تھے لیکن مَیں حکیم صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ کی معمولی جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔ وہ مرجھائے ہوئے بشرے کے ساتھ سنجیدہ، رنجیدہ بیٹھے رہے۔

یہی نہیں بلکہ حکیم صاحب غیر معمولی نوعیت کے گھریلو مسائل میں بھی گھرے ہوئے ہیں۔ اُن کی ایک بیٹی کے تین بچے جسمانی اعتبار سے معذور ہیں۔ اُن کی ایک دو سالہ پوتی گردوں کی خرابی میں مبتلا ہے اُور اُسے تیز ترین ادویہ یعنی سٹیرائیڈز کھلائی جارہی ہیں۔ اُن کے ایک داماد نے

چلتی ٹرین سے چھلانگ لگادی، اس کے سر پر چوٹ لگی، وہ ہفتوں بے ہوش رہا اور مہینوں کے علاج کے بعد اب وہ ٹھیک تو ہے مگر مکمل طور پر شفایاب نہیں ہوا۔ اُن کا یہ داماد کسی اعتبار سے لائق بھی نہیں ہے اور وہ اس حوالے سے بھی پریشان رہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ حکیم کرامت اللہ غیر معمولی مسائل میں کیوں مبتلا ہیں تو میرے نزدیک اُس کا بڑا سبب اُن کی خلقِ خدا سے بے نیازی اور بے اصولی میں مضمر ہے۔

مثال کے طور پر میرے ایک دوست کا موصوف سے عرصہ دراز سے تعارف اور میل ملاقات تھا۔ سوءِ اتفاق کہ اُن کے ایک بہت قریبی عزیز نے مختلف حوالوں سے میرے دوست کو بہت پریشان کیا۔ وہ فریاد لے کر حکیم صاحب کے پاس گیا کہ وہ اپنے عزیز کو سمجھائیں، مگر حکیم صاحب نے اس کی مدد کرنے کی بجائے اپنے عزیز کا ساتھ دیا اور بغیر کسی تحقیق کے محض سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر میرے دوست کے خلاف کردار کشی کی مہم شروع کردی اور اس معاملے میں خوفِ خدا، انصاف، اصول پسندی اور شرافت کے سارے تقاضوں کو پامال کردیا اور باہمی تعلق کا بھی لحاظ نہ کیا...... میرا اندازہ ہے کہ ان کے اس روّیے کے نتیجے میں وہ اللہ کی ناراضگی کی گرفت میں آ گئے اور مسائل اور امراض میں دھنستے چلے گئے۔

عبرت ناک اور ڈرا دینے والی بات یہ ہے کہ حکیم کرامت اللہ کے عزیز پر بھی اللہ تعالیٰ کا غصہ بُری طرح طاری ہوگیا۔ وہ شوگر اور ہارٹ کے امراض میں مبتلا ہو گئے۔ پاؤں کے اور ٹانگوں کے دردوں نے اُنہیں ہلکان کردیا۔ دونوں بیٹوں کا روزگار ختم ہوگیا، وہ لمبے عرصے تک بے روزگاری میں مبتلا رہے اور رزق کی تنگی انہیں کچوکے لگاتی رہی۔ کاش وہ احساس کرتے کہ اللہ کو اپنے بندوں سے پیار ہے اور جو انہیں بلاوجہ ذہنی یا عملی تکلیف میں مبتلا کرتا ہے اس کا سکھ چین رخصت ہو جاتا ہے اور زندگی اس کے لیے کانٹوں کی سیج بن جاتی ہے۔

(۱۵)

ذی شان ملک ایک لائق فائق انجینیئر ہے اُور ایک بڑی دواساز کمپنی کا جنرل مینجر ہے۔ لاکھوں میں تنخواہ پاتا ہے لیکن سب سے بڑھ کر اُس کے مزاج کی خصوصیت یہ ہے کہ اُسے اپنے سٹیٹس کا غیر معمولی خیال رہتا ہے۔ وہ کسی ایسے فرد سے رسماً بھی بے تکلف نہیں ہوتا جس کا معیارِ زندگی اُس کے مقابلے میں فروتر ہو۔

خدا نے ذی شان ملک کو بہت نوازا ہے، لیکن ایک محرومی اُس کی جان کا روگ بن گئی ہے کہ اُس کی چار بیٹیاں ہیں، اُور بیٹے کی نعمت اُسے تا حال میسر نہیں ہے۔ یہ آزار اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے، لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس کا علاج کیسے ہو؟

تقریباً تین سال پہلے کی بات ہے اُس وقت انجینئر موصوف کی تین بیٹیاں تھیں۔ اُسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ عمرے کے لیے بیت اللہ کا سفر کرے اُور وہاں جا کر خدا سے بیٹے کی بھیک مانگے۔ اس کے لیے اُس نے اپنی والدہ کو تیار کر لیا، بیگم کو اُور تینوں بچیوں کو لیا اُور بھرپور طریقے سے سفر کی تیاری کر لی۔ اُس کا خیال تھا کہ بیت اللہ میں براہِ راست ماں دعائیں کرے گی، بیوی زاری کے ساتھ التجا کرے گی اُور تینوں ننھی بیٹیاں ہاتھ اُٹھا کر ربِ کائنات سے بھائی کی بھیک مانگیں گی، سوال کریں گی اُور وہ خود باچشمِ نم بیٹے کے لیے ملتجی ہو گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اِن سب کی دعائیں رد نہیں فرمائے گا اُور اُسے لازمی بیٹے کی نعمت حاصل ہو جائے گی۔

جب انجینئر ذیشان عمرے کی تیاری کر رہا تھا تو عین اُنہی ایام میں اُس کا ایک رشتے دار بیمار ہو گیا اُور ایک ایسے ہسپتال میں ایڈمٹ ہو گیا جو انجینئر صاحب کے گھر کے بہت ہی قریب تھا۔ بمشکل پانچ سات منٹ کی ڈرائیو پر اُور وہاں تک کا سفر اُس کے لیے کسی اعتبار سے بھی دشوار نہ تھا۔

لیکن انجینئر ذیشان نے اپنے مزاج کے مطابق اپنے اِس رشتے دار کی پروا نہ کی، اس کی

مزاج پرسی کرنا پسند نہ کیا کہ وہ سٹیٹس کے اعتبار سے اُس سے کمتر تھا اور والدہ، اہلیہ اور بچیوں کو لے کر عمرے پر روانہ ہو گیا۔

تب ذیشان ملک کے اس بیمار رشتے دار کو ایک حدیثِ قدسی یاد آئی۔ کہ اللہ روزِ قیامت ایک شخص سے کہے گا کہ مَیں بیمار تھا لیکن تم نے میری مزاج پرسی نہ کی، مجھے کھانے کی ضرورت تھی تم نے مجھے کھانا نہ دیا اور مجھے لباس کی حاجت تھی لیکن تم نے مجھے لباس فراہم نہ کیا۔

بندہ جواب میں عرض کرے گا کہ باری تعالیٰ آپ کیسے بیمار ہو سکتے ہیں؟ خدا فرمائے گا کہ فلاں وقت میں میرا فلاں بندہ بیمار تھا، اگر تو اُس کی مزاج پرسی کرتا، تو تو مجھے وہاں موجود پاتا۔

یہ حدیث قدسی یاد کر کے اس مریض نے اپنی ڈائری میں لکھا ''انجینئر ذیشان جس مقصد کی خاطر عمرے کے لیے جا رہا ہے مجھے اُس کا خوب اندازہ ہے، لیکن مجھے خدشہ ہے کہ جب یہ بیت اللہ میں پہنچیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرا فلاں بندہ تمہارے گھر کے بہت ہی قریب ہسپتال میں بیمار پڑا تھا۔ وہ تمہارا رشتے دار بھی تھا اور غریب ہونے کے باوجود ہمیشہ تم سے حسنِ سلوک سے پیش آتا رہا ہے، لیکن تم نے جانتے بوجھتے اس کی ذرہ پروا نہیں کی اور ہسپتال کا معمولی سفر کرنا پسند نہیں کیا لیکن اب میری محبت کا ڈرامہ کر کے یہاں آ گئے ہو۔ اس لیے جاؤ مَیں بھی تمہاری پروا نہیں کروں گا اور تمہاری کوئی دعا قبول نہیں ہو گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اس سارے خاندان نے کم از کم دس روز تک بیت اللہ میں بہت آہ وزاری کی، انجینئر ذیشان نے ملتزم سے لپٹ لپٹ کر اور رو رو کر دعائیں کیں، اُس کی والدہ اور بیگم نے کعبۃ اللہ کا پردہ تھام کر التجائیں کیں اور بچیوں نے ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر ایک بھائی کا سوال کیا، لیکن اِن کی ساری دعائیں اور ساری التجائیں مسترد ہو گئیں۔ یہ لوگ واپس آئے، کچھ عرصے کے بعد انجنئیر صاحب کی اہلیہ امید سے ہوئیں اور وقت گزرنے پر ان کی آغوش میں بیٹے کی جگہ ایک اور بیٹی ڈال دی گئی۔

کاش دیندار طبقہ دین کی روح کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ دعاؤں کی قبولیت کا راز عاجزی میں، لوگوں کا دل رکھنے میں اور ان کی خدمت کرنے میں مضمر ہے۔

(۱۶)

حافظ صبور ہمارے علاقے کے ایک عوامی خطیب ہیں۔ بہت خوش اخلاق، مخلص اُور گرمجوش انسان ہیں۔ جامع مسجد کے خطیب ہیں لڑکوں اُور لڑکیوں کے دو مدارس چلاتے ہیں اُور ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر بھی ہیں۔ وہ بریلوی مکتبِ فکر کے ایک مقبول مقرر ہیں۔

موصوف کو قریب سے جاننے والے ایک دوست نے بتایا کہ حافظ صاحب کی دو بیٹیاں اور تین بیٹے ہیں، مگر بدقسمتی سے کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ بڑی بیٹی کی عمر کم و بیش چالیس سال ہے اُور اُسے کینسر ہو گیا ہے۔ دو بڑے بیٹے بنک ملازم ہیں اُن کی عمریں بھی بالترتیب ۳۴ اور ۳۲ سال ہیں۔

باخبر دوست کی روایت کے مطابق حافظ صاحب کے بچوں کو رشتے نہ ملنے کے دو اسباب ہین۔ ایک تو یہ کہ وہ نسلاً قصاب خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ چنانچہ زمیندار طبقہ اُن کی تقریروں پر وجد تو کرتا ہے، اُن کے ہاتھ چومتا ہے، لیکن حافظ صاحب کے ہاں رشتہ اُستوار کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ ذات پات کے تعصبات نا قابلِ عبور ہیں دوسرا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ حافظ صبور کے والد اُور دادا اہلحدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے، مگر اُنہوں نے بریلوی مسلک کے قبولِ عام کے پیشِ نظر متذکرہ نقطۂ نظر اپنالیا اُور روحانی اعتبار سے شاید اُن کا یہی انحراف اُن کے لیے وبال بن گیا ہے۔

(۱۷)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

آج ہماری بستی کے شیخ الیاس صاحب وفات پا گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کی عمر پچپن سال تھی۔ اُن کی چار بیٹیاں تھیں اُور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا سب سے چھوٹا ہے۔ پرائمری کلاس میں پڑھتا ہے۔ صرف ایک بیٹی کی شادی ہوئی ہے۔

الیاس صاحب ایک دینی تحریک کے ساتھ وابستہ تھے بلکہ اس کے ایک شعبے کے نگران تھے، مگر افسوس کہ اُنہوں نے دینی تعلیمات کو اپنے گھر پر نافذ نہیں کیا تھا۔ مَیں نے اُن کی تین بڑی بیٹیوں کو ہمیشہ 'کھلے منہ' کے ساتھ، بے پردہ سیر کرتے ہوئے دیکھا حالانکہ اس بستی کی خواتین اُور لڑکیاں نقاب لیتی اُور پردہ کرتی ہیں۔

مَیں نے مختلف وقتوں میں کم از کم تین مرتبہ الیاس مرحوم کی بیٹیوں کو توجہ دلائی کہ وہ اللہ رسول کے احکامات کی خلاف ورزی نہ کریں، بستی کا کلچر خراب نہ کریں اُور باہر نکلتے ہوئے چہروں پر نقاب ڈال لیا کریں، لیکن موصوف کی بڑی بیٹی نے میرا مذاق اڑایا اُور برملا کہا کہ پردہ ہم اپنی خاطر کریں گی، کسی کے دباؤ میں نہیں آئیں گے، اُور اس طرح تینوں بہنوں نے کمال جرأت کے ساتھ اپنا رویّہ برقرار رکھا اُور کسی نصیحت یا مشورے کو قبول نہ کیا۔

متعدد مثالوں کی روشنی میں یہ بات کُھل کر میرے سامنے آ چکی ہے کہ اگر ایک شخص دینداری کا دعویٰ بھی کرتا ہو اُور مجلسی زندگی میں اسلام کے نفاذ کا اعلان بھی کرتا پھرتا ہو، لیکن ذاتی اُور خاندانی سطح پر وہ دینی احکام کی پرواہ نہ کرتا ہو بلکہ عملاً اُن کا استخفاف کرتا ہو، تو اللہ کی غیرت اُسے زیادہ دیر تک مہلت نہیں دیتی اُور اللہ کا قانون جلد ہی اُس کے خلاف حرکت میں آ جاتا ہے چنانچہ تقریباً دس سال پہلے شیخ الیاس بھی اللہ کی ناراضگی میں مبتلا ہو گئے۔ پہلے اُن کو شوگر ہو گئی اُور اُس

نے شدت اختیار کر لی حتیٰ کہ وہ دل کے مریض بن گئے اُور اُن کے گردوں کا عمل بھی متاثر ہوگیا.... پھر کوئی چار سال پہلے ایک حادثے میں اُن کی ٹانگ ٹوٹ گئی، ہڈی ٹھیک طرح سے نہ جڑی اُور وہ کم از کم ایک سال تک بستر میں مقیّد رہے اُور شدید تکلیف سے دوچار رہے۔ پھر اُن کا ہرنیا کا آپریشن ہُوا اُور اب گزشتہ چھ ماہ سے اُنہیں یرقان ہوگیا اُور یہ جان لیوا ثابت ہُوا۔ کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اُور وہ آج ملکِ عدم کو سدھار گئے۔

چونکہ شیخ الیاس کا لاہور میں کوئی مکان نہ تھا اُور وہ یہاں کرائے پر رہتے تھے، اس لئے جونہی اُن کی بیگم کی عدت ختم ہوئی، انہیں یہ مکان چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں واقع ضلع فیصل آباد جانا پڑا۔ اُور یہ سوچ کر بہت عبرت ہوتی ہے کہ اب اُن کی بیٹیاں نہ جانے ایک پس ماندہ گاؤں میں کس حال میں زندگی گزار رہی ہوں گی۔

باب: ۵

والدین کی توہین کا وبال

صحیح مسلم کی حدیث ہے جسے حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت کیا ہے۔ نبی اکرمؐ نے دو بار بددعا فرمائی ''وہ آدمی ذلیل ہو، وہ خوار ہو، وہ رسوا ہو'' (رَغِمَ اَنفُہٗ، رَغِمَ اَنفُہٗ) عرض کیا گیا یا رسول اللہ کون؟ آپ نے فرمایا: وہ بدنصیب جو ماں کو یا باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے، پھر اُن کی خدمت کر کے اَور ان کا دل خوش کر کے جنت حاصل نہ کر لے (معارف الحدیث جلد۶ ص ۴۸)

ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوسرے گناہوں کی سزا اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں لیکن والدین کی حق تلفی اَور نافرمانی کی سزا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں دے دی جاتی ہے (معارف القرآن جلد ۵ ص ۴۶۴)

ان دونوں فرامینِ نبویؐ کی روشنی میں میرے سامنے متعدد جیتے جاگتے واقعات ہیں کہ جن لوگوں نے بھی اپنے والدین سے بدسلوکی کا رویّہ اختیار کیا اَور اُن کے حقوق کا لحاظ نہ کیا، اپنی زندگی ہی میں وہ انتہائی عبرتناک صورتِ حال میں مبتلا ہوئے۔ مَیں یہ واقعات قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

(۱)

میرے آبائی گاؤں واقع تحصیل سمبڑیال ضلع سیالکوٹ میں میرا ایک بہت قریبی عزیز ہے۔ بہت ہی بدنصیب ہے، کج ذہن، کج عمل، اس کی عمر اب ستر سے تجاوز کر گئی ہے، لیکن زندگی بھر اُس سے کسی کا بھلا نہیں ہوا نہ والدین کا نہ بہنوں کا نہ بھائیوں کا، خصوصاً والدین کے معاملے میں اس نے ہمیشہ کمال بے حسی اور سنگدلی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں اللہ نے اُسے ہر قسم کے سکھ چین،

اُور آسودگی سے محروم رکھا۔ بیوی بہت احمق، جاہل جھگڑالو اُور بدسلیقہ ملی۔ اُس کا رزق ہمیشہ تنگ رہا۔ اُسے اُور اس کی بیوی کو طرح طرح کی بیماریوں اُور پریشانیوں نے گھیرے رکھا۔ اس کے مویشی مرتے رہے اُور کھیت اچھی فصل سے ہمیشہ محروم رہے۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ اُس نے ایک بیگھہ چنے کاشت کیے ہوئے تھے۔ چنوں میں گھاس پھوس اُور جڑی بوٹیاں بھی تھیں۔ خود تو وہ اپنی طبعی سستی اُور غیر ذمہ داری کی وجہ سے کھیت کی صفائی نہ کر سکا، مگر اُس کے والد ایک دن درانتی لے کر اُس کے کھیت میں چلے گئے اُور خودرو جڑی بوٹیاں اُور گھاس وغیرہ کاٹنے لگے۔ باپ بڑھاپے کی وجہ سے اب کوئی کام نہ کرتا تھا۔ اُس نے ایک بھینس پال رکھی تھی اُور الگ گھر میں رہتا تھا۔ مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح بھینس کے لیے چارہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

اس بدنصیب شخص نے جسے مَیں غلام فرید کا نام دوں گا، باپ کو اپنے کھیت میں دیکھ لیا۔ یہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اُور کھیت کی طرف چل پڑا، وہاں جا کر اس نے باپ کو خوب ڈانٹا، اُسے بُرا بھلا کہا اُور بازو سے پکڑ کر اٹھا دیا اُور جڑی بوٹیاں اُور گھاس جو اُس نے کاٹ کر ایک چادر پر ڈال رکھی تھیں، چادر اُلٹا کر وہیں گرا دیں اُور باپ کو دھکے دے کر کھیت سے نکال دیا۔

نتیجہ یہ ہوا، اُور یہ منظر سارے گاؤں نے دیکھا، کہ چنوں کا یہ کھیت کسی پراسرار بیماری سے جل گیا اُور کسی پودے میں کوئی دانہ تیار نہ ہوا۔ غلام فرید کی ساری محنت بیکار گئی اُور اسے باپ سے بداخلاقی اُور بدتمیزی کی دنیا ہی میں سزا مل گئی۔

(۲)

میرے گاؤں سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک دوسرا گاؤں ہے۔ وہاں شیرا فقیر نامی ایک شخص رہا کرتا تھا۔ تقریباً چھ فٹ قد تھا اُس کا۔ آواز خوب کراری تھی۔ ''ہیر'' شوق سے گایا کرتا۔ لیکن تھا بہت ہی جاہل، اجڈ اَور گنوار۔ ماں سے بہت بدتمیزی سے پیش آتا۔ گالیاں دیتا اَور ہاتھ بھی اُٹھانے سے دریغ نہ کرتا۔

صوفی جمال دین صاحب نے جو اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں، بتایا کہ شیرے کی شادی ہوئی تو اس کی جہالت اَور اکھڑ پن کی وجہ سے اُس کی بیوی نے تنگ آ کر طلاق لے لی، دوسری شادی کی، وہ بھی ناکام رہی۔ اُس کی تیسری بیوی ایک مخبوط الحواس، نیم پاگل سی عورت تھی۔ اس سے شیرے کے دو بیٹے اَور تین بیٹیاں ہوئیں...... بڑا بیٹا باولا ہو کر مر گیا۔ دوسرا ذہنی طور پر معذور تھا۔

شیرے کا حشر بڑا ہی عبرت ناک ہوا۔ اُس کے سگے بھانجے نے اُسے نہر کے پُل پر گولی مار کر قتل کر دیا۔ وہ گرفتار ہوا، مگر چھ ہی ماہ بعد ضمانت پر رہا ہو کر آ گیا۔ کوئی بھی شخص قاتل کے خلاف گواہی دینے پر آمادہ نہ ہوا تھا۔

(۳)

مَیں اپنے علاقے میں ایک قریبی گاؤں کے ایک دوست ماسٹر عبدالرشید صاحب کو ملنے گیا۔ اُن کے گھر کے قریب ہی معراج پہلوان کا بڑا سا مکان ہَے۔ میں نے عبدالرشید صاحب سے معلوم کیا کہ معراج پہلوان کا آج کل کیا حال ہے؟ اُنہوں نے بتایا کہ وہ بالکل قلاش ہو گیا ہے اُور مزدوری کرتا ہے۔ مجھے بے حد تعجب ہوا اُور اللہ کی بے نیازی سے خوفزدہ بھی ہوا کہ وہ تو اچھا خاصا امیر آدمی تھا۔ میں نے تفصیل چاہی تو اُنہوں نے بتایا کہ معراج نوجوانی میں سعودی عرب چلا گیا تھا۔ اُس نے بہت مال کمایا اُور واپس آکر ایک کنال میں بڑا گھر بنایا۔ پھر اُس نے شادی کی۔ اُسے بہت اچھی بیوی ملی۔ نیک، خدمت گزار، اُور خوش اخلاق، لیکن دو سال تک اُس سے اولاد نہ ہوئی تو معراج نے اُسے طلاق دے دی۔ ماں نے اِس ظلم سے روکنا چاہا تو اس سے بہت بدتمیزی کی اُور ماں سے بدتمیزی وہ اکثر کرتا ہی رہتا تھا۔

معراج نے پہلی بیوی کو طلاق دے کر جلد ہی دوسری شادی رچالی، لیکن دوسری بیوی اُس کے لیے مصیبت بن گئی۔ اس سے دو بیٹے اُور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ بڑا بیٹا پانچ سال کا تھا جب وہ کرنٹ لگنے سے مر گیا۔ دوسرا بیٹا اب جوان ہے اُور چھٹا ہوا بدمعاش ہَے۔ وہ ہر طرح کی وارداتیں کرتا ہے اُور باپ کے لیے رسوائی اُور بدنامی کا سبب بنا ہوا ہَے۔ چاروں بیٹیاں جوان ہیں، بڑی کی عمر پچیس سے زیادہ ہے، لیکن کسی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔ اُس کے رزق سے بھی برکت اُٹھ گئی ہے اُور اب وہ مزدوری کرنے پر مجبور ہے، جبکہ پریشانیوں اُور غموں نے اُسے ادھ موا کر دیا ہے اُور اُس کی زندگی جہنم کا نمونہ بن گئی ہے اُور یہ سارا وبال اس پر خصوصاً ماں کی نافرمانی کا پڑا ہے۔

(۴)

میں جس محفل میں بیٹھتا ہوں، موقع محل کے مطابق مکافاتِ عمل کی بات چھیڑ دیتا ہوں اَور کم وبیش ہر محفل سے مجھے کوئی نہ کوئی مفید مطلب واقع مل جاتا ہے۔ دو سال پہلے میرے ایک رشتہ دار کے بیٹے کی شادی تھی۔ وہاں آزاد کشمیر کے سردار عبدالرزاق صاحب (حال مقیم اتفاق ٹاؤن، بالمقابل منصورہ لاہور) نے ایک عبرت ناک واقعہ سنایا۔ اُنہوں نے بتایا کہ پچاس کی دہائی میں اُن کے آبائی گاؤں تراڑکھل (ضلع سدھنوتی) میں خوشحال خاں نامی ایک نوجوان بہت بدمزاج اور جاہل تھا۔ وہ اپنی والدہ سے بہت بدتمیزی سے پیش آتا تھا اَور ایک روز تو اُس نے حد ہی کر دی۔ ماں چھت کے کنارے پر بیٹھی تھی، خوشحال خاں نے کسی بات پر برہم ہو کر ماں کو ٹانگ ماری اَور وہ چھت سے نیچے گر پڑی۔ تب ماں نے تکلیف کے عالم میں بددعا دی: خدا کرے تمہاری ٹانگ سوکھ جائے اَور حیرت انگیز طور پر تین چار دن کے اندر اس کی ٹانگ سوکھ گئی اَور آئندہ پچاس سال تک وہ سوکھی ہوئی ٹانگ کے ساتھ زندہ رہا اَور بیساکھی کے سہارے چلتا رہا تا آنکہ ۲۰۰۲ء میں اُس کی وفات ہوئی۔

(۵)

بخاری صاحب میری بستی کے قریب ہی ایک دوسری آبادی میں کرائے پر رہتے ہیں۔ ایک روز اُنہوں نے اپنے ایک نوجوان واقف کار سے کہا۔ حافظ عبدالرشید خدا کے لیے کبھی والدین کی نافرمانی نہ کرنا اَور اُن کی خدمت سے پہلو تہی نہ کرنا۔ مجھے دیکھ لو مَیں دنیا کا ناکام ترین آدمی ہوں۔ نہ تعلیم مکمل ہوئی نہ بیوی اچھی ملی اَور نہ ہی اولاد لائق اور فرمانبردار ہے۔ اس وقت نہ میرا اپنا کوئی گھر ہے، نہ ڈھنگ کی ملازمت ہے اَور نہ سکون حاصل ہے اَور اس کا سبب یہ ہے کہ بدقسمتی سے مَیں نے والدین کی زندگی میں نہ اُن کا کوئی مشورہ مانا اَور نہ اُن کی خدمت کر سکا۔ اسی کا وبال ہے کہ دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں اَور زندگی مسائل اَور مصائب کی آماجگاہ بن گئی ہے۔

(۶)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

(یکم ستمبر ۲۰۰۰ء)

تین ماہ کی تعطیلات کے بعد کالج کُھلا۔ شعبۂ اُردو کے سب رفقا بیٹھے ہوئے تھے جب پ۔ پبلی کیشنز کے ض۔ قریشی تقریباً دس بجے موٹے سیاہ شیشوں کی عینک پہنے دفتر شعبہ میں داخل ہوئے۔ بیماری کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ مشکل سے چلتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ میری اِن سے بہت پرانی شناسائی ہے۔ اِن کے والدن۔ قریشی گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں انگریزی کے اُستاد تھے اَور محبت اَور اخلاص والے انسان تھے۔

مَیں نے ض۔ قریشی سے صحت کا پوچھا تو بتایا: بیماریوں کا مجموعہ بنا ہوا ہوں۔ شوگر تو بہت پرانی ہے۔ تین ہفتے قبل پھیپھڑوں میں پانی بھر گیا تھا، اُس سے کچھ افاقہ ہوا تو دل کی تکلیف ہو گئی، بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا اَور ناک سے خون آنے لگا۔ اب گردے بہت متاثر ہو گئے ہیں، اُن میں پس پڑ گئی ہے۔ معدہ خراب رہتا ہے اَور جگر ٹھیک کام نہیں کرتا، بینائی خاصی کمزور ہے۔ جس کا ثبوت میری یہ عینک ہے۔

میں نے بچوں کا پوچھا تو بتایا: پانچ بیٹیاں ہیں جن میں سے ایک ذہنی معذور ہے۔ ایک بیٹا ہے۔ میرے استفسار پر کہ بیٹا کیا کرتا ہے۔ اُس کی تعلیم کیا ہے؟ تو بتایا کہ وہ اُلو کا پٹھا بالکل نالائق ہے۔ میٹرک بھی نہیں کر سکا۔

''تو آپ کے ساتھ دکان پر بیٹھتا ہوگا۔''

''نہیں، مکمل آوارہ گردی کرتا ہے اَور اپنے باپ کا دل جلاتا ہے۔'' تب میں نے ض۔ قریشی کو رازداری سے اُن کے کان میں مشورہ دیا: ''قریشی صاحب اپنے والد کے پاؤں پکڑ لیں

اَور اُس وقت تک نہ چھوڑیں جب تک وہ آپ سے راضی نہ ہو جائیں'' مگر موصوف نے میرے مشورے کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں وہ تو مجھ سے بہت خوش ہیں حالانکہ اُنھوں نے صریحاً جھوٹ بولا تھا۔ مجھے ن۔ قریشی صاحب کے ایک قریبی دوست پروفیسر اقبال صاحب نے بتایا کہ ض قریشی کا سلوک اپنے والد سے بہت ہی گھناؤنا تھا۔ پروفیسر ن۔ قریشی نے پ، پبلی کیشنز کی بنیاد رکھی تھی اپنی، اقبال صاحب اَور دوسرے فاضل دوستوں کی نصابی کتب شائع کی تھیں ادارے کو خوب ترقی دی تھی۔ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے ض اس ادارے کی نگرانی کرتے تھے، موصوف نے ادارے کے معاملات اَور حسابات میں پہلے ہیر پھیر کیا، اور پھر زبردستی قبضہ کر کے باپ کو ادارے سے بے دخل کر دیا چنانچہ نوبت مقدمہ بازی تک پہنچ گئی جس کے دوران ض نے اپنے والد کے ساتھ انتہائی سنگدلی اَور بداخلاقی کا رویہ اختیار کئے رکھا جس کے اثر سے وہ بیمار ہو گئے اَور ایک روز دم توڑ گئے۔

☆☆☆

اس تحریر کی شروع کی سطور مَیں نے ستمبر ۲۰۰۰ء میں لکھی تھیں اَور جولائی ۲۰۰۸ء میں ض۔ قریشی کا انتقال ہوا۔ گویا تقریباً آٹھ سال تک وَہ صحت کے حوالے سے انتہائی اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔ اس دوران میں پروفیسر اقبال صاحب کی اطلاع کے مطابق موصوف کی دو بیٹیوں کی شادی ہوئی اَور دونوں کو طلاق ہو گئی۔

(۷)

کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے میرے گھر کے قریب اکمل قریشی صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ آ کر مقیم ہوئے۔ موصوف لاہور کے نواح میں ایک ہائی اسکول کے پرنسپل تھے اُور ریٹائر منٹ کے بعد ایک دینی جماعت کے تعلیمی شعبے کے انچارج بن کر یہاں آئے تھے۔ قریشی صاحب بہت حلیم الطبع اُور نمازوں کے سختی سے پابند تھے، اس لیے مسجد میں آتے جاتے ہمیں اکثر ایک دوسرے کی رفاقت حاصل ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مَیں اُن کے ضروری احوال سے باخبر ہوتا رہا۔

پتہ چلا کہ قریشی صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے اُور وہ برسوں سے امریکہ میں مقیم ہے۔ ایک ہی بیٹی ہے اُور وہ گجرات کے قریب ایک قصبے میں بیاہی ہوئی ہے چنانچہ آجکل قریشی صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ تنہا زندگی گزار رہے ہیں جبکہ اہلیہ گذشتہ آٹھ سال سے مفلوج حالت میں پڑی ہوئی ہے اُور اُس کی حالت غیر معمولی طور پر دگرگوں ہے۔ ....قریشی صاحب اپنی بیگم کی بیماریوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اکثر رو پڑتے تھے۔ فرمایا کرتے: اُس بے چاری کی ٹانگیں جڑ گئی ہیں۔ لمبے عرصے سے چت لیٹے لیٹے اُس کی کمر زخموں سے بھر گئی ہے۔ نہ وہ کروٹ بدل سکتی ہے نہ اُٹھ کر بیٹھ سکتی ہے، نہ خود کچھ کھا پی سکتی ہے۔ نالی ہی سے سیّال صورت میں خوراک دینی ہوتی ہے۔ وہ گلوگیر لہجے میں غمناک آنکھوں کے ساتھ بپتا سناتے: ڈاکٹر صاحب کسی ہسپتال میں ایک مریض کی چار افراد جو خدمت انجام دیتے ہیں، وہ اس بڑھاپے میں مجھ اکیلے کو کرنی پڑتی ہے۔ یعنی زخموں کی ڈریسنگ کرتا ہوں، نالی کے ذریعے خوراک دیتا ہوں، بول و براز ٹھکانے لگاتا ہوں اُور لباس اُور چادر وغیرہ تبدیل کرتا ہوں اُور یہ سب کام مجھے ہی کرنے پڑتے ہیں۔ ایک جز وقتی خادمہ رکھی ہوئی ہے، وہ کھانا پکا دیتی ہے، گھر کی صفائی کر دیتی ہے اُور برتن دھو دیتی ہے۔ باقی سارے امور مجھے ہی انجام دینے پڑتے ہیں۔

قریشی صاحب، چونکہ میرے گھر کے قریب ہی رہتے تھے اُور اس حوالے سے وہ میرے پڑوسی تھے، اس لیے مَیں وقتاً فوقتاً اُن کے گھر پر حاضری دیتا رہتا۔ اُن کی مزاج پرسی کرتا، دلجوئی کرنے کی کوشش کرتا اُور مختلف حوالوں سے تعاون کی پیش کش کرتا۔ اس سے موصوف مجھ سے بہت خوش تھے اُور میرے ضمیر کو بھی اطمینان اُور مسرت حاصل ہوتی تھی۔

قریشی صاحب کو جب پتہ چلا کہ مجھے ہومیوپیتھی سے دلچسپی ہے تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے دیکھیں مَیں آپ کا پڑوسی ہوں اُور ستم رسیدہ ہوں، اس لیے میرے ساتھ مزید تعاون کریں۔ مَیں بوڑھا ہوں اُور کئی طرح کی بیماریوں میں مبتلا رہتا ہوں۔ مَیں ایلوپیتھک دواؤں سے تنگ آ گیا ہوں، میری بیگم کا تو آپ کے پاس کوئی علاج نہیں، لیکن میرے علاج میں آپ بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ اُن کی خواہش پر مَیں اُنہیں مختلف وقتوں میں دوائیں فراہم کر دیا کرتا تھا جس سے وہ بہت مطمئن تھے اُور ہومیوپیتھی پر اُن کا اعتماد اس قدر بڑھ گیا کہ ایک مرتبہ اُنہوں نے اپنی بیگم کی تمام علامات لکھ کر مجھے دے دیں۔ کہنے لگے آپ سٹڈی تو کریں عین ممکن ہے کوئی معجزہ ہو جائے اُور میری بیگم صحت یاب ہو جائے۔ میرے پاس علاوہ دیگر کتابوں کے ڈاکٹر کاشی رام کا تین جلدوں پر مشتمل مفصل میٹریا میڈیکا بھی موجود ہے جس میں ہر مرض کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات بھی درج ہیں۔ چنانچہ جب مَیں نے علامتوں کے مطابق اصل دوا کا کھوج لگایا تو وہ ویلریانہ دریافت ہوئی اُور مَیں اُس کی تفصیلات پڑھ کر کانپ اُٹھا۔ دوا کیا ہے سزا اُور عقوبت کی مختلف صورتوں کا مجموعہ ہے، چند متعلقہ اشارات ملاحظہ فرمائیں۔

کھانے سے قبل ذائقے میں تعفّن، قوائے عقلیہ کند ہو جائیں، مریض خیال کرے کہ اس کے نزدیک جانور لیٹے ہوئے ہیں۔ (گویا وہ ہر وقت خوف اور اذیت میں مبتلا رہے۔) سوتے وقت حلق میں دم گھٹنے کا احساس جس کی وجہ سے مریض ہڑبڑا کر جاگ جائے، بائیں کندھے سے انگلیوں تک بے حد کھینچنے والا درد، بازوؤں میں اینٹھن والے اُور پھاڑنے والے درد" ...

ہومیو پیتھی کا علم اُور فن طبی دنیا کا ایک عجوبہ ہے جس کا کسی بھی دوسرے شعبۂ طب میں کوئی جواب نہیں۔ ایک ماہرِ فن ہومیو پیتھ چند علامتوں سے مریض کے نہاں خانۂ دل میں جھانک سکتا ہے اُور اُس کے باطن کے بہت اندر اُتر کر اُس کے مخفی عزائم اُور خصائص سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے...... چنانچہ مذکورہ بالا علامات نے یہ حقیقت الم نشرح کر دی کہ قریشی صاحب کی بیگم کا جسم ہی خدا کی گرفت میں نہیں ہے، بلکہ اُس کی روح اُور احساسات کو بھی شدید قسم کی اذیت کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

مَیں قریشی صاحب کے سارے احوال کی روشنی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا اُور اس کا ذکر میں نے اپنے بڑے بیٹے حافظ بلال فاروق سے بھی کیا، کہ قریشی صاحب اُور اُن کی بیگم سے کوئی ایسی بڑی تقصیر ہوئی ہے کہ اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کو غیر معمول انداز میں ناراض کر دیا ہے ورنہ وہ تو بہت ہی رحیم و کریم ہے اُور بغیر کسی ٹھوس وجہ کے اپنے بندوں کو لامتناہی عرصے کے لیے مصیبت اُور اذیت میں مبتلا نہیں کرتا۔

اُور پھر اللہ نے اپنے فضل سے سارے معاملے کو میرے سامنے واضح اُور منتج کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک روز مجھے اپنے عزیز شاگرد اُور دوست اشفاق بھٹی صاحب کے ساتھ شیخو پورہ روڈ پر ایک تعزیت کے لیے جانا تھا۔ وہ پروگرام کے مطابق گاڑی لے کر آ گئے۔ اُن کے ساتھ اُن کے ماموں منظور حسین بھٹی بھی تھے۔ تعارف کے بعد اُنہوں نے بتایا کہ مَیں یہاں قریشی صاحب کی بیگم کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا وہ بے چاری ایک عرصے سے بیمار ہے اُور قریشی صاحب سخت آزمائش میں مبتلا ہیں۔

مَیں نے پوچھا کہ آپ قریشی صاحب کو کیسے جانتے ہیں۔؟ تو بتایا کہ قریشی صاحب جس اسکول میں پرنسپل تھے وہاں مَیں نے دس بارہ سال ملازمت کی ہے اُور اس طرح اُن سے میرا تعلق بہت گہرا ہے۔

تب مَیں نے منظور حسین بھٹی صاحب سے درخواست کی کہ براہِ کرم انصاف، غیر جانبداری

اَور دیانت کے ساتھ بتائیے کہ کیا قریشی صاحب نے اپنے والدین کی خدمت کی تھی اَور اُن کی بیگم کا اپنے سسرال کے ساتھ کیسا طرزِ عمل تھا؟

اس پر منظور بھٹی صاحب نے برجستہ کہا: اُنہوں نے خدمت کیا کرنی تھی اُنہیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ میرے ماں باپ کی قبریں کہاں ہیں؟

''کیا مطلب ہے آپ کا؟''میں نے حیرت اَور مسرّت کے ملے جلے احساس سے چونک کر کہا۔ حیرت اس بات پر کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اَور بظاہر دیندار بیٹے کو والدین کی قبر کا بھی پتہ نہیں اَور مسرّت اس انکشاف پر کہ میرے نقطہ نظر کو ایک ٹھوس دلیل ملنے کا وقت آ گیا تھا۔

''مطلب یہ ہے جناب''منظور حسین بھٹی صاحب نے وضاحت کی کہ''قریشی صاحب اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ والدین گاؤں میں رہتے تھے اَور اوسط درجے کا خاندانی پس منظر رکھتے تھے۔ اُنہوں نے قریشی صاحب کو اعلیٰ تعلیم دلوائی اور جب اُنہیں سرکاری نوکری مل گئی تو لاہور کے ایک امیر خاندان نے اُنہیں اچک لیا۔ لڑکی کا ایک بھائی فوج میں اَور دوسرا ریلوے میں بڑا افسر تھا۔ بس قریشی صاحب کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اُنہوں نے شادی کے بعد والدین اَور خاندان سے ناطہ مکمل طور پر توڑ لیا اَور سنگدلی بلکہ سفاکی کے اس مظاہرے میں قریشی صاحب کی بیگم نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اُس نے صاف اعلان کر دیا کہ والدین سے ملنا ہے اَور خاندان سے کوئی تعلق اُستوار رکھنا ہے تو مَیں طلاق لے لوں گی اَور قریشی صاحب اس کی دھمکی کے سامنے ڈھیر ہو گئے۔ وہ بیوی کے بندۂ بے دام غلام بن گئے اَور اُنہوں نے پلٹ کر والدین سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا۔

تب خاندان میں اَور گاؤں میں لوگ قریشی صاحب سے اس قدر بدظن اَور متنفر ہو گئے کہ جب اُن کے والدین یکے بعد دیگرے وفات پا گئے تو کسی نے اُنہیں اطلاع تک دینا گوارا نہ کیا اَور اُنہیں ماں باپ کے جنازوں میں شامل ہونے کی توفیق ہی حاصل نہ ہوئی۔

منظور حسین بھٹی صاحب کے اس انکشاف سے واقعات کی ساری کڑیاں ملتی چلی گئیں۔

میری سمجھ میں آ گیا کہ قریشی صاحب کو اللہ نے ایک ہی بیٹا کیوں عطا کیا، وہ والدین کو یک وتنہا چھوڑ کر امریکہ کیوں چلا گیا اور گذشتہ کئی سالوں سے اس نے پلٹ کر اِن کی خبر گیری کیوں نہیں کی...... پھر آٹھ دس برسوں سے بیگم قریشی جسمانی اور ذہنی اعتبار سے شدید ترین عذاب میں کیوں مبتلا ہے اور قریشی صاحب اس بڑھاپے میں بدترین حالات سے کیوں دوچار ہیں اور زندگی ان کے لیے کیوں سراپا اذیت بن گئی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے جہاں یہ بددعا فرمائی کہ جو شخص والدین کی بڑھاپے میں خدمت نہیں کرتا وہ ذلیل وخوار ہو جائے۔ وہ تباہ وبرباد ہو جائے وہاں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ہلاک ہو گیا وہ شخص جو بیوی کا غلام بن گیا اور قریشی صاحب پر یہ دونوں وعیدیں بیک وقت چسپاں ہو گئیں اور دونوں نے مل کر اِن کا بھرکس نکال دیا۔

(۸)

طارق لمبے عرصے تک سعودی عرب میں ملازمت کرتا رہا۔ وہاں سے اُس نے بہت دولت کمائی۔ لاہور کی ایک بستی میں دس مرلے کا ایک مکان خریدا اُور مختلف مقامات پر کئی رہائشی پلاٹ بھی حاصل کر لیے۔

ایک دن اُس کی سگی پھوپھی باجی صفیہ سے بات ہو رہی تھی۔ طارق کا ذکر آیا تو اس نے بتایا: وہ تو بالکل پھانک ہو گیا ہے۔ کوٹھی بک گئی ہے، سارے پلاٹ فروخت ہو گئے ہیں۔ سعودی عرب سے واپس آ کر اُس نے کئی کاروبار شروع کیے، لیکن سب میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟"مَیں نے پوچھا: "وہ اپنے ماں باپ کا نافرمان ہے، بداخلاق اُور گستاخ ہے اُور بیوی کا غلام ہے۔" باجی صفیہ نے جواب دیا۔

اُور حالات نے طارق کی جو درگت بنائی ہے، اس کا اس سے بہتر کوئی تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

(۹)

اُسے باپ کی بددعا لے بیٹھی

عزیر عطا فاروقی ایک سلجھے ہوئے باوقار نوجوان ہیں۔ منصورہ (ملتان روڈ لاہور) کے سامنے ایک بستی گلشن عباس میں رہتے ہیں۔ اُنھوں نے "مکافاتِ عمل" کے حوالے سے ایک عبرت ناک مشاہدہ لکھ کر میرے حوالے کیا۔ زبان کی ضروری اصلاح کے بعد اُسے عزیر صاحب کے شکریے کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۰ء تک چار سال کا عرصہ روزگار کے سلسلے میں مَیں نے ملائشیا کے صدر مقام کوالالمپور میں گزارا۔ مَیں وہاں مسجد انڈیا کے علاقے میں سیلنگور مینشن میں مقیم تھا، جہاں کئی اَور پاکستانی بھی رہتے تھے جن میں چاچا رحمت بھی تھا۔ عمر اُس کی تقریباً پچپن سال تھی اَور وہ سرگودہا کے قریب ایک گاؤں کا رہنے والا تھا۔ سوکھا سڑا، نحیف و نزار، سستے میلے کپڑے، گویا وہ بےچارگی اَور افسردگی کی مجسم تصویر تھا۔ ہم نے اسے کبھی مسکراتے ہوئے نہ دیکھا۔ گم سم پریشان رہتا۔ خوف اَور حزن نے اُس کے چہرے پر جیسے مستقل بسیرا کر لیا تھا۔ اُسے اچھا کھانا بھی نصیب نہ ہوتا۔ سستے ہوٹل سے جہاں دال یا شوربہ مفت ملتا ہے، وہ ایک وقت میں صرف دو روٹیاں کھاتا تھا۔ کنجوسی اَور جزرسی اس کے کردار کا لازمی جزو بن گیا تھا۔ اندازہ کریں کہ اُس نے کہیں مستقل رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ تھوڑے دن کے لیے کہیں ایک جگہ پناہ لے لیتا اَور پھر کسی دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتا تھا۔

ہر ہفتے کی شام کو ہم سب پاکستانی سری پٹالنگ تبلیغی مرکز میں اکٹھے ہوا کرتے۔ بیان سننے

کے بعد اجتماعی کھانا کھاتے اُور پھر رات گئے تک اپنی آپ بیتیاں سناتے سناتے سو جایا کرتے۔

مورخہ ۷ نومبر ۱۹۹۸ء کو نمازِ عصر کے بعد مَیں چاچا رحمت کی قیام گاہ پر گیا تاکہ اُسے اپنے ساتھ تبلیغی مرکز لے چلوں۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ وہ تیز بخار میں مبتلا ہے اُور بغیر کسی دوا کے یونہی پڑا ہوا ہے۔ پتہ چلا کہ وہ صبح سے بھوکا بھی ہے، چنانچہ مَیں پانچویں فلور سے نیچے آیا۔ ایک میڈیکل سٹور سے دوالی اُور دودھ اُور کھانے کی کچھ چیزیں لے کر اُس کے پاس گیا۔ چاچا نے دودھ پیا، ڈبل روٹی کھائی تو اُس کی طاقت کچھ بحال ہوگئی۔ پھر مَیں نے اُسے دوا کھلائی تو وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اُور کہنے لگا کہ دروازہ بند کر دیں۔ آج مَیں آپ کو اپنی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔

اُور اس کے بعد چاچا رحمت نے جو واقعات سنائے اُنہوں نے مجھے خوفزدہ کر دیا۔ اُور میرے ذہن اُور کردار پر بڑے ہی دُور رس اثرات مرتب کئے۔ یہ عبرت ناک اُور سبق آموز کہانی آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ کیا خبر یہ کِس کِس کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے۔

چاچا رحمت نے بتایا: عزیز صاحب میرے والد بہت بڑے زمیندار تھے۔ مَیں بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ تین بھائی اُور دو بہنیں مُجھ سے چھوٹی تھیں۔ بد قسمتی سے میری طبیعت شروع ہی سے آوارگی کی طرف مائل تھی۔ آٹھویں سے آگے نہ پڑھ سکا۔ چھوٹے بہن بھائیوں پر رُعب گانٹھنا اور ہم عمر لڑکوں کی پٹائی کرنا میرا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جوان ہوا تو باقاعدہ بدمعاش بن گیا اُور پھر ایک دن مَیں نے گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی سے زبردستی شادی کر لی۔

شادی کے جلد بعد مَیں نے باپ سے مطالبہ کیا کہ میرے حصے کی زمین میری ملکیت میں دے دیں۔ باپ نے پس و پیش کیا تو مَیں نے سختی کی اُور باپ نے ساری زمین شرعی اعتبار سے ساری اولاد میں تقسیم کر دی۔ میرے حصے میں بیالیس ایکڑ آئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میری بیوی نے مجھے ترغیب دی کہ یہ جو باپ نے اپنے قبضے میں زمین رکھی ہوئی ہے، اُس سے مطالبہ کرو کہ وہ بھی ہمیں دے دے۔ ماں باپ کو تو اب تین وقت کی روٹی کی ضرورت ہے، وہ ہم انہیں دے دیا کریں گے۔

مَیں نے باپ سے یہ بات کی تو اُس نے جواب دیا کہ دیکھو تمہارے حصے کی زمین مَیں تمہیں دے چکا ہوں۔ اس زمین کے بارے میں مَیں نے وصیت کی ہوئی ہے کہ میری وفات کے بعد یہ گاؤں کی مسجد اُور مدرسے کو دے دی جائے...... یہ زمین مَیں تمہیں نہیں دے سکتا۔

لیکن مَیں نے اصرار کیا کہ یہ زمین بھی میرے قبضے میں دی جائے اُور جب باپ نے سختی سے انکار کیا، تو مَیں نے اُسے گھونسوں اور مکّوں سے مارنا شروع کر دیا۔ اس پر بھی وہ نہ مانا تو مَیں اُس کے سر پر جوتے مارنے لگا اُور اتنے جوتے مارے کہ اُس کے کان سے خون بہنے لگا اُور وہ بے ہوش ہو گیا۔ مَیں اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر ڈیرے پر چلا گیا۔

تقریباً دو گھنٹے گزرے تھے کہ میری ماں میرے پاس آئی کہنے لگی کہ تمہارے باپ کو تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ہوش آتا تھا اُور وہ تمہارے لیے دعا کرتا تھا...... مَیں نے پوچھا کیا دعا کرتا تھا تو بتایا وہ کہتا تھا خدایا میرے بیٹے کو معاف کر دے، اُسے ایسی اولاد نہ دے جو اُسے مارے، اُس کی پٹائی کرے۔

ماں نے یہ بھی بتایا کہ تمہاری چھوٹی بہن نے اپنے حصے کی زمین تمہیں دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ اب خوش ہو جاؤ اُور گھر چلو۔

مَیں بہن کا اعلان سن کر بہت خوش ہوا۔ اسے اپنی فتح سمجھا اُور گھر آ گیا۔

چاچا رحمت نے بتایا عزیز صاحب! میرا باپ اس واقعے کے بعد گم صم رہنے لگا۔ وہ کوئی بات نہیں کرتا تھا، اسی حالت میں وہ ایک روز رات کو سویا اُور صبح بیدار نہ ہوا۔ نیند ہی میں کسی وقت اُسے موت نے آ لیا تھا۔

چاچا رحمت نے بتایا: میری محبوب بیوی نے پانچ سال کے عرصے میں تین بیٹیوں کو جنم دیا اُور پھر اسے کینسر کے موذی مرض نے آ لیا اُور وہ دو سال تک شدید اذیت میں مبتلا رہ کر فوت ہو گئی۔ اس کے علاج پر مَیں نے پیسہ پانی کی طرح بہایا حتیٰ کہ تقریباً نصف رقبہ مجھے فروخت کرنا پڑا مگر اُس کی صحت بحال نہ ہوئی۔

اس کے بعد مَیں نے دوسری شادی کی، اس خاتون سے میری چار بیٹیاں پیدا ہوئیں چونکہ مجھے بیٹے کی شدید خواہش تھی اس لیے میں نے تیسری شادی کی لیکن لگتا ہے کہ باپ نے تو مجھے معاف کر دیا تھا، مگر خدا نے معافی نہ دی اَور تیسری بیوی سے بھی چار لڑکیاں پیدا ہوگئیں۔ اس طرح میرے گھر میں بیٹیوں کی تعداد گیارہ ہوگئی اَور خدا نے مجھے ایک بیٹا بھی عطا نہ کیا گویا باپ کی وہ دعا دردناک انداز میں قبول ہوگئی کہ خدایا میرے بیٹے کو ایسی اولاد نہ دینا جو اُسے مارے، جو اس کی پٹائی کرے۔

چاچا رحمت نے بتایا۔ عزیر صاحب مجھ پر اللہ کی ناراضگی کا کوڑا پوری شدت کے ساتھ برسا۔ میرے رزق سے برکت بالکل ہی رخصت ہوگئی۔ ساری کی ساری زمین بِک گئی، میری بہنوں اَور بھائیوں نے میرا مکمل بائیکاٹ کر دیا اَور جوان ہوتی ہوئی گیارہ بیٹیوں نے میری راتوں کی نیند اَور دن کا سکون غارت کر دیا...... میری صحت برباد ہوگئی اَور مَیں پائی پائی کا محتاج ہوگیا، حتیٰ کہ تنگ آ کر، خوفزدہ ہو کر مَیں یہاں آ گیا ہوں اَور جس طرح کی زندگی گزار رہا ہوں وہ آپ کے سامنے ہے۔ نہ اچھا کھانا نصیب میں ہے نہ اچھا لباس پہنتا ہوں۔ پیسہ پیسہ بچا کر بیویوں کو اَور بیٹیوں کو بھیجتا ہوں، مگر پھر بھی سکون کو ترس گیا ہوں۔ گیارہ بیٹیوں کے مستقبل کا خیال مجھے سانپوں کی طرح کاٹتا رہتا ہے اَور میری زندگی جہنم کا نمونہ بن گئی ہے۔

یہ واقعہ سنانے کے دوران بھی چاچا رحمت بار بار اشکبار ہوتا رہا...... اَور آخر میں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ خوف اَور عبرت سے میرے بھی آنسو نکل آئے۔

چاچا رحمت جب مسلسل بیمار رہنے لگا اَور مزید کمزور ہوگیا، تو ہم پاکستانی دوستوں نے مل کر چندہ کیا اُسے ٹکٹ خرید کر دیا اَور وہ پاکستان آ گیا جہاں وہ ایک سال کے اندر اندر فوت ہوگیا۔

(۱۰)

سگے باپ کا قاتل سارے خاندان سمیت حادثے میں ہلاک ہو گیا

یہ خبر روز نامہ ''پاکستان'' لاہور کے شعبہ ''ایک دن ایک عدالت'' میں ۲۱ر مارچ ۲۰۰۴ء کو شائع ہوئی۔ یہ مقدمہ ایڈیشنل سیشن جج میاں انور نذیر کی عدالت میں زیر سماعت تھا۔

خبر کے مطابق کاہنہ کے علاقے میں ایک زمیندار سلامت علی نے ڈیڑھ لاکھ روپے دے کر ایک مفرور قاتل رشید عرف شیدو سے اپنے سگے باپ محمد شریف کو قتل کرا دیا۔ اس واردات میں وہ خود بھی شامل تھا...... لیکن جب سلامت علی نے باپ کے قتل کے بعد چاول کی مِل اور دیگر جائیداد کو فروخت کرنا چاہا اُور اُس کے بھائی نیامت علی نے مخالفت کی تو اُس نے قتل کے مقدمہ میں نیامت علی کو نامزد کر دیا۔

اخبار کے مطابق اس دوہرے ظلم کے چند دنوں کے بعد سلامت علی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی گاڑی میں کہیں جا رہا تھا کہ حادثہ ہو گیا اُور یہ سارا خاندان ہلاک ہو گیا۔

چونکہ یہ خبر ایک دن کی عدالتی کاروائی پر مشتمل تھی، اس لیے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ سلامت علی اور اس کے خاندان کو مہلک حادثہ کب اور کہاں پیش آیا؟

تاہم زمیندار محمد شریف کے اصل قاتل رشید عرف شیدو نے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر جوڈیشل مجسٹریٹ غلام دستگیر نشتر ٹاؤن لاہور کی عدالت میں ۱۲ر مارچ ۲۰۰۴ء کو خود پیش ہو کر یہ اعتراف کیا کہ اُس نے سلامت علی کے کہنے پر اس کے باپ محمد شریف کو قتل کیا تھا اُور نیامت علی بالکل بے قصور ہے۔

(۱۱)

والدین سے بدسلوکی پر اللہ کا وبال

تقریباً چار سال پہلے کی بات ہے، مَیں ایک تقریب میں شمولیت کے لیے گاؤں گیا تو ایک لمبے عرصے کے بعد گلزار سے ملاقات ہوئی۔ وہ ہمارے گاؤں کے قریب ہی دوسرے گاؤں میں رہتا تھا اور میرا اسکول فیلو تھا۔ وہ دو سال مجھ سے پیچھے تھا۔ پڑھائی میں بہت پھسڈی تھا۔ کھیل کود اور آوارگی میں مگن رہتا تھا۔ اس لیے بار بار فیل ہوتا رہا اور آٹھویں میں تھا جب آخر کار رسی تڑا کر بھاگ گیا اور جا کر فوج میں سپاہی بھرتی ہوگیا۔ اُس کی افتادِ طبع کے پیشِ نظر کوئی اور کام کرنا شاید اس کے بس کی بات بھی نہ تھی اور پھر پچیس تیس سال گزر گئے۔ ہمارا آمنا سامنا نہ ہوا۔ ایک بار سنا تھا کہ گلزار نے فوج سے ریٹائرمنٹ لے لی ہے اور کویت چلا گیا ہے۔

حالانکہ اسکول کے زمانے میں بھی میری گلزار سے بے تکلفی نہیں رہی تھی پھر بھی فطری طور پر ایک طویل مدت کے بعد اُسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اُس کے اطوار میں غرور اور تکبر کا انداز نمایاں تھا شاید اس لیے کہ وہ خاصا امیر ہوگیا تھا اور شاید اس لیے کہ وہ فوج میں رہا تھا۔ اس نے گردن بلند کر کے بتایا کہ اُس نے کویت سے بہت پیسہ کمایا ہے۔ وہ اپنے بڑے بیٹے کو بھی وہیں لے گیا تھا۔ اُس نے تین حج کئے ہیں اور اب گاؤں میں اُس نے شاندار مکان تعمیر کیا ہے۔ مَیں نے بال بچوں کا پوچھا تو وہ ایک دم افسردہ ہوگیا۔ اُس کی گردن کا تناؤ کم ہوگیا اور چہرے پر حزن و ملال کی پرچھائیاں گہری ہوگئیں۔ بولا: میرے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے لیکن اولاد کے حوالے سے میری تقدیر بہت بُری ثابت ہوئی ہے۔

میرے استفسار پر اُس نے بتایا: ”دو سال پہلے مَیں نے بڑے بیٹے کی شادی دھوم دھام

سے کی۔ گیارہ لاکھ روپیہ خرچ کر دیا۔ پچاس ہزار تو صرف آتش بازی پر خرچ ہوا۔ لیکن'' اُس نے بہت لمبی اور ٹھنڈی آہ کھینچی'' لیکن دلہن بس ایک ہی رات میرے گھر میں رہی دوسرے دن ولیمہ تھا۔ دور ونزدیک کے سب رشتہ دار اور ساری برادری جمع تھی، دلہن کے والدین بھی ولیمے میں آئے ہوئے تھے۔ رواج کے مطابق شام کو وہ دلہن کو اور میرے بیٹے کو ساتھ لے گئے اور دوسرے روز دلہن نے اعلان کر دیا کہ مَیں دوبارہ سسرالی گھر میں نہیں جاؤں گی۔ اُس کا کہنا تھا کہ لڑکا بالکل بے کار ہے اُس میں مردانگی کا جوہر ہی نہیں ہے۔

گلزار نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا: '' ڈاکٹر صاحب یہ خبر ہمارے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ میرا سب کچھ لٹ گیا، مَیں برباد ہو گیا اور رشتے داروں اور برادری میں تقسیم کے لیے مَیں نے جو منوں مٹھائی تیار کرائی تھی وہ نہر میں پھینک دی۔ مَیں اور میرا بیٹا کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے تھے اور پھر میری بہو کے باپ نے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن مَیں نے صاف انکار کر دیا۔ میرا عزم تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے میری بہو کو لازماً میرے ہی گھر میں زندگی گزارنی چاہئے۔ وہ میرے بیٹے کی منکوحہ ہے اب اس کا کسی دوسرے گھر میں جانا گویا میری موت کے برابر ہے۔ کیونکہ بہو جو بات کہہ رہی تھی وہ درست نہیں تھی۔'' ڈاکٹر صاحب'' گلزار نے زور دے کر کہا'' حقیقت یہ تھی اور مَیں قرآن پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ میری بہو اچھے کردار کی مالک نہ تھی۔ وہ پولیس میں ملازم تھی اور خاصی تجربہ کار تھی جبکہ میرا بیٹا سیدھا سادا بھولا بھالا نوجوان تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ پچاس تولے سونا ہضم کرنا چاہتے تھے۔ میرا سمدھی بھی آزاد خیال آدمی تھا، اُس کی شہرت اچھی نہ تھی۔

چنانچہ اُس نے طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا اور پھر مَیں نے بھی اُسے خوب چکر دیئے، خوب ذلیل کیا۔ ڈیڑھ سال مقدمہ چلا اور جب وہ میرا سونا واپس کرنے پر آمادہ ہوا تو مَیں نے ناک کی لکیریں نکلوا کر طلاق دلا دی۔ لیکن بھائی عبدالغنی! ہائے میری قسمت، ہائے میرے نصیب کہ اس کے بعد مَیں نے بیٹی کی شادی کی۔ وہ آپ کے گاؤں میں اکبر کے بیٹے کے ساتھ۔ مَیں نے اتنا

جہیز دیا، اتنا جہیز دیا کہ اس علاقے میں کسی نے اپنی بیٹی کو نہیں دیا ہوگا۔ صوفہ سیٹ، بیڈ، ڈائننگ سیٹ، فریج۔ ٹی وی، سٹیل کے سیٹ، پلاسٹک کے سیٹ، چینی کے سیٹ، مَیں نے اپنی سمدھن کو بھی سونے کا ایک سیٹ دیا۔ داماد کے سارے خاندان کو ولایتی قیمتی سوٹوں سے لاد دیا اور بارات کی اتنی تواضع کی کہ دھوم مچ گئی۔ داماد کو اپنے ساتھ کویت لے گیا۔ وہاں اُسے بڑی اچھی نوکری دلا دی۔

لیکن ہائے میرا داماد بڑا ہی کمینہ اور احسان فراموش ثابت ہوا۔ اس نے معمولی سی چپقلش پر پہلے میرے بیٹے سے جھگڑا کیا، مَیں نے سمجھانے کی کوشش کی تو مجھ سے بدتمیزی کی، میرا گریبان پکڑ لیا اور پھر بدبخت نے کھڑے کھڑے میری بیٹی کو تین طلاقیں دے دیں اور پھر گلزار جذباتی ہوگیا۔ ڈاکٹر صاحب، یہ تقدیر کیا ہے؟ یہ اتنی ظالم اور بے رحم کیوں ہے؟ مَیں نے تین حج کئے ہوئے ہیں۔ پھر میرے ساتھ یہ ظلم کیوں ہوا؟ مَیں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا، میرے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا ہے۔؟ اور ان الفاظ کے ساتھ ہی اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا، اُسے دلاسہ دینے لگا۔ حوصلہ اور صبر کی بات کی اور موضوع بدلنے کی خاطر پوچھا:

''گلزار بھائی، آپ کے والد اور والدہ کس حال میں ہیں؟ آپ نے اُن کی خدمت تو خوب کی ہوگی۔''

میرے اس سوال پر گلزار کا موڈ یک دم بدل گیا۔ اُس نے روتے روتے انکھیں صاف کیں، سنبھل کر بیٹھ گیا اور غصے میں بولا۔

''میرے ماں باپ مرکھپ گئے ہیں۔ اُنھوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ بس بددعائیں دیتے رہے اور آج میں انہی کی بددعاؤں کی نحوست میں گھرا ہوا ہوں۔' مَیں گلزار کے اندازِ تکلم پر بھونچکارہ گیا اور حیرت سے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''آپ کو حیرت ہے کہ مَیں اپنے والدین کے خلاف اس طرح کی باتیں کیوں کر رہا ہوں۔ حقیقت ہے کہ انھوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ اُنھوں نے میری تعلیم کے لیے کچھ نہیں کیا،

ورنہ کیا مَیں بھی اتنی تعلیم حاصل نہیں کرسکتا تھا جتنی آپ کی ہے۔؟ آخر آپ کے ماں باپ نے بھی تو کوشش کی اور آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی۔ پھر مَیں نے اپنی زندگی کے لیے جو کچھ کیا، خود کیا۔ فوج میں نوکری کی، پھر کویت چلا گیا، بہت پیسہ کمایا، مکان بنایا، لیکن میرے ماں باپ مجھ سے راضی نہ ہوئے۔ وہ میری بیوی سے بھی مسلسل لڑتے رہے اور مجھے بددعائیں دیتے رہے۔''

گلزار کی واہی تباہی نے مجھے بہت افسردہ اور پریشان کر دیا اور مَیں کمرے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔'

بعد میں مجھے واقفِ حال لوگوں سے پتہ چلا کہ گلزار نے اپنے ماں باپ سے بہت ہی بُرا سلوک روا رکھا تھا۔ اس نے کویت جا کر بہت کمائی کی، لیکن والدین پر معمولی سا بھی خرچ نہ کیا۔ اُس کی بیوی بڑی ہی بداخلاق اور جھگڑالو عورت تھی اور اُس نے ساس سسر کا جینا حرام کر دیا، حتیٰ کہ یہ الگ مکان بنا کر وہاں منتقل ہوگئے، لیکن والدین پرانے کچے مکان میں مقیم رہے۔ گلزار کے والدین کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا کہ گرمیوں کی ایک دوپہر کو سخت دھوپ میں اُس کی بوڑھی ماں کھلے چھت پر بنے ہوئے تنور میں روٹیاں پکا رہی تھی کہ اسے چکر آیا وہ چھت سے نیچے گر گئی اور دم توڑ گئی۔ یہ ظالم ان دنوں کویت میں تھا۔ اس نے ماں کے جنازے میں شمولیت کرنے کی زحمت بھی نہ کی۔ باپ بھی اس حادثے کے جلد بعد فوت ہوگیا اور اس کے جنازے میں بھی یہ بدنصیب شامل نہ ہوا۔

گلزار غیر معمولی حد تک زن مرید اور بے غیرت آدمی تھا۔ ایک چشم دید خاتون نے بتایا کہ ایک بار گلزار کویت سے حج کے لیے گیا اور وہاں سے پاکستان آیا۔ ماں کو پتہ چلا کہ بیٹا حج کر کے آیا ہے، تو وہ محبت اور اشتیاق سے اسے ملنے کے لیے گئی۔ گلزار نے ایک جانماز اٹھایا اور ماں کو پیش کیا۔ بیوی قریب بیٹھی تھی، وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی اور اس نے جھپٹ کر جانماز اپنی ساس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ''میں اس کلموہی کو مصلاً نہیں لینے دوں گی۔'' اس نے کہا اور ماں آنسو بہاتی بیٹے کے گھر سے اُٹھ کر آ گئی۔ گلزار کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنی بیوی کو اس سفاکی پر ڈانٹتا اور ماں کو راضی کرتا، وہ بے

غیرت خاموش بیٹھا رہا۔

ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اس صورتِ حال میں اللہ کا غضب گلزار پر کیوں نہ ٹوٹتا، اس کے ہر کام میں بگاڑ کیوں پیدا نہ ہوتا اور ہر معاملے میں اُسے ذلت ورسوائی کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑتا۔؟

لیکن شامتِ اعمال نے گلزار کا اب تک پیچھا نہیں چھوڑا۔ اس نے والدین کے ساتھ جس بے حسی اور شقاوتِ قلبی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اب تک اُس کے وبال میں مبتلا ہے۔ چنانچہ اُس نے دو سال قبل اپنے بڑے بیٹے کی دوبارہ شادی کی، لیکن چونکہ بیٹا جنسی اعتبار سے واقعتاً نا کارہ تھا، اس لیے گھر میں ایک عجیب وغریب، ناگفتی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ گلزار گذشتہ چند سالوں سے کویت کی ملازمت ترک کر کے مستقلاً گاؤں میں رہتا ہے۔ بیٹے کی شادی ہوئی تو وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کر کے کویت چلا گیا۔ گھر میں جوان بہو تھی اور گلزار کسی اخلاقی ضابطے کا پابند نہ تھا، چنانچہ فضا اب ایسی بن گئی کہ گلزار کی اپنی بیوی سے تند و تیز جنگ شروع ہوگئی اور اب اس جنگ نے ایسے المیے کی صورت اختیار کرلی ہے کہ اس پر چشمِ عبرت رکھنے والا کوئی فرد بھی کانپ کانپ اُٹھتا ہے۔

میاں بیوی میں روز ہی لڑائی ہوتی ہے اور یہ لڑائی اتنی شدت اختیار کر جاتی ہے کہ گلزار بیوی کو چھڑی سے مارتا ہوا اور تعاقب کرتا ہوا باہر گلی میں آ جاتا ہے۔ وہ بیوی جس نے اپنی ساس کے ہاتھ سے مصلاً چھین لیا تھا، اب بال کھولے خستہ حالوں چیخ پکار کرتی ہوئی باہر گلی میں بھاگ رہی ہوتی ہے۔ وہ بہو کے حوالے سے گلزار پر کھلے بندوں الزام لگاتی ہے اور گلزار اُس کی پٹائی کرتا ہوا اُس کا پیچھا کر رہا ہوتا ہے۔ وہ بھی جنونیوں کی طرح چیختا ہے ''لوگو میری بیوی پاگل ہوگئی ہے اس لیے میں اس کو مار رہا ہوں، آؤ تم بھی اسے مارو تا کہ اس کا دماغ ٹھیک ہو جائے۔''

اور یہ دردناک اور عبرتناک سلسلہ بڑی دیر سے جاری ہے۔ گلزار کی زندگی کتوں سے بدتر ہوگئی ہے، اس کی عزت خاک میں مل گئی ہے، کوئی اس سے بات کرنا، اس کے پاس بیٹھنا پسند نہیں

کرتا اور تب مجھے نبی اکرم ﷺ کی وہ حدیث یاد آتی ہے جو صحیح مسلم میں شامل ہے جس میں حضورؐ نے بددعا فرمائی۔ وہ آدمی ذلیل ہو، وہ خوار ہو، وہ رسوا ہو جو ماں باپ کو یا دونوں میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پائے اور ان کی خدمت کر کے اور اُنہیں خوش کر کے جنت حاصل نہ کرے۔'' (بحوالہ معارف الحدیث جلد ششم) ظاہر ہے جس شخص کے حق میں حضورِ ختم الرسلؐ بددعا کریں۔ وہ گلزار کی طرح ذلیل وخوار نہ ہوتو اور کیا ہو؟

(۱۴)

ماں سے بدسلوکی پر اللہ کا غضب

حاجی خدا بخش ہمارے علاقے کے بہت ہی نیک نام بزرگ تھے۔ مجھے تو ان کی زیارت کا شرف حاصل نہیں ہوا، میرے ہوش سنبھالنے سے کچھ ہی پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، لیکن والدین اور دیگر لوگوں کو اُن کی تعریف کرتے پایا۔ اُنہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی کہ اُن کے بچپن میں اس علاقے میں ابھی پرائمری اسکول قائم نہیں ہوا تھا، لیکن وہ غیر معمولی ذہین آدمی تھے۔ گاؤں کے مولوی صاحب سے قرآن ناظرہ پڑھا، لفظوں کی پہچان ہوئی تو خود ہی اُردو کتابیں بھی پڑھنے لگے اور اس طرح وہ حکمت کی بعض کتابوں سے شناسا ہوئے اور خلقِ خدا کا مفت علاج معالجہ کرنے لگے، چنانچہ کشتہ سازی کے ساتھ ساتھ وہ سانپ کے کاٹے کا کامیاب علاج بھی کرتے تھے۔ اس طرح وہ دور ونزدیک ''حاجی ماندری'' کے نام سے معروف ہو گئے۔ حج انہوں نے اس زمانے میں کیا جب اس عمل میں کم وبیش چھ ماہ کا عرصہ صرف ہوتا تھا۔ اس کے لیے بمبئی سے بحری دخانی جہاز چلتے تھے اور جدہ سے مکہ اور مکہ سے مدینہ تک کا سارا سفر اُونٹوں پر طے کرنا ہوتا تھا۔ اُس دور میں یہ سفر واقعی بڑا جانگسل تھا۔ یہ دل گردہ رکھنے والے بہت بہادر اور صاحبِ ایمان لوگوں کا دینی فریضہ تھا۔ حاجی خدا بخش کی بہادری اور اولوالعزمی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اُنہوں نے بیسویں صدی کے آغاز میں جب انگریزوں نے نہری نظام کا اجراء کیا اور پنجاب کے مختلف اضلاع میں بنجر زمینیں آباد ہوئیں تو حاجی صاحب نے بھی منڈی بہاؤالدین سے آگے بوسال کے علاقے میں دو مربعے خرید لیے اور اپنے دو نوعمر بیٹوں کی مدد سے خون پسینہ

ایک کر کے اُنہیں لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل کرلیا، تاہم مستقل رہائش اُنہوں نے اپنے آبائی علاقے ہی میں اختیار کئے رکھی جہاں اُنہیں خاص عزت وتوقیر حاصل تھی۔

حاجی صاحب نے مختلف اوقات میں تین شادیاں کیں اور اس کی ٹھوس وجوہ تھیں۔ پہلی بیوی دو بیٹوں اور تین بیٹیوں کو چھوڑ کر وفات پا گئی تو حاجی صاحب نے دوسری شادی کرلی لیکن بدقسمتی سے یہ خاتون خوبصورت تھیں نہ خوش ذوق، نہ سلیقہ مند۔ اُس نے ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو جنم دیا اور حاجی صاحب نے اُس سے علیحدگی اختیار کرلی۔ چنانچہ تیسری شادی اُنہیں مجبوری کے عالم میں کرنی پڑی۔ یہ خاتون نوجوان تھیں، خوبصورت شخصیت کی مالک تھیں اور بڑی ہی خوش اخلاق اور ہوش مند تھیں اور حالانکہ اُس وقت حاجی صاحب کی عمر کم وبیش ستر سال تھی، لیکن ان کی صحت، طبابت اور ایمان کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے اُنہیں یکے بعد دیگرے دو صحت مند بیٹے عطا کئے۔ بڑا ہاشم علی تھا اور چھوٹا قاسم علی۔ یہ دونوں بھائی بالترتیب چھ اور چار سال کے تھے۔ جب حاجی صاحب ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے۔ اس وقت اُن کی اہلیہ کی عمر چھبیس، ستائیس سال سے زیادہ نہ تھی۔

ہاشم علی اور قاسم علی اگرچہ سگے بھائی تھے، لیکن دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ان کی والدہ ان پڑھ ہونے کے باوجود بڑی ہی سگھڑ خاتون تھیں۔ چنانچہ اُنہوں نے سوتیلے بیٹے سمیت تینوں بھائیوں کو اسکول میں داخل کرادیا۔ بڑے بیٹے اختر نے میٹرک کرلیا تو اسے فوج میں بھرتی کرادیا۔ ہاشم علی لاابالی طبیعت کا لڑکا تھا اور اُس میں غیر سنجیدگی اور آوارگی کے جراثیم غالب تھے، چنانچہ وہ میٹرک نہ کرسکا، تاہم ماں نے کوشش کر کرا کے اُسے بجلی اور ریفریجریٹر کے کورس کرادیئے اور دونوں بڑے بھائیوں کی شادیاں بھی کردیں۔

قاسم علی سب بھائیوں میں سب سے خوبصورت اور لائق تھا۔ اُس نے میٹرک میں اچھے نمبر حاصل کئے اور والدہ نے اُسے سیالکوٹ کے ایک کالج میں داخلہ دلا دیا۔ لیکن بدقسمتی سے ہاشم علاوہ دیگر اخلاقی کمزوریوں کے حسد میں مبتلا تھا۔ وہ والدہ اور قاسم کو پریشان کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا اور گھر میں مختلف حوالوں سے ہنگامہ کھڑا کئے رکھتا۔ نتیجہ یہ کہ حساس طبع قاسم بیمار ہوگیا۔

اُن کے پھیپھڑے متاثر ہوگئے اور اُسے ایف اے کا امتحان پاس کیے بغیر تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اور آئندہ کئی سال کے لیے اُسے بے کاری کے عالم میں گھر پہ ہی مقیم رہنا پڑا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب قاسم سے میرا تعلق قائم ہوا۔ اُس کا گاؤں ہمارے گاؤں سے کوئی تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور سڑک کے کنارے واقع تھا۔ اتفاق سے اُس کا گھر بھی سڑک کے عین متصل تھا اور میں جب بھی کالج جانے کے لیے بس پر سوار ہوتا تو اُسے اکثر و بیشتر اپنے گھر کے سامنے درختوں کی چھاؤں میں چارپائی پر بیٹھے ہوئے دیکھتا تھا۔ چونکہ مطالعے سے میری رغبت جنون کی حد تک تھی اور میں راستے میں چلتے پھرتے ہوئے بھی عموماً کوئی کتاب یا رسالہ پڑھتا رہتا تھا، اس لیے عام لوگوں سے بے تکلف ہونے کی نوبت بہت کم آئی تھی۔ چنانچہ نظریں چار ہونے کے باوجود بڑی دیر تک ہمارے درمیان علیک سلیک یا تعارف کی تقریب پیدا نہ ہوئی تا آنکہ ایک روز قاسم نے خود پہل کر ڈالی۔ ہوا یوں کہ میں کالج سے واپس آیا اور بس سے اتر کر اپنے گاؤں کے راستے کی طرف بڑھا تو قاسم نے آواز دے کر مجھے بلالیا، میں اس کے پاس گیا تو اُس نے غیر معمولی تپاک اور اپنایت کا مظاہرہ کیا۔ میری کم آمیزی کا گلہ کیا، مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ اپنی والدہ سے ملوایا جو قاسم سے بھی بڑھ کر شفقت اور محبت سے پیش آئیں۔ انہوں نے اصرار کے ساتھ دودھ پلایا، حلوہ کھلایا اور تقاضا کیا کہ میں اُن سے ملتا رہوں۔

اس طرح جلد ہی قاسم اور اُس کی والدہ سے میرا تعلق بہت تھوڑے وقت میں گہرا ہوتا چلا گیا۔ دونوں ماں بیٹا تھے ہی بہت اچھے۔ دونوں اخلاص، محبت اور مروّت میں گویا گندھے ہوئے تھے۔ میں جب بھی جاتا، وہ خوشی سے نہال ہوجاتے اور کچھ کھلائے پلائے بغیر آنے نہ دیتے۔ نتیجہ یہ کہ تعلق گہرا ہوتا چلا گیا اور مجھے بھی قاسم کو ملے بغیر چین نہ آتا تھا۔ قاسم کے حوالے سے میری ہاشم سے بھی شناسائی ہوئی، مگر یہ تجربہ خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ ہاشم نے گزر اوقات کے لیے آٹا پیسنے کی چکی لگا رکھی تھی اور وہ اسی خراج گھر کے ایک حصے میں بیوی بچوں سمیت الگ رہتا تھا۔ لیکن اُس کا تعلق نہ اپنی والدہ سے اچھا تھا نہ اپنے بھائی قاسم سے۔ وہ عجیب وغریب ذہنیت کا آدمی تھا۔

حسد، غصے اور تنگ نظری میں مبتلا وہ ہر شخص کو مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ اُس کی والدہ، جیسا کہ اُوپر اشارہ کر چکا ہوں، بڑے ہی اچھے مزاج کی خداترس خاتون تھیں مگر بدقسمت ہاشم انہیں پریشان کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتا۔ اُس کو گلہ تھا، جس کی وہ برملا تکرار کرتا رہتا کہ ماں نے اس کی کسی خوبصورت لڑکی سے شادی نہیں کی حالانکہ اُس کی بیوی بدصورت ہرگز نہ تھی۔ قبول صورت تھی، لیکن سنجیدہ اور خاموش طبع تھی جسے ہاشم کی لڑائی مار پٹائی نے مزید خوفزدہ اور گنگ بنادیا تھا۔

ہاشم فطرتاً ایک عاشق مزاج اور نظر باز نوجوان تھا۔ جس خوبصورت لڑکی کو دیکھتا، اُس کی رال ٹپکنے لگتی اور وہ اس پر ڈورے ڈالنے لگتا۔ حد یہ کہ گھر میں صفائی کے لیے آنے والی ایک لڑکی کو زبردستی پھانسنے کی کوشش کی۔ ماں اُس کی ان حرکتوں پر اُسے ٹوکتی، سمجھاتی، تو سخت بدتمیزی کرتا۔ برملا الزام دیتا کہ خوبصورت لڑکی مرد کو لازماً متاثر کرتی ہے مَیں نوجوان ہوں، ہمارا تو بوڑھا باپ بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکا تھا۔ ماں خون کے گھونٹ پی کے رہ جاتی اور بے اختیار رونے لگتی تھی۔

قاسم کی والدہ تہجد گزار اور بے حد پارسا خاتون تھیں۔ قاسم بھی پنج وقتہ نمازی اور صاف ستھرے کردار کا مالک تھا۔ لیکن ہاشم نماز کے قریب نہ پھٹکتا تھا اور اس کے خیالات بڑے ہی عجیب وغریب تھے۔ کہا کرتا یہ جو کچھ ہم کرتے ہیں، اس کا ذمہ دار خدا ہے۔ اُسی نے ہمارے اندر گناہ کرنے کی حس پیدا کی، اُسی نے شیطان کو تخلیق کیا وہ نہ چاہتا تو ہم گناہ نہ کرسکتے۔ ہم تو تقدیر کے ہاتھوں بالکل ہی بے بس ہیں۔ تاہم وہ بے عمل ملنگوں اور دنیادار درویشوں کا بڑا معتقد تھا۔ نہر کے کنارے چلہ کشی کرتا رہتا۔ جادو اور رمل جفر پر اُس کا اعتقاد خاصا گہرا تھا۔ اور پھر یوں ہوا کہ ہاشم کا کاروبار ٹھپ ہوگیا۔ اُس نے آٹا پیسنے کی مشین لگا رکھی تھی عموماً گاؤں کی جوان لڑکیاں ہی گندم لے کر آیا کرتی تھیں۔ لیکن وہ اپنی حرکتوں سے اتنا بدنام ہوگیا کہ لوگوں نے اپنی لڑکیوں کو چکی پر بھیجنا بند کردیا نتیجتاً اُس نے چکی کی مشینری فروخت کردی اور کوشش کر کے لیبیا چلا گیا۔

چار پانچ سال کے بعد ہاشم لیبیا سے واپس آیا۔ آتے ہی اس نے اپنے آبائی مکان کے متصل، کوٹھی کے انداز میں شاندار مکان بنایا۔ ٹریکٹر خریدا اور دو سال میں اپنے حصے کی دس ایکڑ

زمین پر کاشت کاری کرنے لگا۔ جملہ معترضہ کے طور پر عرض کروں کہ باپ کی وفات کے بعد بوسال والی پچاس ایکڑ زمین پانچوں بھائیوں نے آپس میں برابر برابر تقسیم کر لی، نہ ماں کو حصہ دیا نہ کسی بہن کو اُس کا حق ادا کیا۔

اور پھر ایک دن سنا کہ ہاشم نے ایک نوجوان کنواری لڑکی سے شادی کر لی ہے۔ اُس کی پہلی بیوی اپنے چھ بچوں (چار بیٹیاں، دو بیٹے) کے ساتھ گاؤں میں رہتی تھی جبکہ وہ نئی بیوی کے ساتھ بوسال میں مقیم ہو گیا۔ اُس کی دوسری شادی پر پورے خاندان میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں مگر اُس نے کسی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ یوں بھی کوٹھی بنوا کر اور ٹریکٹر خرید کر اُس کے غرور اور بدتمیزی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا، بیوی کی پٹائی کرنا اور ماں سے بداخلاقی کا رویہ اُس کا معمول بن گیا تھا۔

ہاشم اپنی دو بیٹیوں کی شادی لیبیا جانے سے پہلے کر چکا تھا۔ اس روز اُس کی تیسری بیٹی کی شادی تھی اور وہ ٹریکٹر پر سوار ہو کر اپنی نئی بیوی کے ساتھ شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ اُس کی پہلی بیوی، دونوں بیٹے اور سارا خاندان اُس کے خلاف بھرا بیٹھا تھا، وہ مزاج کا تیز تو تھا ہی، پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ دلہن کی رخصتی کے بعد سب نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ دونوں بیٹے، دونوں بڑے داماد اور باقی سب لوگوں نے اُسے دھن کے رکھ دیا۔ اُس کی نئی بیوی کی بھی بے رحمی سے مرمت ہوئی۔ ظلم کی انتہا یہ ہوئی کہ اُس کے بڑے بیٹے عامر نے اسے گندے پانی کی نالی میں گرایا اور سر پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا، کچھ خدا ترس لوگ آگے بڑھ کر مداخلت نہ کرتے اور جان نہ بچاتے تو شاید دم گھٹ کر وہیں مر جاتا۔

حضور ختم الرسلؐ کی حدیث ہے کہ والدین کا نافرمان انہیں دُکھ دینے والا اپنی زندگی ہی میں اتنے دردناک انجام سے دوچار ہوتا ہے کہ اُس کا حشر دیکھ کر لوگ کانپ جاتے ہیں (او کما قالؐ) چنانچہ تاریخِ انسانی کے سب سے سچے انسان کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی یہ بات حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور ہاشم اپنی بیٹی کی شادی والے دن سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں کتے سے زیادہ ذلیل ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اُس کی جان بچی، بیٹوں نے اس کے ٹریکٹر پر بھی قبضہ کر لیا اور

وہ ذلیل وخوار ہو کر، عجیب ہیئتِ کذائی کے ساتھ گاؤں سے نکل گیا۔

اب اُس نے اپنے حصے کی زمین فروخت کر دی اور وزیر آباد کے قریب ایک گاؤں میں جنرل اسٹور بنالیا۔ حیرت کی بات ہے کہ اتنے بڑے سانحے سے دوچار ہونے کے باوجود اس نے عبرت حاصل نہ کی۔ نہ اپنے مزاج اور روّیے میں اصلاح کی فکر کی، چنانچہ اُس نے اسی گاؤں کی ایک لڑکی سے تعلقات استوار کر لئے اور اس سے شادی کا پختہ پروگرام بنالیا لیکن اُس کی دوسری بیوی اُس کے راستے میں حائل تھی۔ یہ رکاوٹ یوں دور ہوئی کہ ایک روز تیل کا چولہا پھٹ گیا، اس کی بیوی کے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور وہ تڑپ تڑپ کر بھسم ہوگئی اُس نے باقاعدہ منصوبے کے تحت بیوی پر تیل چھڑک کر اسے موت کے گھاٹ اتارا، لیکن چونکہ بے چاری خاتون ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھی، اُس کا باپ مر گیا تھا اور بوڑھی ماں کے سوا اُس کا کوئی قریبی عزیز موجود نہ تھا، اس لیے کسی نے اس حادثے کی پیروی نہ کی۔ ہاشم دونوں بچوں کو اپنی ساس کے پاس چھوڑ آیا اور ہر طرف سے بے فکر ہو کر نئے منصوبے کی طرف بڑھنے لگا۔

اللہ کی سنت یہ ہے کہ ظلم ایک حد تک ہی چلتا ہے اور مظلوم کی بددعا ظالم کا راستہ روک لیتی ہے۔ پتہ نہیں ہاشم کی بدنصیب بیوی کی بددعا تھی یا بے بس بوڑھی ماں کی فریاد تھی یا اُس کے یتیم و لاچار بچوں کی چیخ و پکار کا اثر کہ ہاشم کے لیے تقدیرِ خداوندی کا آخری فیصلہ صادر ہو گیا۔ بیوی کو قتل کرنے کے بعد وہ نئی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا اور اسی سلسلے میں وہ ایک روز موٹر سائیکل پر وزیر آباد جا رہا تھا کہ راستے میں ایک ویگن نے اسے ٹکر مار دی۔ وہ اچھل کر سر کے بل سڑک پر گرا اور موقع پر دم توڑ گیا۔ ظلم و زیادتی کے ایک لامتناہی سلسلے نے ایک روز آخر اپنا رنگ تو دکھانا تھا۔

اب سنئے وہ صورتِ حال جس میں ہاشم کا بیٹا عامر آج کل مبتلا ہے۔ اس ظالم نے اپنے باپ کو بے رحمی سے پیٹا تھا اور اسے گندی نالی میں گرا کر اس کے سر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمبے عرصے سے شدید مصائب اور مسائل میں مبتلا ہے۔ اُس کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ بیٹا ہاتھی بچہ (Elephant Baby) ہے یعنی اتنا موٹا ہے کہ زندگی اُس کے لیے وبال بن گئی

ہے۔ باہر نکلتا ہے، اسکول پڑھنے جاتا ہے تو دوسرے بچے اسے چھیڑتے اور اُس کا مذاق اڑاتے ہیں، چنانچہ وہ گھر ہی میں گھسا رہتا ہے اور بیشتر وقت سویا رہتا ہے۔ تینوں بیٹیاں خوش شکل ہیں، لیکن تینوں کا قد خاصا پست ہے۔ عامر کی بیوی بھی کئی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اُس کے پتّے میں پتھری تھی، نتیجتاً آپریشن کر کے پتہ نکلوا دیا گیا۔ اُس کے گردے بھی خراب ہیں اور وہ دل کی بھی مریضہ ہے، شوگر نے بھی اُسے ہلکان کیا ہوا ہے۔ مَیں گاؤں جاتا ہوں، اسے پتہ چلتا ہے کہ تو میرے پاس آ کر زار زار روتی ہے۔ اُسے سب سے زیادہ پریشانی یہ ہے کہ وہ مر گئی تو اس کی بچیوں کا کیا بنے گا؟ مَیں نے ایک روز عامر کی صحت کا پوچھا تو صرف اتنا کہا کہ اُس کا کچھ نہ پوچھیں، کئی بیماریوں میں مبتلا ہے اور سخت پریشان رہتا ہے۔

(۱۴)

اُس نے باپ کے سر پر جوتے مارے تھے

ماسی ریشم دُور کے رشتے میں میری خالہ تھی۔ اُس کی شادی سیالکوٹ کے نواح میں مشہور قصبے کوٹلی بہرام میں ہوئی تھی۔ یہ بات کہیں ۳۰-۱۹۲۰ کی ہے ورنہ اب تو کوٹلی بہرام سیالکوٹ کا ایک محلہ بن گیا ہے اَور شہر اُس سے بہت آگے تک پھیل گیا ہے۔

مَیں بتارہا تھا کہ ماسی ریشم کی شادی کوٹلی بہرام میں ہوئی۔ اُس کا خاوند قریب ہی کے ایک گاؤں گودھپور میں زمیندارہ کرتا تھا۔ ان کی ایک بیٹی ہوئی اَور ماسی کا خاوند وفات پا گیا۔ اس طرح ایک خوبصورت، طرح دار لڑکی کو عین عنفوانِ شباب میں بیوگی کے شدید ترین المیے سے دوچار ہونا پڑا۔

ماسی ریشم ان پڑھ تھی، لیکن بہت تیز طرار اور ذہین تھی اَور بہادر بھی، اس کے مرحوم خاوند کے بھائیوں نے بہت کوشش کی کہ وہ اُن میں سے کسی سے شادی کرلے یا پھر اس گھر سے نکل جائے، مگر وہ کسی دباؤ میں نہ آئی۔ اُس نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا اَور خاوند کے حصے کی زمین حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ بعد میں اُس نے کوٹلی بہرام کی رہائش ترک کردی اَور گودھ پور میں ایک مختصر سا مکان بنا کر وہاں منتقل ہوگئی۔

ماسی ریشم کی بیٹی رشیداں جوان ہوگئی تو اُس کی شادی اپنے گاؤں ہی میں ایک نوجوان خادم حسین سے ہوگئی۔ خادم حسین ایک غریب، بے سہارا نوجوان تھا اَور ڈرائیوری کرتا تھا۔ ماسی نے اُسے اپنے گھر ہی میں ٹھہرالیا اَور اس طرح دونوں خوش اَور مطمئن ہوگئے، ایک کو گھر کے لیے ایک مرد مل گیا، دوسرے کو بیوی کے ساتھ ایک ماں بھی مل گئی اَور چھت کا سایہ بھی۔

لیکن خادم حسین کی بدنصیبی کہ ماسی ریشم اپنی بعض خوبیوں کے باوصف بدمزاج اور مغرور عورت تھی۔ لحاظ، م کی کوئی چیز اُس میں نہ تھی اور اسے احساس تک نہ ہوتا تھا کہ کسی کی عزتِ نفس کا پاس بھی کیا جاتا ہے۔ وہ مخاطب کو کھڑے کھڑے تو م کرر کھ دیتی اور اُس کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتی، چنانچہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر وہ خادم حسین کو خوب خوب کچوکے لگاتی اور اُسے ذلیل و خوار کر کے شاید اُسے تسکین ملا کرتی۔

خادم حسین ایسے موقعوں پر فریاد طلب نگاہوں سے اپنی بیوی رشیداں کی طرف دیکھا کرتا، لیکن وہ بے نیازی اور بے تعلقی کا انداز اختیار کر کے خاموش رہتی۔ تنہائی کا موقع ملتا تو ساس کے رویّے کی شکایت بھی کرتا، مگر رشیداں کا مزاج بھی بہت کچھ اپنی ماں سے ملتا جلتا تھا، اکلوتی، لاڈلی ہونے کی وجہ سے غرور اور بے نیازی کا عنصر اس میں بھی بدرجۂ اتم تھا، چنانچہ اپنی ماں کے خلاف شوہر کی شکایت سُن کر وہ بُرا سا منہ بنا لیتی اور خادم حسین شرمندہ ہو کر چپ ہو جاتا۔

مزید مصیبت یہ تھی کہ خادم حسین کو رشیداں سے تنہائی کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ پرانی طرز کا ایک ہی بڑا سا کمرہ تھا جس میں یہ تینوں افراد رہتے تھے اور ماسی ریشم ایک بے رحم، بے حِس محتسب کی طرح کڑی نظروں سے دونوں کی نگرانی کرتی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود رشیداں بی بی نے ایک بیٹے کو جنم دے دیا اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور آخری حادثہ ثابت ہوا۔

یہی وہ حالات تھے جب خادم حسین بے بس اور پریشان ہو کر اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ بھی خوبصورت تھا، جوانِ رعنا تھا اور خوش ذوق تھا، چنانچہ اُس۔ نے سیالکوٹ شہر ہی میں ایک لڑکی سے تعلقات استوار کر لئے اور اُسے اپنی توجہات کا مرکز بنا لیا، چنانچہ اب اُس نے ساس کے گھر میں آنا کم کر دیا...... اور ایک روز سنا کہ خادم حسین نے اس خاتون سے باقاعدہ شادی کر لی ہے۔

خادم حسین کی دوسری شادی کی خبر ماسی ریشم اور اُس کی بیٹی پر بجلی بن کر گری۔ پہلے چند دن تو

اُنہوں نے خوب واویلہ کیا، سینہ کوبی کی، خادم حسین کا ماتم کیا اُور پھر اس کا نام آتے ہی وہ زخمی شیرنیوں کی طرح غرّانے لگتیں اُور اُس کی سات پشتوں کو بے نقط سنا جاتیں...... لیکن عملاً وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ خادم حسین نے اُن کے ہاں آنا جانا بالکل ترک کر دیا تھا۔

ماسی ریشم اگرچہ نماز روزے کی پابند تھی، لیکن وہ ہمیشہ ہی سے قبروں اور درگاہوں کی پرستار تھی، وہ بڑی ہی باقاعدگی کے ساتھ ہر جمعرات کو امام صاحب کے مزار پر حاضری دیتی (سیالکوٹ میں ایک شہید بزرگ کا مزار) قبر شریف کا طواف کرتی حتیٰ کہ سجدے میں گر جاتی تھی۔ اسی طرح وقتاً فوقتاً بابل شہید کے قبرستان میں بھی جانا اُس کے نزدیک گویا فرض واجب تھا۔ وہاں بہت سے بزرگوں اُور شہیدوں کے مزار ہیں۔ وہ باری باری سب کے ہاں حاضر ہوا کرتی اُور اُن کی خدمت میں اپنی حاجتیں پیش کرتی۔

خادم حسین کی دوسری شادی کا حادثہ پیش آیا تو مقبروں پر دونوں ماں بیٹی کی حاضریوں کا تناسب کہیں بڑھ گیا۔ کوئی دن نہ جاتا کہ وہ اِردگرد کی درگاہوں پر حاضر نہ ہوا کرتیں، راستے میں وہ خادم حسین اُور اس کے اباواجداد کو منہ بھر بھر کے گالیاں دیا کرتیں اُور قبر پر جاتے ہی سجدے میں گر جاتیں...... یہ اُن کی زندگی کا مستقل معمول تھا جس میں کبھی فرق واقع نہ ہُوا تھا۔

آخر کار اِن کی ''تگ و دو'' رنگ لائی اُور قسمت کا مارا خادم حسین ایک روز اپنی دوسری بیوی کو لے کر گودھپور اِن کے گھر آ گیا۔ پتہ نہیں اُسے کیا زُعم تھا یا وہ کس خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ بہرحال اُن دونوں کو کمرے میں بٹھا کر ماسی ریشم چپکے سے باہر نکلی اُور پڑوس سے ایک قریبی رشتہ دار کو بلا لائی جس نے کمال چابک دستی سے خادم حسین کے ہاتھ باندھے اُور پھر ڈنڈوں اُور جوتوں سے دونوں کی وہ ٹھکائی کی کہ خادم کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس کارِ خیر میں اُس کے بارہ سالہ بیٹے جاوید نے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ وہ زمین پر گرے ہوئے اپنے سگے باپ پر بار بار جوتے برساتا اُور اُس کی دوسری بیوی پر بھی خوب خوب غصّہ نکالتا اُور اُس وقت تو ماسی ریشم اُور رشیداں دونوں قہقہہ لگا کر خوب ہنسیں جب جاوید نے قینچی لے کر اپنی سوتیلی ماں کی گُت

کاٹ ڈالی تھی، جسے ماسی ریشم نے اپنے نواسے کے کارنامے کے طور پر ایک عرصے تک کمرے کے ایک کونے میں لٹکائے رکھا تھا۔

بہر حال خادم حسین کی وہ دُرگت بنی کہ شاید ہی کسی عاشق کی بنی ہو گی۔ اُسے انھوں نے پانی پلا پلا کے مارا اَور جب اُس کے لیے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا محال ہو گیا تو پڑوسی نے اَور جاوید نے سہارا دے کر دونوں میاں بیوی کو سڑک تک پہنچایا اَور تانگے پر بٹھا کر سیالکوٹ روانہ کر دیا۔

غیر معمولی توہین و تذلیل کا یہ عمل خادم حسین کے لیے اتنا سبق آموز ثابت ہوا کہ وہ جلد ہی بیوی اَور دو بیٹوں کو لے کر کراچی چلا گیا، اُس نے سیالکوٹ کی سکونت مستقل طور پر ترک کر دی اَور پھر کبھی واپس لوٹ کر نہ آیا۔

اب ماسی ریشم اور رشیداں بی بی کی ساری اُمیدوں کا واحد مرکز جاوید تھا۔ وہ اسکول میں پڑھتا تھا، لیکن اپنے اکلوتے ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھانا جانتا تھا۔ اُسے یہ بھی شعور تھا کہ وہ مستقبل میں اچھی خاصی قیمتی جائیداد کا مالک بنے گا، اس لئے اُس نے آوارگی کا ہر وہ چلن اختیار کر لیا جو اُس کے بس میں تھا، چنانچہ اُس نے کم از کم دو اضافی سال میٹرک میں لگائے اَور تیسرے سال میں بڑی مشکلوں سے تیسرے درجے میں امتحان پاس کر لیا اَور چونگی محرّر کی حیثیت سے ملازم ہو گیا۔ اس کے لیے اُس کی نانی نے خاصی بڑی رقم رشوت میں لگائی تھی۔

یہ ۶۷-۱۹۶۶ کی بات ہے۔ اُس کی تنخواہ ستر روپے مقرر ہوئی تھی۔ مَیں نے بھی اکتوبر ۱۹۶۶ء میں ایم اے کا امتحان دیا تھا اَور مجھے فوری طور پر اپنے علاقے میں ایک پرائیویٹ کالج میں لیکچرر شپ مل گئی تھی۔ میری ڈھائی سو روپے تنخواہ لگی تھی اَور میری والدہ نے ایک دن تعجب سے کہا تھا: تم نے سولہ جماعتیں پڑھی ہیں اَور ڈھائی سو روپے لے رہے ہو جبکہ ریشم کا نواسہ دس پاس ہے لیکن تنخواہ کے علاوہ روزانہ اپنی ماں کو پچاس روپے لا کر دیتا ہے...... چنانچہ اُس کی بدعنوانی اَور غیر ذمہ داری نے اپنا آپ دکھایا اَور اُسے چھ ہی ماہ کے بعد نوکری سے برطرف کر دیا گیا۔

اب ماسی ریشم نے گودھپور والی زمین میں سے کچھ حصّہ فروخت کر دیا اَور کوٹلی بہرام کے موڑ

پر سڑک کے کنارے اپنے ایک کمرشل پلاٹ میں آٹھ دکانیں تعمیر کرا ڈالیں۔ اُن میں سے دو میں جاوید نے سٹیشنری اور جنرل سٹور بنالیا۔ تجارتی نقطۂ نظر سے دکانیں بڑے ہی اچھے ٹھکانے پر تھیں جہاں مستقبل میں کاروبار چمکنے کے امکانات بہت روشن تھے۔ باقی دکانیں کرائے پر دے دی گئیں اور جاوید کی شادی کر دی گئی۔

اِسے جاوید کی خوش قسمتی ہی سے تعبیر کرنا چاہیے کہ اُس کی بیوی ایک تربیت یافتہ، ملازمت پیشہ نرس تھی۔ وہ سگھڑ اور سمجھ دار بھی تھی، لیکن جاوید نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ وہ عقل سے کام نہیں لے گا اور ہر معاملے میں چھچھورے پن کا مظاہرہ کرے گا چنانچہ اُس نے اِردگرد کے گرلز اسکولوں کی اُستانیوں سے خاص اپنایت کا تعلق قائم کرلیا اور انہیں دل کھول کر اسٹیشنری کا سامان اُدھار پر دیتا رہا۔ وہ تحفے تحائف دینے میں بھی بڑا فراخ دل واقع ہوا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی دکانداری بڑی ہی مشکلوں سے ایک سال تک چلی، سرمایہ ختم ہوگیا اور اُسے کاروبار کا سلسلہ معطّل کرنا پڑا مگر وہ چنداں پریشان نہ تھا۔ گھر کا نظام دکانوں کے کرائے اور بیوی کی نوکری کے سہارے چل رہا تھا۔

مکمل فراغت کا فیضان جاوید کو یہ حاصل ہوا کہ وہ یکے بعد دیگرے سات بیٹیوں کا باپ بن گیا۔ ماسی ریشم اور بہن رشیداں نے سرتوڑ کوشش کی: مختلف مقبروں پر بار بار حاضر ہوئیں، چادریں چڑھائیں، منتیں مانیں، لیکن کسی بزرگ نے بھی مداخلت نہ کی اور جاوید کو ایک بھی بیٹا نہ ملا۔ حد یہ ہوئی کہ اس دوران میں ماسی ریشم نے حج بھی کرلیا، ظاہر ہے وہاں بھی اُس نے سب سے زیادہ دعائیں جاوید کے بیٹے کے لیے کی ہوں گی، لیکن افسوس بات منڈھے نہ چڑھی اور ساتویں بیٹی کے بعد وہ مایوس ہوکر کویت چلا گیا۔

بدنصیبی کویت میں بھی جاوید کے ہم رکاب رہی۔ اُسے گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک روز وہ ٹریفک کے حادثے کا شکار ہوگیا۔ سڑک عبور کر رہا تھا کہ کسی تیز رفتار کار نے اُسے ٹکر ماردی۔ اُس کی دونوں ٹانگیں کئی جگہ سے ٹوٹ گئیں، باقی جسم پر بھی شدید چوٹیں آئیں اور وہ کئی دن تک ہسپتال میں بے ہوش پڑا رہا۔ جان تو خیر اُس کی بچ گئی، مگر تقریباً دو سال تک وہ

ہسپتال میں زیر علاج رہا اَور جب بیساکھیوں کے سہارے چلنے کے قابل ہوا تو پاکستان آ گیا...... مَیں اُس کی مزاج پرسی کے لیے گیا تھا، بڑی قابلِ رحم تھی حالت اُس کی۔ اس کی بوڑھی نانی اُسے اس حال میں نہ دیکھ سکی اَور ایک روز یکا یک دم توڑ گئی۔ پتہ چلا کہ اُس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے۔

یہ بڑی عبرت ناک بات ہے کہ مَیں نے ماسی ریشم اَور رشیداں بی بی کے خاندان میں کبھی بھی سکون اَور مسرّت کو کارفرما نہیں دیکھا وہ ہمیشہ مسائل، مصائب اور امراض میں مبتلا نظر آئیں اَور میرے نزدیک اس کا سبب دونوں ماں بیٹی کی بد اخلاقی تکبّر، قبر پرستی اَور غیر حقیقت پسندانہ اسلوبِ حیات تھا۔ دکھ اَور پریشانیاں اُن پر بارش کی طرح برستی رہیں...... ایک بار پتہ چلا کہ بہن رشیداں کو سر پر شدید چوٹ لگی ہے اَور وہ اپنے حواس کھو بیٹھی ہے۔ مَیں اس کی عیادت کے لیے گیا۔ وہ چار پائی پر گم صم بیٹھی تھی اَور ہٹر ہٹر فضا میں گھور رہی تھی۔ مَیں اُس کے قریب بیٹھ گیا، اُس نے مجھے نہیں پہچانا، سر کی چوٹ نے اُس کی یادداشت پر گہرا اثر ڈالا تھا۔

جاوید نے بتایا کہ چند روز پہلے وہ پڑوسیوں کے ہاں صحن میں بیٹھی تھی...... اُن پڑوسیوں کے ہاں جن کی مدد سے اُس نے اپنے خاوند کی پٹائی کرائی تھی...... کہ تیز ہوا چلنے سے چھت سے لکڑی کا ایک تختہ لڑھکا اَور رشیداں بی بی کے سر پر آ گرا جس سے وہ بے ہوش ہوگئی اَور کئی گھنٹوں کے علاج کے بعد ہوش میں آئی تو اس کا حافظہ جواب دے گیا تھا...... ڈھائی تین سال اسی حالت میں مبتلا رہ کر وہ وفات پا گئی۔ مَیں تعزیت کے لیے گیا تو جاوید بتا رہا تھا کہ مَیں نے یہاں کی ساری جائیداد...... دکانیں اَور مکان...... بیچ کر اسلام آباد منتقل ہونے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اُس نے دُکھ اَور نفرت کے احساس سے کہا: یہ جگہ انسانوں کے رہنے کی نہیں ہے، زندگی کی کوئی سہولت بھی تو حاصل نہیں ہے یہاں...... مَیں چاہتا ہوں کہ میری بیٹیاں اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کریں اَور آزادی کے ماحول میں زندگی گزاریں۔

’’لیکن سات بیٹیوں کے ساتھ آپ اسلام آباد کے اجنبی ماحول میں کیسے ایڈجسٹ کریں

گے۔ یہاں آپ کی برادری ہے، خاندان ہے، حلقہ تعارف ہے۔ وہاں یہ سہولتیں میسر نہیں آئیں گی۔ وہاں آپ کو رشتوں کے حوالے سے مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا"۔ مَیں نے اُس کے منصوبے سے اختلاف کیا۔

"مجھے اس کی پروانہیں" جاوید کہنے لگا "لڑکیاں پڑھ لکھ کر عملی زندگی میں آئیں گی تو خود ہی مسائل کو حل کرلیں گی۔ مَیں اُنگلی پکڑ کر کب تک اُن کی رہنمائی کروں گا اَور پھر وہاں امام بری کا مزار بھی تو ہے...... وہ امام صاحب سے بڑی درگاہ ہے"۔

اَور جاوید نے واقعی ایسا کر دکھایا۔ اُس نے دکانیں، پلاٹ، زمین سب کچھ بیچ دیا اَور اسلام آباد چلا گیا۔ پتہ نہیں وہاں وہ کس حال میں ہے؟

یوں لگتا ہے کہ جس طرح ماسی ریشم اَور رشیداں کی قسمت قبروں اَور مزاروں سے وابستہ ہوگئی تھی اَور اس حوالے سے انہیں کبھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہ ہُوا تھا، اسی طرح جاوید کا مقدر اُن جوتوں سے بندھ گیا ہے جو اُس نے اپنے باپ کے سر پر مارے تھے۔ خطرہ ہے کہ یہ جوتے اُسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے رہیں گے اَور وہ ساری عمر ذلت و رسوائی کی جانب اپنا سفر جاری رکھے گا۔

(۱۴)

میرے پڑوسی مہدی خان گوندل صاحب نے بتایا:

یہ ۱۹۵۰ کی بات ہے۔

محمد خان میرا تایا زاد بھائی تھا۔ بہت بدتمیز، لڑاکا، جھگڑالو۔ ماں باپ سے لڑتا ہی رہتا۔ ایک مرتبہ اُس نے باپ کو زمین پر گرا کر مارا۔ ماں کو گالیاں دیتا، الزام تراشی کرتا اور طرح طرح کے طعنے دیتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ والدین سے مسلسل کشمکش اور محاذ آرائی کی وجہ سے اُس کی شادی بھی نہ ہوئی۔ اُس نے جمع پونجی بنک میں رکھی ہوئی تھی، اُس کے سود سے روز مرّہ کا گزارہ چلاتا تھا۔ پٹواری سے مل کر، اُسے رشوت دے کر اُس نے دس بیگھے زمین بھی ناجائز الاٹ کرائی تھی۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب تک اُس کے والدین زندہ رہے، وہ کسی بڑی مصیبت میں مبتلا نہ ہوا، مگر ماں باپ کے مرتے ہی اس پر اللہ کی ناراضگی بارش کی طرح برسنے لگی۔ اُس کے پیٹ میں اس قدر شدید درد ہوتا تھا کہ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیختا تھا اور بُری طرح زمین پر لوٹتا تھا...... بار بار کہتا تھا میرے پیٹ میں کوئی بلا ہے، اِسے چیر کر باہر نکالو، میرا آپریشن کراؤ، میرا آپریشن کراؤ۔

چنانچہ متعلقہ سارے ہی ٹیسٹ کرائے گئے، ایکسرے، الٹرا ساؤنڈ وغیرہ، لیکن سب ٹیسٹ بالکل صاف تھے، بالآخر اس کے مسلسل اصرار پر اُسے سی ایم ایچ راولپنڈی لے جایا گیا وہاں اُس کا آپریشن ہوا، لیکن حیرت انگیز طور پر اُس کے پیٹ سے کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ سب ڈاکٹر اس بات پر حیران تھے۔ ۱۹۸۰ء میں اس آپریشن پر آٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔

محمد خان نے اپنی اس پُر اسرار بیماری کا سیالکوٹ کے گاؤں روڑس کے حکیموں سے بھی علاج کرایا۔ وہ اس مقصد کے لیے وہاں بہت دن تک مقیم رہا، لیکن اُسے کچھ بھی افاقہ نہ ہوا۔ اس طرح محمد خان دس سال تک پیٹ درد کی اذیت ناک بیماری میں مبتلا رہا، جنرل ہسپتال راولپنڈی کے ڈاکٹر مبشر سے بھی علاج کرایا، لیکن درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور آخر کار وہ پاگل ہو گیا، اُس کی یادداشت ختم ہو کر رہ گئی۔ کھانا تک بھول جاتا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ چونکہ اُسے پیسے سے بے پناہ محبت تھی، اس لیے اُسے نوٹ دکھائے جاتے تو اُس کی یادداشت کچھ عود کر آتی اور وہ کھانے کی طلب کر لیتا ورنہ دو دو دن اُسے کھانا یاد ہی نہ آتا تھا۔

آخری علاج کی خاطر محمد خان کی بڑی بہن اُسے میو ہسپتال لاہور لے آئی، لیکن یہاں بھی اُسے کوئی افاقہ نہ ہُوا۔ کمزوری بڑھتی چلی گئی اور جب معاملہ زیادہ بگڑ گیا تو اُسے واپس گاؤں لے جایا گیا جہاں وہ ۱۹۹۴ء میں فوت ہو گیا۔

مہدی خان گوندل صاحب نے بتایا کہ مَیں تو اُس وقت گاؤں میں نہ تھا، لیکن خاندان کے لوگوں نے اور رشتہ دار خواتین نے بتایا کہ اُس کی موت کا منظر بڑا ہی ہیبت ناک تھا۔ اُسے تشنج کے شدید دورے پڑتے تھے، ہڈیوں کے کڑکڑانے کی آواز آتی تھی، زبان بند تھی اور اذیت کی شدت سے اس کی آنکھیں باہر کو اُبل آئی تھیں اور بے پناہ خوف اُس کے چہرے سے امنڈا پڑتا تھا...... موت کے روز صبح فجر سے لے کر تقریباً گیارہ بجے تک کم از کم چار گھنٹے اُس پر جان کنی کا ایسا عالم طاری رہا کہ عورتیں ساری کی ساری خوفزدہ ہو کر وہاں سے چلی گئیں۔ صرف مرد بیٹھے رہ گئے جن کی موجودگی میں بڑی ہی مشکلوں سے اُسے زندگی سے چھٹکارا ملا۔

یہ تھا وبال والدین کی توہین و تذلیل......اور سود خوری کا۔ کاش کوئی عبرت حاصل کرے۔

(۱۵)

جو خدمت نہیں کرتا، اُس کی خدمت نہیں کی جاتی

پروفیسر سلطان محمود میرے اچھے دوست ہیں۔ اُن سے میرا مزاج اَور ذوق تو نہیں ملتا کہ وہ کٹر سائنس کے آدمی ہیں۔ ایم ایس سی کیمسٹری، علم وادب اَور شاعری سے بہت دُور۔ لیکن وہ دیانت دار، اصول پسند اَور محنتی انسان ہیں اَور کسی بھی مشکل میں وہ ہر شخص کی مدد پر فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے میرے دل میں اُن کی بڑی قدر ہے اَور ہماری دوستی زندہ سلامت ہے۔

سلطان محمود صاحب بڑے لائق آدمی ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں اُنہوں نے ایم ایس سی کیمسٹری کا امتحان بڑے امتیاز کے ساتھ درجہ اوّل میں پاس کیا تھا اسی لئے اگلے ہی سال پبلک سروس کمیشن نے انہیں لیکچرار کی حیثیت سے منتخب کر لیا اَور ان کی تقرری اپنے گھر کے قریب ہی فیصل آباد کے ایک بڑے قصبے کے گورنمنٹ کالج میں ہوگئی۔

سلطان محمود صاحب کے والدین زندہ تھے، اُن کی تھوڑی زرعی زمین بھی تھی۔ وہ لائق اَور محنتی تھے، بڑی آسانی سے پی ایچ ڈی کر سکتے تھے اَور گھر کے قریب رہ کر والدین کی خدمت بھی کر سکتے تھے اَور ملازمت کے حوالے سے اُن کے لیے ترقی کے وسیع امکانات تھے، لیکن بدقسمتی سے اُن پر جلد از جلد دولت بنانے اَور امیر بننے کا بھوت سوار ہو گیا اَور وہ لیکچرار بننے کے ایک سال کے اندر کوشش کر کرا کے کینیڈا چلے گئے اَور پندرہ سال کا طویل قیمتی عرصہ اُنہوں نے غیروں کی خدمت کرنے اَور ڈالر بنانے میں صرف کر دیا۔

سلطان محمود صاحب تین چار سال کے بعد ہی کبھی پاکستان کا چکر لگایا کرتے اَور شادی کے بعد تو یہ وقفہ اور بھی طویل ہو گیا۔ اس دوران میں اُن کے والد وفات پا گئے اَور وہ اُن کے

جنازے میں بھی شامل نہ ہو سکے۔ تاہم یہ اُن کی خوش بختی تھی کہ وہ والدہ کی شدید علالت کی خبر پا کر اُن کے انتقال سے تقریباً ایک ہفتہ پہلے وطن آ گئے اَور چند روز انہیں اُن کے پاس گزارنے کی سعادت حاصل ہو گئی۔

سلطان محمود صاحب کو اللہ نے چار بچے عطا کیے۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں۔ سب کینیڈا میں پیدا ہوئے۔ سب بہت خوبصورت تھے۔ بڑی بیٹی تھی وہ بھی رعنائی اَور دلکشی کی مثال تھی۔ سلطان محمود صاحب میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ساری دولت پرستی کے باوجود اُن میں دینداری اَور دینی غیرت وافر تھی چنانچہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ بڑی بیٹی جوان ہو رہی ہے اَور خطرہ ہے کہ کہیں کینیڈا کی معاشرت اُسے متاثر نہ کرے، تو اُنہوں نے بوریا بستر باندھا اَور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مستقلاً پاکستان آ گئے۔

یہاں سلطان محمود صاحب نے ایک جدید بستی میں پلاٹ خریدا۔ اس پر اسکول کی عمارت کھڑی کی اَور تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موصوف نیک نیت تھے، دیانت دار اَور مخلص تھے، اس لیے اللہ نے اُن کے کاروبار میں برکت اَور وسعت عطا کی اور انہیں دوہرا نفع حاصل ہونے لگا: علم کی اشاعت بھی اَور رزق کی فراہمی بھی۔

پاکستان آ کر اُنہوں نے سارے بچوں کو مختلف تعلیمی اداروں میں داخل کرا دیا۔ بڑی بیٹی زرّین نے فارمیسی میں گریجوایشن کر لی۔ دونوں بیٹوں شاہد محمود اَور حامد محمود نے انٹر کے بعد کمپیوٹر سائنس میں مطلوب کورس کر لیے اور چھوٹی بیٹی صدف نے بی اے کی ڈگری حاصل کر لی۔

کم و بیش دس سال پہلے کی بات ہے، ایک روز پروفیسر صاحب میرے پاس آئے۔ بہت پریشان تھے۔ کہنے لگے حامد محمود کو سمجھائیں، اُس نے رٹ لگا رکھی ہے کہ مَیں کینیڈا جاؤں گا۔ کہتا ہے میرے سارے دوست مجھے طعنے دیتے ہیں کہ تم تو بالکل ہی بیوقوف ہو، تمہارے پاس کینیڈا کی نیشنلٹی ہے اَور تم پاکستان میں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہیں تو فوراً کینیڈا چلے جانا چاہیے۔ وہ پاکستان کے حالات سے بہت بددل ہے اَور کسی طرح یہاں نہیں رہنا چاہتا...... لیکن میری خواہش ہے کہ وہ

یہیں رہے، یہیں ملازمت یا کاروبار کرے۔ کینیڈا کا ماحول ایمان کے حوالے سے انتہائی خطرناک اَور نقصان دہ ہے، مَیں نہیں چاہتا کہ وہ وہاں چلا جائے۔

مَیں نے سلطان محمود صاحب کے کہنے پر حامد محمود سے ملاقات کی۔ اُسے بہت قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ کینیڈا نہ جائے، پاکستان ہی میں سیٹل ہونے کی کوشش کرے اَور والدین کے قریب رہ کر اُن کی خدمت کی سعادت حاصل کرے، مگر وہ کسی طرح ڈھب پر نہ آیا۔ وہ شدت کے ساتھ بضد تھا کہ وہ لازماً کینیڈا جائے گا، اُس کا اصرار تھا کہ پاکستان ایسا ملک نہیں کہ یہاں سکون سے باعزت زندگی گزاری جاسکے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ حامد محمود کینیڈا چلا گیا، اُسے اس اقدام سے کوئی بھی نہ روک سکا...... تاہم سلطان محمود صاحب مطمئن تھے کہ ان کا بڑا بیٹا شاہد اُن کے پاس پاکستان ہی میں رہے گا۔ انہوں نے بتایا ''شاہد نے مجھے یقین دلایا ہے کہ حامد جذباتی ہے، اُسے یہ فیصلہ نہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن مَیں یقین دلاتا ہوں کہ جیسے بھی حالات ہوں، مَیں پاکستان ہی میں مقیم رہوں گا، مَیں والدین سے ہرگز دور نہ ہوں گا''۔

لیکن اس بات کو ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک روز پروفیسر سلطان محمود صاحب نے مجھے انتہائی دل گرفتگی کے ساتھ بتایا کہ ڈاکٹر صاحب، بہت کام خراب ہوا ہے، اب شاہد نے بھی حامد کا راستہ اختیار کرلیا ہے۔ کہتا ہے مَیں بھی کینیڈا جاؤں گا۔ یہاں نہ کوئی نوکری ملتی ہے نہ کاروبار کے امکانات ہیں، پھر یہاں مَیں رہ کر کیا کروں۔ مَیں نے اُسے بہت سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دونوں باپ بیٹا مل کر اپنے اسکول کی توسیع کرتے ہیں۔ اللہ فضل فرمائے گا اَور ہم مسائل سے دوچار نہیں ہوں گے، لیکن وہ بھی میری کوئی دلیل یا اپیل ماننے پر تیار نہیں۔ اس نے تو روانگی کی تاریخ بھی طے کرلی ہے، ٹکٹ بھی خرید لیا ہے۔

ظاہر ہے اس صورتِ حال میں شاہد محمود سے کوئی بات کرنے کا فائدہ نہ تھا، تاہم مَیں نے ایک روز دونوں باپ بیٹوں کو اپنے گھر کھانے پر بلالیا تاکہ شاہد سے الوداعی ملاقات بھی ہوجائے

اُور ضروری گفتگو بھی...... اُور پھر مَیں نے شاہد سے بے تکلفی کے ساتھ دوٹوک انداز میں بات کی۔ مَیں نے اُسے بتایا کہ یہ جو صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اُور آپ دونوں بھائی باپ کو اکیلا چھوڑ کر کینیڈا جا رہے ہیں، یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ کی سنت کا ایک حیرت انگیز مظاہرہ ہے۔ مَیں نے شاہد سے کہا: آپ کے والد نے اپنے ماں باپ کی خدمت سے منہ موڑا اُور انہیں چھوڑ کر باہر چلا گیا اُور اب اُس کے دونوں بیٹے اُسے تنہا چھوڑ کر جا رہے ہیں...... یہ بالکل وہی بات ہے جو کسی فارسی شاعر نے کہی ہے کہ

ہر چہ خدمت کرد، او مخدوم شد
ہر کہ خود را دید اُو محروم شد

یعنی جو خدمت کرتا ہے، اُس کی خدمت کی جاتی ہے اُور جو شخص اپنے ہی مفاد کو سامنے رکھتا ہے اُور دوسروں سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ خدمت سے محروم رہتا ہے۔

مَیں نے اُسے لگی لپٹی رکھے بغیر بتایا کہ آپ کے باپ نے اپنے ماں باپ کی خدمت نہیں کی تھی اُور آج وہ خود بھی خدمت کے مواقع سے محروم ہو رہا ہے۔ لیکن شاہد بیٹے، مَیں نے اُسے درد مندی سے کہا: خدارا اس سلسلے کو روک دیجیے، ورنہ یاد رکھیے کہ آج آپ دونوں بھائی جس طرح اپنے والد کو اکیلا چھوڑ کر بیرونِ ملک جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح آپ کے بڑھاپے میں آپ کے بیٹے بھی آپ سے جدائی اختیار کر جائیں گے اُور آپ ان کی یاد میں آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ لیکن لگتا ہے کہ شاہد پر میری باتوں کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تھا۔

(۱۶)

میری چھوٹی بہن ممتاز نے بتایا: میرا جیٹھ غلام حسین شادی کراتے ہی والدین سے الگ ہوگیا اَور پھر اُس نے گھر کے کسی بھی معاملے میں ہرگز دلچسپی نہ لی۔ نہ ماں باپ کو کبھی کوئی پیسہ دیا، نہ انہیں کسی عید تہوار پر کوئی کپڑا بنوا کر دیا۔ اُس کے بعد تین بہنوں کی اَور تین بھائیوں کی شادیاں ہوئیں، لیکن اس خدا کے بندے نے کسی موقع پر والدین سے معمولی سا تعاون نہ کیا حتیٰ کہ کسی بہن کو کسی موقع پر کوئی معمولی سا تحفہ تک نہ دیا۔

ممتاز نے بتایا غلام حسین کے تین بیٹے اَور دو بیٹیاں ہیں بڑے بیٹے ذوالفقار کی شادی ہوئی تو اس نے بھی ہو بہو وہی انداز اختیار کیا جو اُس کے باپ نے اپنے والدین سے روا رکھا تھا، یعنی بیوی کو لے کر فوراً الگ ہوگیا اَور خاندان سے بالکل لاتعلق ہوگیا۔ ممتاز نے بتایا ایک روز غلام حسین بہت افسردہ اَور پریشان ہوکر مجھ سے گلہ کررہا تھا: ممتاز کبھی ذوالفقار کو تو سمجھاؤ ہم اُس کے ماں باپ ہیں، اُس کے چھوٹے بہن بھائی بھی ہیں، ہماری ضرورتیں بھی ہیں، وہ کماتا ہے، مگر ہمیں پوچھتا تک نہیں اَور مَیں سوچتی رہ گئی کہ مَیں ذوالفقار کو کیا سمجھاؤں، تم نے اپنے والدین اَور چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ اب تمہارے ساتھ ہورہا ہے تو پریشان ہورہے ہو۔ جو کچھ تم نے بویا تھا، وہی کاٹ رہے ہو تو گلہ کیسا؟

ممتاز نے بتایا کہ ذوالفقار کے بعد غلام حسین کے دوسرے بیٹے سرفراز کی بھی شادی ہوگئی ہے اَور اس نے بھی بعینہٖ باپ کا طرزِ عمل اختیار کیا یعنی وہ بھی الگ ہوگیا ہے اَور والدین کے ساتھ معمولی سا مالی تعاون نہیں کرتا۔ بڑی بیٹی کی شادی کی ہے مگر سسرال میں اس کے حالات درست نہیں ہیں اَور وہ زیادہ وقت اپنے والدین کے گھر میں رہتی ہے۔

(۱۷)

پشاور کے علی خان لکھتے ہیں:

ہمارے ایک قریبی رشتہ دار خاندان میں تین بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ سب کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ والد وفات پا گیا ہے، ماں زندہ ہے اُور ضعیف ہے، اُسے سب سے چھوٹے بیٹے سے خاص محبت تھی اُور وہ اُسی کے ساتھ اپنے آبائی گھر میں رہ رہی تھی، لیکن بدقسمتی سے بہو کی اپنی ساس سے نہ بنی اور اُس نے خاوند سے مطالبہ کیا کہ میں تمہاری ماں کے ساتھ اس گھر میں نہیں رہ سکتی، یا اِسے رکھ لو یا مجھے رکھ لو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹے نے ایک دن ماں سے کہہ دیا کہ آپ کی وجہ سے میرا گھر برباد ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ماں کو اپنا مکان چھوڑ کر بیٹی کے ہاں پناہ لینی پڑی۔

اس واقعے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ چھوٹا بیٹا فالج میں مبتلا ہو گیا۔ اُس کے جسم کا دایاں حصہ بیکار ہو گیا۔ زبان بھی بند ہو گئی۔ چنانچہ اس کے لیے اُٹھنا، بیٹھنا، چلنا پھرنا محال ہو گیا۔ پیشاب پاخانہ بھی چارپائی ہی پر کرنا پڑتا...... ہر طرح کا علاج ہوا، مگر کوئی دوا کارگر نہ ہوئی...... بیوی نے کچھ عرصہ تو خدمت کی، مگر پھر اُس کے تیور بدلنے لگے اُور وہ اُس کی تیمارداری سے پہلو تہی کرنے لگی اُور پھر تو یہ نوبت آئی کہ گھر میں غیر مردوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی...... اور ایک روز بیوی نے برملا خاوند سے کہہ دیا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک دن سٹامپ فروش کو ساتھ لے آئی طلاق نامہ پر اُس کا انگوٹھا لگوایا اُور اسے انتہائی علالت اُور معذوری کی حالت میں چھوڑ کر چلی گئی۔ جاتے ہوئے گھر کا سارا قیمتی سامان بھی لے گئی۔

اس بدنصیب نے بیوی کی خاطر ماں کو گھر سے نکالا تھا، مگر صلے میں اُسے بدترین نوعیت کی بیماری اُور بیوی کی بے وفائی ملی۔ دنیا بھی برباد، آخرت بھی برباد۔

(بشکریہ ماہنامہ ''عبقری'' لاہور مارچ ۲۰۰۹ء)

(۱۸)

دونا شکرے بھائیوں کی کہانی

میری ایک بہت قریبی عزیزہ کی شادی اٹھارہ سال کی عمر میں ہوئی لیکن شومئی قسمت کہ صرف سات سال کے بعد اُس کا خاوند عین جوانی میں فوت ہوگیا۔ اس وقت موصوفہ کی عمر پچیس سال سے زیادہ نہ تھی اُور وہ ایک بیٹی اُور تین بیٹوں کی ماں بن چکی تھی۔ چھوٹا بیٹا باپ کی وفات کے وقت صرف دو ماہ کا تھا۔

میری یہ عزیزہ جسے میں حمیدہ کا نام دوں گا۔ ایک غریب کسان گھرانے میں بیاہی گئی تھی، اُور اُس کا خاوند ایک مزدور پیشہ آدمی تھی جس کے پاس جائیداد نام کی کوئی چیز نہیں تھی...... خاوند کی وفات کے بعد تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ حمیدہ کے ساس سسر نے مطالبہ کر دیا کہ وہ اپنے دیور کے ساتھ نکاح کر لے، تبھی وہ اس گھر میں رہ سکتی ہے، لیکن اُس نے اس پیش کَش یا مطالبے کو قبول نہ کیا۔ اُس کا موقف یہ تھا کہ وہ اپنے چار یتیم بچوں کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے رکھے گی اُور دوسرا نکاح نہیں کرے گی۔ اس کے پیشِ نظر دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث تھی کہ جو بیوہ عورت اپنے بچوں کی پرورش اُور تربیت کی خاطر نکاح نہ کرے اُور مشقت سے اُس کا رنگ سیاہ ہو جائے تو وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگی...... لیکن اُس کے سسرال نے اس انکار کو انا کا مسئلہ بنالیا اُور اسے بچوں سمیت گھر سے نکال دیا۔

اب یہ لمبی کہانی ہے: بہت تکلیف دہ، بہت ایمان افروز اُور بہت ولولہ انگیز کہانی کہ اُس نے چاروں بچوں کی پرورش کیسے کی، بیٹوں کو کیسے تعلیم دلائی اُور اُن کی شادیاں کیسے کیں۔ اللہ کے فضل سے حمیدہ خاتون کی دعاؤں سے، اُس کے بھائی کی رہنمائی اُور ایثار سے اُور اس کی بیٹی کی شبانہ روز محنت سے کہ وہ کپڑے سینے کی ماہر بن گئی اُور سلائی مشین کی برکت سے اُس نے گھر کا

نظام بھی چلایا اَور بھائیوں کی تعلیم کا بندوست بھی کیا، حتیٰ کہ تینوں بھائی اپنے قدموں پہ کھڑے ہوگئے، بڑا ایک پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوگیا، منجھلا سرکاری کالج میں لیکچرار بن گیا اَور سب سے چھوٹے نے بھی ایم اے تک تعلیم حاصل کرلی اَور گورنمنٹ اسکول میں سولہواں گریڈ حاصل کرلیا۔

مَیں ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے قارئین کی خدمت میں جو حقیقت پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حمیدہ خاتون کے دونوں بڑے بیٹوں نے ناشکرے پن اَور غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا، اپنی جانثار ماں کی قدر نہ کی جس کے نتیجے میں وہ بدترین حالات سے دوچار ہوئے اَور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وعید اُن پر چسپاں ہوگئی کہ ''ہلاک ہوگیا وہ شخص جو بیوی کا غلام ہوگیا''۔

جیسا کہ بیان کرچکا ہوں حمیدہ بہت ہی اچھے مزاج کی خاتون تھی۔ بڑے بیٹے غلام حسین کی شادی ہوئی تو حمیدہ بی بی نے اس کی بیوی کو بیٹی سے بڑھ کر پیار دیا اَور اُس پر گھر کی کوئی بھی ذمہ داری نہ آنے دی۔ دکان سے سودا سلف خود خرید کر لاتی، آٹا خود گوندھتی، روٹیاں خود پکاتی اَور اس زمانے میں سالن تیار کرنا اَور روٹیاں پکانا آسان کام نہ تھا، چولہے میں لکڑیاں جلتی تھیں اوپلوں سے کام لیا جاتا تھا، اَور دونوں طریقے بہت مشکل تھے۔ بہ ہر حال حمیدہ کھانا تیار کرکے بہو کو عزت سے کھلاتی اَور پھر برتن بھی خود ہی دھوتی اَور یہ سلسلہ سالہا سال تک چلتا رہا۔ غلام حسین کے چار بیٹے تھے، ان کی نگہداشت، صفائی وغیرہ کا فریضہ، کھلانا پلانا زیادہ تر حمیدہ خاتون ہی انجام دیتی۔

اس طرح یکے بعد دیگرے اپنے اپنے وقت پر تینوں بیٹوں کی شادیاں ہوگئیں اَور حمیدہ نے خصوصاً دونوں بڑی بہوؤں کی خوب خدمت کی اَور اپنی سی کوشش کی کہ دونوں کو خانہ داری کے معاملے میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لیکن آفرین ہے کہ دونوں بہوؤں نے اپنی فرشتہ سیرت ساس کی قدر نہ کی۔ بڑی تو پھر بھی تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دیتی، مگر بڑبڑاتے ہوئے، ماتھے پر تیوری ڈالے ہوئے، پھر ہر ملنے جلنے والے سے ساس کی برائیاں کرتی اَور چغلیاں کھاتی تھی، لیکن منجھلے بیٹے مطلوب حسین کی بیوی نے تو غیر ذمہ داری اَور بے حسی کی انتہا کردی۔ ساس بے حد شفقت اَور محبت سے کھانا تیار کرکے اس کے

کمرے میں پہنچاتی، یہ اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تناول کرتی اَور کمال بے نیازی سے جھوٹے برتن دروازہ کھول کر باہر سرکا دیتی اَور ساس مسکراتے ہوئے برتن اٹھاتی اَور دھو کر کچن میں رکھ دیتی۔ ڈیڑھ دو سال تک یہ سلسلہ بڑی ہی باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہا تا آنکہ مطلوب حسین نے گوجرانوالہ ہی میں کہ جہاں وہ لیکچرار ہو گیا تھا، مکان کرائے پر لے لیا اور اہلیہ اَور دو بچیوں کو لے کر وہاں منتقل ہو گیا۔ اس دوران میں مطلوب حسین نے کبھی بھی اپنی بیگم کو اُس کی ذمہ داری کا احساس دلانے کی کوشش نہ کی، اُسے کبھی نہ بتایا کہ ہماری ماں نے ہمارے لئے کیا قربانیاں دی ہیں اَور اب جبکہ وہ جوان ہے اُسے گھر کی بہو کی حیثیت سے مختلف فرائض انجام دینے چاہیں اور ادھیڑ عمر ماں کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، لیکن اُس کی بیوی نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ وہ کوئی بھی کام نہیں کرے گی، اپنے کپڑے تک نہیں دھوئے گی۔ فارغ وقت میں وہ بس لیٹی ہی رہتی تھی یا رسالوں کا مطالعہ کرتی رہتی تھی، خانہ داری کا کوئی کام کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ افسوس دونوں بھائیوں نے مکمل طور پر اپنی بیویوں کی غلامی اختیار کر لی تھی اَور وہ انہیں کسی سلسلے میں مشورہ دیتے یا نصیحت کرتے ہوئے خوف محسوس کرتے تھے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ جن نوجوانوں نے غریب یا دنیاوی اعتبار سے کمتر گھرانوں میں پرورش پائی ہوتی ہے، لیکن وہ اپنی محنت اَور ذہانت کے بل پر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اونچے مناصب پر فائز ہو جاتے ہیں، وہ اگر احساسِ کمتری میں مبتلا نہ ہوں اَور سلامتِ طبع رکھنے والے ہوں، تو اظہارِ تشکر کے طور پر وہ عجز کا اَور خدمت کا اسلوب اختیار کر لیتے ہیں، لیکن اس طبقے کی غالب اکثریت منفی احساس میں مبتلا ہو جاتی ہے، وہ شکر اَور عجز کے بجائے جھوٹے تفاخر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اَور بخل اَور تنگ دلی اُن کے مزاج کا حصّہ بن جاتے ہیں، بدقسمتی سے مطلوب حسین نے بھی انہی خصوصیات کو اپنے روّیے اَور کردار کا حصّہ بنا لیا۔ چنانچہ ایک جانب اُس کی بیوی اپنی ساس سے عملاً بداخلاقی اَور پھوہڑ پن کا روّیہ اختیار کرتی تو مطلوب حسین مالی اعتبار سے بدترین خست کا مظاہرہ کرتا..... وہ حالانکہ تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھا، اسلامیات کا استاد تھا اَور سب

سے زیادہ تنخواہ بھی اُسی کی تھی، مگر وہ پیسے پیسے پہ جان دیتا تھا اور اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اُسے ماں پر یا کسی بھائی بہن پر کچھ بھی خرچ نہ کرنا پڑے۔

اندازہ کیجیے کہ حمیدہ خاتون بیمار ہوگئی۔ وہ اپنے چھوٹے بیٹے اصغر حسین کے ساتھ آبائی گاؤں میں رہتی تھی۔ اتفاق سے وہ گوجرانوالہ ہی کے ایک حکیم سے علاج کراتی تھی اور ہر پندرہ دن کے بعد وہاں سے دوا آتی تھی۔ مطلوب حسین یہ دوا بڑی آسانی سے حاصل کر کے والدہ کو پہنچا سکتا تھا، مگر اُس نے یہ خدمت انجام دینے سے انکار کر دیا اور اصرار کیا کہ اصغر حسین آئے اور خود دوا لے کر جائے۔ مقصد یہ تھا کہ اُسے دوا کے پیسے نہ دینے پڑیں اور کرایہ بھی نہ خرچ کرنا پڑے۔ کس قدر بدنصیب تھا پروفیسر مطلوب حسین کہ نہایت مہربان ماں پر خرچ کرنے سے اور پندرہ دن کے بعد بھی اُس کی قدم بوسی کی سعادت سے محروم رہ جاتا۔ وہ بدنصیب ہی نہیں احمق بھی تھا۔ اُسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ ماں باپ پر خرچ کرنے سے دولت گھٹتی نہیں، بڑھتی ہے اور سارے معاملات خیر و برکت میں ڈھل جاتے ہیں۔

مطلوب حسین کی اکلوتی محسن بہن کی شادی بھی گوجرانوالہ میں ہوئی تھی یہ وہی بہن تھی جس نے سلائی مشین چلا چلا کر مطلوب حسین کی پرورش کی تھی اور تعلیم دلائی تھی، وہیں اتفاق سے اُس کی سالی کا گھر بھی تھا۔ اس شخص کی سنگدلی اور بے حسی کا اندازہ کیجیے کہ یہ وقتاً فوقتاً سالی کے گھر میں تو حاضری دیتا تھا، لیکن بہن سے ملاقات کرنے کی اُسے توفیق نہیں ملتی تھی، اُسے خطرہ تھا کہ وہاں جائے گا، تو پھل یا کسی دیگر تحفے کی صورت میں اُسے کچھ خرچ کرنا پڑے گا اور یہ اُس کی طبیعت اور جیب پر ناروا بوجھ ہوتا۔

حمیدہ خاتون اپنی زندگی دینی اور اخلاقی اعتبار سے بہت اچھی گزار کر اپنے مالک کے حضور پہنچ گئی، تو اللہ کی سنت کے عین مطابق غلام حسین اور مطلوب حسین مختلف حوادث کی لپیٹ میں آتے چلے گئے۔ غلام حسین کی بیوی کو اپنی ساس کی زندگی ہی میں مختلف وقفوں کے ساتھ قولنج کے دورے پڑتے تھے جس سے وہ شدید ترین تکلیف سے دوچار ہوتی تھی۔ حمیدہ خاتون

کی وفات کے بعد ان دوروں کا وقفہ کم ہو گیا اور کئی دیگر بیماریاں بھی سر اٹھانے لگیں۔ موٹاپا ہونے لگا اور جوڑوں میں درد شروع ہو گئے۔ اور اس کے ساتھ ہی پیٹ کے قولنج نے آگے بڑھ کر رسولی کی صورت اختیار کر لی...... اور یہ عوارض بڑھتے ہی چلے گئے اور گزشتہ سات آٹھ سال میں اِن بیماریوں نے اس قدر شدت اور پیچیدگی اختیار کر لی ہے کہ غلام حسین کی بیوی کی زندگی مستقل عذاب بن گئی ہے اور اُس کے گھر کا سکھ چین رخصت ہو گیا ہے۔ اُس کے چار بیٹے ہیں۔ غلام حسین بیٹی کی نعمت سے محروم ہے اور وہ کسی بیٹے کی شادی کرنے کی بھی پوزیشن میں نہیں ہے۔ نتیجہ یہ کہ اُس کی بیگم کو مختلف بیماریوں کی حالت میں گھر کا سارا کام خود ہی کرنا پڑتا ہے چنانچہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ بیماریوں کے ہجوم میں گھریلو ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے اُس کی کیا درگت بنتی ہو گی اور غلام حسین ذہنی اور عملی اعتبار سے کس غیر معمولی پریشانی کا سامنا کرتا ہو گا...... اللہ مجھے معاف فرمائے، میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے جس کا اظہار مَیں نے دو ایک اور مواقع پر بھی کیا تھا کہ بیویاں نہ بلاوجہ بیمار ہوتی ہیں اور نہ بلاوجہ طبعی عمر سے پہلے مرتی ہیں، یہ دراصل بعض خاوندوں کے اعمال ہوتے ہیں کہ جن کے سبب سے اللہ تعالیٰ انہیں مختلف مسائل اور مصائب سے دوچار کر دیتا ہے اور اُن کی گھریلو زندگی پریشانیوں میں گھر جاتی ہے۔

مطلوب حسین نے اپنی والدہ اور بہن کے ساتھ جس بے وفائی اور ناشکرے پن کا مظاہرہ کیا، اُس کا وبال اُسے غلام حسین سے بھی زیادہ بھگتنا پڑا۔ وہ مختلف امتحانوں کی نگرانی کے لیے لازماً جاتا تھا اور گرمیوں کی تعطیلات کا سارا عرصہ پرچے دیکھتا تھا، اس طرح اُس نے خاصا پیسہ بنا لیا اور گوجرانوالہ ہی کی ایک نئی بستی میں آٹھ مرلے کا پلاٹ ساٹھ ہزار میں خرید لیا، لیکن اُس کی بیگم اور سسرال کو پلاٹ کا محلِ وقوع پسند نہ آیا حالانکہ وہ ایک فراخ بستی میں واقع تھا اور اصرار کیا کہ اس کو فروخت کر دیا جائے اور ان کی ضد کی وجہ سے اُسے یہ پلاٹ نسبتاً نقصان اٹھا کر بیچنا پڑا۔

تقریباً ایک سال کے بعد مطلوب حسین نے چھ مرلے کا ایک پلاٹ ڈیڑھ لاکھ میں خریدا۔ عبرت ناک بات یہ ہے کہ یہ پلاٹ ایک تنگ گلی میں واقع تھا جس کی چوڑائی صرف پانچ فٹ تھی۔

اِس طرح ایک قلیل عرصے میں مطلوب حسین کو رہائشی پلاٹ کے حوالے سے اچھے خاصے مالی نقصان سے دوچار ہونا پڑا اُور آج اس کا مکان ایک ایسی گلی میں ہے جہاں موٹر سائیکل کے سوا کوئی ڈھنگ کی سواری نہیں جاسکتی اُور اِردگرد ایسے لوگوں کے گھر ہیں جو قطعی دنیادار ہیں اُور جہاں شور و شغب میں سکون تلاش کرنا کارے دارد ہے۔ مکان کا محلِ وقوع اُور ماحول پروفیسر مطلوب حسین کے لیے ایک ایسا دائمی روگ ہے کہ جس سے نجات کی کوئی صورت اُسے نظر نہیں آتی۔ یہ حادثہ والدہ کی زندگی ہی میں پیش آ گیا تھا۔

حمیدہ خاتون کی وفات کے بعد مطلوب حسین کی بیگم مختلف بیماریوں کی لپیٹ میں آتی چلی گئی۔ پہلے اُسے اپنڈکس کی تکلیف ہوئی اُور آپریشن ہوا۔ پھر وہ بواسیر میں مبتلا ہوئی اُور آج تک اس تکلیف سے نجات حاصل نہیں کرسکی اُور چند سال پہلے اُسے ہیپاٹائٹس سی کا عارضہ لاحق ہوگیا اُور اس تکلیف نے تو اُس کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ انتہائی مہنگا، تھکا دینے والا علاج ہے۔ ٹیکے اتنے ظالم کہ اُس کے سر کے بال اُڑ گئے ہیں، اور وہ بدہضمی اُور بے خوابی میں مبتلا ہوگئی ہے۔ سرکاری ملازمت کی وجہ سے بلاشبہ مطلوب حسین کو علاج کے اخراجات مل جاتے ہیں لیکن میڈیکل بلوں کی وصولی ایسی اوگھٹ گھاٹی ہے کہ جس کا سفر مطلوب حسین کو شدید پریشانی میں مبتلا رکھتا ہے اُور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے، کیا نہ کرے، غور طلب بات یہ بھی ہے کہ مطلوب حسین کی سترھویں سے اٹھارویں گریڈ میں ترقی بھی غیر معمولی تاخیر سے ہوئی۔ اس عمل میں اُسے تیئس سال تک انتظار کرنا پڑا۔

مطلوب حسین کی تین بیٹیاں ہیں اور تین ہی بیٹے ہیں۔ بڑی بیٹی بہت لائق ہے۔ اُس نے دو سال پہلے پری میڈیکل میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ انٹری ٹیسٹ میں فیل ہوگئی، گزشتہ برس اُس نے پھر کوشش کی۔ اس مقصد کی خاطر مطلوب حسین جوان بیٹی کو لے کر ایک ہفتہ لاہور میں بیٹھا رہا۔ اُس کی انتہائی کوشش تھی کہ اُس کی بیٹی کسی طرح ڈاکٹر بن جائے۔ بیٹی نے محنت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی، لیکن بدنصیبی پھر آڑے آئی اُور وہ اس برس بھی فیل ہوگئی۔ حسّت

اُور ماں بہن سے بے وفائی مطلوب حسین کی خواہشات کی تکمیل میں مستقل رکاوٹ بن گئی ہے دیکھیے وہ اس وبال سے کب نکلتا ہے۔

غلام حسین اُور پروفیسر مطلوب حسین کے برعکس اِن کے چھوٹے بھائی اصغر حسین کے حالات و معاملات کو دیکھیں تو عجیب ایمان افروز نقشہ نظر آتا ہے۔ اصغر حسین کی بیوی لبنیٰ نے اپنی مرحومہ ساس کی خوب خدمت کی۔ سگی بیٹیوں کی طرح اُس کا خیال رکھا۔ وہ بہت خوش اخلاق لڑکی ہے اُور اپنی ذمہ داریوں کا خوب احساس رکھتی ہے...... اُس کے خاوند اصغر حسین نے بھی اپنی والدہ کی خدمت میں کوئی دریغ نہ کیا...... اس کا اجر اللہ نے ان دونوں میاں بیوی کو یہ دیا کہ انہیں ایک بیٹی اُور چار بیٹوں کی نعمت سے نواز دیا۔ گوجرانوالہ کی ایک بہت اچھی بستی میں اُن کا اپنا گھر ہے۔ اصغر حسین بہت قریبی فاصلے پر واقع ایک اسکول میں تعینات ہے۔ حیرت انگیز طور پر دونوں میاں بیوی ہر طرح کی بیماریوں سے محفوظ ہیں اُور پانچوں بچوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں اُور یہ صلہ ہے والدہ مرحومہ کی خدمت کا، اُس پر کھلے دل سے خرچ کرنے کا۔

(۱۹)

میرے ایک دوست ہیں، اُن کے ماں اُور باپ کے مزاج میں بہت فرق تھا۔ باپ دھیمی طبیعت کے صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، جبکہ والدہ بے عمل تھیں، قبر پرستی اُور پیر پرستی پر اُس کا ایمان بہت پختہ تھا۔ مزاج میں غصہ اُور تیزی غیر معمولی تھی اُور چونکہ دیہات کی روایت کے مطابق والدہ کو گھر کے جُملہ فرائض انجام دینے کے ساتھ باہر کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا تھا بلکہ مویشیوں کا گوبر وغیرہ ٹھکانے لگانے کا فریضہ بھی اُسے ہی انجام دینا پڑتا تھا، اس لیے اُس کے مزاج پر اکثر برہمی غالب آجایا کرتی تھی اُور اپنے خاوند سے اس کی اچھی خاصی تو تکار ہو جایا کرتی تھی اُور وہ اس حوالے سے خاوند کا ذرا بھی لحاظ یا احترام ملحوظ نہ رکھتی تھی ......اُور اس کی اچھی خاصی بے عزتی کرنے کے بعد رونے دھونے میں مصروف ہو جایا کرتی تھی۔

اس صورتِ حال میں میرا یہ دوست کہ اُس وقت نوعمر تھا اُور اسکول میں پڑھتا تھا، برملا ماں کا ساتھ دیتا تھا اُور اس کی حمایت میں باپ سے بدتمیزی کر جاتا تھا، اُس کے لہجے میں گستاخی کا عنصر اچھا خاصا غالب آجاتا تھا۔

مکافاتِ عمل کا کھیل دیکھیے کہ میرے اس دوست کو جو بیوی ملی، وہ بہت خشک مزاج اُور غصہ ور تھی جس کی وجہ سے اُسے عمر بھر تلخیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے چار بیٹے تھے۔ چاروں فرمانبردار تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے اُور چاروں نے اعلیٰ تعلیم بھی حاصل کر لی، مگر عجیب و غریب حادثہ یہ ہوا کہ چاروں بیٹوں نے باپ کے مزاج کی کوئی خصوصیت اختیار نہ کی۔ وہ مختلف حوالوں سے باپ سے اختلاف ہی کرتے نظر آتے تھے اُور شاید ہی کسی موضوع پر اُن کا اتفاق رائے ہوتا تھا جس کے نتیجے میں میرا یہ دوست بھرے گھر میں بھی اپنے آپ کو یک وتنہا محسوس کرتا

تھا اور عبرت کی بات یہ ہے کہ جب بھی میاں بیوی میں کبھی ناگوار صورت بنتی تھی تو بیٹے ماں ہی کی حمایت کرتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی بھول کر بھی باپ کو حق بجانب قرار نہ دیا۔ بیٹے تو باپ سے اُسی لہجے میں تکرار کرتے تھے جس لہجے میں میرا دوست اپنے باپ سے تو تکار کیا کرتا تھا...... اس سے مجھے جماعتِ اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد مرحوم کے بیٹے میاں احسن فاروق صاحب کی ایک بات یاد آ گئی کہ آپ کا بیٹا جب بھی آپ سے گستاخی یا تیز مزاجی کا مظاہرہ کرے تو ٹھنڈے دل سے یاد کیجیے، آپ نے بھی کسی وقت اپنے والد سے اسی لہجے میں بات کی ہوگی...... یہ مکافاتِ عمل ہے اور اس سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے۔

(۲۰)

وہ والدین سے دُور اَور اللہ کے غصے کے قریب ہو گیا

مَیں بابا نذیر کو جب بھی دیکھتا ہوں رنج اَور کرب کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہوں اَور جب سے اُس کی زبانی اُس کے حالات سے آگاہ ہوا ہُوں، اس کیفیت میں عبرت اَور خوف کا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ بابا نذیر کو مَیں برسوں سے جانتا ہوں، کبھی کسی دکان پر بیٹھے ہوئے، کبھی کسی شخص سے گپ شپ کرتے ہوئے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ چار پانچ سال پہلے وہ مذہب اور مذہبی لوگوں سے بہت بیزار تھا۔ بہت قابلِ احترام علماء کے بارے میں بھی ناگواری اَور بدگمانی کا اسلوب اختیار کرتا اَور دینی شعار کے معاملے میں استہزا کا انداز اختیار کرتا، لیکن اب اُس کی کنوتیاں خاصی ڈھیلی ہو گئی ہے۔ مذہبی لوگوں ہی نے مل کر اُسے ایک کمرہ کرائے پر لے دیا ہے اَور ایک دینی جماعت کے ایک عہدیدار نے اس کے لیے دو وقت کے کھانے کا انتظام کر دیا ہے۔

مَیں بابا نذیر کو کم و بیش تیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ بے آسرا اَور تن تنہا بے یار و مددگار زندگی گزار رہا تھا۔ پہلے تو اُس کے کھانے پینے کا بھی کوئی مستقل انتظام نہ تھا۔ کبھی کسی نے ترس کھا کر کھلا دیا اَور کبھی کہیں پناہ لے لی۔ وہ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتا ہی پھرتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کی زندگی کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئی ہے اَور اس کی ساری شخصیت لیر لیر ہو گئی ہے۔

بابا نذیر کے متفرق اَور جزوی حالات سے مَیں آگاہ ہوتا رہتا تھا: اُس کا ایک بیٹا ہے۔ امریکہ میں ملازمت کرتا ہے، بہت امیر ہے اُس کی دو بیٹیاں ہیں، ایک کو طلاق ہو گئی ہے اَور بیوی مستقل ذہنی مریض ہے، لیکن تفصیل کے ساتھ، ثقہ حوالے سے اُس کے معاملات سے واقفیت نہ ہو رہی تھی۔ میرا وجدان کہتا تھا کہ بہت سے دیگر واقعات کی روشنی میں اَور اللہ کی سنت کے حوالے سے بابا موصوف کے معاملے میں ''مکافاتِ عمل'' کا قانون کارفرما ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ بابا

سے کسی وقت خود بات کروں اور اس کی کہانی خود اس کی زبانی سننے کا موقع پاؤں، لیکن اس کام کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ میری بات سننا ہی گوارا نہ کرے۔ اس کے مزاج میں جھلاہٹ اور غصہ بھی ہے، ہوسکتا ہے وہ ڈانٹ دے اور مجھے خفت کا سامنا کرنا پڑے۔

لیکن خدا کا شکر ہے برف پگھل گئی۔ مختلف مواقع پر مجھے بابا نذیر کی خدمت کا موقع ملا۔ میں نے تعاون کیا تو اس کا روّیہ خاصا خوشگوار ہوگیا اور کچھ عرصہ قبل جب ایک روز میرا اُس کا آمنا سامنا ہوا اور مَیں نے پیش کش کی کہ اگر اُس کے پاس فرصت ہے تو میرے ساتھ چلیں اور چائے نوش کریں تو وہ فوراً راضی ہوگیا اور مَیں اُسے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں مجھے بابا نذیر کی خدمت کا کئی بار موقع ملا۔ اب بھی چائے آنے سے پہلے مَیں نے اُسے کچھ رقم پیش کی جسے اُس نے بغیر کسی تکلف کے خاموشی سے جیب میں ڈال لیا اور پھر چائے پیتے ہوئے مَیں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ جو آپ لمبے عرصے سے ڈانواں ڈول صورت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ کیوں ہے اور اس کے پیچھے کیا کہانی ہے؟

بابا پہلے تو کچھ دیر خاموش رہا پھر اُس کے لبوں سے ایک لمبی آہ نکلی اور پھر اُس نے جو واقعات سنائے۔ اس کے مطابق وہ ۱۹۲۴ء میں کھاریاں کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اُس کے والد حافظ فضل داد (یہ نام اصل نہیں ہے) ایک اسکول ٹیچر تھے، صوفی منش اور باعمل انسان تھے، لیکن بدقسمتی سے نذیر احمد پرائمری سے آگے نہ پڑھ سکا، اُس نے نالائق اور آوارہ لڑکوں کی صحبت اختیار کر لی اور خود بھی گھر سے بھاگ کر آوارگی کو زندگی کا چلن بنالیا...... اُس زمانے میں بمبئی تھیٹر اور فلم کا مرکز تھا اور گھر سے بھاگے ہوئے لڑکوں کی آخری پناہ گاہ یہی شہر تھا، چنانچہ نذیر احمد بھی بمبئی جا پہنچا...... اور قیامِ پاکستان تک وہیں ہوٹلوں اور تھیٹروں میں نوکریاں کر کے وقت گزارتا رہا، تاہم اس نے اس دوران یہ کارنامہ ضرور انجام دے دیا کہ کسی نہ کسی طرح مڈل کا امتحان پاس کر لیا اور اس زمانے میں اس کی بھی خاصی اہمیت تھی۔

تقسیم کے بعد بابا نذیر پاکستان آ گیا اور اپنے والدین کے پاس آنے کی بجائے سکھر میں

مقیم ہُوا اُور وہاں محکمہ انہار میں اوورسیئر کی حیثیت سے ملازمت کرنے لگا۔ سکھر میں اس نے ایک ہندو ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کرلیا۔ پھر وہ کراچی چلا گیا اُور یہیں اُس کی بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ کراچی میں اُس کا تعارف ایک ایسے خاندان سے ہوا، جس کی لڑکیاں بہت خوبصورت تھیں، لیکن کردار کے اعتبار سے وہ خاندان پستیوں میں گرا ہوا تھا، چنانچہ ۱۹۵۴ء میں اُس نے اسی خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ یہ لڑکی اپنی خاندانی روایات کے مطابق آوارہ مزاج تھی اُور بہت جاہل بھی۔

۱۹۵۷ء میں نذیر اپنی بیوی کو لے کر اپنے والدین کے پاس گاؤں آیا، لیکن اُس کی بیوی کے انداز و اطوار اتنے ناپسندیدہ تھے کہ اُس کے بے حد متدّین اُور باعمل والد نے اُسے قبول نہ کیا اُور دونوں میاں بیوی کو گھر سے نکال دیا اُور اس کے بعد نذیر احمد نے دوبارہ کبھی بھی گاؤں کا رُخ نہ کیا۔ حالانکہ اُس کے والد کی وفات بیس سال کے بعد ۱۹۷۹ء میں ہوئی تھی۔

۱۹۷۴ء میں نذیر کراچی سے لاہور منتقل ہو گیا۔ دراصل وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لیے وہ انہیں اپنے ننہالی رشتہ داروں سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اُس کے چار بچے تھے۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں...... لاہور میں اُس نے سخت محنت کی۔ سولہ سولہ گھنٹے کام کرتا، کئی کئی اداروں کی خدمت کرتا، اُور وہ اُس وقت خوشیوں سے نہال ہو گیا جب اُس کے بڑے بیٹے انوار کو انجینیرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔

انوار خوبصورت اُور لائق تھا، لیکن وہ پیپلز پارٹی کا جیالا تھا اُور کسی نوع کی اخلاقی قدروں کا قائل نہ تھا۔ اُس کے دل میں باپ کی قربانیوں کی کوئی پروا نہ تھی اُور سچی بات ہے کہ نذیر احمد کی ساری اولاد پر اپنی ماں اور اُس کے خاندان کے گہرے اثرات ثبت تھے۔ اندازہ کیجیے کہ انوار جونہی انجنیئر بنا اُس نے باپ سے معمولی مشورہ کیے بغیر جلو کے ایک امیر خاندان میں خود ہی شادی کرلی۔ نذیر احمد کی چھوٹی بیٹی جو بہت خوبصورت تھی، تھرڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی، لیکن تعلیم ادھوری چھوڑ کر کراچی چلی گئی اُور جا کر خالہ زاد سے شادی رچالی۔ نذیر احمد کے لیے یہی صدمے شدید

پریشانی اور بدنامی کا باعث بن رہے تھے کہ ایک اور قیامت ٹوٹی۔ اُس کا چھوٹا بیٹا پرویز جوانٹر میں پڑھتا تھا اور بے حد خوبصورت تھا راوی میں ڈوب کر مر گیا اور اس صدمے سے اُس کی بیوی کا ذہنی توازن بگڑ گیا۔

انجنیئر انوار لاہور کی ایک سٹیل فیکٹری میں مینجر بن گیا...... پھر وہ سعودی عرب چلا گیا، وہاں کئی سال مقیم رہ کر کینیڈا منتقل ہو گیا اور آج کل امریکہ میں ہے۔ لاکھوں روپے ماہوار تنخواہ لیتا ہے، لیکن اس بدنصیب نے کبھی بھولے سے بھی باپ کا حال نہیں پوچھا۔ اُس کے لاہور میں چار مکان ہیں، لیکن باپ پچاسی سال کی عمر میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اُس کا نہ کوئی مکان ہے، نہ کوئی روزگار۔ وہ دووقت کی باعزت روٹی کو بھی ترس گیا ہے۔ چند خدا خوف لوگوں نے مل کر اُسے پندرہ سو روپے ماہوار پر ایک کمرہ کرائے پر لے دیا ہے اور ایک دینی جماعت کے رہنما نے اُس کے لیے کھانے کا انتظام کر دیا ہے۔ اُس کی بیوی اپنی بڑی بیٹی کے پاس رہتی ہے اور یہ واحد اولاد ہے جس کی طرف سے نذیر احمد کو کوئی پریشانی لاحق نہیں..... ورنہ جس بیٹی یعنی نازیہ نے گھر سے بھاگ کر خالہ زاد سے شادی کی تھی، اُسے وہاں بھی کوئی خوشی حاصل نہ ہوئی۔ اُس کا خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ تھا، چنانچہ دس سال کی رفاقت کے بعد نازیہ نے طلاق لے لی...... پھر اسلام آباد کے ایک معزز اور اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد سے شادی کی، اُس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی، لیکن تیرہ سال کی رفاقت کے بعد اس نے اس خاوند سے بھی خلع لے لیا۔ بیٹے باپ کے پاس ہیں، بیٹی نازیہ کے پاس ہے اور اب یہ بھی لاہور آ گئی ہے اور نذیر احمد کے دکھوں میں کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ بیٹی کو اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا لیکن اس انتہائی بڑھاپے میں جبکہ وہ خود درماندہ و لاچار ہے، بیٹی اور نواسی کا سہارا کیسے بنے۔ چنانچہ مَیں دیکھ رہا ہوں چند ہفتوں میں بابا نذیر پہلے سے کہیں زیادہ نحیف ہو گیا ہے، اُس کی کمر کا خم بڑھ رہا ہے اور خدا جانتا ہے کہ وہ اپنی بےعملیوں اور بے اعتدالیوں کی سزا کس صورت میں بھگتتا رہے گا......

(افسوس بابا نذیر ۱۱راگست ۲۰۰۹ء کو وفات پا گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون)

باب: ٦

شادیوں میں غیر اسلامی حرکتوں کا وبال

علامہ اقبال ٹاؤن لاہور کے کامران بلاک میں میرے ایک عزیز دوست رہتے ہیں۔ بنک آفیسر ہیں اور اخلاص ومحبت کے پیکر۔ ایک دن دورانِ گفتگو ہم اس امر پر تشویش کا اظہار کر رہے تھے کہ موجودہ حالات میں بچیوں کے رشتوں کا بڑا بحران ہے اور اچھے رشتے بہت کمیاب ہیں۔ اس پر موصوف محترم نے بتایا کہ رشتوں کا بحران تو ہے ہی، لیکن انتہائی تشویش کی بات یہ ہے کہ جو رشتے ہو رہے ہیں، وہ محفوظ نہیں رہتے اور اکثر وبیشتر طلاق پر منتج ہو رہے ہیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ گذشتہ چند سالوں میں اُن کی گلی میں آٹھ دس بچیوں کی شادیاں ہوئی ہیں اور اُن میں سے دو تین کے سوا سب کو طلاق ہو گئی ہے۔ حیرت انگیز اور عبرت ناک بات یہ ہے کہ اِن میں سے اکثر شادیاں قریبی رشتے داروں میں ہوئی تھیں۔

مَیں یہ تو نہیں جانتا کہ متذکرہ شادیاں کیوں ناکام ہوئیں نہ مَیں اِن کی وجوہ معلوم کر سکا ہوں، لیکن کئی مثالوں کی روشنی میں یہ گمان رکھتا ہوں کہ جن شادیوں میں نمائش اور اسراف کا مظاہرہ ہوتا ہے اور بے پردگی اور ناچ گانے کا کلچر اختیار کیا جاتا ہے، وہاں لازماً اللہ کی ناراضگی طاری ہو جاتی ہے اور معاملات سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔ میرے مشاہدے میں اس طرح کے کئی زندہ واقعات ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ نام مَیں نے سب کے تبدیل کر دیئے ہیں۔

(۱)

ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب میرے کلاس فیلو اَور دوست ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ڈھاکا سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد اُنھیں سعودی عرب میں ملازمت مل گئی اَور وہ کئی سال تک وہاں کسی شہزادے کے ذاتی معالج کی حیثیت سے متعین رہے۔ چنانچہ اُنھوں نے خوب دولت کمائی لیکن بالآخر ۸۳-۱۹۸۲ء میں وہ واپس وطن آ گئے اَور لاہور میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ یہاں اُنھوں نے ایک معروف بستی میں مکان خرید لیا، قریب ہی ذاتی ہسپتال بنالیا اَور اس طرح آسودگی کی زندگی گزارنے لگے۔

ڈاکٹر صاحب کی دو بیٹیاں اَور ایک بیٹا ہے۔ اُنھوں نے بڑی بیٹی کی شادی اپنی بیگم کے سگے بھتیجے سے ۱۹۸۵ء میں کی۔ دولہا میاں نے مطالبہ کیا کہ اُس کی بارات ہلٹن ہوٹل میں اُترے گی۔ چنانچہ وزیر آباد سے تین سو باراتیوں کی فوج ظفر موج ہلٹن میں وارد ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے بھی مع خاندان شمولیت کی دعوت دی تھی۔

مَیں نے مختلف ہوٹلوں میں شادی کی کئی تقریبات میں شرکت کی ہے، لیکن یہ تقریب منفرد اَور یکتا تھی۔ ڈاکٹر عبدالعلیم نے خوب دل کھول کر پیسہ لٹایا تھا۔ کھانوں کی اتنی ورائٹی اَور کثرت میں نے کبھی کہیں نہیں دیکھی۔ آٹھ قسم کی تو میٹھی چیزیں تھیں۔ ہر قسم کے گوشت تھے اَور پوری محفل رنگ و نور میں نہائی ہوئی تھی...... لیکن میرے لیے جو منظر بے حد تعجب اَور تکلیف کا سبب بنا وہ دلہن اَور ڈاکٹر صاحب کے خاندان کے جلوس کی آمد کا انداز ہے۔ انتہائی تیز روشنیوں اَور کیمروں کے جلو میں دلہن ہال میں داخل ہوئی۔ مکمل میک اپ اَور مکمل بے پردگی، اُس کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کی بیگم گلے میں دوپٹہ ڈالے اَور بال کھولے چل رہی تھی اَور اُس کے پہلو میں اُن کی چھوٹی جوان

بیٹی دلہن ہی کا مثنیٰ بنی خراماں خراماں چل رہی تھی اُس کے بھی بال کُھلے تھے اور لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ سینکڑوں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی، ان کے عقب میں ڈاکٹر صاحب نوعمر بیٹے کے ساتھ شرمندہ شرمندہ سے سر جھکائے چہل قدمی کے انداز میں محوِ خرام تھے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مَیں نے ڈاکٹر صاحب سے الوداعی ملاقات کی، اُن کا شکریہ ادا کیا اُور شکایت کی: ''ڈاکٹر صاحب آپ اتنا عرصہ سعودی عرب میں رہے ہیں، دینی مزاج رکھتے ہیں، پھر آپ نے یہ حرکت کیوں کی، بے پردگی اُور نمائش کا یہ مظاہرہ نہیں ہونا چاہئے تھا''۔ ڈاکٹر صاحب بہت شرمندہ ہوئے۔ کہنے لگے: ''ہم یہاں نئے نئے آئے ہیں۔ محلے والوں نے جیسے مشورہ دیا ہم نے عمل کر لیا۔ لیکن اب تو یہ رسمیں اس معاشرے کا ضروری حصہ بن گئی ہیں، ان سے بچنا ممکن نہیں رہا ہے''۔

''لیکن ایک پڑھے لکھے دیندار شخص کو ان سے احتراز کرنا چاہیے تھا۔ یہ باتیں اللہ کو پسند نہیں ہیں''...... مَیں اپنا فرض ادا کر کے واپس آ گیا اُور بہت دیر تک ڈاکٹر صاحب سے ملنے کو جی نہ چاہا۔

تقریباً ایک سال گزر گیا۔ مَیں ایک مرتبہ اتفاق سے اُس بستی میں گیا جہاں ڈاکٹر صاحب کا گھر اُور ہسپتال تھا تو موصوف سے بھی ملاقات ہوگئی۔ مَیں نے خیر خیریت دریافت کی اُور خصوصاً اُس بیٹی کے بارے میں پوچھا جس کی گزشتہ برس شادی ہوئی تھی، تو ڈاکٹر صاحب بہت پریشان ہوئے، آہ بھر کر بولے: اُس بے چاری کا کیا پوچھتے ہو، اُسے تو چھ ماہ بعد ہی طلاق ہوگئی تھی۔

مُجھے جیسے کرنٹ لگا، بے اختیار منہ سے نکلا اناللہ وانا الیہ راجعون مگر یہ حادثہ کیوں ہوا؟ دولہا تو آپ کا قریبی عزیز تھا، آپ کی بیگم کا سگا بھتیجا تھا۔

یہی تو المیہ ہے فاروق صاحب، یہی تو پُراسرار بات ہے کہ اُس ظالم نے کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دیں۔ کہہ دیا کہ مُجھے یہ لڑکی پسند نہیں حالانکہ وہ اُس کے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھی۔ اُور شادی سے پہلے اُس نے اُسے بارہا دیکھا تھا...... لیکن تقدیر اٹل ہے، اس پر کسی کا بس نہیں۔

صدمے سے اُور احساسِ عبرت سے میری زبان گنگ ہوگئی، مَیں خاموش رہا، لیکن کاش

مَیں ڈاکٹر صاحب کو بتا سکتا کہ نہیں حضرت اللہ کی تقدیر اندھی بہری نہیں ہے، یہ انسانوں کے اچھے بُرے اعمال کے تناظر میں حرکت کرتی ہے۔ ایک شخص سب کچھ جانتے بوجھتے، معلومات رکھتے ہوئے اگر اللہ کی بغاوت پر تُل جائے اَور تہیہ کر لے کہ وہ خالقِ اکبر کے قوانین کا مذاق اُڑائے گا، تو پھر اللہ کی رحمت ایسے شخص سے روٹھ جایا کرتی ہے، پھر پریشانیاں اَور مشکلات ایسے راستوں سے اُس پر حملہ آور ہوتی ہیں کہ جن کا عام حالات میں تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔

(۲)

نعیم ڈار سائنس کالج میں میرے رفیقِ کار تھے۔ بحیثیت اُستاد تو وہ لائق اَور دیانت دار نہیں تھے، لیکن خوش مزاج تھے اَور ''اوپر'' والوں کو راضی رکھنا جانتے تھے۔ مَیں صدرِ شعبہ تھا اَور شاید میری خوشنودی کے لیے وہ ''اسلامیت'' کی تعریف و توصیف بھی کرتے تھے، لیکن میرا تاثر ہے کہ وہ باعمل مسلمان نہیں تھے اَور اُن کی طبیعت بار بار پھکّو بازی کی طرف لڑھک جاتی تھی۔

ڈار صاحب کی شادی ہوئی تو اُنہوں نے مجھے بھی دعوت دی۔ شادی ستمبر کی آخری تاریخوں میں تھی اَور رات کو تھی۔ مَیں پروگرام کے مطابق عین بروقت گلشنِ راوی کے ایک ''میرج ہال'' میں پہنچ گیا، لیکن ہال مکمل طور پر خالی تھا۔ ایک فرد بھی وہاں موجود نہ تھا۔ انتظار کر ہی رہا تھا کہ قریبی مسجد سے عشا کی اذان بلند ہوئی۔ مجھے اطمینان ہوا اَور مَیں مسجد میں چلا گیا۔ نماز پڑھی اور واپس ہال میں آیا تو اِکادُکا لوگ آنے لگے اَور کہیں ساڑھے دس بجے ہال بھر گیا لیکن پھر عجیب منظر بنا، سٹیج سے صوفے وغیرہ ہٹائے گئے۔ وہاں طبلے، سارنگیاں اَور موسیقی کے آلات سجائے گئے اَور دو جوان لڑکیاں آ کر تھرکنے لگیں۔

مجھے اس بدمذاقی پر سخت افسوس ہوا۔ عام طور پر پہلے مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اَور پھر اِس طرح کی کارروائی کو انجام دیا جاتا ہے۔ پھر جس کا جی چاہتا ہے وہاں بیٹھتا ہے، اَور جس کا جی چاہتا

ہے، چلا جاتا ہے...... مگر یہاں تو اِن لوگوں نے گویا سب مہمانوں پر لازم کر دیا کہ پہلے یہ بیہودہ پروگرام دیکھو، پھر کھانا ملے گا۔

مَیں نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں ضائع نہ کیا۔ ہیلمٹ اُٹھایا، باہر نکلا، موٹر سائیکل سٹارٹ کی اَور گھر آ گیا۔ اُس وقت رات کے کم از کم ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ گھر کا پکا ہوا کھانا کھایا اَور سو گیا۔

نعیم ڈار نے جس بے حسی بلکہ بیہودگی کا مظاہرہ کیا تھا، اُس کا خمیازہ اُسے بہت جلد بھگتنا پڑا۔ وہ ایک بڑبولا آدمی تھا اَور کوئی بات چھپا کر نہ رکھتا تھا۔ اُس کی باتوں سے اَور شدید ذہنی ٹینشن سے اندازہ ہوا کہ اُسے جو بیوی ملی ہے، وہ جھگڑالو اَور اکھڑ مزاج ہے۔ ہر بات میں بحث کا انداز اختیار کر لیتی ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے، ایک اسکول میں ٹیچر ہے اَور مرد و زن کی مساوات کی قائل ہے، اس لیے وہ بیوی کے لیے ہرگز ضروری نہیں سمجھتی کہ وہ خاوند کی خدمت کرے اَور کچن میں مصروف رہے۔

ڈار کی باتوں سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ اُس کی بیوی صحت مند نہیں ہے۔ کئی بیماریوں میں مبتلا ہے جس کے لیے اُسے روزانہ ہی شام کو کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑتا ہے۔ ایک دن تو وہ سب ساتھیوں کی موجودگی میں رو ہی پڑا۔ کہنے لگا: جان بڑے عذاب میں پھنس گئی ہے، بیوی وبالِ جان بن گئی ہے، اُس نے کسی اعتبار سے بھی سکون نہیں بخشا۔ مَیں تنگ آ گیا ہوں، مَیں اُسے چھوڑ دوں گا اَور بہت جلد طلاق دے دوں گا...... اَور واقعی اُس نے ایسا کر دکھایا۔ اس طرح بمشکل دو مہینے گزرے تھے کہ نعیم ڈار لنڈورا ہو گیا۔ اُسے شادی کے موقع پر روا رکھی جانے والی بدعملی لے بیٹھی۔ لاکھوں کی دولت بھی ضائع ہوئی، بیوی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا، عزت بھی برباد ہوئی اَور مستقل پریشانی اُس کا مقدر بن گئی۔

(۳)

میرے بچپن کے ایک دوست علامہ اقبال ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ مَیں انہیں ملنے کے لیے گاہے گاہے جاتا رہتا ہوں۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے بتایا کہ اُن کے عین پڑوس میں شیخوپورہ کے ایک سندھیلہ خاندان نے ایک مکان خرید لیا ہے۔ یہ خاندان بہت امیر تھا۔ تین مختلف اضلاع میں اُن کی زمینیں تھیں۔ اینٹوں کے بھٹے تھے اَور کولڈ سٹوریج بھی تھے۔ اقبال ٹاؤن والا مکان اُنہوں نے محض ریسٹ ہاؤس کے طور پر خریدا تھا۔ وہ مہینے میں ایک آدھ بار آتے تھے۔ سیر اَور تفریح کرتے تھے۔ داتا صاحب پر حاضری دیتے تھے اَور چلے جاتے تھے۔

بظاہر یہ لوگ مذہبی تھے۔ خاتونِ خانہ نمازی تھی، مگر اُن کی دینداری محض رسمی نمازوں، جمعرات کے ختموں، گیارہویں کی نذر اَور داتا صاحب کی حاضری تک محدود تھی، ورنہ اُن کا سارا طرزِ زندگی روایتی دنیادار زمینداروں والا تھا۔

میرے دوست نے بتایا کہ اس خاندان میں دو بیٹے اَور چار بیٹیاں تھیں۔ انہوں نے بڑے بیٹے کی شادی غیر معمولی دھوم دھام سے کی۔ سینکڑوں لوگ بارات میں اَور ہزاروں ولیمے میں شامل ہوئے۔ میوزیکل بینڈ تو تھا ہی، لیکن انفرادیت پیدا کرنے کے لیے طوائفوں کا مجرا بھی ہُوا اور یہ شغل رات بھر جاری رہا۔ شراب خوب چلی اَور نوجوان جاٹوں نے دل کی ہر تمنا پوری کی۔

اس علانیہ اَور کھلم کھلا بدعملی کا وبال یہ پڑا کہ جس لڑکے کی شادی تھی، اسے کچھ ہی عرصے کے بعد ہیروئن کی چاٹ لگ گئی اَور وہ عادی نشئی بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی بیوی روٹھ کر والدین کے ہاں چلی گئی اَور وہاں اُس نے خلع کا مقدمہ دائر کر دیا۔ بڑی بیٹی کی شادی ہوئی تو اُس کے دو بچے یکے بعد دیگرے ذہنی اعتبار سے معذور پیدا ہوئے۔ چھوٹی کی شادی ہوئی تو وہ اولاد سے محروم رہی۔

(۴)

قمر بھٹی مرحوم میرے بہت اچھے دوست تھے۔ محنتی خوش اخلاق، مُخلص اُور دیانت دار۔ پیکو میں سب انجنیئر تھے۔ ملازمت سے فارغ ہو کر سہ پہر کو گھر آتے، تو آٹے کی چکی چلا لیتے اُور پتہ بند باندھ کر آٹا پیسنے میں لگ جاتے اُور خلقِ خدا کی خدمت کرتے اُور یہی بات ہماری دوستی کا سبب بن گئی کہ مَیں اُن دنوں اکٹھی گندم خرید لیتا تھا اُور ہر پندرہ روز کے بعد اُن کی چکی سے پسوا لیا کرتا تھا۔

بھٹی صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں، لیکن دینی اعتبار سے وہ ایک بے عمل آدمی تھے اُور مسجد سے اُن کا تعلق بہت ہی کمزور تھا۔ ملاقاتوں میں انہیں توجہ بھی دلاتا، لیکن اُن کی طبیعت اِدھر مائل نہ ہوئی۔ اُن کے تین بیٹے اُور دو بیٹیاں تھیں...... بڑی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے کی۔ بارات اُن کی سگی بہن کے گھر سے آئی تھی۔ رات کو بارات بڑی تاخیر سے آئی اور باراتیوں نے کم از کم آدھ گھنٹے تک شادی گھر کے سامنے رُک کر ڈھول کی تھاپ پر خوب خوب بھنگڑا ڈالا۔ دولہا کے دوستوں نے اپنی فتح مندی کا ڈٹ کا مظاہرہ کیا، خوب بنکارے، خوب چیخے۔ اُور تو اور بھٹی صاحب کی بہن یعنی دولہا کی ماں بھی درمیان میں کود پڑی، وہ بھی بھنگڑا ڈالنے لگی اُور اُس نے اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے بھی کھینچ لیا اُور دونوں بہن بھائی مل کر ناچنے لگے...... باراتی خوب خوب لطف اندوز ہوئے۔ ایسی خوش مزاجی اُور محبت و یگانگت کا منظر کسی نے کاہے کو دیکھا ہوگا۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا۔ چند ہفتوں کے بعد بھٹی صاحب سے ملاقات ہوئی، تو بے حد افسردہ نظر آئے۔ پوچھا خیریت تو ہے، بتایا کہ خیریت نہیں ہے۔ میرے بھانجے داماد نے ہم سے صریحاً دھوکا کیا ہے۔ انکشاف یہ ہوا ہے کہ اُس نے خفیہ طور پر ایک فلمی ادارہ کے ساتھ شادی کر رکھی ہے

اُور اُس کا طرزِ عمل ہماری بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں ہے۔ بھٹی صاحب کا داماد فوٹو گرافر تھا اُور فلمی دنیا کے ساتھ اُس کے مراسم بڑے گہرے تھے۔

بڑی بیٹی کی شادی کے تقریباً تین سال کے بعد بھٹی صاحب نے جاوید کی شادی کی تو ویسے پر ایک میوزک گروپ کی خدمات حاصل کیں۔ تقریب کا ماحول مخلوط تھا اُور پردے کا معمولی سا بھی اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ خواتین کی غالب اکثریت کے چہرے اُور سر کھلے تھے۔ حیرت ہوئی کہ میوزک گروپ کے سب نوجوان خوبصورت، باوقار اُور صحت مند تھے اُور صاف محسوس ہوتا تھا کہ پڑھے لکھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے...... اُنہوں نے میرج ہال کے وسیع وعریض بیسمنٹ میں ہر طرح کے اُردو، پنجابی گانے پیش کئے۔ مَیں کچھ دیر تک حیرت اُور عبرت سے یہ منظر دیکھتا رہا اُور پھر دل گرفتگی کے ساتھ اُٹھ کر آ گیا۔

اس واقعے کے چند مہینوں کے بعد بھٹی صاحب کی بہن فوت ہوگئی تو مَیں تعزیت کے لئے اُن کے گھر پر گیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ جاوید نے ہمیں سخت مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ اُس نے اوپر اپنے کمرے میں ڈش لگوالی ہے۔ (یہ ملاقات ۱۱ر اکتوبر ۱۹۹۶ء کو ہوئی تھی اُور اُس زمانے میں ڈش کا رواج عام نہیں ہوا تھا) دونوں میاں بیوی فلمیں دیکھتے رہتے ہیں اُور میری چھوٹی بیٹی بھی وہیں چلی جاتی ہے، خطرہ ہے کہ یہ ماحول اس کے ذہن کو بھی متاثر نہ کر دے۔

بھٹی صاحب نے مزید بتایا کہ جاوید کی نظر میری گاڑی پر بھی ہے اُور اصرار کر رہا ہے کہ گاڑی اُس کے حوالے کر دی جائے، وہ اس حوالے سے بدتمیزی اُور اکھڑ پن کا مظاہرہ بھی کر رہا ہے۔

مَیں نے بھٹی صاحب کو احساس دلانے کی کوشش کی کہ یہ پریشانیاں اُور مسائل اس لئے پیدا ہوئے ہیں کہ آپ نے شادیوں پر دینی تعلیمات کی خلاف ورزی کی تھی...... لیکن محسوس ہوتا تھا کہ میری باتوں کا اُن پر چنداں اثر نہیں ہوا......

افسوس بھٹی صاحب عملی اُور ذہنی اعتبار سے مسائل کی دلدل میں دھنستے چلے گئے اُور ساٹھ سال کی عمر سے پہلے ہی ایک روز دل کے حملے سے جان ہار گئے۔

(۵)

اعجاز صاحب کی زبانی یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ مرحوم چودھری افضل خاں کی دونوں بیٹیوں کو طلاق ہوگئی ہے۔ مجھے یاد ہے ایک بار میں مرحوم کی عیادت کے لیے اُن کے گھر گیا تھا تو وہاں ڈھولکی کا اُور لڑکیوں کے گانے کا بے پناہ شور تھا...... مُجھے بہت تعجب ہوا کہ مرحوم کا تشخص سراسر دینی تھا اُور وہ ایک دینی جماعت ہی کے رُکن تھے۔ میرے استفسار پر وہ بہت دل گرفتہ ہوئے اُور گلوگیر لہجے میں بتایا کہ اُن کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔ میرے اعتراض پر بے بسی سے رونے لگے ''ڈاکٹر صاحب میرے گھر میں کوئی میری بات سننے یا ماننے پر تیار نہیں''۔

تب یاد آیا کہ چودھری صاحب کے چار میں سے دو بیٹے فلمی دنیا سے وابستہ ہیں اُور اہلیہ ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود خاصی لبرل ہیں...... چنانچہ اس صورتِ حال کا جو وبال پڑنا چاہئے تھا، وہ سامنے آ کے رہا اُور چودھری افضل خاں کی ساری دینداری دھری کی دھری رہ گئی۔

(۶)

پروفیسر شمس بٹ دیال سنگھ کالج اَور سائنس کالج میں میرے کولیگ تھے۔ خوش مزاج، خوش اخلاق اَور مخلص انسان ہیں۔ بات بات میں چٹکلے چھوڑنے والے، فضا کو بہت خوشگوار رکھنے والے۔

پانچ سال پہلے اُن کے بڑے بیٹے لقمان کی شادی تھی۔ مجھے وہ کارڈ دینا تو بھول گئے، لیکن شادی کی سہ پہر کو اُنہوں نے فون کیا، بہت معذرتیں کیں اَور نہائت اصرار کے ساتھ دعوت دی کہ مَیں آج شام کے بعد اُن کے بیٹے کے ولیمے میں لازماً شرکت کروں۔ ''جب تک آپ نہیں آئیں گے، مَیں کھانا شروع نہیں کراؤں گا، اگر آپ بے شمار لوگوں کو بھوکا نہیں رکھنا چاہتے، تو آپ کو ضرور آنا ہوگا''۔

اَور مَیں نے اُن کی محبت اَور اصرار کے آگے سپر ڈال دی اَور شادی میں شرکت کے لیے چلا گیا۔ یوں بھی اُن کا گھر میرے گھر سے زیادہ دُور نہیں ہے اَور یہ تو معاملہ ہی خلوص اَور محبت کا تھا۔

ولیمے کا انتظام اُن کے گھر کے قریب ہی کھُلے پلاٹ میں کیا گیا تھا۔ جہازی سائز کے دو ٹینٹ نصب کئے گئے تھے، زمین پر مختلف رنگوں کے قالین بچھائے گئے تھے جن پر خوبصورت کرسیاں اَور میز آراستہ کئے گئے تھے...... تقریب کا مجموعی مزاج مخلوط تھا، اگرچہ ایک ٹینٹ مردوں کے لئے مخصوص تھا اَور دوسرا عورتوں کے لیے لیکن عورتیں کھلے منہ مکمل آرائش وزیبائش کے ساتھ آزادانہ گھوم پھر رہی تھیں۔ پردے کا کہیں معمولی سا اہتمام بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

لیکن یہ کیا، کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے انتظار کے بعد اعلان کیا گیا: حضرات کھانے سے پہلے موسیقی کا ایک ہلکا پھلکا پروگرام ہوگا اَور اس کے بعد آپ حضرات کی تواضع کی جائے گی اَور اس

کے ساتھ ہی پاپ سنگرز کی ایک پوری ٹیم اپنے جُملہ سازوسامان کے ساتھ سٹیج پر براجمان ہوگئی اَور بڑے ہی پُرشور ڈیکوں پر موسیقی کا پروگرام شروع ہوگیا۔

سچی بات ہے مجھے شمس صاحب کی اس بد مذاقی پر بہت ہی افسوس ہُوا۔ سبھی ہم خیال دوستوں کا تاثر یکساں تھا۔ پیشہ معلّمی سے وابستہ، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص سے اس حرکت کی توقع نہ تھی اَور اگر وہ اِسے ضروری بھی سمجھتے تھے، تو کھانے کے بعد وہ اس فرض کو نپٹا سکتے تھے۔ سب کو بلا استثنا اس بیہودگی سے لُطف اندوز ہونے کی سزا تو نہیں ملنی چاہئے تھی......لیکن افسوس کہ موصوف کے مزاج میں غیر سنجیدگی کا جو لازمی عنصر تھا، یہ اُسی کا کرشمہ تھا، چنانچہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

لیکن دینی مزاج رکھنے والے، ہم چار پانچ دوستوں کا پیمانۂ صبر آٹھ دس منٹ کے بعد ہی لبریز ہوگیا۔ گانے اتنے لچر اَور فحش تھے، گانے والوں کی اچھل کود اتنی واہیات تھی اَور شور اس قدر ناقابلِ برداشت تھا کہ ہم لوگ خاموشی سے اُٹھ آئے اَور اپنے اپنے گھروں کو آگئے۔ پروفیسر شمس بٹ نے پانچ افراد کو پنڈال سے اٹھتے ہوئے ضرور دیکھا ہوگا، لیکن اُنہوں نے کسی معذرت کی ضرورت محسوس نہ کی اَور بعد میں بھی اُنہوں نے کسی وضاحت یا شرمندگی کا اظہار نہ کیا۔ ظاہر ہے جو لوگ اس زمانے میں موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا ذوق نہیں رکھتے اَور ایک شادی والے گھرانے کی خوشی میں شریک ہونے کا سلیقہ نہیں رکھتے، انہیں یہ سزا ملنی ہی چاہئے تھی۔

اس واقعے کے بعد میرا بٹ صاحب سے ربط ضبط بہت کم ہوگیا۔ اتفاقاً آمنا سامنا ہوجاتا، تو رسمی علیک سلیک ہوجاتی اَور بس۔ حیرت کی بات ہے کہ انہوں نے اس "حادثے" کے بارے میں کسی بھی ساتھی سے معمولی وضاحت یا ندامت کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اُن کے اس رویے یا صحیح تر لفظوں میں غیر معمولی بداخلاقی سے مَیں تو بہت دل برداشتہ ہُوا۔

اس واقعے کو پانچ سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ چندروز پہلے کی بات ہے۔ رمضان کی دوسری تیسری تاریخ تھی کہ شمس صاحب کا فون آیا، مَیں نے حال چال پوچھا تو روتے ہوئے بتایا

''مَیں تو برباد ہوگیا تین دن پہلے میری بیوی فوت ہوگئی ہے وہی اس عمر میں میری مونس و دمساز تھی۔مَیں تو بہت پریشان ہوں۔اب میرا کیا ہوگا''۔

مَیں نے افسوس اَور ہمدردی کا اظہار کیا،مرحومہ کی مغفرت کی دعا کی اَور فوری تعزیت کے لیے اُن کے گھر پہنچ گیا...... وہاں بالمشافہ دعا کی،انہیں صبر اَور حوصلے کی تلقین کی...... اَور برسبیلِ تذکرہ پوچھ لیا،آپ کا بیٹا لقمان نظر نہیں آیا،وہ کہاں ہے،اُس کا کیا حال ہے؟

''وہ ایک مقامی کالج میں لیکچرار ہے''شمس بٹ صاحب نے بتایا''مگر اُس کا بہت بُرا حال ہے،سوتیلی والدہ کی وفات سے بھی تو وہ پریشان ہے،لیکن اس کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ شادی کو پانچ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے،مگر اُس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔اِس سے وہ شدید ڈیپریشن اَور ٹینشن میں مبتلا رہتا ہے اَور گھر واپس آتے ہی کمرے میں بند ہو جاتا ہے۔کسی سے ملتا نہیں،بات نہیں کرتا،بس چپ چاپ سارا وقت ٹی۔وی کے سامنے بیٹھا رہتا ہے''۔

تب مجھے لقمان کی شادی کے سارے مناظر یاد آ گئے، بے پردگی،موسیقی، نمائش اَور اسراف......اَور ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔اللہ بہت غیرت مند ہے اَور وہ اپنے قوانین اَور اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والوں کو معاف نہیں کرتا،کسی نہ کسی صورت میں ایسے لوگوں کو سزا مل کے رہتی ہے۔چنانچہ میرے خیال میں شمس بٹ اَور اُن کے بیٹے کو اُسی بے اصولی کی سزا مل رہی ہے جس کا مظاہرہ اُنہوں نے شادی کے موقع پر کیا تھا یعنی اولاد جیسی نعمت سے یہ لوگ محروم ہیں،یہ خاندان اَور گھر چمنِ حیات کے ایسے پھولوں سے محروم ہے کہ جن کے وجود کے بغیر گھر مسرتوں سے خالی اَور ماحول سکون سے عاری ہوتا ہے اَور پروفیسر شمس بٹ کا گھر مسرتوں سے خالی اَور سکون سے عاری ہے۔کاش وہ تسلیم کرلیں کہ اس کا سبب اُن کی اپنی بے عملی ہے۔

آہ،مکافاتِ عمل۔

(۷)

شدید سردیوں کا موسم تھا۔ دسمبر یا جنوری کا مہینہ تھا۔ میں اپنے قریبی عزیزوں کو ملنے کے لئے آبائی گاؤں آیا تھا اَور چھوٹی بہن کے ہاں ٹھہرا تھا۔ شام کے بعد کھانا کھایا، عشا کی نماز پڑھی، گپ شپ ہوئی اَور رات کے نو بجنے تک باتوں کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا اَور سب کو جمائیاں آنے لگیں یوں بھی بجلی اَور ٹی وی کی گہما گہمی کے باوجود دیہات میں اب بھی لوگ جلد سو جانے کے عادی ہیں..... چنانچہ اُس رات ساڑھے نو بجے تک مَیں اپنے بستر پر دراز ہو چکا تھا اَور بہت ہی خوش تھا کہ آج ایک لمبے عرصے کے بعد جلد نیند سے ہم آغوش ہو رہا ہوں، ورنہ لاہور کا تو کلچر ایسا ہو گیا ہے کہ کتنی بھی کوشش کیوں نہ کریں، گیارہ بجے سے پہلے سونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ مَیں نیند کے حوالے سے بہت خوش نصیب واقع ہوا ہوں۔ رات یا دن کے جس حصے میں بھی تکیے پر سر رکھتا ہوں، فوراً سو جاتا ہوں اَور اکثر نیند کا غلبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اذکار اَور دعائیں تک پڑھنے کی مہلت نہیں ملتی چنانچہ متذکرہ رات کو بھی میں فوراً ہی سو گیا اَور پھر سر پیر کا ہوش نہ رہا۔

لیکن، لیکن یہ کیا..... ٹھائیں ٹھائیں ٹھاہ، ٹھائیں ٹھائیں ٹھاہ، زوردار گولے، ہیبت ناک شور..... مَیں گہری نیند کے باوجود ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا دیکھا تو رات کے گیارہ بجے تھے گولوں کا شور تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا تب یاد آیا کہ گزشتہ شام کو جب مَیں ویگن سے اُترا تھا تو ساتھ والے گاؤں میں بہت گہما گہمی تھی اَور دُور تک ٹیوبوں اَور رنگا رنگ کے فینسی قمقموں کے کھمبے گڑھے ہوئے تھے اَور سڑک پر خوب چہل پہل تھی۔ پتہ چلا کہ گاؤں کے ایک زمیندار چودھری کبیر کے بیٹے کی شادی ہے اَور بارات آج دوپہر کو بڑی دھوم دھام سے لڑکی والوں کی طرف روانہ ہوئی ہے۔ تب ساری

بات سمجھ میں آ گئی۔ یقیناً اس وقت بارات دلہن کو لے کر واپس آئی ہے اَور یہ گولہ باری اَور آتش بازی اسی فتح کا جشن منانے کے لیے کی جا رہی ہے۔

شدید ترین گولہ باری نے میری نیند اُچاٹ کر دی تھی۔ چودھری کبیر کا گھر میری قیام گاہ سے کم از کم تین فرلانگ دُور تھا۔ سوچا کہ جب بے آرامی کے حوالے سے میری یہ کیفیت ہے تو اُس گاؤں کے لوگوں کا کیا عالم ہوگا۔ بے اختیار دل سے دعائیں نکلیں کہ باری تعالیٰ ان لوگوں کو ہدایت اور سمجھ عطا فرما دیجیے۔ ان کو توفیق عطا فرما دیجیے کہ یہ خلقِ خدا کے لیے اذیّت کا سبب نہ بنیں۔ بار بار خیال آتا کہ اس غیر معمولی گولہ باری کے نتیجے میں پتہ نہیں کتنے مریض شدید پریشان ہوئے ہوں گے، پتہ نہیں کتنے بچے ہڑبڑا کر جاگ پڑے ہوں گے اَور اب گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنے والدین کو دوہری تکلیف میں مبتلا کیے ہوں گے، لیکن بے شمار لوگوں کی طرح چوھری کبیر کو کسی کی پروا نہ تھی، اُسے صرف اپنی جاہلانہ خوشی محبوب تھی، اُسے تو اُس مسجد کے احترام کا بھی کوئی لحاظ نہ تھا جو اُس کے بالکل پڑوس میں واقع ہے اَور جہاں بدقسمتی سے وہ کبھی حاضری نہیں دیتا۔

مَیں بے خوابی کے شدید اضطراب میں کروٹیں بدلتا رہا، خیال تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہ ابال اُتر جائے گا، اس طوفانِ بدتمیزی کا زور تھم جائے گا، لیکن لاحول ولاقوۃ...... یہ لے تو بڑھتی ہی جا رہی تھی، اس میں تو کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی تھی بلکہ لحہ بہ لحہ اس میں شدت آتی جا رہی تھی...... اَور اب رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کم از کم ایک گھنٹے سے یہ ہنگامہ جاری تھا اَور پورے زور شور سے جاری تھا۔

تب میری زبان پر بے اختیار بددعائیں جاری ہوگئیں۔ باری تعالیٰ یہ بہت ہی بدبخت لوگ ہیں، انہیں نہ آپ کی شرم ہے، نہ اُس نبی کی حیا ہے جس کے اُمتی ہونے کا یہ دعویٰ کرتے ہیں اَور انہیں نہ مسجد کا پاس ہے اَور نہ آپ کی مخلوق کا کوئی لحاظ ہے۔ باری تعالیٰ یہ آپ کی، آپ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات کی کھُلم کھُلا توہین کر رہے ہیں اَور آپ کے بندوں کے لئے تکلیف اَور پریشانی کا سبب بن رہے ہیں۔ پھر یہ سراسر جہالت کا، نمود و نمائش کا اَور

اسراف کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس لئے باری تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کر دیجیے اَور سچی خوشی اَور سکون سے انہیں محروم کر دیجیے۔

معذرت خواہ ہوں کہ مَیں نے یہ بد دعا کی، لیکن آخر کیا کرتا، مُجھے اپنی بے آرامی کا بھی احساس تھا اَور بے شمار بے گناہ لوگوں کی پریشانی کا بھی خیال آ رہا تھا جو میری طرح شدید قسم کی اذیت میں مبتلا کر دیئے گئے تھے۔ بہر حال یہ انتہائی تکلیف دہ ڈرامہ تقریباً ایک بجے تک جاری رہا جس کے بعد مَیں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

مَیں دوسری صبح لاہور واپس آ گیا اَور اپنی معمول کی زندگی میں کھو گیا۔ ڈیڑھ دو ماہ کے بعد دوبارہ گاؤں جانے کا اتفاق ہوا، تو گفتگو کے دوران پتہ چلا کہ شادی کے دو ہفتے کے بعد ہی چودھری کبیر کے گھر میں آگ لگ گئی تھی۔ جس ہال کمرے میں اُس کی بہو کا سامان پڑا تھا اَور سامان بڑی کثرت سے تھا کہ وہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی، وہاں شام کو بجلی کی استری چالو حالت میں پڑی رہ گئی اَور اس کی حرارت سے کپڑوں میں آگ لگ گئی۔ سردیوں کا موسم تھا، گھر کے سب لوگ دوسرے کمروں میں سو رہے تھے چنانچہ پتہ اُس وقت چلا جب صبح پانچ بجے دھوئیں کے مرغولے ہال کمرے سے نکل کر باقی گھر میں پھیلنے لگے، یہ لوگ خوفزدہ ہو کر بیدار ہوئے، لیکن بجلی کی تاریں جل جانے کی وجہ سے پورے گھر میں گھپ اندھیرا تھا، اس لئے وہ فوری طور پر حادثے کی نوعیت کو نہ سمجھ سکے۔

پتہ چلا کہ دلہن کا سارا جہیز جس میں فریج، ٹی۔ وی اَور الیکٹرانکس کی بہت قیمتی اشیا بھی تھیں، مکمل طور پر تلف ہو گیا۔ کمرہ بھی برباد ہو گیا اَور گھر کی بجلی کا سارا نظام جل گیا اَور چودھری کبیر کو شدید ترین ذہنی اذیت کے علاوہ لاکھوں کے نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔

مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ چودھری کبیر کے گھر میں یہ حادثہ محض اتفاق سے پیش نہیں آیا بلکہ یہ اللہ کے قانونِ مکافات کا ایک بدیہی نتیجہ تھا...... بے شمار واقعات کی روشنی میں میری یہ رائے بنی ہے کہ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے ہمارے اعمال کے نتیجے

میں ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن جلد ششم میں سورہ زلزال کی تفسیر کرتے ہوئے یہ فکر انگریز فقرے رقم فرماتے ہیں: ''قرآن و حدیث میں ہر قسم کے اعمال کی جزاوسزا کا ایک مفصل قانون موجود ہے اور یہ جزاوسزا دنیا سے آخرت تک انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے'' (ص ۴۲۴) چنانچہ چودھری کبیر کے گھر میں جو کچھ ہوا وہ وبال تھا، اُس کے غیر انسانی، غیر اخلاقی اور غیر دینی روّیے کا۔ اس نے اللہ رسول کے احکامات کو پاؤں تلے روند ڈالا، اُس نے بے شمار بے قصور لوگوں کو نہ صرف بے آرام کیا بلکہ اُنہیں شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیا، اُس نے اسراف و تبذیر اور نمائش کی صورت میں شیطانی کھیل کھیلا اور میری طرح ان گنت لوگوں نے اور مسجد نے اُس کے لیے جو بد دعائیں کیں، اُنہوں نے آگ کی صورت اختیار کر لی اور چودھری بے بسی کے ساتھ ہاتھ ملنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ اُس کا تکبّر اور طنطنہ خاک میں مل گیا، اور یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ میرے سامنے بہت سی مثالیں ہیں کہ جن لوگوں نے بھی شادی بیاہوں میں دینی تعلیمات کی توہین کی، نمود و نمائش بے پردگی، بے حیائی اور اسراف کا انداز اختیار کیا اور خلقِ خدا کے لیے دُکھ اور تکلیف کا سبب بنے، شادی کے بعد یہ گھرانے کبھی سچی خوشی یا حقیقی سکون سے آشنا نہیں ہوئے۔ بے عملی کی نحوست لازماً ان پر سایہ فگن ہوئی اور لڑائی، فساد، باہمی انتشار اور رزق کی تنگی اِن کا مقدّر بن گئی۔

باب : ۷

مالِ حرام کا وبال

(۱)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۵؍جولائی ۱۹۹۷

اپنے بچپن کے دوست حامد علی کے گھر واقع پاک بلاک علامہ اقبال ٹاؤن گیا۔ وہاں مَیں نے اُن کے گھر پر تین تین چار چار سال کے دو خوبصورت اَور پیارے سے بچوں کو کھیلتے ہوئے دیکھا۔ پوچھا یہ بچے کس کے ہیں تو وہ افسردہ ہوگئے اَور اُنہوں نے بڑی ہی عجیب وغریب، ڈرا دینے والی کہانی سنائی...... کہنے لگے یہ دونوں بچے جی ایم ملک کے نواسے ہیں جو دو سال پہلے سرگودھا تعلیمی بورڈ کے چیئرمین تھے۔ وہاں اُن پر تین کروڑ روپے کے غبن کا کیس بنا تھا اَور وہ برطرف کردیئے گئے تھے۔

حامد علی صاحب نے بتایا جی ایم ملک کے سارے گھرانے کی کہانی بڑی دردناک ہے۔ ابھی وہ سرگودھا میں اپنے عہدے پر کام کررہے تھے کہ اُن کا جوان خوبصورت بیٹا ٹریفک حادثے میں ہلاک ہوگیا...... اُن کی دو بیٹیاں اُن کے سگے بھائی کے ہاں بیاہی ہوئی تھیں، اُن کا ایک ایک بیٹا تھا کہ دونوں کو طلاق ہوگئی۔ یہ وہی بچے ہیں جو آپ نے دیکھے ہیں۔

پھر جی ایم ملک کے بڑے بیٹے کی شادی بھی اُسی بھائی کے گھر میں ہوئی تھی، جب اُس کی بہنوں کو طلاق ہوئی، تو اس نے بھی باپ کے اصرار پر اپنی بیوی کو طلاق دے دی...... اس طرح سارا گھرانا بڑی ہی اندوہناک صورتِ حال سے دوچار ہوا۔

جی ایم ملک کی دونوں بیٹیوں کی عمریں ابھی ۲۱ سے ۲۳ سال کے درمیان تھیں۔

(۲)

مَیں جب بھی کسی ایسے بچے کو دیکھتا ہوں جو ذہنی یا جسمانی اعتبار سے معذور ہو تو فوری طور پر میرا یہ تاثر بنتا ہے کہ اس بچے کے والد کا تعلق نہ خدا سے اچھا ہے نہ خلق خدا سے کہ خدا تو بے حد و حساب رحیم و کریم ہے۔ وہ کسی گناہ یا خطا کے نتیجے میں وقتی اَور عارضی طور پر تو اپنے بندوں کو، تادیب اَور عبرت کی خاطر، کسی آزمائش میں مبتلا کرتا ہے، لیکن لامتناہی عرصے تک اور شدید ترین مصیبت اَور پریشانی سے وہ بلاوجہ دوچار نہیں کرتا۔ اس کے پس منظر میں لازماً کوئی بہت خاص سبب ہوتا ہے اَور اِن اسباب میں علاوہ دیگر باتوں کے مالِ حرام کا عمل دخل بھی ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان بنتے وقت انصار اَور مہاجرین دونوں کی اکثریت نے حلال و حرام کی تمیز کھو دی۔ مقامی آبادی نے ہندوؤں اور سکھوں کی جائیدادوں پر خوب خوب ہاتھ صاف کیا اَور مہاجرین میں سے بہت سوں نے ناجائز کلیم داخل کئے اور ایسی جائیدادوں پر قابض ہو گئے جن کا وہ استحقاق نہیں رکھتے تھے چنانچہ ''مکافاتِ عمل'' کے تحت اس کے وسیع اثرات مرتب ہوئے اَور علاوہ دیگر مسائل اَور مصائب کے متعلقہ گھرانوں میں معذور بچے کثرت سے پیدا ہوئے چنانچہ میرا تاثر ہے کہ اگر سروے کیا جائے تو شاید دنیا بھر میں سب سے زیادہ معذور بچے پاکستان کے حصے میں آئیں گے۔

چودھری حیدر علی قمر جالندھر کے مہاجر تھے۔ خوبصورت شخصیت کے حامل، بہت خوش اخلاق اَور بظاہر بہت دیندار...... لیکن بے چارے غیر معمولی مسائل و مصائب میں مبتلا رہے۔ اُن کے چار بیٹے تھے۔ ایک عین جوانی میں فوت ہو گیا۔ ایک کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک آٹھ دس سال کی عمر میں چھت سے گر کر فوت ہو گیا۔ نمبر دو بیٹے کے تین بیٹے ذہنی معذور تھے۔

جسمانی اعتبار سے صحت مند، لیکن تینوں کے سر چھوٹے تھے اُور تینوں گھر بھر کے لیے مستقل مصیبت بلکہ عذاب بنے رہتے تھے، ایک دوسرے سے لڑتے، توڑ پھوڑ کرتے اُور عبرت ناک بات یہ ہے کہ چونکہ چودھری صاحب ہی عام حالات میں گھر پر موجود رہتے تھے اُور اُن کا بیٹا یعنی معذور لڑکوں کا باپ کاروبار کے سلسلے میں دن بھر باہر رہتا تھا، اس لئے عام طور پر چودھری صاحب ہی کی شامت آئی رہتی تھی اُور وہ انہیں زدوکوب بھی کرتے تھے۔ کئی مرتبہ لڑکوں نے انہیں زمین پر گرا کر زخمی بھی کیا۔

اللہ مجھے معاف کرے میرا گمان یہ ہے کہ چودھری حیدر علی قمر نے تقسیم کے وقت غلط کلیم دیئے تھے، ناجائز جائیداد حاصل کی تھی جس کا خمیازہ وہ معذور پوتوں کی صورت میں بھگتتے رہے اُور عرصۂ دراز تک اِن سے مار کھاتے رہے۔

چودھری صاحب کے ایک تندرست پوتے کو انہی ذہنی معذور لڑکوں نے دھکا دے کر چھت سے گرا کر مار دیا تھا۔

(۳)

ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے بتایا

بھائی پھیرو میں ایک پٹواری تھا، یوپی کا مہاجر پٹھان تھا، وہ ترقی کر کے تحصیل دار بن گیا اُور اُس کی تقرّری محکمہ بحالیات میں ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا اُس نے رشوت کی حد کردی اُور بے پناہ دولت بنائی۔ بھائی پھیرو میں بہت بڑی ایک متروکہ حویلی پر بھی قبضہ کرلیا۔

اُس کی سزایوں شروع ہوئی کہ اس کے گھر کے چار افراد یعنی دو بیٹے اُور دو بیٹیاں اپنے تانگے پر نہر کے کنارے سیر کر رہے تھے کہ گھوڑا بدک کر نہر میں کود گیا اُور یہ چاروں بہن بھائی ڈوب کر مر گئے۔ اِن کی لاشیں بڑی کوشش سے کئی دن کے بعد ملیں۔ کوچبان نے البتہ چھلانگ لگا

کر اپنی جان بچالی تھی۔

اس صدمے سے مذکورہ تحصیل دار شدید بیمار ہو گیا اور بستر سے لگ گیا۔ تشخیص ہوئی تو پتہ چلا کہ اُسے ٹی بی ہو گئی ہے۔ یہ مرض اُس زمانے میں لاعلاج تھا، چنانچہ خاصی مدت تک غیر معمولی تکلیف میں مبتلا رہ کر تحصیلدار فوت ہو گیا...... اس کے پیچھے اُس کی بیوی اور ایک بیٹی رہ گئی تھی۔ بیوی بھی ایک روز برین ہیمرج سے مر گئی۔ بیٹی کو اُس کے رشتے دار کراچی لے گئے اور اس طرح سارے خاندان کا صفایا ہو گیا۔

(۴)

پروفیسر احسان الحق چیمہ صاحب نے بتایا: میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو محکمہ بحالیات میں افسر تھا۔ وہاں اُس نے رشوت کی انتہا کر دی۔ کلیموں کی خرید و فروخت میں بہت بڑی جائیداد بنالی...... چودہ پندرہ مربعے زمین اور زرعی فارم۔

اُس کے دو بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں...... بڑا بیٹا دنیا جہاں کی خرابیوں میں مبتلا ہو گیا۔ آوارگی، جعل سازی، بدمعاشی، شراب نوشی...... اُس کی وجہ سے باپ کی بے حد رسوائی ہوئی حتیٰ کہ اُسے عاق کر دیا گیا۔

مذکورہ افسر کی بیگم بھی بہت سی بیماریوں میں مبتلا ہو گئی۔ سکون اور اطمینان اس گھر میں کبھی نظر نہیں آیا۔ ہر طرف مالِ حرام کی نحوست کے اثرات دکھائی دیتے تھے۔

(۵)

ذیل کی تحریر مشہور کالم نویس اور دانشور جناب محمد اظہار الحق کی ہے۔ جو روزنامہ نوائے وقت (۴ جنوری ۲۰۰۵ء) میں شائع ہوئی تھی۔ تاثیر اور افادیت کے پیشِ نظر قارئین کی نذر کر رہا ہوں

چار پائی کے گرد لوگوں کا دائرہ تھا جو گھوم رہا تھا۔ دیکھنے والے ایک ایک کر کے اس کا منہ دیکھ رہے تھے اور دائرے سے باہر نکل رہے تھے۔ مَیں بھی اس دائرے میں شامل ہو گیا اور جب میّت کے سرہانے پہنچا اور منہ دیکھا تو میری ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ مَیں نے مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اس کے چہرے پر زمانوں کی زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر سر کے اوپر تک چہرے کے ارد گرد سفید کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے کھڑے ہو جانے سے چلتا ہوا دائرہ تھم گیا ہے۔ مَیں دائرے سے باہر نکل آیا۔ وہ کالج کے زمانے سے ہمارا ساتھی تھا۔ دلکش شخصیت، طویل قامت، ہمیشہ ہنستا ہوا، حاضر جواب شاعری سے از حد دلچسپی، مصطفیٰ زیدی اور کئی دوسرے شعراء کا کلام ازبر تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دوست تھا اور مخلص تھا۔ مہمان نوازی میں اسے لطف آتا تھا اور دوسروں کے کام آ کر اسے مسرت حاصل ہوتی تھی۔

لیکن افسوس! اسے ملازمت ایسے شعبے میں ملی جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ یہ شعبہ اس کا اپنا انتخاب تھا یا یہ مصیبت اس نے نادانستہ مول لی تھی۔ بہر حال کچھ عرصہ اس شعبے میں کام کر چکا تو اس کی کایا کلپ ہو چکی تھی۔ اب وہ عامر پہلے جیسا عامر نہیں رہا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے فون کیا ''تمہارے شہر آیا ہوں، ملو گے نہیں؟'' وہ ایک فائیو سٹار ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ مَیں جتنی دیر اس کے پاس بیٹھا رہا، اس کا موضوع گفتگو ڈالر رہا۔ وہ مجھے تفصیل سے بتانا چاہتا تھا کہ آدمی کو بہت سے روپے جمع کر کے انہیں ڈالروں میں تبدیل کر لینا چاہیے اور پھر ڈالر حفاظت سے رکھنے چاہئیں، لیکن مجھے اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اس عمل کی میکانیات میں کورا تھا۔ چنانچہ

تھوڑی دیر کے بعد مَیں اجازت لے کر رخصت ہوگیا۔

کچھ دنوں بعد مجھے اس کے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہ ملا تو کھانے کے لیے شہر کے سب سے بڑے فائیو سٹار ہوٹل میں لے گیا۔ ماحول کے چکا چوند اور کھانے کی اجنبیت کی وجہ سے مَیں مسلسل بے کل رہا۔ اس نے بل میں ڈھیر سارے پیسے ادا کیے۔ اگلی دفعہ مَیں گیا تو مَیں نے اصرار کیا کہ کھانا اس کے گھر میں کھاؤں گا۔ وہ بادل نخواستہ گھر لے گیا۔ گھر میں صرف ایک بنگالی نوکر تھا۔ اس کا تیار کردہ سالن ادھ پکا تھا اور روٹیاں کچی تھیں۔ ڈرائنگ روم کا فرنیچر انتہائی قیمتی تھا لیکن اس پر مٹی کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ مَیں نے پوچھا بھابی کہاں ہیں۔ اس نے ایک عجیب سی بے بسی کے انداز میں بتایا کہ آرٹ گیلری میں تصویروں کی نمائش دیکھنے گئی ہوئی ہیں۔

ناجائز پیسے کی ریل پیل اسے زمین سے اور زمین میں پھیلی ہوئی جڑوں سے بہت دور کیے جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا وہ ہوا میں تیر رہا ہے۔ حرام کی دولت خباثتوں کی شکل میں اپنی ساری اولاد ساتھ لاتی ہے۔ چنانچہ وہ برائیوں کے حصار میں گھر گیا اور المیہ یہ تھا کہ اسے اپنے گھر جانے کا احساس ہی نہیں تھا تاوقتیکہ اس اداس صبح کو اس کے اور میرے ایک مشترکہ دوست نے فون پر یہ وحشت اثر خبر سنائی کہ عامر نے خودکشی کر لی ہے اور جب مَیں وہاں پہنچا اور لوگوں کے گھومتے دائرے میں داخل ہو کر اس کا آخری دیدار کیا تو میری ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔

یہ واقعہ جو میرے ساتھ پیش آیا، ہم سب کے ساتھ آئے دن پیش آ رہا ہے۔ ہم ہر روز دیکھ رہے ہیں کہ دولت جمع کرنے کے لیے اندھا دھند تیز بھاگنے والے منہ کے بل گر رہے ہیں، یوں کہ پھر اٹھ نہیں سکتے۔ کوئی چھ کروڑ دے کر نیب سے چھوٹتا ہے اور خودکشی کر لیتا ہے۔ کوئی مشکوک آمدنی سے محل تعمیر کرتا ہے اور اس محل میں قدم رکھنے سے پہلے اٹھا لیا جاتا ہے۔ کسی کے بچے اس کی جمع کی ہوئی دولت جیب میں ڈال کر اسے خدا حافظ کہہ دیتے ہیں، کوئی قانون سے بچنے کے لیے دولت اور جائیداد قابل اعتماد رشتہ داروں کے نام کراتا ہے اور جب اس دولت اور جائیداد سے محظوظ ہونے کا وقت آتا ہے تو رشتہ دار ملکیت کی دستاویزات پر اپنا نام دکھا کر اسے پہچاننے سے

انکار کر دیتے یں۔ کوئی جھوٹ بولتا ہے کہ مجھے خون کا کینسر ہے خدا کے لیے مجھے رہا کرو کسی کا بیٹا ناجائز دولت کے سہارے اتنا بپھرتا ہے اور غبارے کی طرح پھیلتا ہے کہ قاتل بن جاتا ہے اور ساری دولت خاندان کو رسوائی اور قاتل کو بھاگنے سے نہیں بچا سکتی۔ کوئی لاکھوں روپے بیٹے کے اکاؤنٹ میں ڈال کر اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے سمندر پار بھیجتا ہے اور بیٹا وہ ساری دولت خرچ کر کے اسی طرح واپس آ جاتا ہے جس طرح گیا تھا۔ یہ سب کچھ......اور بہت کچھ اور بھی۔ ہم دیکھتے ہیں اور دن رات دیکھتے ہیں لیکن ہمارے اعصاب اس قدر مضبوط ہیں کہ ہم قانونِ قدرت سے ڈرتے ہیں نہ سبق حاصل کرتے ہیں۔

(۶)

فتح علی خان ہارڈ ویئر کا کاروبار کرتا تھا۔ پائپ، ٹونٹیاں، واش روم کا سامان اَور کیل قبضے اَور چونکہ وہ ایک دینی تحریک سے وابستہ تھا۔ باریش تھا، صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا اَور جب بھی وہ دکان پر فارغ ہوتا عام دکانداروں کی طرح ٹی۔وی دیکھنے کی بجائے وہ قرآن پڑھتا رہتا اَور تسبیح لئے ذکر کرتا رہتا، اس لئے میرے دل میں اُس کی بڑی عزت تھی اَور مَیں جب بھی ضرورت پڑتی، فاصلہ نسبتاً زیادہ ہونے کے باوجود مَیں اُسی کی دکان سے سامان خریدتا تھا۔

چند سال پہلے ہم نے مکان کے اوپر دو کمروں کا اضافہ کیا، تو پائپ فٹنگ، بیسن اَور شاور وغیرہ کا سارا سامان اُسی سے خریدا۔ مَیں نے اپنی عادت کے مطابق ایک دیندار شخص پر اندھا اعتماد کیا اَور کسی بھی دوسری دکان سے قیمتوں کا موازنہ نہ کیا۔

لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اندازہ ہوا کہ فتح علی خان نے تو سامان کی دوگنی سے بھی زیادہ قیمتیں لگائی ہیں اَور سامان بھی سارا نمبر دو فراہم کیا ہے تو بہت صدمہ ہوا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ صبر کر کے خاموش ہوگیا۔

موصوف کی گراں فروشی کا اندازہ ایک روز مجھے یوں ہوا کہ پلاسٹک کے پائپوں کو ملانے والے جائنٹ کی ضرورت پڑی تو مَیں نے پہلے ایک دکان سے پتہ کیا، اُنہوں نے اس جائنٹ کی قیمت دو روپے بتائی اَور وہ اچھے میٹریل میں مضبوط بنا ہوا تھا۔ مَیں محض تجسس کے تحت خان کی دکان پر چلا گیا تو اس نے اُسی جائنٹ کی قیمت حالانکہ وہ ناقص میٹریل میں تھا، دس روپے بتائی۔

اس کے بعد تو کئی لوگوں نے بتایا کہ فتح علی خان گاہک کی کھال اُتارتا ہے، وہ دینی تحریک، تلاوتِ قرآن اَور ذکر کے پردے میں غیر معمولی منافع خوری کا ارتکاب کرتا ہے اَور اس معاملے میں اُس کے اندر مروّت، حیا یا خوفِ خدا کا کہیں بھی گزر نہیں ہے۔ سچی بات ہے مَیں موصوف

کے روّیے سے بہت ہی بددل اُور افسردہ ہُوا۔ جب دیندار لوگ کاروباری دیانت اُور اخلاق سے عاری ہو جائیں، تو پھر قیامت ہی کا انتظار کرنا چاہیے۔ کبھی اُس کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو دانستہ نظریں چرا کر، منہ دوسری طرف پھیر کر گزر جاتا۔ اُس سے علیک سلیک کی بھی ہمت نہ پڑتی۔

اُور یہ بات جولائی ۲۰۰۶ء کی ہے۔ ایک دن پتہ چلا کہ فتح علی خان شدید بیمار ہے، اس کے دماغ میں ٹیومر کی تشخیص ہوئی ہے۔ لاہور کے سارے متعلقہ ڈاکٹروں اور شوکت خانم ہسپتال والوں نے جواب دے دیا ہے اور اُس کے بھائی اُسے آغا خان ہسپتال کراچی لے گئے ہیں۔

کراچی میں فتح علی خان تقریباً ایک ماہ تک زیرِ علاج رہا۔ سنا ہے علاج اتنا مہنگا تھا کہ دکان بک گئی، دکان کا سارا سامان بیچنا پڑا اُور اُس کے بھائی بھاری قرض تلے دب گئے، لیکن افسوس کہ کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اُور موصوف ۲۸-۷-۲۰۰۶ کو وفات پا گیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر تقریباً چالیس سال تھی اُور اُس کے چار کم عمر بچے تھے۔

(۷)

وہ آگ کی طرف بڑھتا ہی جا رہا تھا

پیر نصیر بی اے میں میرا کلاس فیلو تھا۔ وہ پڑھائی میں چنداں لائق نہ تھا، لیکن اللہ نے اسے شخصیت کے حوالے سے کئی خوبیوں سے نواز رکھا تھا۔ اگرچہ اُس کا رنگ سانولا تھا لیکن خدوخال بڑے ہی متوازن اور دلکش تھے۔ بھاری بارعب چہرے پر بچوں کی سی معصومیت رقصاں رہتی۔ وہ دراز قد تھا اور حالانکہ اُس کا جسم موٹاپے کی طرف مائل تھا، لیکن اُسے دیکھ کر ذرا بھی بھدّے پن کا احساس نہ ہوتا تھا۔ لبوں پر خوبصورت مسکراہٹ سجائے، نصیر تپاک اور گرم جوشی سے ملتا تو کوئی بھی اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ وہ مجلسی نوجوان تھا، گپ شپ کا عادی تھا، یہی سبب ہے کہ اُس کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا اور حالانکہ اسے بہت اچھی تقریر کرنی نہیں آتی تھی، لیکن اپنی ذاتی خوبیوں، شخصیت کی دلآویزی اور دوستوں کے بھرپور تعاون کی وجہ سے وہ بڑی ہی آسانی سے کالج یونین کے الیکشن میں کامیاب ہو گیا اور سٹوڈنٹس یونین کا صدر بن گیا۔ یہ بات 1964ء کی ہے۔

پیر نصیر کا تعلق ایک معزز راجپوت خاندان سے تھا۔ لگتا ہے کہ اس کے اجداد میں سے کسی بزرگ نے دینی اور روحانی اعتبار سے خاص عزت حاصل کر لی ہو گی، اس لئے خاندان کے سارے ہی افراد کے ساتھ پیر کا سابقہ چسپاں ہو گیا۔ اُس کے والد بھی پیر کہلاتے تھے۔ اُس کے پھوپھا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ایک نیک نام دینی جماعت کے مقامی قائد بھی تھے۔

پیر نصیر مجھ سے بڑی ہی محبت اور تپاک سے پیش آیا کرتا۔ وہ طلبہ یونین کا صدر تھا اور مَیں کالج میگزین کا مدیر، اُسی زمانے میں میرے طبع زاد مضامین ملک کے سب سے بڑے رسالے ''اُردو ڈائجسٹ'' میں شائع ہوتے تھے۔ اس لئے بھی حلقہء احباب میں اللہ نے مجھے ایک خاص عزت عطا کر دی تھی۔ علاقائی اعتبار سے بھی وہ میرا ''گرائیں'' تھا۔ یعنی وہ میرے گاؤں کے

قریب ہی ایک قصبے میں رہتا تھا۔ اس طرح کالج کے علاوہ بھی اُس سے ملاقات کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی تھی، اور جب بھی ایسا موقع آتا وہ بڑی ہی گرم جوشی اور اپنایت کا مظاہرہ کرتا۔

لیکن بی اے کے بعد پیر نصیر سے میرا رابطہ بہت کمزور ہو گیا۔ مَیں مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گیا۔ یہاں حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ قلم کی مزدوری، پھر روزگار کے جھمیلے اور اس حوالے سے غیر معمولی مصروفیت، نتیجہ یہ کہ کم وبیش پانچ چھ سال تک سر پَیر کا ہوش نہ رہا۔ اسکول اور کالج کے دوستوں سے ملاقاتیں خواب و خیال بن گئیں، تا آنکہ اللہ کو مجھ پر ترس آ گیا اور مَیں ستمبر 1970ء میں کالج لیکچرار کی حیثیت سے محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گیا اور زندگی ایک نئے انقلاب سے روشناس ہوئی۔

پیپلز پارٹی کا پہلا دور تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت تھی اور مَیں گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کر رہا تھا اور وہاں سے گاؤں کا فاصلہ کم ہونے کی وجہ سے مَیں روزانہ گھر چلا جایا کرتا تھا۔ ایک روز حسنِ اتفاق سے بس میں پیر نصیر سے ملاقات ہو گئی۔ خوش قسمتی سے ہم دونوں کو ایک ہی سیٹ پر جگہ مل گئی اور اس طرح گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گپ شپ کا موقع مل گیا۔

پیر نصیر سے مَیں نے پوچھا کہ آج کل کیا شغل ہے، تو مسکراتے ہوئے کمال ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ ''آج کل حرام کھا رہا ہوں۔'' ''کیا مطلب؟'' میں نے پریشان اور حیران ہو کر پوچھا۔ ''ٹریکٹروں کے پُرزے بیچتا ہوں۔ ڈیلروں کو فراہم کرتا ہوں اور اس کے لیے ملک کے دور دراز کا سفر کرتا ہوں''۔

''لیکن اس میں حرام کھانے والی کون سی بات ہے''؟ مَیں نے وضاحت چاہی۔

''حرام والی بات یوں ہے'' پیر نصیر نے صاف گوئی سے کہا ''ٹریکٹر کے پرزے پاکستان کے، لاہور کے بنے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن مَیں ڈیلروں کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ میڈ ان جاپان ہیں۔'' پھر وہ پاکستانی کاریگروں کی تعریفیں کرنے لگا۔ ''ظالم اتنے ذہین اور ماہر ہیں اور دیسی خراد مشینوں پر پرزے اتنی نفاست اور ہنرمندی سے بناتے ہیں کہ شاید خود جاپانی انجینئر بھی ان میں

امتیاز نہ کرسکیں۔لیکن ظاہر ہے دونوں کے معیار اور قیمتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور مَیں اس فرق کو کیش کراتا ہوں۔ بہت آمدنی ہے اس میں، بہت پیسہ کماتا ہوں مَیں ...... لیکن ظاہر ہے سب حرام کا ہے، ناجائز ہے اسی لئے مَیں اپنے ذہن پر سخت بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ میرا سکون لٹ گیا ہے، راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے''۔

''لیکن آپ اس ناجائز کاروبار کو ترک کیوں نہیں کردیتے؟ اس کی تو بنیاد ہی جھوٹ اور بے ایمانی پر استوار ہے''۔

''مگر فاروق بھائی، مَیں اس کاروبار کو چھوڑ نہیں سکتا۔ مَیں اس کے سوا اور کوئی کام کرنے کا اہل نہیں ہوں۔ شاید آپ نہیں جانتے کہ مَیں بی اے کے بعد مزید تعلیم حاصل نہیں کرسکا تھا، مَیں نے کوئی ہنر بھی نہیں سیکھا۔ اب کروں تو کیا کروں؟ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے اس کاروبار میں منافع بہت ہے۔ اس کو چھوڑ کر کوئی اور کام کروں گا تو اس میں اتنی یافت نہیں ہوگی ...... اس لئے مَیں اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوں۔ یقیناً میرا ضمیر مجھے کچوکے لگاتا ہے لیکن مَیں کمزور آدمی ہوں، ضمیر کی آواز پر عمل نہیں کرسکتا۔ اب تو اسی کے ساتھ جینا مرنا ہے، اس کو چھوڑنے کی اب اپنے اندر ہمت نہیں ہے''۔

''لیکن پیر جی، یہ کام ہے بہت خطرناک۔ یہ تو آپ کی آخرت بھی برباد کردے گا اور دنیا میں بھی بہت مسائل پیدا کرے گا''مَیں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

پیر نصیر نے زچ ہوکر موضوع بدل لیا۔ کہنے لگا''میرا ایک کام کرادیں۔ مَیں بہت پریشان ہوں''۔ اور میرے استفسار پر اُس نے وضاحت کی کہ اُس کی بیگم ایم اے اُردو ہے۔ وہ مسلسل اصرار کررہی ہے کہ وہ ہر قیمت پر ملازمت کرے گی لیکن کوشش کے باوجود ملازمت نہیں مل رہی۔

پھر اس نے میرا ہاتھ دبایا''مَیں اس کے لئے بڑی سے بڑی رشوت دینے کے لیے تیار ہوں، خدا کے لئے اسے کسی کالج یا اسکول میں ملازمت دلوادیں''۔

میں نے پیر نصیر کو بتایا کہ آج کل صوبہ پنجاب کے وزیر تعلیم ایک پرانے مسلم لیگی ہیں، جس

طرح آپ کا تعلق پیروں کے خاندان سے ہے اور آپ کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہو چکے ہیں، اسی طرح موصوف نے چونکہ تحریکِ پاکستان میں فعّال کردار ادا کیا تھا، اس لئے پیپلز پارٹی میں شامل ہو جانے کے باوجود اُن کی سات پشتوں کے گناہ بخش دیئے گئے ہیں۔ انہوں نے بڑے ہی دھڑلے سے نئی تقرری کا ریٹ پانچ ہزار روپے جبکہ ٹرانسفر کا تین ہزار مقرر کر رکھا ہے۔ آپ پانچ ہزار روپے ادا کریں اور اپنی بیگم کو لیکچرار بنوالیں، اس کے لئے پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔

پیر نصیر سے میری یہ ملاقات کئی سالوں کے وقفے سے ہوئی تھی اور اسے دیکھ کر مجھے بہت ہی خوشی ہوئی تھی، لیکن اُس کی باتیں سُن کر اور اُس کے طرزِ زندگی سے آگاہ ہو کر مَیں سخت پریشان اور افسردہ ہوا۔ آہ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے۔ ایک دینی گھرانے کا فرد، ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی اور اس کا ضمیر اس قدر مسخ ہو جائے کہ وہ نیکی بدی اور حلال حرام کا امتیاز کھو دے۔ وہ اپنی شخصیت کا کتنا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جو لوگ اس پر اعتماد کرتے ہیں، اُن سے جھوٹ بھی بولتا اور انہیں فریب بھی دیتا ہے۔ مجھے خطرہ تھا کہ یہ بدنصیب آدمی کسی سخت مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا کہ اللہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بدعنوانی کرنے والوں کو لمبی ڈھیل نہیں دیتا۔

پھر ایک روز مَیں نے نہایت ہی دردناک لرزا دینے والی خبر سنی۔ پیر نصیر نے خودکشی کر لی ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو جلا لیا ہے۔ مجھے اس خبر پر زیادہ حیرت نہیں ہوئی لیکن بے پناہ کرب، بے پناہ افسوس ہوا اور مَیں ایک روز تعزیت کے لئے اُس کے والد کے پاس چلا گیا۔ بوڑھا باپ حُزن والم کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔ مَیں نے فاتحہ پڑھی، اس کی دلجوئی کی لیکن تفصیل سے بات نہ ہو سکی۔ باپ کی زبان صدمے اور ندامت سے گویا گنگ ہو گئی تھی۔ وہاں سے اُٹھ کر مَیں اُس کے پھوپھا کے ہاں چلا گیا کہ اُن کا گھر بھی قریب ہی تھا۔

تب نصیر کی پھوپھی نے رو رو کر سارے حادثے کی تفصیل سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ نصیر کی بیوی اُس کے لیے عذاب بن گئی تھی۔ وہ امیر والدین کی بیٹی تھی۔ ایم اے تھی، جبکہ نصیر نے محض بی

اے تک تعلیم حاصل کی ہوئی تھی۔ تعلیم اور معیشت کے اس تفاوت نے اس کی بیوی کو غرور میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ جھگڑالو قسم کی بداخلاق عورت تھی۔ اصرار کرتی کہ مَیں نے اعلیٰ تعلیم اس لئے حاصل نہیں کہ سارا دن باورچی خانے میں قید رہوں۔ مَیں لازماً کالج لیکچرار بنوں گی اور اس گاؤں نما قصبے میں زندگی نہیں گزاروں گی۔

بالآخر پیر نصیر نے بھاری رقم خرچ کی اور اسے لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار بنوا دیا اور رہائش بھی وہیں منتقل کر لی، لیکن بیوی کی بدمزاجی میں کمی ہونے کی بجائے مزید اضافہ ہو گیا۔ بات بات پر جھگڑا، بات بات پر فساد، اُن دنوں نصیر نے سمن آباد سے ملحق ایک آبادی رسول پارک میں رہائش اختیار کی ہوئی تھی۔

نصیر کی پھوپھی محترمہ نے بتایا کہ دونوں میاں بیوی میں تعلقات کی خرابی آخری انتہا تک جا پہنچی، لیکن نصیر علیحدگی یا طلاق کی جرأت اس لئے نہ کرتا تھا کہ وہ ایک بچی کا باپ بن چکا تھا۔ دوسرے مہر کی رقم بہت بھاری لکھی گئی تھی، جسے ادا کرنے کی اُس میں استطاعت نہ تھی۔ چنانچہ وہ انتہائی جبر کے تحت اپنی بیوی سے نباہ کر رہا تھا، لیکن دراصل اس کی زندگی کسی عذاب سے کم نہ تھی۔ ہر وقت کی دانتا کِل کِل، ہر وقت کا کرب، چنانچہ آخر کار اُس نے بہت ہی خوفناک، بھیانک فیصلہ کر لیا۔ ایک روز جب کہ چھٹی کا دن تھا، اُس کی بیوی گھر پر تھی، باہمی جھگڑا اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ نصیر نے اعلان کر دیا کہ مَیں اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، آج مَیں اس عذاب سے نجات حاصل کر لوں گا اور اپنے آپ کو جلا لوں گا۔ یہ کہہ کر اس نے سکوٹر کی ٹینکی سے پٹرول ایک بوتل میں نکال لیا اور بیوی کو کہنے لگا کہ ''دیکھو یہ مَیں نے پٹرول کی بوتل ہاتھ میں پکڑ لی ہے۔ مَیں اسے اپنے کپڑوں پر انڈیلنے لگا ہوں، بتاؤ تم اپنے روّیے کو تبدیل کرو گی یا نہیں؟''

بیوی نے ترت جواب دیا۔ ''میرا روّیہ بالکل درست ہے، مَیں اسے ہرگز نہیں بدل سکتی۔ جلتے ہو تو جل مرو۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔''

اب نصیر نے پٹرول اپنے سر پر اور کپڑوں پر انڈیل لیا، ماچس ہاتھ میں پکڑ لی اور پھر کہا

''دیکھو یہ مَیں نے پٹرول اپنے آپ پر ڈال لیا ہے، ماچس میرے ہاتھ میں ہے، کیا تم اپنے آپ کو بدلنے پر آمادہ ہو یا نہیں؟ سنگدل بیوی نے نہایت بے نیازی سے جواب دیا ''مَیں کہتی ہوں تم بے شک جل مرو، مجھے کوئی پروا نہیں، لیکن مَیں تمہاری دھونس میں نہیں آؤں گی۔'' اور اس کے ساتھ ہی نصیر نے ماچس کی تیلی ڈبیا سے نکالی، اسے ایک کنارے پر رگڑا، شعلہ بھڑکا اور اس کا سارا جسم الاؤ بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی دلدوز چیخوں سے سارا محلّہ گونج اٹھا۔ آس پڑوس کے کچھ لوگ جمع ہوئے، لیکن آگ کسی کے قابو میں نہیں رہی تھی۔ اس نے انتقامی طور پر بیوی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے بھی سارے کپڑے اَور سر کے بال جل گئے، لیکن وہ اپنی سنگدلی اور بداخلاقی کی سزا بھگتنے کے لیے زندہ رہ گئی، جبکہ نصیر کا سارا جسم بہت بُری طرح جل گیا، وہ تین دن تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہا اور سسک سسک کر دم توڑ گیا۔

نصیر کی پھوپھی یہ دردناک واقعہ سنا رہی تھیں اور مَیں غم و اندوہ اور خوف کی ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ غیر معمولی نوعیت کا ایک دردناک حادثہ تھا۔ ایک جوان مرگ تھی جس پر جس قدر بھی دکھ کا اظہار کیا جاتا، کم ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اُس پر کوئی ظلم ہوا۔ ظلم کی روش تو خود اس نے اختیار کی تھی جس میں جھوٹ، فریب، عیاری اور حرام خوری کا عمل دخل نمایاں تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے، ایک بظاہر دینی گھرانے سے وابستہ ہوتے ہوئے اُس نے ضمیر کی آواز کو بُری طرح دبائے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیوی کی صورت میں پہلے اس پر ایک بداخلاق اور بے رحم عورت کو مسلط کیا گیا جس سے اُس کا ذہنی سکون غارت ہو کر رہ گیا اور جب اُس نے اپنے خانگی حالات سے بھی کوئی عبرت حاصل نہ کی تو دنیا ہی میں اسے آگ کے حوالے کر دیا گیا۔ دیکھئے اللہ کی کتاب اس حوالے سے کیا کہہ رہی ہے۔

ترجمہ: ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔'' (سورۂ یونس آیت 44)

(۸)

چودھری محمد شفیع باجوہ پولیس میں تھانیدار تھے۔ اُن کے والد کی صرف دو ایکڑ زمین تھی، لیکن ریٹائرمنٹ تک چودھری صاحب نے اس میں ساٹھ ایکڑ کا اضافہ کر دیا۔

چودھری صاحب کے دو بیٹے تھے۔ مختار باجوہ میرا اسکول فیلو تھا۔ مجھ سے ایک سال آگے تھا۔ بہت خوبصورت اَور لائق لڑکا تھا۔ وہ ایف ایس سی کے بعد نیوی میں افسر ہو گیا تھا لیکن عین عنفوانِ شباب میں یہ جوانِ رعنا باپ کی آنکھوں کے سامنے وفات پا گیا......اور اس صدمے سے چودھری شفیع کو چہرے کا فالج ہو گیا۔ وہ کم از کم دس سال تک اس تکلیف میں مبتلا رہے اَور منہ چھپا کر زندگی گزارنے پر مجبور رہے۔

چودھری صاحب کا دوسرا بیٹا فراز باجوہ تھا۔ یہ وکیل تھا۔ اسے بھی چہرے کا لقوہ ہو گیا۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر خطرناک بیماریوں نے بھی سارے گھرانے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہو گا، مگر اس سلسلے میں کوئی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

(۹)

لاہور کے ایک بڑے تعلیمی ادارے میں تنتیس چونتیس سال کی ایک خاتون ٹیچر نے اپنے ایک رفیق کار کو بتایا: میرے ابو سیشن جج تھے۔ اُنہوں نے بہت دولت بنائی اَور ماڈل ٹاؤن لاہور میں اپنا مکان تعمیر کرلیا، مگر اس میں منتقل ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ میرے بڑے بھائی کا السر پھٹ گیا اَور وہ والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر آخرت کو سدھار گیا اَور اس کے ڈیڑھ دو سال کے اندر اندر والد بھی ہارٹ اٹیک سے وفات پاگئے۔

ہم دو بھائی اَور دو بہنیں تھیں۔ بڑی بہن کی شادی ہوئی، مگر اُس کا اپنے خاوند کے ساتھ نباہ نہ ہوا اَور اُس نے خلع لے لیا۔ والدہ کو اس حادثے کا اس قدر شدید صدمہ ہوا کہ وہ بھی ایک دِن برین ہیمرج سے دم توڑ گئیں۔

مذکورہ ٹیچر نے بتایا:

اب گھر میں ہم دو بہنیں ہیں اَور ایک چھوٹا بھائی ہے۔ بڑی بہن کا مزاج شدید چڑچڑا ہو گیا ہے، وہ معمولی معمولی بات پر سخت غصے میں آجاتی ہے اور خواہ مخواہ اُلجھتی رہتی ہے، اسی لئے مَیں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہوں اَور دیر تک یونیورسٹی میں موجود رہتی ہوں۔ دیکھئے اس میں کہاں تک کامیاب ہوتی ہوں کہ یہ بہرحال مصنوعی سہارا ہے۔

کاش اس خاتون کا مرحوم سیشن جج باپ ناجائز دولت نہ بناتا اَور اس سے مکان کھڑا نہ کرتا کہ یہی دولت اَور یہی مکان سارے خاندان کے لیے عذاب بن گیا۔

(۱۰)

محمد بوٹا گجر جالندھر میں پیدا ہوا۔ وہ ہرگز لائق آدمی نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے میٹرک کر سکا، مگر ہجرت کر کے پاکستان آیا، تو اُسے پولیس میں اے ایس آئی بھرتی کر لیا گیا اُور اسے چند ہی سالوں میں گلبرگ لاہور میں ایک اہم تھانے کا انچارج بنا دیا گیا۔ یہاں اُس نے دھڑلے سے دولت بنائی، اُس نے بدقماش عورتوں کو کھلی چھٹی دے دی، جوأ خانوں کی، شراب فروشوں اُور منشیات فروشوں کی علانیہ سرپرستی کی اُور بدی اور بدکاری کے اِن سب اڈوں سے خوب خوب پیسہ اکٹھا کیا۔ چونکہ وہ اپنی ''کمائی'' میں سے افسرانِ بالا کو بھی معقول حصّہ فراہم کیا کرتا تھا، اس لئے وہ اپنے سارے منفی کردار کے باوجود ترقی کر کے ڈی ایس پی بن گیا اُور لاہور ہی میں تعینات رہا۔

مجھے اس شخص کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملیں۔ بس ایک واقفِ حال نے بتایا کہ 1980ء کے قریب اس نے اپنے بیٹے کی شادی بڑی ہی دھوم دھام سے کی تھی۔ مہمانوں کی تعداد تقریباً دو ہزار تھی جن میں خاصی بڑی تعداد جالندھر کے سکھوں کی تھی۔ شادی گلبرگ کے ایک بڑے ہوٹل کے وسیع لان میں ہوئی تھی۔ اُس میں پولیس بینڈ تو تھا ہی، مگر آرمی بینڈ کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ شان وشوکت اُور دھوم دھڑکے کا یہ تماشا رات دو بجے تک جاری رہا۔ تین بجے کھانا مِلا جو پی سی (یعنی پرل کانٹینٹل) کے معیار کا تھا۔ کھانوں کی بے شمار قسمیں تھیں اُور ہر کھانا کثرت سے تھا۔ مہمانوں نے خوب کھایا، ڈی ایس پی کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی اُور رات کے آخری حصے میں ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔

لیکن، یہ کیا...... شادی کے دوسرے ہی دن طلاق ہوگئی، لڑکی نے صاف کہہ دیا کہ مُجھے یہ لڑکا پسند نہیں، مَیں اس کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی اُور آج ہی اُور ابھی علیحدگی چاہتی ہوں، چنانچہ علیحدگی ہوگئی اُور بوٹے گجر کی حرام کی کمائی نے اس کی مصنوعی عزت اور غرور کا جنازہ نکال دیا۔

(۱۱)

کریم شیخ پنجاب گورنمنٹ میں بڑے افسر تھے۔ اہم عہدوں پر فائز رہے۔ بہاولپور میں تھے جب 1999ء میں ایک فضائی حادثے میں وفات پا گئے۔

راوی نے بتایا کہ موصوف لاہور میں وسیع جائیداد کے مالک تھے۔ علامہ اقبال ٹاؤن میں اُن کے دو مکان تھے: ایک کنال میں اَور دس مرلے میں۔ دس مرلے والا مکان ڈبل سٹوری تھا۔ اس کے علاوہ جوہر ٹاؤن میں بھی اُن کے متعدد قیمتی پلاٹ تھے۔ مَیں بدگمانی نہیں کرتا کہ اُنہوں نے ایک سرکاری ملازم ہوتے ہوئے اس قدر جائیداد کیسے بنالی، لیکن اُن کے بچوں اَور گھریلو حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُن کے معاملات خدا سے اور خلقِ خدا سے درست نہ تھے۔

موصوف کے چار بیٹے اَور دو بیٹیاں تھیں۔ ایک بیٹا مکمل پاگل تھا، دوسرا چالیس فیصد تک ابنارمل تھا۔ تیسرا کانوں سے بہرا تھا اَور چوتھا جو نارمل تھا وہ بھی کانوں کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ کریم شیخ بہت باہمت اور صابر آدمی تھے، پاگل بیٹے کا پیشاب پاخانہ خود ہی صاف کیا کرتے کہ وہ مزاج کا بہت سرکش تھا اَور کسی ملازم کے قابو میں آتا ہی نہیں تھا۔

(۱۴)

گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ میں شاہد بھٹی نامی ریاضی کے ایک لیکچرار تھے۔ خوبصورت، دلکش شخصیت کے مالک تھے اور جب پتہ چلا کہ موصوف اپنے مضمون میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں تو مَیں اُن کی قابلیت سے بہت مرعوب ہوا۔ اب مَیں اُن کا احترام بھی کرنے لگا، لیکن یہ جان کر بہت تشویش ہوئی اور حیرت بھی کہ بھٹی صاحب کئی خطرناک امراض میں مبتلا ہیں: انہیں شوگر ہے، بلڈ پریشر ہے اور معدے کے بھی کئی مسائل ہیں حالانکہ اُن کی عمر اُس وقت چالیس سال سے بھی کم تھی۔ اور وہ دبلے پتلے، دھان پان آدمی تھے۔

کئی سال کے بعد پتہ چلا کہ شاہد بھٹی صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ Evaluation کے لیے ہندوستان بھی گیا تھا۔ وہاں انکشاف ہوا کہ ہو بہو اسی عنوان پر وہاں کا ایک ہندو پروفیسر پی ایچ ڈی کر چکا ہے اور اس کا مقالہ شائع بھی ہو چکا ہے اور بھٹی صاحب نے تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ اُسی کو نقل کر لیا تھا۔ چنانچہ ہندوستانی حکومت نے باقاعدہ تحریری صورت میں حکومتِ پاکستان سے اس کی شکایت کی اور یہ مقالہ مسترد کر دیا گیا۔

تب ساری بات سمجھ میں آ گئی۔ اللہ نے اس شخص کی چوری اور بددیانتی کی اُسے یہ سزا دی کہ کم عمری میں خطرناک بیماریوں میں مبتلا کر دیا اور بدنامی اور رسوائی کی وافر مقدار بھی اس کے حصے میں آ گئی۔

اِسے کہتے ہیں کوئلوں کی دلالی میں منہ کالا۔

(۱۴)

ملک شمیم کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ وہ میرے کلاس فیلو ملک فرقان کے والد تھے۔ وجیہہ و شکیل، گورے چٹے، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، خوش اخلاق، خوش گفتار۔ مگر دیانت، اصول یا ضابطہ نام کی کوئی چیز اُن کی زندگی میں نہیں تھی۔ قیامِ پاکستان کے وقت انہوں نے اپنے قصبے میں ہندوؤں کا سامان خوب لوٹا اور اپنا گھر بھر لیا۔

شاید اسی مال حرام کا یہ وبال پڑا کہ وہ بدکاری کے راستے پر گامزن ہو گئے اور پھر اتنے جری ہوئے کہ مذکر مونث کی اُن کے نزدیک کوئی تمیز نہ رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اللہ کی شدید ترین پکڑ میں آ گئے، 1963ء میں اُن کی بیگم فوت ہو گئیں اور وہ تقریباً چالیس سال کی عمر ہی میں رنڈوے ہو گئے۔

شمیم صاحب کے تین بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ فرقان سب سے بڑا تھا، اُس سے چھوٹا برہان بہت نیک اور پارسا تھا اور تبلیغی جماعت سے وابستہ ہو گیا تھا اور شمیم صاحب اُسے ہمہ وقت سان پر چڑھائے رکھتے تھے۔ ''ہمارے خاندان میں آج تک کوئی مولوی نہیں بنا۔ تم نے اس کم عمری میں داڑھی رکھ کر مجھے میرے دوستوں کی نظروں میں ذلیل کر دیا ہے''۔ سب سے چھوٹا نعمان تھا۔ باپ کی طرح دراز قد اور بہت خوبصورت۔ اِسے انٹرمیڈیٹ کے بعد فوج میں کمیشن مل گیا تھا اور وہ لیفٹیننٹ بن گیا تھا۔

مگر اولاد کے حوالے سے شمیم صاحب اپنے اعمال ہی کی طرح بہت بدنصیب ثابت ہوئے اور اُن کا لائق فائق لفٹین بیٹا نعمان ٹرین کی لپیٹ میں آ کر جاں بحق ہو گیا۔ بعض لوگ کہتے ہیں اس نے خود ٹرین کے آگے چھلانگ لگا دی تھی۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ برہان بھی عین بھرپور جوانی میں موت کی آغوش میں چلا گیا۔

اُسے ہیضہ ہوا اَور وہ جانبر نہ ہوسکا۔ فرقان نے پی آئی اے میں ملازمت کرلی تھی۔ بعد میں وہ کینیڈا چلا گیا تھا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا نسیم کی ایک ہی بیٹی تھی۔ اس کی انہوں نے اپنے رشتے داروں ہی میں شادی کی، اس کی ایک بچی ہوئی، لیکن ڈیڑھ دو سال کے بعد ہی اُسے طلاق ہوگئی وہ اپنے باپ کے گھر میں آ گئی۔ شمیم صاحب اُدھیڑ عمر ہی میں متعدد امراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بے خوابی، بلڈ پریشر اَور معدے کی خرابی۔ جب یہاں کوئی علاج کارگر نہ ہوا، تو فرقان انہیں کینیڈا لے گیا اَور وہ وہیں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں فوت ہو گئے۔ اس طرح باپ کی بدعملی نے پورے گھرانے کو برباد کر کے رکھ دیا۔ کاش کوئی عبرت حاصل کرے۔

(۱۴)

بیگم کوٹ کے علاقے میں ایک ریٹائرڈ تھانیدار تھا۔ نام تو اُس کا کچھ اور تھا مگر سہولت کی خاطر آپ اُسے کامران کہہ سکتے ہیں۔ وہ سالہا سال تک اس علاقے میں تعینات رہا۔ رشوت وہ خوب لیتا اُور دھڑلے سے لیتا۔ اُسے یہ علاقہ اتنا پسند آیا کہ اُس نے یہیں شاندار مکان بنایا، کاروبار کی خاطر اینٹوں کا بھٹہ قائم کیا اُور ایک پلازہ بھی تعمیر کر ڈالا۔

کامران تھانیدار کے چار بیٹے اُور دو بیٹیاں تھیں، عجیب بات یہ ہے کہ اپنی بداعمالیوں کے باوجود اُس نے چاروں بیٹوں کو قرآنِ پاک حفظ کرایا، لیکن یوں لگتا ہے کہ اُس کے گھر اُور رزق میں مالِ حرام کی اس قدر بہتات تھی کہ حافظِ قرآن ہونے کے باوجود چاروں بیٹے اپنے بیٹے کی طرح خوفِ خدا سے، اخلاق، دیانت، امانت اُور رحم سے بالکل بیگانہ تھے اُور چاروں عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔

۱۔ بڑا بیٹا اپنے بہنوئی کو قتل کرنے گیا مگر اُس نے اپنے دفاع مین اس پر گولی چلادی اُور یہ موقع پر جاں بحق ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ۲۵ سال سے زاید نہ تھی۔

۲۔ دوسرا بیٹا لاہور جا رہا تھا جب راوی کے پل پر اس کی گاڑی میں آگ لگ گئی اُور وہ جل کر مر گیا۔

۳۔ تیسرا بیٹا وی سی آر اُور فلمیں کرائے پر دیا کرتا تھا۔ وہ شرقپور روڈ پر کسی جگہ وی سی آر دینے جا رہا تھا کہ بس سے ٹکرا کر ہلاک ہو گیا۔

۴۔ کامران تھانیدار کے چوتھے بیٹے نے ساری جائیداد اپنے نام لگوانے کے لیے سترہ رمضان کو اپنی دو بہنوں کو قتل کر دیا۔ چند ہی روز کے بعد اُس کے بہنوئیوں نے اُسے اُس وقت گولی ماردی جب وہ اپنے زیرِ تعمیر پلازہ کے سامنے کھڑا تھا۔ اس طرح

کامران تھانیدار کے چار بیٹے اَور دو بیٹیاں اس کی نظروں کے سامنے قتل ہو گئے اَور اللہ نے اُسے مالِ حرام جمع کرنے اَور اسے ہی ملجا و ماویٰ سمجھنے کی کڑی سزا دے دی۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اس قدر سفاک آدمی تھا کہ اس کے مظالم سے تنگ آ کر اُس کا سگا چھوٹا بھائی بیگم کوٹ سے ترکِ مکانی کر کے لاہور چلا گیا۔ اُس کی بیوی ۲۰۰۰ء میں اس وقت ہارٹ اٹیک سے مر گئی تھی جب اُس کے بیٹے کے ہاتھوں اس کی دو بیٹیاں قتل ہوئی تھیں۔

کامران تھانیدار نے ۲۰۰۲ء میں تقریباً اسی سال کی عمر میں ایک نوعمر لڑکی سے شادی کی اَور خدا نے اُسے اس حوالے سے زیادہ ذلیل کرنے کے لیے لمبی عمر عطا کی۔ وہ ۲۰۰۹ء میں ستاسی سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔

(۱۵)

اس سلسلے میں روزنامہ ''پاکستان'' لاہور کی یہ خبر (مورخہ ۲۰۰۰-۷-۱۱) بھی عبرت کی ایک خوفناک مثال ہے:

''ریٹائرڈ ڈی ایس پی مرزا عزّت بیگ گھر کے صحن میں قتل''

''مقتول کا اپنے بیٹے کے ساتھ جائیداد کا تنازع چل رہا تھا''

کرائم رپورٹر کے مطابق تھانہ مسلم ٹاؤن میں واقع ایس پی صدر آفس کے قریب نامعلوم افراد نے گھر کے اندر گھس کر ریٹائرڈ ڈی ایس پی کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ متعلقہ پولیس اطلاع کے باوجود ایک گھنٹہ تاخیر سے پہنچی...... بتایا جاتا ہے کہ ۶۰ سالہ ریٹائرڈ ڈی ایس پی مرزا عزت بیگ نے جو کاہنہ کا رہائشی تھا، اپنی ملازمت کے دوران میں نیو مُسلم ٹاؤن کے سی بلاک میں کوٹھی نمبر ۱۰۵ تعمیر کرائی تھی۔ لیکن مقتول کا اپنے اکلوتے بیٹے مرزا عظمت بیگ کے ساتھ جائیداد کا جھگڑا چل رہا تھا جس کی وجہ سے وہ ۱۰۵ سی کی رہائش ترک کر کے بیٹی کے ہاں مقیم تھے۔ لیکن کچھ ہی عرصہ پہلے ایک رشتہ دار نے باپ بیٹے کی صلح کرادی تھی اَور وہ واپس اپنے مکان میں آ گئے تھے۔ موصوف دو بیٹیوں اَور ایک بیٹے کے والد تھے۔ اُن کی اہلیہ چند سال پہلے وفات پا گئی تھی۔

پولیس کے مطابق جائیداد کے جھگڑے پر مقتول ڈی ایس پی کا اپنے ایک بھائی اَور دو بھتیجوں سے بھی مقدمہ بازی چل رہی تھی اس جھگڑے میں دو افراد قتل بھی ہو گئے تھے اَور مقتول کُچھ عرصہ کے لئے جیل کی ہوا بھی کھا چکے تھے۔

یہ بات سمجھنے کے لئے کچھ زیادہ سوچ بچار کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس سارے المیے کا سبب مالِ حرام کی کارفرمائی تھی۔

(۱۶)

قدرت اللہ صاحب نے بتایا:

چودھری اکبر علی عرف پہلوان محکمہ انہار میں چیف انجینئر تھا۔ وہ تونسہ بیراج پر گیارہ ارب روپے کے پراجیکٹ کا نگران تھا۔ موصوف پرلے درجے کا مغرور اُور بداخلاق آدمی تھا۔ اپنے ماتحت افسروں کو اُور عام ملازمین کو بات بات پر ننگی گالیاں دیا کرتا اُور باقاعدہ غنڈہ گردی پر اُتر آتا تھا۔

وہ بڑا ہی بدعمل اُور رشوت خور بھی تھا۔

یہ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی بات ہے، وہ تونسہ بیراج میں اپنی کوٹھی کے لان میں ٹہل رہا تھا جب اُس کے کان پر ایک مچھر نے کاٹ لیا۔ حیرت انگیز طور پر یہ مچھر اس قدر زہریلا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو گئے، پورے جسم میں زہر پھیل گیا اُور وہ شدید قسم کی خارش میں مبتلا ہو گیا...... اُسے فوری طور پر کراچی کے آغا خاں ہسپتال منتقل کیا گیا، ہر طرح کا علاج ہوا، لیکن کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اُور وہ کراچی ہی میں فوت ہو گیا۔

وفات کے وقت اُس کی عمر ۵۵ سال تھی۔

باب: ۸

ان لوگوں نے اپنی بیویوں کو ناحق طلاق دی تھی

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے نزدیک حلال کاموں میں سب سے زیادہ مبغوض (یعنی قابلِ نفرت) کام طلاق ہے'' (ابوداؤد۔ مشکوٰۃ بابُ الطلاق) اس حوالے سے بہت سے واقعات میرے سامنے آئے تو اندازہ ہوا کہ واقعتاً طلاق کے عمل سے اللہ تعالیٰ کو شدید نفرت اَور بُغض ہے اَور جو لوگ بلاوجہ یہ حرکت کرتے ہیں یعنی بغیر کسی ٹھوس سبب کے محض کسی نفسانی غرض کے تحت اپنی بیویوں کو طلاق دیتے ہیں، وہ بعد میں بدترین حالات سے دوچار ہوتے ہیں، نئی بیویاں انہیں شدید ترین پریشانیوں میں مبتلا کرتی ہیں، وہ اولاد کے حوالے سے طرح طرح کے مسائل میں گھر جاتے ہیں اَور زندگی اُن کے لیے مصیبت اَور وبال بن کر رہ جاتی ہے۔ اس ضمن میں کم وبیش ایک درجن واقعات براہِ راست میرے مشاہدے اَور علم میں ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ دیکھیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی ایک ایک بات اَور ایک ایک وعید اپنے اندر کس قدر سائنسی حقیقت رکھتی ہے۔ (العیاذ باللہ تعالیٰ)

(میں نے سارے واقعات کے کرداروں کے نام تبدیل کر دیئے ہیں)

(۲)

ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب نے بتایا:-

میرے ایک کزن ہیں۔ وہ پانچ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ باپ فوت ہو چکے تھے۔ اُنہوں نے کمال ایثار سے کام لیا۔ خود تو میٹرک کر کے پرائمری اسکول میں ٹیچر ہو گئے، مگر باقی چاروں بھائیوں کو اعلیٰ ترین تعلیم دلائی۔ اسی لئے اُن کی شادی تاخیر سے ہوئی اور چھتیس سینتیس سال کی عمر میں وہ گھر بسا سکے۔ اُن کی بیوی لاہور کے ایک معزز تعلیم یافتہ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور یتیم تھی۔

شادی کے بعد اللہ نے انہیں ایک بیٹا عطا کر دیا، لیکن اُنہیں پتہ چلا کہ اُن کی بیوی ٹی بی کی مریضہ ہے، تو وہ بہت خوفزدہ اور بددل ہوئے۔ اصل میں حالات نے انہیں بہت کفایت شعار اور کنجوس بنا دیا تھا اور وہ پیسہ پیسہ بچانے کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے جب انہیں اندازہ ہوا کہ ٹی بی کے علاج پر انہیں بہت خرچ کرنا پڑے گا اور بڑی بھاگ دوڑ کرنی ہوگی، تو انہوں نے بیوی کو طلاق دے دی۔ حالانکہ اُس زمانے میں ٹی بی کا علاج سرکاری سطح پر مفت ہوتا تھا اور اس کا مریض شفایاب ہو جاتا تھا۔

بہر حال میرے کزن کی بیوی بے چاری دوبارہ اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی محتاج ہو گئی اور تھوڑی ہی مدت کے بعد فوت ہو گئی۔ اس کے جلد بعد اُس کا بچہ بھی وفات پا گیا۔

موصوف نے کچھ ہی عرصے کے بعد دوسری شادی کر لی، لیکن نئی بیوی نے ان کے گھر میں آتے ہی فساد برپا کر دیا۔ اُسے اعتراض تھا کہ یہ صاحب بہت کنجوس ہیں، تھڑدلے ہیں اور بخیل ہیں۔ چنانچہ روز لڑائی ہونے لگی اور بمشکل دو ماہ گزرے تھے کہ وہ محترمہ رسّی تڑا کر بھاگ گئی اور

اُس نے طلاق لے لی۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا:

اب میرا یہ کزن رنڈوا ہو گیا اَور دیر تک اِسے نئی شادی رچانے کی جرأت نہ ہوئی۔اس نے فرصت سے فائدہ اٹھایا منشی فاضل کیا، ایف اے کیا، بی اے کیا۔اور اس کی ترقی سولہویں گریڈ میں ہوگئی، لیکن تقرر کے معاملے میں محکمے کے اہلکاروں سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔اس کی ترقی منسوخ ہوگئی اَور گیارہویں گریڈ میں اس کی تنزّلی کر دی گئی۔اس نے احتجاج کے طور پر یہ تنزّلی قبول نہ کی، گھر بیٹھ گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ملازمت ختم کر دی گئی۔

اس دوران میں اس نے تیسری شادی کر لی تھی اَور اس سے ایک بیٹی بھی تھی۔

ملازمت سے برطرفی کے ساتھ نئی بدنصیبی یہ ہوئی کہ ایک حادثے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی اَور وہ کوئی ڈیڑھ سال تک زیرِ علاج رہا۔زخم بار بار خراب ہوتا رہا اَور بار بار اُسے پریشانیوں اَور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ موصوف کی عمر تقریباً پچھتر سال ہوگئی ہے۔ملازمت کی مدت تقریباً ۲۵ سال ہوگئی تھی اَور اُسے آسانی سے پنشن اور گریجوایٹی مل سکتی تھی، لیکن وہ ایک ٹانگ سے معذور ہے، لنگڑا کر چلتا ہے اَور بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا، اس لئے مشکل اور پیچیدہ دفتری جھمیلوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا اَور یہ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔

حالات نے اُسے کئی امراض میں مبتلا کر دیا ہے: وہ ہائی بلڈ پریشر کا مستقل مریض بن گیا ہے، اُس کی راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے اَور اکلوتی جوان بیٹی کا سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہوا جاتا ہے۔وہ اعتراف کرتا ہے کہ مشکلات اَور مصائب کا یہ سارا وبال اُس پر اس لیے پڑا کہ اس نے اپنی بے گناہ بیوی کو طلاق دی اَور اُس کے علاج پر خرچ کرنے میں کنجوسی کی۔یہ عبرت ناک بات ہے کہ بیوی کے علاج پر اُس زمانے میں محض ڈیڑھ دو ہزار روپے خرچ ہونے تھے، لیکن اس کے بدلے اُسے اپنی ٹانگ ٹوٹنے پر کم از کم ساٹھ ہزار روپے خرچ کرنے پڑے، تکلیف اَور پریشانی اس پر مستزاد تھی۔

(۳)

ہمارے گاؤں کے مہر شفیع کی شادی ہوئی تو اُسے بیوی بہت اچھی ملی۔ نیک، عبادت گزار اَور حلیم الطبع۔ بدقسمتی سے شفیع اَور اُس کا سارا خاندان جاہل اَور بے عمل تھا۔ ان لوگوں نے اُس لڑکی کی کوئی قدر نہ کی بلکہ مختلف حوالوں سے اُسے پریشان کرتے۔ ''یہ نمازیں ہی پڑھتی رہتی ہے۔ اِسے قرآن پڑھنے کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ یہ گونگی ہے، بولتی نہیں'' اَور آخرکار اُسے ایک ہی سال کے بعد طلاق دے دی۔

مہر شفیع نے دوسری شادی کی تو وہ لڑکی پہلی بیوی کے بالکل برعکس تھی۔ زبان دراز، جھگڑالو، بےعقل اور بے عمل۔ تنگ آ کر اُسے انہوں نے الگ مکان میں منتقل کر دیا۔ اس بیوی سے شفیع کی چھ بیٹیاں پیدا ہوئیں اَور صرف ایک بیٹا۔ اُس کا گھر عموماً جنگ و جدل کا میدان بنا رہتا ہے۔ پہلی مطلقہ بیوی کی جلد ہی شادی ہوگئی، اُسے بہت اچھا خاوند مل گیا۔ سسرال والے اُس کی بہت قدر کرتے ہیں۔

(۴)

پروفیسر عرفان ذکی کا تعلق ایک مذہبی، تعلیم یافتہ اور زمیندار گھرانے سے تھا۔ وہ ایم اے عربی بھی تھے اور ایم اے اسلامیات بھی، لیکن اُن کا مزاج بہت عجیب وغریب تھا۔ نوجوانی میں اُن کی شادی اپنی چچا زاد سے ہوئی۔ اُن کے چچا اُن کے گاؤں میں بلکہ پڑوس ہی میں رہتے تھے، لیکن حیرت انگیز طور پر پروفیسر عرفان نے شادی کے دوسرے ہی روز اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ یہ کہہ کر کہ یہ لڑکی مجھے پسند نہیں ہے۔ حالانکہ یہ لڑکی ان کے لیے ہرگز اجنبی نہیں تھی اَور دیکھی بھالی تھی۔ دونوں گھرانے، باپ اور چچا، خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے، مگر کیا کر سکتے تھے۔ خاموش ہو کر بیٹھ رہے۔

تھوڑے ہی عرصے کے بعد پروفیسر عرفان نے بڑا ہی عجیب مطالبہ کر دیا کہ مَیں چھوٹے بھائی لقمان کی منگیتر سے شادی کروں گا۔ یہ لڑکی اپنے امیر والدین کی اکلوتی بیٹی تھی، وسیع جائیداد کی مالک تھی اَور خوبصورت تھی۔ قصہ کوتاہ یہ کہ والدین اَور سارے خاندان کو اِن کے مطالبے کے سامنے جھکنا پڑا اَور عرفان صاحب کی شادی اپنے چھوٹے بھائی کی منگیتر سے ہوگئی۔

فرحت شادی سے پہلے مکمل تندرست اَور صحت مند تھی۔ اُسے کوئی معمولی سا بھی روگ نہ تھا، مگر عرفان صاحب کے گھر میں آتے ہی پُراسرار طور پر اُسے کئی بیماریوں نے آلیا۔ اُس کے ہاتھوں اَور پاؤں پر کئی جلدی تکلیفیں نمودار ہوگئیں کہ نہ وہ باورچی خانے میں کام کرنے کے قابل رہی اَور نہ لانڈری میں کوئی خدمت انجام دے سکتی۔ چولہے کے قریب جاتی تو ہاتھوں پر چھالے بن جاتے اَور کپڑے دھونے لگتی تو صابن والے پانی سے اُس کے پاؤں پر سوجن ہو جاتی۔ اس کے علاوہ بھی متعدد عجیب وغریب بیماریوں نے اُسے گھیر لیا۔ دوسرے چوتھے روز وہ بیٹھی بیٹھی بے

ہوش ہو جاتی اور اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگتا۔ اس پر خاموشی کے دورے پڑتے اور کئی کئی دن تک گم سُم رہتی۔ بڑی بوڑھیوں نے عرفان صاحب کو بتایا کہ فرحت پر جنّات کا سایہ ہے۔ چنانچہ موصوف حالانکہ صحیح العقیدہ مسلمان تھے، پھر بھی روایتی پیروں کے گھروں کے چکر لگانے لگے اور ہفتے عشرے کے بعد وہ فرحت کی قمیض یا بنیان اُٹھا کر کسی عامل کے ہاں حاضری دینے کے لیے چل پڑتے۔ اور یہ سلسلہ بغیر کسی تعطّل کے لمبے عرصے تک چلتا ہی رہا۔

اللہ نے عرفان صاحب کو دو بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کیا۔ بیٹا سب سے چھوٹا تھا لیکن ذرا بھی ذہین نہ تھا۔ اُس کا پڑھائی میں اور اسکول میں دل ہی نہ لگا۔ بہت مشکلوں سے، گھسٹ گھسٹ کر اُس نے میٹرک کیا اور پھر اُنہوں نے اُسے ایک کاروبار میں لگا دیا، مگر وہ چنداں کامیاب نہ ہوا۔ جوان ہونے پر اُس کی شادی کی، مگر کئی سالوں کے انتظار کے بعد بھی وہ اولاد سے محروم ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ فرحت کی بیماریوں میں شدت آتی چلی گئی، حتیٰ کہ یہ خبر پروفیسر عرفان اور اُن کے کنبے پر بم بن کر گری کہ وہ کینسر میں مبتلا ہے اور یہ خاصا پھیل چکا ہے۔ حیرت انگیز طور پر عرفان صاحب اس انکشاف کے بعد علاج کی طرف سے لاتعلق سے ہو گئے اور فرحت عرفان صاحب کے ایک دوست کے گھر میں آ گئی اور وہاں ڈیڑھ دو ماہ تک بے یار و مددگار پڑی رہی۔ عرفان صاحب روزانہ شام کو آتے، رسمی مزاج پرسی کرتے اور چلے جاتے حتیٰ کہ اسی کیفیت میں وہ ایک روز دم توڑ گئی۔ وفات کے وقت فرحت کی عمر چالیس سال سے کچھ ہی زیادہ تھی اور چونکہ اُس وقت تک اُس کے والدین زندہ تھے، اس لئے عرفان صاحب کو اُس کی جائیداد میں سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

(۵)

ڈاکٹر افتخار نے لو میرج کی تھی۔ اُس کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی۔ اللہ نے انہیں دو بیٹے عطا کئے لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ ڈاکٹر افتخار کے چھوٹے بھائی نے اُن کی سالی سے شادی کی خواہش ظاہر کی جسے ڈاکٹر کی ساس نے قبول نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر نے غصے میں آ کر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔

بیوی نے تو طلاق کے جلد بعد دوسری شادی کر لی، مگر ڈاکٹر افتخار تقریباً دس سال سے ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ اس کی عمر پچاس سے تجاوز کر گئی ہے، مگر اُس کی شادی نہیں ہوئی اس کا بھائی بھی کنوارا بیٹھا ہے۔ طلاق کے وبال نے سارے خاندان کو متاثر کیا ہے۔

(۶)

ڈاکٹر خالد کا بھائی عامر سات آٹھ سال سے بیرونِ ملک تھا۔ واپس آیا تو بیوی کو طلاق دے دی اُور دوسری شادی رچالی۔ اُس کے بچے سیانے تھے، اُنہوں نے سوتیلی ماں کو قبول نہ کیا، نتیجہ یہ کہ گھر میں لڑائی فساد روز کا معمول بن گیا۔ عامر کی سابق بیوی سادہ مزاج اور فرمانبردار تھی۔ اب اُسے وہ یاد آتی، ایک روز وہ شدید صدمے کی حالت میں اُس کے والدین کے گھر چلا گیا اُور مطلقہ بیوی سے بات کرنا چاہی، مگر اُس کے سالوں نے اُور دوسرے رشتے داروں نے اُسے پکڑ لیا اُور خوب پٹائی کی۔ اب عامر کی زندگی عجیب عذاب میں ہے۔ دوسری بیوی کی وجہ سے گھر جہنم بن گیا ہے، مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے۔

(۷)

طاہر شاہ کی شادی قریبی رشتہ داروں میں ہوئی تھی یعنی سگی پھوپھی کے ہاں۔ خدا نے اُسے دو بیٹیاں اَور ایک بیٹا عطا کیا، لیکن اُسے بیوی سے شکایت تھی کہ ایک تو اُس کے والدین امیر نہیں اَور اُنہوں نے جہیز بس واجبی سا دیا ہے، دوسرے وہ بڑبڑاتا رہتا کہ اُس کی بیوی تیز طرّار اَور چنچل نہیں، اس لئے طاہر نے شادی کے پانچویں برس یعنی جب اُس کی دوسری بیٹی پیدا ہوئی، بیوی کو طلاق دے دی اَور ایک ماڈرن، امیر گھرانے میں شادی کر لی۔

طاہر شاہ کی دوسری بیوی اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوبصورت اَور آزادی پسند تھی اَور اس پر وہ بہت خوش اَور مطمئن تھا۔ لیکن سسرال سے جس قدر دولت ملنے کی اُسے توقع تھی، وہ پوری نہ ہوئی۔ دوسرے جس بات سے وہ بہت ہراساں ہُوا، وہ جڑواں بچوں کی پیدائش تھی۔ ایک بیٹا، ایک بیٹی اور دونوں پولیو میں مبتلا تھے۔ دونوں کے پاؤں ٹیڑھے تھے اَور جب دونوں نے ہوش سنبھالا، تو گویائی کی صلاحیت سے بھی محروم تھے۔ اس بیوی سے طاہر شاہ کی دو بیٹیاں مزید پیدا ہوئیں۔

طاہر شاہ معذور بچوں کے علاج کے سلسلے میں ہلکان ہوگیا۔ وہ محنتی آدمی تھا، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا، اُسے ایک بین الاقوامی فرم میں بہت اچھی ملازمت مل گئی، اس لئے اُس نے ملک کے بہترین ڈاکٹروں سے بچوں کا علاج کرایا، حتیٰ کہ اس مقصد کی خاطر ہندوستان بھی گیا اَور کئی بار گیا، مگر اُس کے بچے شفایاب نہ ہوئے۔

طاہر شاہ کا پہلا بیٹا اَور بیٹیاں اپنی ماں کے پاس ہیں، یہ سب جوان ہیں، لیکن باپ کی شکل بھی دیکھنے کے روادار نہیں۔ وہ ملازمت کے جھمیلوں سے فارغ ہوکر رات کو گھر آتا ہے، تو دو معذور بچے اَور دو جوان ہوتی ہوئی بیٹیاں اُسے شدید پریشان رکھتی ہیں اَور اُس کا سکون غارت ہوا رہتا ہے۔

(۸)

پبلک سروس کمیشن کی طرف سے لیکچرار منتخب ہونے کے بعد میری تقرری گورنمنٹ کالج شکرگڑھ (ضلع سیالکوٹ) میں ہوئی جہاں مَیں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء یعنی چار سال تک تدریسی فرائض انجام دیتا رہا۔ اس دوران میں وہاں میرا ایک شاگرد قمر علی خاں بھی تھا۔ جو دو سال میری کلاس میں پڑھتا رہا اَور مَیں اُس کی ذہانت اَور دینی ذہن کی وجہ سے اُس سے بہت متاثر تھا۔ اُس کے والد بھی دینی مزاج کے تھے اَور دکاندار تھے۔

تازہ ترین معلومات کے مطابق قمر علی خان بی اے کرنے کے بعد جب عملی زندگی میں آیا، تو اُس نے بھی والد کی طرح تجارت ہی کو روزگار کا ذریعہ بنایا اَور ساتھ ہی ایک دینی جماعت کا رکن بن گیا۔ شاید قحط الرجال کی وجہ سے اُسے اتنی اہمیت دی گئی کہ ضلعی سطح پر وہ اس جماعت کا سیکرٹری بنالیا گیا۔

قمر علی خاں ذہین تو تھا، مگر برخود غلط تھا اَور اپنے بارے میں ہمیشہ ہی سے خوش فہمی میں مبتلا تھا۔ ایک بااثر دینی جماعت میں ضلعی سطح پر اُسے اہمیت ملی، تو اس کا دماغ خراب ہوگیا۔ شکرگڑھ میں اسی جماعت نے ایک گرلز اسکول بنایا ہوا تھا، قمر علی خاں اُس کا سرپرست اَور نگران بھی تھا اَور اس کا اس حوالے سے اسکول میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔

موصوف کی بدنصیبی کہ اُس نے پردے کے تقاضوں کو نظر انداز کیا، وہ فتنے میں مبتلا ہوگیا اَور اُس نے اسکول کی ایک نوجوان اُستانی سے تعلقات اُستوار کرلیے۔ وہ شادی شدہ تھا، اُس کی دو نوعمر بیٹیاں اَور ایک بیٹا تھا، مگر عشق کا بھوت اُس پر بُری طرح سوار ہوگیا۔ اُس نے متعلقہ اُستانی سے شادی کے عہد و پیمان کیے اَور بیوی کو طلاق کی دھمکیاں دینی شروع کردیں۔ نتیجہ یہ

ہوا کہ گھر کا ماحول آخری حد تک بگڑ گیا، لڑائی مار کٹائی روز کا معمول بن گیا اور قمر علی نے بالآخر بیوی کو طلاق دے دی۔

''مکافاتِ عمل'' کا کھیل دیکھیے کہ اپنی بیوی کو فارغ کر کے جب قمر علی خاں نے اپنی دوست اُستانی کے والدین سے شادی کی بات کی تو اُنہوں نے صاف انکار کر دیا اور بیٹی کی شادی عجلت سے کسی دوسری جگہ کر دی۔

یہاں سے مایوس ہو کر قمر علی نے ایک دوسری خاتون سے شادی رچالی، مگر اس بیوی سے اُس کا ذرا بھی نباہ نہ ہُوا اور ہفتہ دس دن ہی گزرے تھے کہ بیوی کے پیہم مطالبے سے خوفزدہ ہو کر اُس نے اُسے طلاق دے دی۔

کچھ عرصے کے بعد قمر علی کو تیسرا نکاح کرنا پڑا۔ مگر شومیِ قسمت کہ یہ بیوی بے چاری سدا کی روگن ہے۔ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہے اور قمر علی کے لیے مستقل اذیت اور ناگوار بوجھ بن گئی ہے اور کوئی دن نہیں جاتا کہ وہ کسی نہ کسی ہسپتال یا ڈاکٹر کے ہاں چکر نہ لگاتا ہو۔

قمر علی خاں نے دینی معلومات رکھتے ہوئے اور ایک دینی جماعت سے وابستہ ہونے کے باوجود ایک نامحرم عورت سے جو دوستی اُستوار کی تھی اور اپنی بیوی کو ناحق طلاق دی تھی، اُس کا وبال درازتر ہوتا چلا گیا۔ اُس کی بڑی بہن کا خاوند سعودی عرب میں ملازم تھا، وہ عین جوانی میں فوت ہو گیا، تو بہن بے سہارا ہو کر قمر علی کے گھر میں آ گئی۔ اس کی جوان بیٹی نے ماموں کے کردار کی تقلید کی اور ایک شخص کے ساتھ فرار ہو گئی۔ قمر علی کا اپنا بیٹا ایل ایل بی میں پڑھتا تھا اُس نے اپنے ایک دوست کی بہن سے شادی کرنا چاہی، مگر قمر علی خاں کی غیرت بیدار ہو گئی۔ اُس نے ایک غیر برادری میں بیٹے کو شادی کرنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹا اپنی ماں کے پاس چلا گیا اور ماں نے اُس کی خواہش کے مطابق اُس کی شادی کر دی۔ اس طرح جوان بیٹا بھی اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ قمر علی خاں اب یک وتنہا، بے یار و مددگار بڑی کسمپرسی میں زندگی گزار رہا ہے۔ اُس کی بینائی چون، پچپن سال ہی کی عمر میں تشویش ناک حد

تک کم ہوگئی ہے اور بیمار بیوی کے علاج معالجے سے جو وقت بچتا ہے وہ ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے گزار دیتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک حادثے میں اس کی ٹانگ بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اب وہ بیساکھیوں کے سہارے جی رہا ہے اور دو غیر شادی شدہ جوان بیٹیوں اور بیمار بیوی کے مسائل اُسے ہلکان کئے رکھتے ہیں۔

(۹)

ڈاکٹر اکرام الحق لاہور کے ایک بڑے کالج میں اُردو ادبیات کے پروفیسر تھے۔ راست فکر، خوش اخلاق اَور دیانت دار۔ علمی و تحقیقی صلاحیتوں سے تو اُنہوں نے کوئی کام نہ لیا، لیکن اُنہوں نے ہومیو پیتھی کا کورس کرلیا اَور ایک معروف بستی میں کلینک بنالیا جو بڑی کامیابی سے چلنے لگا۔

ڈاکٹر اکرام الحق سے ایک فاش غلطی یہ ہوئی کہ اُنہوں نے شادی کی اَور پھر چند ماہ بعد ہی بیوی کو طلاق دے دی۔ پھر دوسری شادی کی اَور اُس سے بھی جلد فراغت حاصل کرلی پھر تیسری کی اَور اُس سے بھی اُن کا نباہ نہ ہوا۔ یوں لگتا ہے کہ وہ آئیڈیل کی تلاش میں تھے اَور آئیڈیل انہیں ملتا نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہوگئے اَور انہوں نے بے تحاشا سگریٹ نوشی شروع کردی۔ آخر کار وہ حالات سے اتنے بددل ہوئے کہ اُنہوں نے لاہور سے نقلِ مکانی کا فیصلہ کرلیا۔ ذاتی مکان اَور کلینک فروخت کردیا۔ ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اَور سب کچھ سمیٹ کر وہ صوبہ سرحد کے پہاڑی علاقے مانسہرہ چلے گئے۔ وہاں اُنہوں نے ایک مکان خریدا، ایک بڑا پلاٹ ایک تعلیمی ادارے کے لیے حاصل کیا اَور ایک خاتون سے شادی کرکے تعلیمی ادارے کی تعمیر شروع کردی۔ حیاتِ نو کا یہ پروگرام اُنہوں نے پچاس سال کی عمر کے بعد شروع کیا۔

اس وقت جبکہ ڈاکٹر صاحب کی عمر تریسٹھ چونسٹھ سال سے تجاوز کررہی ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ موصوف کے چار ننھے ننھے بچے ہیں۔ دو بیٹیاں ہیں دو بیٹے ہیں۔ تعلیمی ادارہ چلانے کا منصوبہ مکمل ناکام ہوچکا ہے۔ حالانکہ اُس پر ان کا سارا اثاثہ صرف ہوگیا تھا۔ تفکرات اَور مسلسل سگریٹ نوشی نے اُن کی صحت کو خاصا متاثر کیا ہے اَور وہ جگر کے مریض بن گئے ہیں۔ وہ پشاور کی ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اَور ساتویں روز ہی اپنے بال بچوں کے پاس مانسہرہ آتے ہیں۔ اس طرح گویا تین بیویوں کو یکے بعد دیگرے طلاق دینے کا خمیازہ وہ اس طرح بھگت رہے ہیں کہ نہ گھر کے رہے ہیں نہ گھاٹ کے۔

(۱۰)

مَیں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۹ء تک پانچ سال گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں فرائض انجام دیتا رہا۔ اُس دور میں وہاں احمد دین نامی انگریزی کے ایک پروفیسر تھے۔ عموماً سیاہ چشمہ لگائے رکھتے تھے۔ پروفیسر اقبال جاوید صاحب نے بتایا کہ اُن کا ایک بیٹا اَور ایک بیٹی تھی جب انہوں نے اپنی بیگم کو طلاق دے دی اَور ایک لیڈی لیکچرار سے شادی رچالی...... لیکن یہ شادی زیادہ دیر نہ چلی اَور دونوں کی علیحدگی ہوگئی۔

موصوف نے دوبارہ پہلی بیوی سے رابطہ کیا اَور اس سے پھر نکاح کر لیا، لیکن باہمی غلط فہمیاں اس قدر بڑھ چکی تھیں کہ نباہ نہ ہوا اَور پھر طلاق ہوگئی۔

اس حادثے کے بعد پروفیسر صاحب کا دماغی توازن برقرار نہ رہا، وہ نیم پاگل ہوگئے اَور کچھ عرصے کے بعد وفات پاگئے۔

(۱۱)

محترمہ عائشہ عثمان یونیورسٹی آف لاہور (رائے ونڈ روڈ) میں انگلش کی لیکچرار ہیں۔ اُنہوں نے بتایا (۰۹-۰۵-۰۳) کہ تقریباً پندرہ برس پہلے کی بات ہے کہ میرے ماموں فیصل ٹاؤن کے فلیٹوں میں رہائش پذیر تھے۔ اُن کے گھر کے سامنے گھسن نامی ایک افسر کا فلیٹ تھا۔ اُس کی بیوی گھریلو عورت تھی، سادہ مزاج تھی، اُن کی شادی کو پانچ برس کا عرصہ گزر گیا تھا، لیکن اُن کا کوئی بچہ نہیں ہوا تھا، اس وجہ سے بھی وہ خاتون افسردہ اَور پریشان رہتی تھی۔

ایک سال یہ خاتون اپنے والدین اَور بھائی کے ساتھ حج کرنے چلی گئی۔ اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے خاوند نے ایک شوخ وشنگ، آزاد خیال عورت سے تعلق اُستوار کر لیا، اُس سے شادی کا وعدہ کر لیا اَور جونہی اُس کی بیوی حج سے واپس آئی، اُس نے اُسی روز اُس کے ہاتھ میں طلاق نامہ تھما دیا اَور اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔ وہ بے چاری دروازے سے باہر گر کر بے ہوش ہوگئی، اُس کے والدین اَور بھائی کو خبر ہوئی تو وہ اُسے اٹھا کر لے گئے۔ اس حادثے کے ڈیڑھ ماہ بعد یہ خاتون صدمے سے انتقال کر گئی۔

گھسن نے پروگرام کے مطابق فوری طور پر نئی شادی کر لی۔ اب وہ بہت خوش تھا اَور اپنی آزاد خیال، بے پردہ، بیوی کے ساتھ خوب چہکتا ہوا نظر آتا تھا۔

نئی شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال گزر گیا، لیکن اس خاتون سے بھی اولاد کے کوئی آثار نہ تھے۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ گھر میں آگ لگ گئی، خاتون کے ریشمی کپڑے تھے، اُنہوں نے فوراً ہی آگ پکڑ لی اَور وہ بری طرح جل گئی۔ آگ بجھاتے ہوئے گھسن کے ہاتھ بھی جھلس گئے۔ جان بچانے کی خاطر خاتون گیٹ سے باہر بھاگی اور عین اس جگہ پر گر کر دم توڑ گئی جہاں گھسن کی پہلی بیوی طلاق ملنے کے بعد صدمے سے بے ہوش ہو کر گری تھی۔

(۱۲)

دنیاپور (ضلع لودھراں) کے اُستاد رب نواز صاحب نے اپنا ایک مشاہدہ بیان فرمایا۔
اُنہوں نے بتایا کہ احمد بشیر میرا دوست تھا۔ ویکسی نیٹر تھا۔ دنیاپور کے قریب ایک جاگیردار کا مینجر تھا جہاں مناسب تنخواہ کے ساتھ اُسے کئی طرح کی سہولتیں حاصل تھیں یعنی مکان، غلہ، سبزیاں وغیرہ۔ اُس نے شادی کے دو سال بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دی حالانکہ اس کی ایک بیٹی بھی تھی۔

دراصل احمد بشیر نے ایک مطلقہ عورت سے جو اسی جاگیر میں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ رہتی تھی، تعلق استوار کر لیا تھا۔ طلاق کے بعد وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، مگر اس خاتون کے رشتہ دار راضی نہ ہوئے پھر اس شخص نے ایک اور عورت سے شادی کی، مگر چار پانچ سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ پہلی بیوی اپنی بیٹی کو ساتھ لے گئی تھی۔

اب افتاد یہ پڑی کہ وہ جاگیردار مر گیا کہ جہاں احمد بشیر ملازم تھا۔ جاگیردار کے بیٹوں نے زمین فروخت کر دی اُور اسے ملازمت سے نکال دیا۔ اس کی تنخواہ اور دیگر فوایدسب ختم ہو گئے۔ اب وہ شدید ٹینشن اُور ڈیپریشن میں مبتلا رہتا ہے اُور تیزی سے بوڑھا ہوتا جا رہا ہے حالانکہ اس کی عمر ۴۵ سال سے زیادہ نہیں ہے۔

(۱۳)

میرے ایک عزیز دوست نے جو پندرہ سال تک کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں مقیم رہے ہیں، بتایا کہ وہاں ٹورانٹو یونیورسٹی ہی میں ایک پاکستانی پروفیسر تھا۔ آبائی طور پر ٹوبہ ٹیک سنگھ سے تعلق رکھتا تھا اَور لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کینیڈا منتقل ہوا تھا۔ اُس کی شادی اُس کے والدین نے اپنے ہی خاندان میں کی تھی اَور اُس کا ایک بیٹا بھی تھا، مگر پروفیسر موصوف نے ٹورانٹو میں ایک مقامی عورت سے تعلقات استوار کر لیے، اَور اپنی بیوی کو طلاق دے کر اُس سے شادی کر لی۔

مگر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ اس کی دوسری بیوی نے بے وفائی کا مظاہرہ کیا اَور اس کی موجودگی میں ایک دوسرے شخص سے تعلقات اُستوار کر کے خاوند کو چھوڑ کر چلی گئی۔

اس حادثے کا پروفیسر پر اس قدر شدید اثر ہوا کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا اَور اُس کے بھائیوں نے اُسے مینٹل ہسپتال میں داخل کرا دیا۔

میرے دوست نے بتایا کہ مَیں خود بھی ایک بار پاگل خانے جا کر پروفیسر مذکور سے ملا تھا۔ وہ ہائی سیکورٹی سیل میں جہاں بہت خطرناک قیدیوں کو پابند کیا جاتا ہے، مقیّد تھا۔ اُس کے ناخن اَور سر اَور چہرے کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اَور آنکھوں میں وہ وحشت تھی جو صرف درندوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

(۱۴)

وہ غیر معمولی رسوائی سے دوچار ہوا

تقریباً دس سال پہلے شیخ نور عالم سے تعارف کر کے بڑی خوشی ہوئی۔ سرو قد، خوبصورت بلکہ دلکش سراپا، عمر تقریباً چالیس سال تھی۔ متشرع داڑھی، مزاج میں انکسار کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا، بہت محبت اور تپاک سے ملے۔ زراعت میں ماسٹر ڈگری کے حامل تھے۔ عرصہ تک سعودی عرب میں مقیم رہے۔ اس کمائی سے میرے گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر ایک فراخ آبادی میں ڈیڑھ کنال کا پلاٹ خریدا۔ نیچے اسکول بنایا اور اوپر رہائش اختیار کر لی۔ جب بھی ملاقات ہوتی موصوف بہت ہی گرم جوشی سے ملتے، لیکن اس گرم جوشی میں تصنع کا عنصر چھلک چھلک پڑتا تھا جس پر مَیں حیران بھی ہوتا اور پریشان بھی۔

موصوف جس بستی میں رہتے تھے اس میں متوسط طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی اکثریت تھی۔ پتہ چلا کہ شیخ صاحب کو وہاں خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے اور وہ اس سوسائٹی کے سیکرٹری منتخب ہوگئے ہیں اس اطلاع پر مجھے قدرتی طور پر بہت خوشی ہوئی۔

اتفاق کی بات ہے کہ تقریباً دو سال قبل میرے قریبی عزیزوں نے اس بستی میں مکان خرید لیا اور رجسٹریشن وغیرہ کے سلسلے میں انہیں شیخ نور عالم کے تعاون کی ضرورت پڑی۔ تب مَیں ایک شام کو ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ فون پر مَیں نے ان سے وقت لے لیا تھا۔ مَیں مغرب کے بعد ان کے گھر پر پہنچا۔ گھنٹی دی تو وہ خود دروازے پر تشریف لائے اور ہمیشہ کی طرح نہایت تپاک کے ساتھ ہنستے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا اور ہاتھ پکڑ کر طویل راہداری میں سے مجھے مکان کے عقبی جانب لے گئے۔ مَیں حیران تھا کہ اس سے پہلے جب بھی ان کے ہاں حاضری کا

اتفاق ہوا، وہ گیٹ کے پاس ہی ایک کمرے میں بٹھایا کرتے تھے، لیکن آج وہ مجھے بے دھڑک اندر ہی اندر لیے جا رہے ہیں۔ میں اس بات پر بھی تعجب محسوس کر رہا تھا کہ گھر میں کوئی اور فرد نظر نہیں آ رہا جبکہ میری معلومات کے مطابق وہ ایک بھرپور گھرانا رکھتے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں اور چار یا پانچ بیٹیاں ہیں۔

بہر حال شیخ صاحب میرا ہاتھ تھام کر مکان کے آخری حصے میں مجھے اس مقام پر لے گئے جہاں بڑا ہی خوبصورت، آراستہ و پیراستہ پائین باغ اپنا جوبن دکھا رہا تھا۔ وہاں کئی طرح کے درخت تھے، پھول دار پودے کثرت سے تھے۔ گہرے سبز رنگ کا گھاس نظروں کے راستے دل میں کھبا جا رہا تھا۔ میں تو اس منظر سے مسحور ہو گیا اور ایک میز کے گرد پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ موسم بڑا ہی خوشگوار تھا اور منظر بڑا ہی دلنواز، اس لیے میں نے یہیں بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا، مگر شیخ صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھیں گے۔ ''وہاں آپ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ماحول دیکھیں گے۔'' چنانچہ میں بادلِ نخواستہ اُٹھ کر ان کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑا۔

اور شیخ نور عالم صاحب نے بالکل درست کہا تھا۔ واہ سبحان اللہ، ڈرائنگ روم کیا تھا، جنت کا ایک قطعہ تھا، نئے نکور قیمتی، خوش وضع صوفے، بے حد دیدہ زیب گراں بہا قالین، ڈرائینگ روم کا ہر کونا پھولوں کے گلدستوں سے سجا ہوا تھا اور مغربی دیوار تو پوری کی پوری ایک انتہائی خوبصورت، بے حد دلکش قدرتی منظر کی تصویر سے آراستہ تھی۔ میں یہ تصویر دیکھ کر مبہوت ہو گیا۔ قدرتی مناظر کا حسن میری بہت بڑی کمزوری ہے، انہیں دیکھ دیکھ کر میرا جی نہیں بھرتا، میں بے خود ہو جاتا ہوں، اس آئینے میں خالقِ کائنات کے عرفان سے بہرہ ور ہوتا ہوں اور غیر معمولی نوعیت کا روحانی سرور میرے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ قدرتی مناظر کی دید سے مجھے دوہرا فائدہ ہوتا ہے، ذوقِ جمال کی تسکین بھی اور معرفتِ کردگار کا شرف بھی۔

چنانچہ میں خاصی دیر تک بت بنا اس منظر کو دیکھتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ سوچوں کے

حصار سے نکل کر میرا پہلا تبصرہ تھا کہ شیخ صاحب آپ بہت ہی خوش نصیب ہیں۔اللہ نے آپ کو دنیا ہی میں جنت عطا کر دی ہے۔گھر بھی خوبصورت ہے، بیٹے بھی خوبصورت اور مہذب ہیں۔ مجھے آپ کی قسمت پر واقعی رشک آ رہا ہے۔

اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔مَیں نے اپنے عزیزوں کا مسئلہ بیان کیا تو کہنے لگے کہ مَیں تو اب اس سوسائٹی کا عہدیدار نہیں ہوں اور ان دنوں تو اس قدر پریشان ہوں کہ جی چاہتا ہے خودکشی کرلوں۔

یہ بات سن کر مَیں بھونچکا رہ گیا۔ابھی چند لمحے پہلے تو مَیں ان کی خوش بختی پر رشک کا اظہار کر رہا تھا اور ابھی ان کی زبان سے خودکشی کے الفاظ سن رہا تھا۔مَیں چکرا کے رہ گیا اور بے اختیار سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔تھوڑی دیر تک مَیں اسی کیفیت میں مبتلا رہا اور جب اوسان بحال ہوئے تو مَیں نے ان سے اس بات کی وضاحت چاہی۔

شیخ صاحب نے لمبی آہ بھری اور شدید غم ناک آواز میں کہنے لگے۔

''ڈاکٹر صاحب! میرا تو سب کچھ برباد ہو گیا،مَیں تو ذلیل وخوار ہو گیا۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ مَیں اس وقت گھر میں بالکل اکیلا ہوں،کوئی دوسرا فرد یہاں موجود نہیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ چار دن پہلے میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔''

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' مجھے جیسے کرنٹ لگا۔مَیں بے اختیار اپنی جگہ سے اچھلا اور چلّایا ''لیکن ایسا کیوں ہوا۔یہ سانحہ کیوں رونما ہوا۔''

''ڈاکٹر صاحب، کیا بتاؤں مجھ پر تو قیامت گزر گئی'' شیخ صاحب نے روتے ہوئے کہا'' کیا آپ یقین کریں گے کہ میرے دونوں بیٹوں نے انتہائی بے رحمی سے میری پٹائی کی۔مَیں نے جان بچا کر بھاگنا چاہا تو انہوں نے تعاقب کر کے مجھے مین گیٹ سے جا پکڑا اور میری ٹانگیں پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے مجھے اسی ڈرائینگ روم میں لائے اور دوبارہ مارنے لگے۔بڑے بیٹے نے تو حد ہی کر دی۔اس نے میرے سر پر جوتے بھی مارے اور میری بیوی اپنی نگرانی میں یہ ساری کارروائی

کراتی رہی اوران کوشہ دیتی رہی۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ ایک رشتہ دار نا گہانی طور پر آ گیا اوراس نے مداخلت کر کے مجھے ان کے پنجوں سے چھڑایا، ورنہ پتہ نہیں کیا ہو جاتا۔''

شیخ نور عالم نے بتایا کہ اب تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نکال چکا ہوں۔ دونوں بیٹوں کے خلاف پولیس کیس بنوایا ہے۔ ایک بیٹا گرفتار ہو گیا ہے، دوسرا مفرور ہے۔ چاروں بیٹیاں اپنی خالہ کے گھر ہیں اور مَیں یہاں بے شرموں کی طرح زندہ رہنے پر مجبور ہوں۔''

یہ سب کچھ میرے لیے بہت غیر معمولی تھا۔ مَیں تو سناٹے میں آ گیا۔ ایسا حادثہ نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ یہ تو واقعی قیامت کی علامت تھی کہ بیٹے باپ کو بے رحمی سے پیٹیں، اس کے سر پر جوتے ماریں اور بیوی پاس کھڑی ہو کر اطمینان سے یہ سارا منظر دیکھے۔ الامان، الحفیظ، العیاذ باللہ۔

مَیں دیر تک سکتے کی کیفیت میں رہا۔ پھر مَیں نے اس واقعے پر اظہار افسوس کیا، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہمدردی ظاہر کی اور پوچھا شیخ صاحب یہ سب کچھ تو بہت ہی دردناک، بہت ہی المناک ہے۔ اس پر جس قدر بھی افسوس کا اظہار کیا جائے کم ہے، لیکن آپ نے غور کیا ہے کہ اس کا سبب کیا بنا ہے؟ یہ المیہ کیوں رونما ہوا ہے؟''

''نہیں میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کہ میرے سر پر یہ آسمان کیوں ٹوٹا ہے۔ میرا سب کچھ کیوں غارت ہوا ہے اور مجھے کتے سے زیادہ کیوں ذلیل کیا گیا ہے؟'' شیخ نور عالم نے جواب دیا۔

''نہیں شیخ صاحب، یہ معاملہ اتنا سادا نہیں ہے، اس کی کوئی ٹھوس وجہ ہے۔'' سچ سچ بتایئے جب نوجوانی میں آپ کی شادی کی بات چلی تھی تو آپ نے کوئی دیندار رشتہ تو نہیں ٹھکرایا تھا۔''

''ہاں۔ ٹھکرایا تھا۔ بلکہ دو ٹھکرائے تھے۔'' لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟ شیخ صاحب نے اچھل کر کہا ''یہ تو راز ہے جو بہت کم لوگوں کے علم میں ہے۔''

''شیخ صاحب محترم!'' مَیں نے جواب دیا۔ ''یاد رکھیں اللہ تبارک وتعالیٰ تو بہت ہی رحیم و کریم ہیں۔ جہاں تک مَیں نے ان کا مزاج پہچانا ہے، وہ اپنے بندوں کی تربیت اور تہذیب کی

خاطر چھوٹی موٹی آزمائشیں تو ان پر طاری کرتے ہیں اور وہ عارضی نوعیت کی ہوتی ہیں، لیکن غیر معمولی نوعیت کی، انتہائی تکلیف دہ اور رسوا کن مصیبتیں وہ بہت بڑے گناہوں کے بغیر اپنے بندوں پر نازل نہیں کرتے۔ یقیناً آپ سے کچھ خطائیں، بڑی بھیانک قسم کی خطائیں سرزد ہوئی ہیں جن کا خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔''

''جی ہاں ڈاکٹر صاحب، آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' شیخ صاحب اب بالکل ڈھیلے پڑ گئے تھے اور ان کا سر ان کے گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ وہ بڑی ہی نحیف آواز میں بولے ''میں نے پہلا رشتہ ایک حافظ قرآن لڑکی کا مسترد کیا تھا۔ یہ میری سگی خالہ کی بیٹی تھی اور اس سے باقاعدہ میری منگنی ہوئی تھی لیکن میں نے اعلان کر دیا کہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، ایم ایس سی ہوں اور یہ محض میٹرک پاس ہے اس لیے میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔

میرے اس اقدام سے میری والدہ تو سخت ناراض ہو گئیں اور انہوں نے میرے معاملات سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ اب میرے والد نے مداخلت کی اور اور میری شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کر دی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور اس خاتون سے شادی کر لی جو چند روز پہلے تک میری بیوی تھی اور جس نے بیٹوں سے میری پٹائی کروائی ہے۔''

''لیکن اس خاتون سے آپ کا تعارف کیسے ہوا اور کہاں ہوا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ڈاکٹر صاحب'' شیخ صاحب بولے ''اس خاتون سے میں نے ''لو میرج'' کی تھی۔ میرے ایک جاننے والے تھے، اعظم شاہ، میرا ان کے ہاں آنا جانا تھا۔ ان کی یہ بیٹی بہت ہی خوبصورت تھی، اگرچہ ان پڑھ تھی، لیکن میری نظروں میں کھب گئی، میں نے پہلی بیوی کو طلاق دے دی او .اس سے شادی کر لی۔''

''تو پھر آپ کو جوتے نہ پڑتے تو اور کیا ہوتا۔'' میں نے کہا ''شیخ صاحب، آپ نے بار بار بے اصولی اور خدا سے بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ حافظ قرآن خالہ زاد سے منگنی توڑی۔ خالہ اور والدہ کو ناراض کیا۔ پھر پھوپھی زاد سے باقاعدہ شادی ہوئی اور اسے بھی آپ نے طلاق دے کر والدا۔

پھوپھی کی توہین وتذلیل کی اور پھر ایک جاہل اور گنوار لڑکی سے صرف اور صرف ظاہری حسن کی بنیاد پر شادی رچالی۔ تب اللہ کی لاٹھی حرکت میں نہ آتی تو کیا ہوتا؟ مَیں سمجھتا ہوں کہ آپ کے ساتھ جو کچھ ہوا یہ نہ ہوتا تو تعجب ہوتا۔ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ مکافاتِ عمل کا تقاضا یہی تھا۔ جو آپ نے بویا وہی کاٹا۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

میں تو یہ باتیں کرکے اٹھ آیا۔ لیکن میرے ذہن میں تجسس تھا کہ شیخ نور عالم کے ساتھ جو کچھ گزری ہے ان کے بیٹوں نے جس طرح اس کی پٹائی کی ہے، ان کی بیوی نے پاس کھڑے ہو کر انہیں جس طرح جوتے مروائے ہیں، اس کا ظاہری سبب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شیخ صاحب چونکہ بہت دل پھینک واقع ہوئے ہیں، ازلی حسن پرست ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے اسکول کی کسی استانی پر مہربان ہونے کی کوشش کررہے ہوں۔ ان کی بیگم کو اس کا اندازہ ہوگیا ہو جس کے نتیجے میں یہ المیہ رونما ہوا ہو۔

اور میرے اس خدشے کی تصدیق شیخ صاحب کے ایک پڑوسی نے کردی۔ واقعی وہ ایسی سرگرمیوں میں ملوث پائے گئے جو ان کی بیوی اور لڑکوں کو سخت ناپسند تھیں۔ یہی سبب ہے کہ ضمانتیں ہونے کے بعد ان کے بیٹوں نے ان کے خلاف دوبارہ آپریشن کیا جو بالآخر تحریری سمجھوتے پر ختم ہوا جس کے مطابق یہ طے پایا کہ وہ سکول سے دستبردار ہوجائیں گے صورت حال ایسی گھمبیر اور نازک ہوگئی تھی کہ انہیں یہ شرط تسلیم کرتے ہی بنی۔

شیخ نور عالم کی زندگی جہنم بن کے رہ گئی ہے۔ اب وہ گھر کے ہیں نہ گھاٹ کے۔ وہ جنت نظیر اور فراخ مکان جو انہوں نے بڑے شوق سے بنوایا تھا، اب دو حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے۔ درمیان میں دیوار کھینچ دی گئی ہے۔ ان کی مطلقہ بیوی اور بیٹے، بیٹیاں الگ رہتی ہیں اور یہ اکیلے، یک وتنہا الگ رہتے ہیں۔ سکول ان کے بیٹے چلا رہے ہیں۔

(۱۵)

مَیں نے چودہ ایسے واقعات لکھے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنی بیویوں کو ناحق طلاق دی، وہ بدترین حالات سے دوچار ہوئے اُور سچے سکون اُور مسرّت سے محروم رہے۔ اگلے دو مضامین میں مَیں آپ کو بتاؤں گا کہ طلاق ہی نہیں بلکہ جو لوگ منگنیاں توڑتے ہیں، اُن پر بھی اللہ کا سخت عتاب نازل ہوتا ہے اُور وہ بھی زندگی بھر مشکلات اُور پریشانیوں ہی میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقی مسرت اُور راحت اُن سے بھی روٹھی ہی رہتی ہے۔

اس ضمن میں غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کو انسانوں اُور کمزور مخلوق ہونے کی وجہ سے خصوصاً عورت ذات سے بے پناہ ہمدردی ہے اُور جو شخص بھی کسی عورت پر ظلم کرتا ہے، اُس کی عزتِ نفس کو پامال کرتا ہے اُور اُسے معاشرے میں ذلیل ورسوا کرتا ہے، پھر وہ لازماً اللہ کے غصے کا شکار ہوتا ہے اُور وہ ایسے آدمی سے ضرور انتقام لیتا ہے۔

چنانچہ میرے سامنے ایک ایسی ہی زندہ مثال ہے کہ میرے ایک قریبی مرحوم دوست نے ایک سال کے بعد منگنی توڑ دی اور اس کے نتیجے میں اس کی منگیتر شدید ترین صدمے سے دوچار ہوئی، وہ ایک مدت تک ذہنی مریض بنی رہی اُور مہینوں تک بسترِ علالت پر پڑی رہی۔ دراصل وہ اپنے خاندان، اپنے حلقۂ تعارف اُور اپنے گاؤں میں اس قدر رسوا ہوئی کہ اِن ساری کیفیات کا وارد ہونا ایک فطری امر تھا اُور میرے دوست کی یہ خطا ایسی نہ تھی کہ ربِ رحیم وکریم اس کو نظر انداز کر دیتا۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ میرے اس دوست نے یہ منگنی کسی دنیاوی غرض سے نہیں توڑی تھی، بلکہ اس کے پس منظر میں عقیدہ اُور نظریہ کارفرما تھا۔ مگر پھر بھی اللہ کو اس کی یہ حرکت ایک آنکھ نہ بھائی کہ اس میں ایک عہد، ایک معاہدے کا فسخ بھی تو شامل تھا۔

قصہ یوں ہے کہ میرا یہ قریبی مرحوم دوست بہت باعمل مسلمان تھا اَور توحید پر سختی سے کار بند تھا۔ اُسے قبر پرستی، پیر پرستی اَور بدعات وخرافات سے شدید نفرت تھی، مگر جب وہ عملی زندگی میں داخل ہوا تو شومئ قسمت سے والدہ کے دباؤ پر اُس کی منگنی ایک ایسے خاندان میں ہوگئی جہاں یہ ساری خرابیاں موجود تھیں اَور اِن کا اس سے پہلے، اجنبیت کی وجہ سے، اُسے کوئی ادراک نہیں تھا، چنانچہ مختلف ملاقاتوں میں، جب اُس نے بار بار دیکھا کہ اُس کی منگیتر کے والد جو ایک روایتی مولوی تھے اَور دین کا بہت ہی سطحی اور معمولی علم رکھنے والے تھے، مختلف درگاہوں اَور قبروں کا ذکر عقیدت سے کرتے ہیں، پیر پرست ہیں اَور مولانا مودودی کو برا بھلا کہتے ہیں جو میرے دوست کی محبوب اَور انتہائی محترم شخصیت تھے، تو اُس نے بالآخر بادلِ نخواستہ یہ منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا اَور قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، اللہ کو میرے اس دوست کا یہ عمل ہرگز پسند نہ آیا کہ اس کے نتیجے میں ایک بے گناہ لڑکی شدید ترین ذہنی اور عملی اذیت سے دوچار ہوئی اَور وہ اپنے پورے ماحول میں نکو بن گئی اَور کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہی۔ میرے دوست کی والدہ بھی غیر معمولی پریشانی سے دوچار ہوئی، وہ اس لڑکی کی خوش اخلاقی سے بہت متاثر تھی اَور اس منگنی کو ہر قیمت پر قائم رکھنے کے حق میں تھی...... اس طرح گویا دو خواتین کا دل ٹوٹا تھا اَور انسانی حوالے سے دونوں کی حیثیت واہمیت مسلّم تھی۔

اس واقعے کے بعد میرے اس دوست نے ایک اور لڑکی کو بھی شدید ذہنی اذیت سے دوچار کیا۔ یہ لڑکی اعلیٰ تعلیم یافتہ، بہت لائق فائق اَور بہت دینی مزاج رکھنے والی تھی۔ میرے دوست نے خود اس میں دلچسپی لی، مگر رابطہ شروع ہونے پر جب اس شخص کو پتہ چلا کہ یہ لڑکی ظاہری شخصیت کے اعتبار سے چنداں قبول صورت نہیں ہے، تو اس نے اس لڑکی کی قابلیت اَور دینی مزاج وعمل کو نظر انداز کر کے یہ رشتہ مسترد کر دیا۔

آخر کار کئی سالوں کے انتظار کے بعد میرے اس دوست کو ایک ایسا خاندان مل ہی گیا جو اس کے خیالات ونظریات سے ہم آہنگ تھا اور والدین کے لیے بھی قابلِ قبول تھا اَور دونوں ایک ہی

برادری سے تعلق رکھتے تھے۔

چنانچہ میرے دوست کے آبائی گھر سے تقریباً تین سو میل دور چولستان کے علاقے میں اُس کی شادی ہوگئی۔ اُس کی بیوی اسلامیات میں ایم اے تھی اُور اس کے سسرال کا سارا گھرانا ایک دینی تحریک سے وابستہ تھا۔

لیکن شادی کے جلد ہی بعد اُسے اندازہ ہوگیا کہ اللہ کی بے نیازی نے اس خاندان سے وابستہ کر کے اُسے دراصل کڑی سزا دی ہے۔ چنانچہ اُس نے دیکھا کہ اس خاندان میں محبت، اخلاص اُور تپاک کا کوئی گزر ہی نہیں ہے۔ بظاہر یہ لوگ نمازیں بھی پڑھتے تھے، پردے کا بھی اہتمام تھا اُور گھر میں تفہیم القرآن اُور مولانا مودودی کی دیگر کتابیں بھی موجود تھیں، لیکن سب کچھ محض زبانی جمع خرچ تک محدود تھا اُور دین کا کوئی ایک عقیدہ بھی اُن کے ذہنوں میں راسخ نہیں ہوا تھا اُور عمل کا حصہ نہیں بنا تھا۔ اُس کے سسر ایک مغرور اُور بد اخلاق آدمی تھے بلکہ عام دنیاوی شرافت سے بھی عاری تھے اُور ساس شفقت اُور محبت کے احساس ہی سے محروم تھی۔ اسی روّیے کا نتیجہ تھا کہ یہ خاندان غیر معمولی نوعیت کے مسائل اُور مصائب کا شکار تھا، لیکن حیرت انگیز طور پر یہ لوگ کسی حادثے سے عبرت حاصل نہیں کرتے تھے نہ انہیں اپنی کسی غلطی کا احساس ہوتا تھا۔ اس طرح اللہ نے چھانٹ کر، خوب منتخب کر کے اُسے ایک ایسے خاندان میں ٹانک دیا جہاں انسانی احترام، اخلاقی اقدار اُور محبت و شفقت کی شدید کمی تھی۔

لیکن سب سے تکلیف دہ روّیہ میرے دوست کی بیوی کا تھا۔ یہ اگرچہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی اور اسلامیات میں ایم اے تھی، لیکن اپنے والدین ہی کی طرح دین کی کسی تعلیم پر اس کا عمل نہ تھا۔ اُسے شعور ہی نہیں تھا کہ ایک مسلمان بیوی کا روّیہ اپنے خاوند کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے یا وہ کون سے ذرائع ہیں جن سے گھر کے ماحول کو خوشگوار رکھا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی خاندانی روایت کے مطابق چڑچڑے مزاج کی خاتون تھی اُور خوش ہونا اُور دوسروں کو خوش رکھنا جانتی ہی نہیں تھی۔ جھگڑا کرنا، ہر بات میں تکرار کرنا گویا اُس کی سرشت میں شامل تھا۔ وہ ہر بات میں اختلاف کرتی تھی

اور ’’نہیں جی‘‘ اُس کا تکیہ کلام تھا۔ حوصلوں کو توڑنے اَور ہمتوں کو پست کرنے میں اُس کا جواب نہ تھا۔ معاملات کا ہمیشہ تاریک پہلو دیکھا کرتی اور مخاطب کے پاؤں تلے سے زمین نکال دیتی۔ تنک مزاجی اَور یاس پسندی اُس کے مزاج کا مستقل حصہ تھی۔ وہ احساسِ شکر سے بالکل عاری تھی اَور اپنی غلطی تسلیم کرنے کی قائل ہی نہیں تھی نہ کسی بات پر معذرت یا شرمندگی کا اظہار کرتی تھی۔

میرے اس دوست کا تعلق چونکہ خدا سے بھی بہت اچھا تھا اَور وہ خدا کے بندوں کی خدمت پر بھی ہمیشہ کاربند رہتا تھا اس لئے خدا نے اس کے خاندان کو بے شمار نعمتوں سے نواز دیا تھا۔ بیٹے بھی ہوئے، بیٹیاں بھی ہوئیں اَور میرے اس دوست کو معاشرے میں عزت بھی بہت حاصل ہوئی، مگر اس کی بیوی کی زبان پر نہ کبھی خدا کے شکر کا ذکر آیا اَور نہ کبھی اُس نے اپنے خاوند کی قدر افزائی کی ضرورت محسوس کی۔ میرا دوست کہا کرتا تھا کہ اگر میں چاند اَور تارے بھی توڑ کر اس کے قدموں میں ڈال دوں گا، تو یہ نہ خوش ہوگی، نہ میرا شکریہ ادا کرے گی۔

اللہ معاف کرے عجیب مزاج تھا اس عورت کا، اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود نہ اُسے جنت کا شوق تھا، نہ جہنم کا خوف تھا، وہ رسمی نوعیت کی نمازیں بھی پڑھتی تھی اَور پردے کا اہتمام بھی کرتی تھی، لیکن اس کے ہاں عام بنیادی دینی تعلیمات پر عمل کا بھی شدید فقدان تھا۔ مثال کے طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہمان کو اللہ کی رحمت قرار دیا ہے اَور فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ اَور آخرت پر ایمان رکھتا ہے، اُسے چاہئے کہ مہمان کی تکریم کرے، مگر یہ خاتون مہمان کو ہمیشہ ایک مصیبت سمجھتی رہی اَور اگر میرا دوست اصرار نہ کیا کرتا اَور دباؤ نہ ڈالتا تو یہ کسی مہمان کو کھانا کھلانے پر آمادہ نہ ہوتی۔ چنانچہ مہمان آنے پر بڑبڑاتی اَور علانیہ پریشانی کا اظہار کر کے یہ ماحول کو ناگوار بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتی۔

میرے مرحوم دوست کی یہ بیوی گھر کے سارے کام کیا کرتی۔ کھانا پکاتی، کپڑے دھوتی اَور کبھی کام کرنے والی چھٹی کرتی تو صفائی کا کام بھی خود کر لیتی، لیکن کوئی کام بھی یہ خوش دلی سے نہیں کرتی تھی۔ اُسے شعور ہی نہیں تھا کہ ایک بیوی اَور ماں کا منصب کس قدر عظیم ہے اَور یہ فرائض

انجام دے کر وہ دنیا اور آخرت کے حوالے سے کس قدر راجر سمیٹ رہی ہے۔ لیکن یوں لگتا ہے کہ اُسے آخرت کی جوابدہی اور حساب کتاب کا شعور ہی نہیں تھا۔ وہ جو کام کرتی بڑبڑاتے ہوئے کرتی، احسان جتاتے ہوئے کرتی، ایک ایسے مزدور کی طرح جو بیگار میں پکڑا گیا ہو اُس کے ہر کام میں بیزاری اور غصہ شامل ہوتا تھا۔ وہ دودھ میں مینگنیاں ڈالنے کا فن بہت اچھا جانتی تھی۔ میرے دوست نے اُسے کئی ڈرا دینے والی احادیث سنائیں، مثلاً یہ کہ حضورؐ نے دوبار بیان فرمایا کہ جہنم میں سب سے زیادہ عورتیں جائیں گی اس سبب سے کہ وہ اپنے خاوندوں کی ناشکر گزار ہوتی ہیں۔ پھر یہ کہ روزِ قیامت میزان میں سب سے بھاری چیز ایک مسلمان کا اخلاق ہوگا۔ پھر یہ کہ مسلمان سراپا محبت ہوتا ہے اور اُس شخص میں کوئی خیر نہیں ہے جو دوسروں سے محبت نہیں کرتا اور دوسرے اُس سے محبت نہیں رکھتے اور پھر یہ کہ اگر ایک ماں اپنے بچوں کی شفقت کے ساتھ اچھے طریقے سے دینی تربیت کرتی ہے تو وہ اللہ کے ہاں بے حد وحساب اجر کی مستحق ہوگی۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس خاتون پر کسی بھی دینی تعلیم کا اثر نہیں ہوتا تھا اور وہ اُسے عمل کا حصہ نہیں بناتی تھی۔ اکثر چڑ کر کہتی یہ مجھے لیکچر نہ دیا کریں مجھ سے زیادہ دینی تعلیمات سے کون واقف ہے۔ چنانچہ میرے دوست نے بتایا کہ رفاقت کی طویل مدت میں اس خاتون کے منہ سے مَیں نے کبھی بھی اللہ، آخرت یا دین کے حوالے سے کوئی بات نہیں سنی۔ اُس نے بچوں سے بھی کبھی دین کی، اخلاق کی یا تربیت کی بات نہ کی۔ تربیت کا لفظ شاید اُس کی لغت میں تھا ہی نہیں۔ اس کے برعکس اُسے غیبت اور بدگمانی کی باتوں سے بہت رغبت تھی اور وہ شکوہ وشکایت کئے بغیر رہتی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ میرا دوست عمر بھر ترستا ہی رہا کہ اُس کی بیگم کبھی اُس سے پوچھے کہ کیا بات ہے آج آپ پریشان کیوں ہیں یا پھر کبھی وہ کسی گھریلو مسئلے پر سنجیدگی سے گفتگو کرے لیکن ایسا حادثہ گھر میں کبھی بھی رونما نہ ہوا۔ اسی لئے وہ کہا کرتا تھا کہ اگرچہ مَیں میں ایک معمولی آدمی ہوں، لیکن بیگم کے مزاج کے حوالے سے مَیں سقراط اور ٹالسٹائی کے برابر کھڑا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ میری بیوی نے مجھ پر پانی کی بالٹی نہیں گرائی اور ٹالسٹائی کی طرح مجھے تا حال گھر سے فرار ہونے پر مجبور نہیں ہونا پڑا۔ وہ اکثر اُداس

ہو کر یہ شعر پڑھا کرتا تھا ۔

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

چنانچہ میرے دوست کی بیگم نے بھرپور کوشش کی کہ ایک شوہر اُور باپ کی حیثیت سے گھر میں اُس کی سیادت قائم نہ ہو لیکن وہ اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہ ہوئی، اُور چونکہ میرے دوست کا رویہ خدا اُور خلقِ خدا سے بہت اچھا تھا۔ وہ اللہ کے حضور تواتر اُور پابندی سے استغفار کیا کرتا اُور اپنی سابق منگیتر اُور اس کے والدین کے لیے دعائیں کرتا رہتا تھا پھر اُس کا کتاب سے بہت گہرا تعلق تھا، اس لیے اللہ نے اُسے گہرے قلبی سکون سے نواز دیا تھا چنانچہ وہ نہ تو بے خوابی میں مبتلا ہوا، نہ کسی نوعیت کے خوف اُور حزن سے دوچار ہوا اُور نہ کسی خطرناک بیماری سے اُس کا سابقہ پیش آیا اُور اللہ نے سنگلاخ چٹانوں میں سے اُس کے لیے چشمے جاری کر دیئے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مَیں درجۂ اوّل کا قیدی ہوں، اللہ نے مجھے میرے جرم کی سزا دی، مگر چونکہ مَیں نے یہ جرم اضطراری حالت میں کیا تھا، اس لیے اللہ نے مجھے قید میں خاصی سہولتیں اُور آسانیاں بھی عطا فرما دیں لیکن گھریلو سطح پر اُس کی سزا کا عمل کم و بیش عمر بھر جاری رہا۔ چنانچہ گھر میں ہمہ وقت ایک کشمکش اُور کھینچا تانی کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ کوئی کام ہموار طریقے سے (SMOOTHLY) چلتا ہی نہیں تھا۔ یہی سبب ہے کہ میرا دوست ستر سال کی عمر میں ایک رات سویا اُور صبح اُٹھ نہ سکا۔ نیند ہی میں وہ کسی وقت موت کی وادی میں اُتر گیا تھا۔ وہ اکثر دعا کیا کرتا اُور اُس کی دعا قبول ہوگئی کہ باری تعالیٰ مجھے بڑھاپے میں کسی کا محتاج نہ کرنا اُور چلتے پھرتے اٹھا لینا کہ اس دنیا میں کوئی بھی کسی کا سچا خیر خواہ نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

میرا یہ دوست ذمہ دار خاوند تھا، ذمہ دار باپ تھا، وہ گھر کی ایک ایک ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ اُس نے بچوں کی تعلیم اُور پرورش پر خرچ کرنے میں کبھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک باعمل مسلمان تھا

اُور رزقِ حلال کے تقاضوں کو احسن طریقے سے پورا کرتا تھا۔ وہ عبادات میں معمولی سا تساہل نہ کرتا اُور خلقِ خدا کی خدمت سے کبھی پہلوتہی نہ کرتا......لیکن اُسے جو بیوی ملی وہ اُس کی تمناؤں کے بالکل برعکس تھی۔ وہ محض ایک بیوی تھی جس میں ایک خدا خوف، سمجھدار رفیقۂ حیات والی کوئی بات نہ تھی اُور ظاہر ہے اس کی یہ محرومی کسی اتفاق کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اُس کے ایک کبیرہ گناہ کی سزا تھی کہ اُس نے ایک معاہدہ توڑا تھا اُور ایک بے قصور لڑکی کو ذلیل ورسوا کیا تھا چنانچہ قدرتِ خداوندی نے اُسے یہ سزا دے کر اس سے کوئی زیادتی نہ کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا یہی اصول ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّ لٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ یعنی اللہ تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود اپنے آپ پر زیادتیاں کرتے ہیں (سورہ یونس ۱۰/آیت ۴۴) اور ظاہر ہے اللہ اپنے اصولوں میں تبدیلی نہیں کیا کرتا۔

(۱۶)

بدعہدی کی سزا......ایک بزرگ کی بددعا

پروفیسر سلطان محمود صاحب کے خاندان کا یہ واقعہ بھی ''مکافاتِ عمل'' کی بڑی حیرت انگیز اُورعبرت ناک مثال ہے۔ پروفیسر موصوف کی اہلیہ کی ایک بہن راولپنڈی میں رہتی ہے۔ اُس کی ایک بیٹی ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہے، وہ لائق ہے اور خوبصورت بھی اُور ڈاکٹر بننے کے بعد وہ راولپنڈی ہی کے کسی ہسپتال میں ملازمت کر رہی تھی اُور والدین نے اُس کا رشتہ ایک نوجوان ڈاکٹر سے کر دیا تھا اُور منگنی ہوئے کم از کم ایک سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔

جیسا کہ مَیں بتا چکا ہوں پروفیسر صاحب کا بڑا بیٹا شاہد بہت خوبصورت نوجوان ہے۔ دراز قد، سمارٹ، وجیہ وشکیل، ہنس مکھ اُور خوش اخلاق۔ وہ کینیڈا سے آیا ہوا تھا اُور راولپنڈی میں شادی کی کوئی تقریب تھی۔ وہ سوٹ پہن کر اُور بن ٹھن کر اُس تقریب میں شامل ہوا اُور اپنی خالہ...... کی آنکھوں میں کھب گیا۔ وہ اُس پر فریفتہ ہوگئی اُور اس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ ڈاکٹر سے منگنی توڑ کر اپنی بیٹی کی شادی شاہد سے کرے گی۔ عین ممکن ہے کہ اس منصوبے میں اُس کی ڈاکٹر بیٹی کی شدید خواہش بھی کارفرما ہو۔

بہرحال پروفیسر سلطان محمود صاحب کی سالی نے اپنے اس ارادے کا اظہار اپنی بڑی بہن یعنی بیگم سلطان محمود سے کیا اُور اُسے اس پر آمادہ کر لیا اُور پھر اُسے ہی مجبور کیا کہ وہ اُس کی بیٹی کے منگیتر ڈاکٹر کے گھر والوں سے منگنی توڑنے کی بات کرے...... چنانچہ پروگرام کے مطابق پروفیسر صاحب کی بیگم راولپنڈی گئیں اور اُنہوں نے فون پر اپنی بھانجی کے منگیتر کے گھر اُس کے باپ سے بات کی کہ ہمیں یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ ہم منگنی توڑنے کا اعلان کر رہے ہیں۔

پروفیسر صاحب نے بتایا کہ جب میری بیگم نے اپنی بھانجی کی منگنی توڑنے کی خبر سنائی تو اُس کے منگیتر ڈاکٹر کے باپ کی یوں کیفیت ہوئی جیسے اُسے کسی سانپ نے کاٹ لیا ہو۔ وہ فون پر چیخا، رویا، تڑپا، اُس نے منّتیں کیں، ترلے کیئے، خدا رسول کے واسطے دیے کہ ہم پر یہ ظلم نہ کرو، ساری برادری کو اَور میرے بیٹے کے سارے دوستوں کو منگنی کا علم ہو چکا ہے، ہم شادی کی تیاری کر چکے ہیں، منگنی ٹوٹ گئی تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی، ہم بہت بدنام ہوں گے، لیکن پروفیسر صاحب کی بیگم یا اُن کی بہن پر اس بزرگ آدمی کی آہ وفریاد کا کوئی اثر نہ ہوا، اُنہوں نے سختی سے اپنا فیصلہ دہرایا اَور فون بند کر دیا۔

قصہ کوتاہ یہ کہ ڈاکٹر یاسمین کا نکاح شاہد محمود سے فون پر ہو گیا دونوں خاندان بہت خوش تھے۔ شاہد کو فرصت ملی تو وہ نکاح کے چند مہینوں کے بعد پاکستان آیا۔ رخصتی عمل میں آئی، ولیمہ ہوا۔ شاہد صرف ایک ہفتہ یہاں ٹھہرا اَور واپس چلا گیا...... پتہ چلا کہ دونوں میاں بیوی میں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہے اَور نکاح کے فوراً بعد انٹرنیٹ پر دونوں میں جو گفتگو ہوتی تھی، اُس میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے، اسی لئے شاہد پاکستان آیا اَور اگرچہ اُس کی بیوی ایک ہفتہ اُس کے پاس لاہور میں ٹھہری رہی، مگر دونوں میں جسمانی قرب پیدا نہ ہوا اَور اختلافات بڑھتے چلے گئے۔

اَور قارئین کرام اس سنگ دلی اَور بے اصولی کا جو مظاہرہ دونوں خاندانوں نے کیا اُس کا ڈراپ سین یہ ہوا کہ تقریباً دو سال کی شدید پریشان کن صورتِ حال کے بعد نوبت طلاق تک پہنچ گئی اَور طلاق ہوئے بھی تقریباً تین سال گزر چکے ہیں، مگر ڈاکٹر یاسمین کی اب تک شادی نہیں ہوئی اَور گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ پتہ نہیں اُس کے سابق منگیتر ڈاکٹر کے بوڑھے باپ کی بد دعائیں کیا رنگ لائیں گی۔

باب : ۹

عشق اور خانہ خرابی

مولانا حالیؒ نے فرمایا تھا۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا!

جس گھر سے سر اٹھایا اُس کو بٹھا کے چھوڑا

اور موصوف محترم کی بات جس طرح پہلے درست تھی، اُسی طرح آج بھی سو فیصد درست ہے۔ چنانچہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جو لوگ شادی سے پہلے یا بعد میں غیر عورتوں سے تعلقات اُستوار کرتے ہیں اَور عشق و عاشقی کے چکر میں مبتلا ہوتے ہیں، اُن کی عائلی زندگی کبھی پُرسکون نہیں گزرتی اَور وہ عمر بھر طرح طرح کے مسائل و مصائب سے دوچار رہتے ہیں۔ میرے سامنے اس طرح کے متعدد واقعات ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں (اصل نام سارے واقعات میں تبدیل کر دیے گئے ہیں)۔

☆☆☆

(۱)

مَیں نے ایم اے اردو کی تعلیم کے لیے ستمبر ۱۹۶۴ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ ۱۹۶۴-۶۶ء کے اس سیشن میں طلبہ و طالبات کی تعداد ڈھائی سو تک پہنچ گئی۔ ڈیڑھ سو لڑکیاں، ایک سو لڑکے، چنانچہ صدرِ شعبہ اَور پرنسپل کالج ڈاکٹر سید عبداللہ نے یہ دیکھ کر کہ کسی بھی کمرے میں اتنی بڑی تعداد اکٹھے نہیں سما سکتی، لڑکوں اَور لڑکیوں کی کلاسوں کا انتظام الگ الگ کر دیا اَور لڑکوں کے لیے کالج کے لان میں چھولداریاں اَور خیمہ نصب کر دیا گیا، لیکن اس سے کالج کی

مجموعی فضا پر کوئی مثبت اثر نہ پڑا۔ ہر وقت، ہر مقام پر لڑکوں لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا اُور جہاں دو چار لڑکے باہم اکٹھے ہوتے، کوئی نہ کوئی لڑکی ہی اُن کی گفتگو کا موضوع ہوتا چنانچہ مَیں نے تشویش کے ساتھ یہ بات محسوس کی ہے کہ مخلوط تعلیم کے ماحول میں جو چیز سب سے زیادہ پروان چڑھتی اُور پنپتی ہے، وہ غیر سنجیدگی اُور فکر و عمل کی سطحیت ہے۔

راجہ فیاض میرا کلاس فیلو تھا۔ راولپنڈی کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ لائق اُور ذہین و فطین تھا۔ اللہ نے اُسے شخصیت بھی اچھی عطا کی تھی۔ بانکا سجیلا، خوبصورت نوجوان تھا۔ وہ ہماری ایک کلاس فیلو محمودہ پر عاشق ہو گیا اُور بہت بُری طرح دل دے بیٹھا۔ محمودہ عجیب و غریب، متضاد خصوصیات کی لڑکی تھی۔ وہ اتنی خوبصورت اُور طرحدار تھی کہ کوئی بھی فارغ بے فکرا نوجوان اس پر بڑی آسانی سے عاشق ہو سکتا تھا۔ وہ باوقار تھی، سر پر ہمیشہ دوپٹہ لئے رکھتی، لیکن گپ شپ کی بہت شوقین۔ جو لڑکا بھی اُس سے بات کرنا چاہتا، وہ اُسے مایوس نہ کرتی۔ اس سے کتنے ہی لڑکے خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے اُور راجہ فیاض اُن میں پیش پیش تھا۔

راجہ فیاض اُور مَیں ہم دونوں اوینٹل کالج کے وولنر ہوسٹل میں رہتے تھے۔ راجہ ہر دوسرے تیسرے دن بن سنور کر پرانی انارکلی کے قریب گرلز ہوسٹل کا جہاں محمودہ مقیم تھی، پابندی سے چکر لگایا کرتا تھا جانے سے پہلے مجھے اشعار سنا کر جاتا اُور واپس آ کر میرے کمرے میں بیٹھا اپنی قسمت پر ناز کرتا رہتا۔ محمودہ اُس کی محبت کی قدر کرتی تھی اُور اُس نے اُسے کبھی بھی مایوس نہ کیا تھا۔

لیکن دوسرے سال کے آخری مہینوں کی بات ہے، جب راجہ فیاض نے محمودہ سے شادی کی تمنا کی، تو وہ سخت برافروختہ ہوئی۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ ہمارا گھرانا ایک قدامت پسند گھرانا ہے اُور ہمارے ہاں برادری سے باہر شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے والد اپنے علاقے کے ایک ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں اُور مَیں کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتی جس سے اُن کی عزت پر حرف آتا ہو۔

اس حادثے سے راجہ فیاض بری طرح متاثر ہوا۔ اس کا سکون درہم برہم ہو گیا۔ وہ میرے

پاس آ کر بیٹھا رہتا۔ آہیں بھرتا رہتا، الم انگیز شعر گنگناتا رہتا۔ ایک بار اُس نے بڑی ہی دل گرفتگی سے کہا: اب مَیں کسی پڑھی لکھی لڑکی سے ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ اب میں اپنے گاؤں میں کسی ان پڑھ لڑکی کو اپنی بیوی بنالوں گا۔

اَور واقعی اُس نے ایسا ہی کیا امتحان دے کر وہ گاؤں گیا اَور جاتے ہی اپنے رشتہ داروں میں ایک ان پڑھ لڑکی سے شادی کرلی۔ لیکن چونکہ ایم اے میں اُس کے نمبر باوجود لائق ہونے کے بہت ہی کم آئے تھے، اس لئے کوشش کے باوجود اُسے کوئی ڈھنگ کی نوکری نہ ملی۔ پھر وہ بیرونِ ملک چلا گیا۔ کچھ عرصہ جرمنی میں مقیم رہا، وہاں سے انگلینڈ چلا گیا جہاں قسمت نے یاوری کی۔ نوکری بھی مل گئی اَور چند سالوں کے بعد اُسے وہاں کی شہریت بھی حاصل ہوگئی۔ اُس نے بیوی کو بھی وہیں انگلینڈ میں بلالیا تھا۔

ایم اے کا امتحان دینے کے بعد میرا راجہ فیاض سے رابطہ منقطع ہوگیا۔ بس اِدھر اُدھر سے یہ پتہ چلتا رہا کہ وہ انگلینڈ سے جدّہ آ گیا ہے اَور وہاں ایک فرنچ فرم میں کمپیوٹر انجنیئر کی حیثیت سے بہت ہی اچھی تنخواہ لے رہا ہے۔ اُس کی دو بیٹیاں اَور ایک بیٹا ہے اَور بڑا آسودہ حال ہے ...... اور پھر ایک روز اس خبر نے مجھے ہلا کر رکھ دیا کہ راجہ فیاض نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔

سچی بات ہے مجھے اس اطلاع سے دلی صدمہ ہوا۔ ظاہر ہے کوئی شخص بھی یہ آخری اقدام شوقیہ کبھی نہیں کیا کرتا اَور مدتوں تک شدید کرب کی آگ میں جلنے کے بعد یہ انتہائی قدم اٹھاتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے ایک جگہ سے راجہ کا ایڈریس حاصل کیا اَور اُسے ہمدردی اور افسوس کا خط لکھا اَور دریافت کیا کہ اُس کی زندگی میں یہ اندوہناک واقع کیوں پیش آیا ہے؟

اُس کا جواب آیا کہ مَیں نے اپنی بیوی کے ساتھ چودہ سال کا عرصہ گویا حالتِ عذاب میں بسر کیا ہے۔ اُس عورت نے گویا قسم کھا رکھی تھی کہ ہر بات میں وہ میری مخالفت کرے گی۔ پھر شدید غصہ اَور چڑچڑا پن اُس کی شناخت بن گئی تھی چنانچہ گھر کا ماحول مستقل طور پر میرے لیے جہنم بن گیا تھا اَور اب تو میرے بچوں نے بھی اصرار کیا تھا کہ اُس سے علیحدگی اختیار کرلوں۔

اس مراسلت سے راجہ فیاض کے ساتھ میرے رابطے کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ اُس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ مَیں کسی اچھی عورت کا انتخاب کروں اَور اس کی شادی کرادوں۔ مَیں نے اس سلسلے میں کوشش کا آغاز بھی کردیا، مگر اُسی اثنا میں پتہ چلا کہ دو دوستوں نے اس کے لیے بیوی تلاش کرلی ہے اَور اس کی شادی بھی ہوگئی ہے۔

اللہ نے ۱۹۸۹ء میں مجھے اپنے خاص فضل سے پہلی بار حج کی سعادت عطا فرمادی۔ راجہ فیاض اُن دنوں جدہ ہی میں مقیم تھا۔ اس لیے اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں بلکہ اس کے گھر جانے کا اَور اس کی بیگم سے ملاقات کا موقع بھی مل گیا...... بے چاری ذرا بھی خوبصورت نہیں تھی۔ تب اُس نے بڑی بے بسی سے متذکرہ دونوں دوستوں کا گلہ کیا۔ ''مَیں نے تاکید کی تھی کہ کسی خوبصورت خاتون کا انتخاب کرنا لیکن ظالموں نے ایک ایسی عورت میرے سر منڈھ دی جو عمر میں مجھ سے بڑی ہے اَور خوبصورت بھی نہیں ہے''۔

راجہ فیاض بڑا امیر آدمی ہے۔ اسلام آباد کے ایک مہنگے، پوش سیکٹر میں اُس کی بہت بڑی کوٹھی ہے، لیکن سکون اور راحت نام کی کوئی چیز اُسے میسّر نہیں۔ بڑی بیٹی کی شادی ایک فوجی افسر سے کی، بہت جہیز دیا، لیکن بیٹی دو ننھے بچے چھوڑ کر ایک حادثے میں ہلاک ہوگئی۔ اکلوتا بیٹا انگلینڈ ہی میں رہتا ہے۔ دس سال پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی، مگر وہ اولاد سے محروم ہے۔ راجہ فیاض کی دوسری بیوی سے بھی کوئی اولاد نہیں ہے...... اس طرح اس کی زندگی کربِ مسلسل کی ایک تکلیف دہ داستان ہے اَور اس داستان کے ڈانڈے میرے خیال میں اس کے عشق سے ملتے ہیں۔ وہ عشق جو اس نے شادی سے پہلے محمودہ سے فرمایا تھا اَور پتہ نہیں اس کے وبال سے وہ کب نکلے گا؟ کاش اللہ اسے اب معاف کردے۔ کاش اُس کی یہ طویل آزمائش اُس کی غلطیوں کا کفارہ بن جائے کہ اب اُس نے اپنے حالات سے خاصی عبرت حاصل کرلی ہے اَور وہ ایک باعمل مسلمان کی زندگی گزار رہا ہے۔

(۲)

گورنمنٹ کالج گوجرانولہ سے تبادلے کے بعد جب میں لاہور منتقل ہوا تو جنوری ۱۹۸۰ء میں مَیں نے جس بستی میں اقامت اختیار کی وہاں فطری طور پر متنوع اَور منفرد رویّوں کے لوگ بستے تھے، مگر کم وبیش سب کے سب شریف اَور دیندار تھے۔ انہی میں میجر مجید بھی تھے۔ ساٹھ سے متجاوز تھے، لیکن متشرع صورت کے ساتھ وہ اب بھی ایک باوقار، خوبصورت شخصیت کے حامل تھے اَور اُن سے مل کر خوشی ہوتی تھی۔ دینِ اسلام کے ساتھ وہ اتنے کمٹڈ تھے کہ باوثوق ذرائع کے مطابق جب اُن کی پوسٹنگ لاہور میں تھی، تو ایک بڑے عالمِ دین کی محفل میں باوردی چلے جاتے تھے۔ وہ یقیناً بہادر آدمی تھے، مگر افسوس کہ گھر کے محاذ پر اُنہوں نے شکست فاش کھائی تھی۔ اُن کی چھ بیٹیاں تھی اَور چار بیٹے۔ سبھی خوبصورت تھے۔ بیٹیاں اس بستی کے کلچر کے برعکس بے پردہ تھیں۔ کھلے منہ آزادانہ گھومتی رہتیں اَور میجر صاحب کا اُن پر کوئی کنٹرول نہ تھا۔ بڑی بیٹی کی شادی تو اُنہوں نے خود قاعدے اصول سے کی، لیکن باقی کے معاملے میں انہیں شدید ترین پریشانیوں بلکہ رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک نے ریلوے کے ایک ٹکٹ کولیکٹر سے خود ہی شادی رچالی۔ ایک کا خاوند عین جوانی میں فوت ہوگیا اَور وہ ایک بیٹے کو لے کر مستقل طور پر باپ کے سر آپڑی۔ ایک کو طلاق ہوگئی اَور اس کے عقدِ ثانی کے سلسلے میں میجر صاحب غیر معمولی پریشان رہے۔

بیٹوں کا معاملہ اس سے بھی زیادہ ناخوشگوار رہا۔ بڑا بیٹا آٹھ دس سال پہلے غائب ہوگیا تھا۔ اُس کا پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں ہے اَور کیا کرتا ہے؟ البتہ باپ کی وفات کے بعد وہ ایک بار اپنے سے بڑی عمر کی ایک خاتون کے ساتھ آیا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ سارا عرصہ وہ کراچی میں مقیم رہا اور ایک ترک خاتون کے ساتھ بغیر نکاح کے زندگی گزارتا رہا۔

میجر صاحب کا ایک بیٹا ہیروئن پر لگ گیا اَور المناک موت سے دوچار ہوا۔ تعلیم کسی کی بھی مکمل نہ ہوئی۔ ایک نے طویل آوارہ گردی کے بعد کیری ڈبہ بنالیا اَور زندگی کی گاڑی کو لشتم پشتم کھینچنے لگا۔ صرف چھوٹا بیٹا ٹھیک انداز میں پاؤں پر کھڑا ہوسکا یہ الگ بات ہے کہ ایک حادثے میں اُس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا اَور وہ اب تک قدرے لنگڑا کے چلتا ہے۔

بہرحال اولاد کی بے عملی، بے راہروی اَور نالائقی نے میجر مجید کو ذہنی اَور عملی اعتبار سے شدید ترین اذیتوں میں مبتلا کیے رکھا۔ اُنہیں کبھی بھی سکھ کا سانس لینا نصیب نہ ہوا۔ مَیں نے اُنہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہ دیکھا۔ مسجد کے راستے میں بھی وہ سر نیہوڑائے، چپ چاپ چلتے رہتے۔ افسردگی اَور پژمردگی گویا ان کے چہرے پر کھنڈ گئی تھی۔ چنانچہ پہلے وہ شوگر میں مبتلا ہوئے اَور پھر ہارٹ کے مریض بن گئے اَور آخرکار اسی بیماریٔ دل کے ہاتھوں وہ زندگی ہار گئے۔

غور طلب بات یہ ہے کہ میجر مجید اولاد کے ہاتھوں عمر بھر مصائب و آلام میں کیوں مبتلا رہے۔ یہ بات تسلیم نہیں کرنی چاہیے کہ یہ سب کچھ محض تقدیر کا چکر تھا اَور جو کچھ ہوا محض اتفاق سے ہوگیا۔ ہمیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اللہ کی یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہے ہمارے اعمال کے نتیجے میں ہوتا ہے اَور خدا اَور خلقِ خدا کے ساتھ ہمارا روّیہ ہی ہماری تقدیر کی تشکیل کرتا ہے چنانچہ مجھے باخبر ذرائع سے پتہ چلا کہ یہ سارا شاخسانہ میجر صاحب کی لومیرج کا تھا۔

ہوا یوں تھا کہ نوعمری میں موصوف کی منگنی اپنی خالہ زاد سے ہوگئی تھی، لیکن انٹر کا امتحان دینے کے بعد جب وہ آرمی آفیسر بن گئے اَور کمیشن ملنے کے بعد باقاعدہ فیلڈ میں آ گئے، تو ان کے ایک سینئر آفیسر کی نہایت خوبصورت بیٹی نے انہیں شیشے میں اتار لیا اَور انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنی منگیتر سے شادی نہیں کریں گے۔ والد، والدہ اَور خالہ نے انہیں بہت قائل کرنے کی کوشش کی، خوشامدیں کیں، منتیں کیں، لیکن نوجوان کیپٹن مجید پر کسی کی بھی آہ وزاری کا اثر نہ ہوا اَور انہوں نے اپنی محبوبہ سے بیاہ رچالیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ والدین نے اَور سارے خاندان نے اُن کا بائیکاٹ کر دیا

اُور زندگی بھر اُن سے تعلق استوار نہ کیا۔ یوں بھی میجر صاحب کے ضمیر نے اگر کبھی انگڑائی لی بھی اُور انہوں نے اپنے خاندان کی شادی غمی میں شریک ہونا چاہا بھی تو ان کی بیگم نے سختی سے منع کر دیا۔ اُن کی بیگم یقیناً خوبصورت تھی، مگر بہت ہی بداخلاق اُور مغرور تھی۔ اُس کے غرور اُور خود پرستی کا یہ عالم تھا کہ عین بڑھاپے میں جب اُس کی عمر ستر برس سے متجاوز تھی اُور کتنے ہی عوارض نے اُسے گھیر رکھا تھا، اُس نے ایک روز قریبی بیکری کے مالک سے کہا ''مسعود بیٹے جب میری شادی ہوئی تھی اُور مَیں دلہن بن کر میجر صاحب کے گھر آئی تھی، تو ساری دنیا مجھے دیکھنے آئی تھی''۔

''لیکن آنٹی میں تو نہیں آیا تھا'' خوش مزاج مسعود صاحب نے چٹکی لی تھی اُور آنٹی جھینپ کر رہ گئی تھی۔

کیپٹن مجید نے محبوبہ سے شادی بھی کر لی، اُس کے دس بچے بھی ہو گئے، لیکن وہ خاندان سے مکمل کٹ کے رہ گیا، وہ والدین کی خدمت سے، دعاؤں سے عمر بھر کے لیے محروم ہو گیا نتیجہ یہ کہ زندگی اُس کے لیے جہنم بن کر رہ گئی۔ ہر آنے والا دن اُس کے کرب اُور اذیّت میں اضافہ کرتا رہا۔ اُس نے گھبرا کر دینداری کے حصار میں پناہ لینی چاہی، لیکن یوں لگتا ہے کہ خدا نے اُس کی مجبورانہ ''توبہ'' قبول نہ کی اُور اسے اولاد کے حوالے سے بدترین حالات کا سامنا کرنا پڑا جس میں وہ ایک لمبے عرصے تک مبتلا رہا تا آنکہ موت نے اس کی مشکل آسان کر دی شاید غالب نے میجر مجید ہی کے لیے کہا تھا ؎

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
مَیں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

(۳)

میرے آبائی گاؤں (واقع ضلع سیالکوٹ) سے دو کلو میٹر کے فاصلے پر ایک بڑا قصبہ ہے۔ چودھری محمد شریف وہیں کے رہنے والے تھے۔ سابق فوجی تھے اُور صوبیدار سے ریٹائر ہو کر اب زمیندارہ کرتے تھے۔ بہت نیک نہاد، مخلص اُور باعمل مسلمان تھے اُور اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں یاد کر کے اب بھی خوشی محسوس ہوتی ہے۔

اولاد کے حوالے سے چودھری محمد شریف بہت خوش نصیب واقع ہوئے تھے۔ اُن کے چھے بیٹے اُور دو بیٹیاں تھیں۔ سب مجموعی اعتبار سے خوش اخلاق اُور اچھی سرشت رکھنے والے تھے۔ سبھی نے مناسب تعلیم حاصل کی ان میں سے چار بھائی مختلف محکموں میں ملازم ہیں جبکہ دو زمیندارہ کرتے ہیں۔

راشد اِن سب میں شوخ، چنچل اُور چلبلی طبیعت کا مالک تھا۔ حالانکہ اس نے بی ایس سی تک تعلیم حاصل کی اُور پھر اُسے فوج میں کمیشن مل گیا، مگر اُس کے مزاج کا کھلنڈرا پن کبھی بھی کم نہ ہوا بلکہ غیر سنجیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ وہ جب بھی رخصت پر گھر آتا، ملاقات کے لیے میرے پاس ضرور آتا تھا اُور عجیب بات ہے کہ ہمیشہ بے وقت آیا کرتا یعنی رات کو خاصی تاخیر کے ساتھ۔ مَیں بہت زِچ ہوا کرتا، برملا اپنی خفگی کا اظہار بھی کرتا، لیکن وہ میرے ردِعمل کو قہقہوں میں اُڑا دیا کرتا۔ کہا کرتا.....I am regular in irregularity یعنی میں بے قاعدگی کے معاملے میں بہت بااصول ہوں۔

راشد بڑبولا بھی بہت تھا۔ چھچھورا پن اُس کے مزاج کا لازمی حصہ تھا۔ جو فضول حرکتیں وہ اِدھر اُدھر کرتا اُس کو فخر سے بیان کرنے میں کوئی حرج محسوس نہ کرتا جس سے اندازہ ہوا کہ جس

زمانے میں وہ اکیڈمی میں ٹریننگ پر تھا، ان دنوں بھی وہ وقتاً فوقتاً ایبٹ آباد کے ہوٹلوں میں چکر لگایا کرتا اَور آوارہ پیشہ ور لڑکیوں سے مراسم استوار رکھتا۔ یہ حقیقت تکلیف دہ ہے کہ ایک انتہائی نیک اَور باعمل باپ کا بیٹا ہونے کے باوجود راشد شرم و حیا اَور شرافت سے محروم تھا۔ باخبر لوگوں نے بتایا کہ جب وہ رخصت پر اپنے قصبے میں آیا کرتا تھا تو اِدھر اُدھر جھک مارے بغیر نہیں رہتا تھا۔

اَور پھر راشد کی شادی ہوگئی۔ اُس کی بیوی ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھی اَور سونے پر سہاگہ یہ کہ وہ بھی آرمی میں کیپٹن آفیسر تھی۔ وہ ایک ایسے ریٹائرڈ سول جج کی بیٹی تھی جو رشوت اور کرپشن کے حوالے سے بڑا ہی بدنام تھا اَور اس کا خاندان غرور اَور بداخلاقی میں ایک خاص شہرت رکھتا تھا۔ ان کی بداخلاقی اَور سفاکی کو مَیں نے راشد کی شادی والے دن اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ جوہر ٹاؤن لاہور میں ایک کھلی جگہ پر ٹینٹ لگے تھے اَور وہاں بارات کے لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ دس گیارہ سال کا ایک بچہ بھی وہیں کھانے میں مصروف تھا۔ راشد کے سسرال میں سے ایک شخص نے اُس سے بڑے رعب سے پوچھا تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو؟ اَور ابھی وہ کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ اُس شخص نے ایک تھپڑ اُسے اس طرح پورے زور سے مارا کہ وہ بے چارا لڑھکنیاں کھاتا ہوا دور جا گرا۔ پھر دوڑ کر اُسے پکڑا اَور اس کی خوب پٹائی کی۔ مَیں یہ منظر دیکھ کر کھانا نہ کھا سکا اَور دیر تک کرب میں مبتلا رہا۔

راشد کے سسر کو جاننے والے ایک شخص نے مجھے ایک اور عجیب بات سنائی جس سے اس خاندان کے کردار پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ اس نے بتایا کہ راشد کی دو سالیوں کی شادی ہو رہی تھی۔ ہال میں مخلوط محفل جمی تھی۔ اسٹیج پر دونوں دولہے بیٹھے تھے۔ وہیں دلہنوں کو لایا گیا۔ اُن میں سے ایک لڑکی نے جب اپنے دولہا کو دیکھا تو اس نے زور سے چیخ ماری اور اٹھ کر بالکل فلمی انداز میں شور مچانے لگی کہ میں اس شخص کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی، یہ بدصورت ہے، مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔ اُس نے دلہنوں والی مخصوص چادر سر سے اٹھا کر پٹخ دی، چوڑیاں توڑ کر پھینک دیں اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں راشد کے سسر اَور خاندان کی وہ بھد اُڑی کہ الامان والحفیظ۔

ماشاء اللہ اس ''ہمہ آفتاب'' خاندان کی ایک چشم و چراغ ڈاکٹر اَور آرمی کیپٹن لڑکی سے راشد کی شادی ہوئی، تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے اَور اس کی آنکھیں پھر اس طرح چندھیا ئیں کہ باقی ہر چیز اوجھل ہو کر رہ گئی۔لڑکی کے باپ نے شرط عاید کی کہ میری بیٹی ایک دن کے لیے بھی راشد کے آبائی گھر میں نہیں جائے گی۔اس کے نیک دل والد خود انہیں ملنے کے لیے متعلقہ چھاؤنی میں گئے، تو بہو کے طرزِ عمل سے اس قدر بددل اَور خوفزدہ ہوئے کہ واپس آکر چند ہی روز کے بعد انہیں سینے میں شدید درد اٹھا اَور جانبر نہ ہو سکے۔

راشد کی بیوی نے سختی سے منع کر دیا کہ اُس کے والدین یا بہن بھائیوں میں سے کوئی انہیں ملنے نہیں آئے گا۔ وہ اس کی تنخواہ پر قبضہ کر لیتی اَور معمولی جیب خرچ کے سوا اُسے کوئی پیسہ ادا نہ کرتی۔راشد اُس سے اتنا مرعوب ہوا کہ اپنی باگیں بالکل ہی اس کے ہاتھ میں دے دیں، قسطوں پر ایک پلاٹ خریدا تو وہ بھی بیوی کے نام پر۔راشد جیسا کہ عرض کر چکا ہوں بہت بڑبولا ہے، کوئی بات چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔میری اُس سے ملاقاتیں بہت طویل عرصے کے بعد ہوتی تھیں، لیکن جو کچھ اُس کے دل و دماغ پر گزرتی، من و عن کہہ دیتا۔ایک مرتبہ بتایا میری بیگم گھر پر میری مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے۔ باقاعدہ حکم چلاتی ہے، میری مجال نہیں کہ کسی بچے کو ٹوک سکوں، کسی کو گھر پر چائے کے لیے بلا سکوں۔وہ باقاعدہ ڈانٹتی ہے، شاؤٹ کرتی ہے۔ایک مرتبہ تو راشد نے ایک ایسی بات سنائی کہ مَیں چکرا کر رہ گیا اَور اس شخص کی بے غیرتی پر دیر تک حیران رہا۔''ایک بار ہم راولپنڈی سے اپنی گاڑی پر لاہور آرہے تھے، وزیر آباد پہنچے تو مَیں نے بیگم سے کہا ''ماں سے ملے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔کیا ہی اچھا ہو کہ ہم یہاں سے گوجرانوالہ جانے کی بجائے سمبڑیال کی طرف مڑ جائیں اَور ماں کی دعائیں حاصل کرتے جائیں''۔

''نہیں نہیں، ہرگز نہیں، ہم گاؤں نہیں جائیں گے، مَیں اس کتیا کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی''

اُس کے الفاظ تھے۔"I don't want even to see that bitch"

اس انتہائی شرمناک مثال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ راشد کی بیگم کس قماش کی عورت تھی

اُور راشد اُس کے سامنے بے غیرتی کی کس پستی میں گر گیا تھا اُور اُسے اپنی بزدلی کی وجہ سے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھتا تھا۔

چنانچہ ایک بار میرے گھر پر بیٹھ کر وہ شدید ترین کرب کا اظہار کرتا رہا۔ کہنے لگا "مَیں زندگی سے اس قدر تنگ آ گیا ہوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ یا خودکشی کر لوں، یا کشمیر جا کر شہید ہو جاؤں"۔ لیکن نہ اس نے خودکشی کی اُور نہ وہ کشمیر گیا بلکہ فوج سے ریٹائرمنٹ لے کر امریکہ بھاگ گیا۔ اُور پتہ نہیں اپنے مزاج اُور ضرورت کے مطابق وہاں کیا گُل کھلا رہا ہو گا؟

(۴)

فاضل صاحب میرے دور کے عزیز ہیں۔ اگر چہ وہ ایف اے سے آگے تعلیم حاصل نہیں کر سکے تھے، لیکن دنیاوی اعتبار سے خاصے خوش نصیب تھے۔ باپ زمیندار تھے۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے، اُنہوں نے چند ایکڑ زمین اپنے پاس رکھی، باقی اپنی زندگی ہی میں دونوں بیٹوں میں برابر تقسیم کر دی۔ فاضل صاحب نے ڈسپنسرز کورس کر لیا اَور قصبے میں ایک میڈیکل سٹور بنا لیا اَور پریکٹس بھی شروع کر دی جوان کی خوش اخلاقی، دیانت داری اَور ملنساری کی وجہ سے بہت اچھی چل پڑی اَور وہ چند سالوں کے اندر بہت آسودہ حال ہو گئے۔

فاضل صاحب اس لحاظ سے بھی خوش نصیب تھے کہ اللہ نے اُنہیں چار بیٹے اَور ایک بیٹی عطا کی تھی۔ بیوی خوبصورت نہیں تھی، لیکن بہت سلیقہ منداَور سگھڑ تھی اَور فرمانبردار بھی، اس لئے بظاہر فاضل صاحب کی زندگی بڑے اطمینان سے گزر رہی تھی اَور سارے عزیز واقارب اُن پر رشک کرتے تھے۔

لیکن فاضل صاحب کی بدقسمتی کہ مقامی سول ہسپتال کی ایک نرس سے اُن کا تعارف ہو گیا۔ یہ خاتون بہت شوخ اَور چنچل تھی، بات کرنے کا فن جانتی تھی اَور سب سے بڑھ کر اس کی مسکراہٹ میں ایک دلآویزی تھی، چنانچہ فاضل صاحب کی اس سے دوستی بڑھتی چلی گئی۔ روز کی ملاقاتیں معمول بن گئیں اَور پھر ایک دن انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ لازماً پروین سے شادی کر لیں گے۔

فاضل صاحب کا اعلان پورے خاندان کے لیے دھماکا خیز ثابت ہوا۔ ہر ایک نے شدید مخالفت کی، ہر ایک نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، انہیں احساس دلایا کہ ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس لئے مستقبل میں بہت سے مسائل پیدا ہوں گے، لیکن فاضل صاحب نے کسی

کی ایک نہ سنی اور پروین سے زبردستی شادی رچالی۔ اس کے لئے علیحدہ مکان کا انتظام اُنہوں نے کر لیا تھا۔

اَور اس عشق کا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ پہلی بیوی اَور بچوں نے اُن کا بائیکاٹ کر دیا اَور چند سال کے اندر اندر پروین سے اُن کی یکے بعد دیگرے چار بیٹیاں پیدا ہو گئیں۔ بڑی بیٹی کی عمر اٹھارہ برس ہے، پروین کی انتہائی خواہش ہے کہ وہ ڈاکٹر بنے اَور مستقبل میں اُس ہسپتال کی نگرانی کرے جو دونوں میاں بیوی نے مل کر بنایا ہے اَور کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس مقصد کی خاطر پروین نے اصرار کر کے قریبی بڑے شہر میں ایک مکان کرائے پر حاصل کیا ہے وہیں بیٹی کو ایک کالج کی پری میڈیکل کلاس میں داخلہ دلایا ہے اَور فاضل صاحب کو پابند کیا ہے کہ وہ سارے کام چھوڑ کر وہاں بیٹی کے پاس رہیں، اس کی تعلیم کی نگرانی کریں، ٹیوشن کا انتظام کریں تا کہ اُسے لازماً میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے اَور وہ ڈاکٹر بننے میں کامیاب ہو جائے۔

حالت یہ ہے کہ مختلف تفکّرات نے فاضل صاحب کو شدید ڈیپریشن میں مبتلا کر دیا ہے بیٹیاں جوانی کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ دیگر مسائل اس کے علاوہ ہیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ شوگر کے مریض بن گئے ہیں اَور بڑھاپا بڑی تیزی کے ساتھ ان پر طاری ہوتا جا رہا ہے۔ افسردگی اَور پژمردگی اُن کی شخصیت کا لازمی حصہ بن گئی ہے اَور وہ اُس وقت کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں جب پہلے پہل پروین سے اُن کی دوستی استوار ہوئی تھی۔ اس طرح حسرت اور پشیمانی اُن کی زندگی کا لازمہ بن گئی ہے اَور وہ زبانِ حال سے اس شعر کو الاپتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

سخت کافر تھا جس نے پہلے مؔیر
مذہب عشق اختیار کیا......،

(۵)

۲۴ر نومبر ۲۰۰۶ء بروز جمعہ کو ساڑھے نو بجے صبح اے ٹی وی چینل سے ''مارننگ وِد فرح'' پروگرام میں ایک بڑی ہی عبرت ناک کہانی دکھائی اَور سنائی گئی تھی۔ پروگرام کی کمپئر فرح کے قریب موٹی چادر میں مکمل چھپی ہوئی ایک خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔فرح نے بتایا کہ اس لڑکی کا نام نویدہ ہے،اس کا تعلق لاہور سے ہےاَور یہ ابھی اپنی کہانی اپنی زبانی آپ کو سنائے گی۔

یہ کہہ کر فرح نے چادر اس خاتون کے چہرے سے ہٹائی تو ایک انتہائی دہشت ناک منظر سامنے تھا۔ کتنے ہی لوگ اس منظر کو دیکھ کر خوف سے کانپ اُٹھے ہوں گے اَور خواتین نے چیختے ہوئے آنکھوں کے سامنے ہاتھ رکھ لئے ہوں گے۔ جو چہرہ نظر آیا وہ انسان کی بجائے کسی آسیب کا چہرہ تھا۔ سر کی اَور چہرے کی ساری جلد جل چکی تھی، بال مکمل غائب تھے، آنکھوں کی جگہ دو گڑھے تھے، ناک جل کر اپنا وجود ختم کر چکی تھی اَور کان غائب تھے، ہونٹ معدوم ہو گئے تھے اَور دانت انتہائی ڈراؤنا منظر پیش کر رہے تھے۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ کسی سفاک آدمی نے اس بے چاری عورت پر تیزاب خاصی مقدار میں پھینکا ہے اَور اُس کے حلیے کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

اب فرح کے مطالبے پر اُس خاتون ......نویدہ...... نے اپنی کہانی سنائی۔ اُس نے بتایا: مَیں نے ۱۹۹۵ء میں ''لومیرج'' کی تھی۔ ایک نوجوان سے تعلق قائم ہو گیا اَور مَیں نے اُس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ سارے خاندان نے روکا، والدین نے، بھائی بہنوں نے اَور بہنوئی نے بہت سمجھایا، لیکن مجھ پر عشق کا بھوت سوار تھا، مَیں نے کسی کی نہ سُنی اَور زبردستی شادی کر لی۔

لڑکے نے مجھے چکمہ دیا تھا کہ ہمارا بہت اچھا کاروبار ہے۔ ہم بہت امیر ہیں، لیکن شادی کے بعد پتہ چلا کہ سب کچھ جھوٹ تھا۔ لڑکا مکمل بے روزگار تھا اَور گھر میں امیری یا کشادگی کا نام و

نشان نہ تھا، تاہم مَیں نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا اُور سلائی کڑھائی کر کے گھر چلانے لگی۔ اس دوران میرے دو بیٹے بھی ہو گئے۔

میرے خاوند نے مزید دھوکا یہ دیا کہ اپنی خالہ زاد سے شادی کر لی۔ مَیں نے احتجاج کیا اُور طلاق کا مطالبہ کر دیا تو اس ظالم نے کھڑے کھڑے تین طلاقیں دے دیں۔

اس واقعے کو نو سال گزر گئے۔ ۲۰۰۴ء میں میرے سابق خاوند نے مطالبہ کیا کہ لڑکوں کو میرے حوالے کر دیا پھر دس لاکھ روپے دو۔ مَیں نے کسی نہ کسی طرح انتظام کر کے چار لاکھ روپے اُسے دے دیئے، لیکن اس بد بخت نے پھر بھی میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا اُور وہ حالت بنا دی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ اب مَیں نہ زندوں میں ہُوں نہ مُردوں میں...... زندگی میرے لئے ایک عذاب اُور تہمت بن گئی ہے۔

آخر میں نویدہ نے فرح کے کہنے پر اپنے ناظرین کو پیغام دیا: مَیں محبّت کے چکر میں پڑنے والی ہر لڑکی سے درخواست کروں گی کہ خدارا اس بکھیڑے میں نہ پڑنا۔ عشق جتانے والے سب لڑکے دھوکے باز اُور جھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ عشق کا بُھوت صرف چھ مہینے زندہ رہتا ہے، پھر زندگی کی حقیقتیں اس کا وجود ختم کر دیتی ہیں...... نویدہ نے زور دے کر کہا: والدین جو مشورہ دیں، جو نصیحت کریں اُس کو ردّ نہ کرنا، ورنہ پچھتائیں گے، میری طرح ساری عمر روئیں گے۔

باب: ۱۰

کانٹے بونے والوں کا کانٹے ہی مقدّر ہیں

چودھری محمد اکرم رانجھا سپریم کورٹ کے ایک لائق اور معروف وکیل ہی نہیں بلکہ حیرت انگیز طور پر بہت اچھے ادیب اُور انشا پرداز بھی ہیں۔ اُنہوں نے ساندل بار کی مخصوص دیہاتی زندگی کے مشاہدات اُور عبرت انگیز واقعات کو اس قدر خوبصورتی سے دلکش ادبیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ ادب و انشا ہی نہیں بلکہ مقصدیت کا زندۂ جاوید نمونہ بن گئے ہیں۔ اس نوعیت کے واقعات پر مشتمل اُن کے مضامین کا ایک مجموعہ ''مخفی ہاتھ'' کے عنوان سے چند سال پہلے شائع ہوا تھا۔ اِن سچی کہانیوں میں اُنہوں نے یہ بتایا ہے کہ ظلم اُور زیادتی کے اِن واقعات میں ظالم حالانکہ بہت طاقتور اُور بااثر ہوتا ہے مگر خالقِ کائنات کا مخفی ہاتھ حرکت میں آتا ہے اُور جفاکار لوگ لازماً کیفرِ کردار کو پہنچ جاتے ہیں۔

مَیں موضوع کی مناسبت سے محترم رانجھا صاحب کے اِن مضامین کی تلخیص اپنی کتاب میں شامل کر رہا ہُوں۔ جو قارئین موصوف محترم کی تحریر کے حُسن سے لطف اندوز ہونا چاہیں وہ اُن کی کتاب ''مخفی ہاتھ'' کا مطالعہ فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

(۱)

یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے میری عمر بارہ سال تھی۔ والدہ محترمہ کی آنکھ کا آپریشن تھا اُور اس سلسلے میں مَیں اپنے قریبی قصبے کوٹ مومن (ضلع سرگودہا) میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ایک روز شام سے پہلے مَیں نے قصبے کے بڑے بازار میں ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا، خوش پوشاک نوجوان جس کے

چہرے پر غرور اور تمسخر کی علامتیں بڑی واضح تھیں، چہک رہا تھا، اُس کے گرد ایک ہجوم جمع تھا اور ایک نحیف و نزار بوڑھا، پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے منتیں کر رہا تھا۔

پتہ چلا کہ نوجوان قصبے کا معروف زمیندار سمندا ہے۔ وہ اپنے خاص کردار کی وجہ سے پورے علاقے میں مشہور تھا۔ اس کے سامنے بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ اس کا تعلق ایک بہت بڑے خاندان سے تھا۔ اس کے باپ کے تین بھائی تھے اور اُن کے بیٹے، پوتے بیسیوں کی تعداد میں تھے۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر شہ زور اور سرکش تھے، وسیع زمینیں تھیں، مال مویشی، باغات، صحت، طاقت، دبدبہ غرض انہیں سب نعمتیں میسّر تھیں، لیکن خوفِ خدا، رحم اور انصاف کی ان میں شدید ترین کمی تھی...... یہی وجہ ہے کہ پورا علاقہ ان سے خوفزدہ تھا۔ کوئی خوبصورت لڑکی اُن سے سلامت نہ تھی، جس کو چاہتے، جب چاہتے اُٹھا لیتے تھے۔ کوئی اُن کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا۔

کوٹ مومن کے بازار میں اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ سمندا نفیس تہ بند اور بوسکی کی قمیض میں ملبوس، اونچا شملہ لگائے شام کی سیر کو نکلا تھا۔ وہیں ایک موچی جوتے فروخت کر رہا تھا۔ اس نے زری کا ایک قیمتی جوتا لیا اور پہن لیا اور جب موچی نے اس کی قیمت طلب کی تو اُس نے قہقہہ لگایا اور اس کا تمسخر اُڑانا شروع کر دیا...... ''دیکھو ابھی چند روز پہلے میں تمہارے گاؤں دیوال کے زمینداروں کی لڑکی لے کر آیا ہوں، اس طرح تمہارا تعلق بھی میرے سسرال سے ہے، جاؤ خاموشی سے چلے جاؤ، دامادوں سے جوتے کی قیمت نہیں لیا کرتے۔''

غریب موچی سمندے کی بات سن کر بے اختیار رونے لگا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر منت سماجت کرنے لگا، لیکن سمندے پر اُس کی آہ وزاری نے کوئی اثر نہ کیا۔ وہ قہقہے لگاتا رہا اور موچی کا مذاق اُڑاتا رہا۔ کوئی نہیں تھا جو اُسے سمجھاتا، اس ظلم سے روکتا۔

سمندے اور اُس کے خاندان کی چیرہ دستیاں جب حد سے بڑھ گئیں تو خدا کا کوڑا حرکت میں آ گیا اور اِن کے درمیان قتل و غارت کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ جس نے اس پورے خاندان کو

برباد کر کے رکھ دیا۔ اکرام رانجھا صاحب اس عبرت ناک، دلدوز کہانی کی تفصیلات یوں بیان کرتے ہیں:

پندرہ بیس سال گزر گئے، ایک واردات میں مجھے بیس برس کی سزا ہوگئی اُور مَیں سنٹرل جیل ملتان کی بی کلاس بیرک میں قیدی کی حیثیت سے داخل ہوا تو میرا استقبال ایک دبلے پتلے نوجوان نے کیا۔ وہ بھی عمر قید بھگت رہا تھا اُور قیدیوں کے اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جو لاوارث سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے وارث یا تو ہوتے ہی نہیں یا پھر وہ دور دراز کی جیلوں میں آ کر انہیں ملنے سے قاصر ہوتے ہیں...... یہ نوجوان کوٹ مومن والے اُسی سمندا کا چھوٹا بھائی یارا تھا۔ یارا نے اپنی داستان میاں محمد اکرم رانجھا کو بڑی تفصیل سے سنائی:

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے میرا بھائی سمندا پورے قصبے کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ کوئی نوجوان ایسا نہیں تھا جس کے بدن پر اُس کی لاٹھی کا نشان نہ تھا اُور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ ہماری برادری بہت بڑی اور ہمارا اتفاق علاقے بھر میں ضرب المثل بن گیا تھا۔ دنیا جہاں کا عیش ہمیں حاصل تھا اُور ہر دنیاوی نعمت میّسر تھی۔

لیکن آخر کار بے شمار لوگوں کی بددعائیں رنگ لے آئیں اُور ایک معمولی سے واقعے نے وہ چنگاری سلگائی جو بعد میں الاؤ میں تبدیل ہوگئی اور جس نے ہماری ساری شان وشوکت خاک میں ملادی...... ہوا یوں کہ ایک رات خاندان کے سارے نوجوان گھر کے وسیع صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اُور لالٹین بجھ گئی۔ سمندا اُور اُس کا چچازاد مہرا ایک چارپائی پر تھے اُور کھانے کے دوران سرگوشیوں اُور قہقہوں میں مصروف تھے وہ نہ صرف ہم عمر تھے بلکہ ہمراز اُور ہم مشرب بھی تھے۔ اُن دونوں کی آشنائی باہمی رضامندی سے، ایک ہی عورت سے تھی اور کھانا کھاتے ہوئے یہی عورت اُن کا موضوعِ گفتگو تھی۔

لالٹین بجھنے سے اندھیرا چھا گیا، اس لئے چہروں کے تاثرات دیکھے نہیں جاسکتے تھے، سمندا نے مہرا پر مذاق سے کوئی چوٹ کی اُور پیار سے اُس کے گال پر ہلکی سی چپت لگادی۔ مہرے نے

اندھیرے میں اس چپت کو سنجیدگی سے لے لیا اُور جواب میں پوری قوت سے زوردار تھپڑ سمندے کے منہ پر جڑ دیا...... بَس پھر کیا تھا، سمندا بپھر گیا۔ دونوں جانب سے مُکّوں اُور لاتوں کا مینہ برسنے لگا اُور دونوں نے ایک دوسرے کے بال زور زور سے کھینچے۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہو گیا...... خاندان کے سب چھوٹے بڑے کھڑے ہو گئے اُور اُنھوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ وقتی طور پر صلح صفائی ہو گئی، لیکن لگتا ہے کسی خفیہ قوت نے ساری صورتِ حال کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، چنانچہ دوسرے روز صبح ایک غلط فہمی پر دونوں چچا زاد بھائیوں کے درمیان اس بُری طرح جنگ ہوئی کہ سمندے کا بھائی فتّہ مہرے اُور اس کے بھائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ مہرا اُور اس کے چار بھائی گرفتار ہو گئے۔

خاندان والوں نے پھر مداخلت کی۔ صلح صفائی کی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ مہرے کی چار بہنیں ہم چار بھائیوں کے نکاح میں دے دی گئیں اُور ہم نے بھائی فتّے کا خون معاف کر دیا۔ اِس طرح اُمید پیدا ہو گئی کہ سارے معاملات درست ہو جائیں گے اُور آپس کی غلط فہمیاں رفع ہو جائیں گی، لیکن قدرتِ خداوندی کا مخفی ہاتھ کام کرتا رہا۔ سیشن کورٹ میں شہادتیں دینے کا وقت آ گیا۔ چونکہ صلح ہو چکی تھی، ہمارے نکاح بھی ہو چکے تھے، اس لیے ہم نے مقدمے کی تیاری کی نہ کوئی وکیل مقرر کیا۔

دوسری صبح ہم کچہری پہنچے۔ مہرا اُور اُس کے چاروں بھائی پولیس کی حراست میں سیشن کورٹ کے احاطے میں داخل ہوئے۔ چونکہ انہیں بھی صلح کی اطلاع ہو چکی تھی، اس لئے وہ بہترین لباس پہن کر، شملے لگا کر آئے تھے۔ ہم دونوں فریق احاطے میں اکٹھے بیٹھے تھے کہ اچانک سمندا للکارتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اُور غضب ناک آواز میں بنکارا: ''میرے بھائی فتّے کو قتل کر کے پھر شملے لگاتے ہو، سن لو، میری کوئی صلح نہیں'' چنانچہ کھیل بگڑ گیا، صلح ختم ہو گئی۔ مقدمے میں ہماری کوئی تیاری نہیں تھی، اس لیے وکیلِ صفائی کی جرح کے جواب میں ہم غلط سلط پتہ نہیں کیا کیا بول گئے۔ سیشن جج کے علم میں یہ بات آ گئی کہ چار رشتے لینے کے باوجود سمندا پارٹی نے دھوکا دیا ہے اُور صلح

پر کاربند نہیں رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مہرا اُور اُس کے بھائی بری ہوگئے۔

اس واقعے کو تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز سمندا شیر کی طرح دھاڑتا ہوا فریقِ مخالف پر حملہ آور ہوگیا۔ ہم بھائیوں نے بھی ساتھ دیا۔ مہرا پارٹی کا ایک شخص قتل ہوگیا۔ بہت سے زخمی ہوئے۔

ہم چاروں بھائیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ مقدمہ چلا، سمندے کو پھانسی ہوگئی، باقی عمر قید بھگت رہے ہیں۔ ماں باپ پیچھے مرگئے، ہم اُن کے جنازوں میں بھی شامل نہ ہوسکے۔ جوان بہنیں ہیں وہ اکیلی ملاقات کو نہیں آسکتیں..... مہرے کی چار بہنیں ہمارے نکاح میں ہیں اُن کی زندگیاں بھی برباد ہیں۔ زمین، باغات، مال مویشی سب مقدمہ بازی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب ہمارا کچھ بھی نہیں رہا، نہ خاندان، نہ برادری، نہ جتھا۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ سب کُچھ کیوں ہُوا؟ نہ مہرا اُور اُس کے بھائی ہمارا نقصان چاہتے تھے اُور نہ ہم اُن کے دشمن تھے، پھر یہ سب کچھ کیوں ہوا، کیسے ہوگیا؟

یہ کہتے ہوئے یارا بے اختیار رونے لگا، اُس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اُور وہ سسکیاں لیتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں بار بار کہتا رہا، یہ سب کچھ کیوں ہوگیا، ہم تو ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے۔

اُور یارے کے آنسو مجھے پندرہ برس پیچھے لے گئے۔ مَیں نے دیکھا کہ کوٹ مومن کے ایک بازار میں ایک مغرور گبرو زمیندار جتاتی قہقہے لگا رہا تھا اُور ایک غریب، پھٹے حالوں موچی اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے، زار زار روتا ہوا فریاد کر رہا تھا، مگر متکبّر زمیندار کے تیوروں پر اس کا ذرا بھی اثر نہیں ہو رہا تھا..... اُور یہ تو ایک مثال تھی نہ جانے سمندے اُور اس کے بھائیوں اُور عم زادوں کے ہاتھوں کتنی عزّتیں پامال ہوئی تھیں، کتنے بے گناہ لوگوں کی انا مجروح ہوئی تھی اُور کتنی فریادیں تھیں جو سینوں میں گھٹ کے رہ گئی تھی.....لوگ سمجھتے ہیں یہ دنیا اندھیر نگری ہے، نہیں اس کا ایک خالق و مالک بھی ہے اُور جب اُس کا قہر حرکت میں آتا ہے تو وقت کے بڑے بڑے فرعون بھی بے بس اُور لاچار ہوجاتے ہیں۔

(۲)

یہ ۱۹۰۰ء کی بات ہے۔ ضلع سرگودھا میں دریائے جہلم کے کنارے گوندلوں کی وسیع آبادیاں تھیں۔ یہ لوگ اُس زمانے کے مطابق ہر لحاظ سے خوشحالی اَور فارغ البالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ جوار اَور باجرے کی روٹی، دودھ، دہی اَور لسی کے ساتھ کھاتے۔ پیلو کا پھل عام تھا اَور وہ اسے رغبت کے ساتھ نوش کرتے تھے۔ ابھی نہری پانی نہیں آیا تھا، چراگاہیں عام تھیں، گائے بھینس کا دودھ، بھیڑ بکری کا گوشت عام تھا، کاشت کاری برائے نام تھی۔ نوجوان صرف گلہ بانی کی مشقت کے عادی تھے اَور اس کے ساتھ کبڈی، کشتی اَور پرکوڈی کے کھیل روزمرّہ کا معمول تھے۔ صحتوں کا یہ عالم تھا کہ ایک نوجوان ایک وقت میں بارہ سیر دودھ پی جاتا، سالم بکرا بھون کر کھا جاتا اَور ایک ہی ہلّے میں دریا کو تیر کر عبور کر جاتا اَور دوسرے کنارے کو چھو کر فوراً ہی واپس آ جاتا۔

گوندلوں کی ایسی ہی ایک آبادی کا ایک نوجوان سب سے بانکا سجیلا تھا۔ صحت، جوانی، فارغ البالی اور قبیلے کی قوّت کا گھمنڈ اَور سب سے بڑھ کر خوفِ خدا سے بے نیازی، چنانچہ یہ نوجوان اپنے انداز واطوار میں شترِ بے مہار بن گیا تھا اَور لاٹھی ہاتھ میں لے کر، شاہانہ لباس پہن کر وہ آبادی کی گلیوں میں عاد و ثمود کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتا اَور گردن تانے، اکڑتا ہوا نظر آیا کرتا۔

ایک روز ساون کے مہینے میں جب کہ بارشوں نے سارا گردوغبار دھو دیا تھا اَور موسم بہت خوبصورت تھا، یہ نوجوان دیدہ زیب لاچہ اَور لمبی قمیض پہن کر، سر پر طرّے دار پگڑی رکھ کے، اَور ہاتھ میں اپنا محبوب ہتھیار بلّم لے کر دریا کے کنارے اپنی بھینسوں کو دیکھنے کے لیے نکلا۔ واپسی پر اُسے راستے سے ہٹ کر ایک جھونپڑی نظر آئی۔ جس کے سامنے دو بچے کھیل رہے تھے اَور قریب ہی ایک کتیا آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی اور اُس کے دو ننھے پلّے اس کے تھنوں سے

لپٹے دودھ پی رہے تھے۔

نوجوان گوندل کتیا کے قریب آیا تو کتیا غرّانے لگی۔ نوجوان کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ وہ اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا جس پر کوئی انسان بھی ٹیڑھی آنکھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتا تھا چہ جائیکہ ایک حقیر، پلید کتیا یہ جسارت کرے۔ گوندل نے ایک قدم آگے بڑھایا تو وہ پھر غرّائی، اِس پر اُس نے غضب ناک نگاہوں سے دیکھا اُور اگلے ہی لمحے اس نے بلّم کی انی کتیا کے پیٹ میں اتار دی۔ وہ چیخی بلبلائی تڑپی اُور پھر ٹھنڈی ہوگئی۔

بے گناہ کتیا مرگئی، جھونپڑی کے دونوں لڑکے خوب روئے، کتیا کے دونوں بے زبان بچے چیختے رہے، ان کے سوا کسی نے اس ظلم پر احتجاج نہ کیا اُور بات آئی گئی ہوگئی۔

اس واقعے کو چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک روز اس نوجوان گوندل کا اپنے چچازاد بھائی سے جھگڑا ہوگیا اُور اس کے دوسرے ہی روز رات کو وہ قتل ہوگیا۔ قاتل لاش کو دریائے جہلم میں بہا آئے، لیکن اگلی صبح لاش اُس مقام پر کنارے سے آ لگی جہاں نوجوان گوندل کی بھینسیں بیٹھی جگالی کر رہی تھیں۔ چنانچہ مقتول کے باپ نے مذکورہ نوجوان ہی کو قاتل قرار دیا اُور تھانے میں ایف آئی آر درج کرادی۔ اُسے گرفتار کرلیا گیا اُور گجرات جیل بھیج دیا گیا۔

مقدمہ سیشن سپرد ہُوا۔ سیشن جج میانوالی انگریز تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوکر شاہ پور آیا، پھر دورہ کرتے ہوئے گجرات پہنچا۔ وہیں کیس کی سماعت ہوئی اُور نوجوان گوندل کو موت کی سزا ہوئی۔

ڈیڑھ سال کے عرصے میں تمام اپیلوں کا فیصلہ ہو چکا تھا جو سب اس کے خلاف گئیں۔ صرف وائسرائے کی رحم کی اپیل کا فیصلہ باقی تھا۔ ملزم کو یقین تھا کہ اُسے پھانسی نہیں ہوسکتی کہ وہ بے گناہ تھا، اس نے یہ قتل نہیں کیا تھا۔ قاتل اور لوگ تھے جن کی لڑکی کے ساتھ مقتول کے ناجائز تعلقات تھے، لیکن اس وقت اس کی ہمت جواب دے گئی جب ڈسٹرکٹ جیل جھنگ کی کال کوٹھڑی میں اس نے سوتے میں خواب دیکھا کہ سامنے ایک زنجیرِ عدل لٹک رہی ہے۔ لگتا تھا اُس کا دوسرا سرا آسمان میں کہیں پیوست ہے۔ بے قرار ہوکر وہ اس کی طرف بڑھا تا کہ وہ زنجیر ہلائے اُور اپنی

بے گناہی ثابت کرے لیکن جب وہ زنجیر کے قریب پہنچا تو وہی کتیا اپنے دو بچوں کے ساتھ اس کے راستے میں حائل ہوگئی اَور اس طرح غرّانے لگی کہ وہ سخت خوفزدہ ہوا۔ اُس کی نیند کا سلسلہ ختم ہوا تو وہ پسینے میں تربتر تھا۔ رات کا باقی حصّہ اس نے رونے اَور توبہ استغفار میں گزار دیا۔

انجام کار وہی ہُو جس کا اُسے ڈر تھا، وائسرائے سے ٹوانوں نے بھی سفارش کی، مگر وہ مسترد ہوگئی اَور آخر کار ۵ر اگست ۱۹۰۲ء کو نوجوان گوندل کو صبح چار بجے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اُس کی لاش خلافِ معمول دیر تک پھڑ پھڑاتی رہی۔

آج بھی آہلی کے لوگ اُس کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ یہ شخص ایک بے زبان، بے قصور کتیا کو ہلاک کرنے کے جرم میں پھانسی پا گیا تھا۔

(۳)

یہ واقعہ سرگودہا کے قریب ایک گاؤں کا ہے۔ وہاں ایک خاندان اپنے چار بیٹوں سمیت رہائش پذیر تھا۔ ساڑھے بارہ ایکڑ بہت زرخیز زمین، آٹھ بھینسیں، چار بیل اور تانگہ گھوڑا۔ غرض اپنے وقت کی انہیں ہر آسائش اَور ہر نعمت حاصل تھی۔ میاں بیوی دونوں نیک طینت، صوم وصلوٰۃ کے پابند اَور خوش اخلاق تھے، لیکن بدقسمتی سے وہ اپنے بیٹوں کو تعلیم نہ دلا سکے نہ اُن کی تربیت کر سکے اَور وہ آوارگی اَور غرور میں مبتلا ہو کر ہر طرح کی غیر اخلاقی حرکتیں کرنے لگے حتیٰ کہ احمد خاں اور سمند خاں نے جو بیس اَور اٹھارہ سال کے ہو چکے تھے، ایک روز گاؤں کے امام مسجد کے بیٹے کو بہت بیدردی سے پیٹ ڈالا۔ بے چارے کا قصور یہ تھا کہ اُس نے اتنی سی بات کہہ دی تھی کہ وہ اپنے باپ کی طرح نمازی نہیں، اس لیے وہ باپ کی طرح خوش قسمت بھی نہیں ہوں گے...... اس بات سے برہم ہو کر وہ دونوں اس لڑکے پر پل پڑے اَور اُسے اس وقت تک بے رحمی سے مارتے رہے جب تک تھک کر بے دم نہ ہو گئے۔

یہ بات ستر کی دہائی کی ہے۔ اُس زمانے میں بھی دیہات کے مولوی بہت غریب، مسکین اَور بے نوا ہوتے تھے اَور انہیں پٹواریوں کے کاغذات میں کمیں ہی لکھا جاتا تھا۔ چنانچہ مولوی صاحب بے چارے کُچھ بھی نہ کر سکے۔ بیٹے کو اُٹھا کر گھر لے آئے اَور بے بسی سے آنسو بہاتے رہے۔

متذکرہ ماں باپ کو بیٹوں کی اس حرکت کا پتہ چلا تو وہ بہت پریشان ہوئے، لیکن چونکہ احمد خاں بہت تیز مزاج کا تھا اَور ہر وقت لڑنے جھگڑنے پر تیار رہتا تھا، اس لئے اس کو ڈانٹ ڈپٹ نہ کر سکے، تاہم اُسے قائل کر لیا کہ وہ دوسرے دن سے تانگہ کرائے پر چلایا کرے اَور گاؤں سے سرگودہا تک تین چار چکر لگا لیا کرے۔ مقصد یہ تھا کہ وہ آوارگی سے بھی بچ جائے گا اَور کمائی کی بھی

ایک صورت نکل آئے گی۔ سمند خاں کو والدین نے سرگودہا میں لکڑی کا ٹال بنا دیا۔

لیکن احمد خاں کو تانگہ چلاتے ہوئے بمشکل ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ اُس نے ایک دن تانگہ گھوڑا بیچ کر رائفل خرید لی، پیپلز پارٹی کے مقامی ایم این اے کی سفارش سے اُس نے رائفل کا لائسنس پہلے ہی حاصل کر لیا تھا۔

والدین احمد خاں کی اس حرکت سے سخت پریشان اَور ملول ہوئے، مگر بے بس تھے۔ چنانچہ ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ایک روز احمد خاں نے اپنے ماموں زاد محمد دین کو رائفل کے بٹ اَور نالی سے بری طرح پیٹ ڈالا۔ سبب یہ بنا کہ احمد رائفل کندھے سے لٹکا کر سارا دن گاؤں کی گلیوں میں اکڑتا پھرتا اَور ماموں کے گھر کے سامنے سے بار بار گزرتا۔ چونکہ وہ ماموں کی بیٹی سے منسوب تھا، اس لئے لوگوں نے اس کے بیٹے محمد دین کے کان بھرے کہ احمد خاں دراصل شادی سے پہلے ہی تمہاری بہن پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ اس حوالے سے اُس کا محمد دین سے جھگڑا ہو گیا اَور احمد خاں نے اُسے سخت زدوکوب کیا۔

اس کے ردِ عمل میں دوسرے ہی دن محمد دین نے اپنے دوستوں کی مدد سے احمد خاں اَور سمند خاں پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ احمد خاں کی ٹانگ میں گولی لگی، مگر سمند خاں نے بھاگ کر جان بچالی۔ احمد خاں کو علاج کے لیے راولپنڈی لے جایا گیا، لیکن ٹانگ کی ہڈی چورا چور ہو چکی تھی، اس لئے ڈاکٹروں نے ٹانگ کاٹ دی اَور وہ مصنوعی ٹانگ کے ساتھ بے چارگی کی زندگی گزارنے لگا۔

اس واردات کے الزام میں محمد دین، اُس کا ایک بھائی اَور ان کے تین دوست گرفتار ہوئے، لیکن تین چار ماہ کے بعد ہی ضمانت پر رہا ہو کر گھر آ گئے۔

احمد خاں کے ماموں نے صلح کی بہت کوشش کی، اُس کی منگیتر نے بھی بہت ترلے لئے، مگر احمد خاں آمادہ نہ ہوا اَور ایک شام کو چار دوستوں کی مدد سے محمد دین کو قتل کر ڈالا۔ اس واردات میں احمد خاں اَور اُس کے چار دوست شامل تھے، مگر پرچہ تین بھائیوں کے خلاف ہوا۔ تینوں گرفتار ہو گئے، لیکن چونکہ احمد خاں کی ایک ٹانگ مصنوعی تھی، اس لئے وکیل کی حیلہ سازی سے وہ ضمانت

پر رہا ہو گیا۔

لیکن دو ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک روز جب کہ وہ تانگے پر سوار ہو کر سرگودھا سے واپس آ رہا تھا کہ محمد دین کے چھوٹے بھائی نے اُسے پستول مار کر قتل کر دیا۔ کوچوان اُور سواریاں جان بچا کر بھاگ گئیں اُور احمد خاں کی لاش تانگے کی اگلی سیٹ پر پڑی رہ گئی۔ احمد خاں کی ماں سائراں مائی بڑی بہادر اُور دانش مند عورت تھی۔ وہ بڑے حوصلے سے آئی اُور احمد خاں کی لاش کو مخاطب کر کے کہنے لگی: احمد خاں تم نے امام مسجد کے بیٹے کو غریب اُور مسکین سمجھ کر بے دردی سے مارا تھا، تم کندھے سے رائفل لٹکا کر گاؤں میں یوں پھرتے تھے جیسے تم ہی گاؤں کے مالک اُور رازق تھے لیکن بیٹا دیکھ لیا تم نے اپنے تکبّر کا انجام۔ کاش تم خدا کی نعمتوں کی ناشکری نہ کرتے اور کاش تم خدا کے بندوں کو حقیر نہ جانتے۔ تم نے اپنے آپ کو بھی برباد کیا اُور ہمارے سارے خاندان کو بھی اندھیروں کی نذر کر دیا۔

(۴)

ذیل کا مضمون بھی میاں محمد اکرم رانجھا صاحب نے رقم فرمایا۔ ذیل میں اس کی تلخیص پیش کی جارہی ہے۔

ملتان کے نواحی گاؤں میں پندرہ سو ایکڑ زمین کا مالک ایک زمیندار اپنی عمر طبعی سے پہلے ہی فوت ہوگیا۔ اس کی جوانمرگی میں عورت اور شراب کا ہاتھ بیان کیا جاتا ہے۔ جوان بیوہ اور ننھا منا احتشام الحق رہ گئے۔ احتشام کی عُمر اس وقت صرف تین سال تھی۔ انگریزی حکومت اُس وقت اپنے عروج پر تھی۔ اسی دَور میں انگریز ڈپٹی کمشنر نے ننھے احتشام الحق کی کل زرعی وسکنی جائیداد کو کورٹ آف وارڈ کے تحت اپنی کفالت ونگرانی میں لے لیا اور پھر سردار علی جوئیہ کو جو کہ ڈسٹرکٹ بورڈ کا ایک معمولی پڑھا لکھا کلرک تھا، اس تمام جائیداد کا منتظمِ اعلیٰ اور مختارِ عام بنا کر بھیج دیا۔

مہر سردار علی جوئیہ کی مالی حالت بڑی سقیم اور معمولی تھی۔ ننھے احتشام کی وسیع زرعی املاک بالفعل اس کے قبضے میں آئیں تو اُس نے خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ڈپٹی کمشنر بھی کبھی کبھار دَورے پر آتا اور انتظامات اور مالی اُمور کی نگرانی میں براہِ راست دلچسپی کا مظاہرہ کرتا، لیکن سردار علی جوئیہ ہی درحقیقت اب جائیداد کا مختارِ کُل تھا۔ ننھا احتشام جب ذرا سیانا ہوگیا تو اسے ڈیرہ دون اور علی گڑھ کی جانب برائے حصولِ تعلیم روانہ کر دیا گیا، جہاں سے وہ پچیس سال کی عمر میں واپس گھر آیا۔ اس کا قیام اپنے گاؤں میں چند روز ہوتا اور چھٹیاں ختم ہوتے ہی وہ پھر سے ڈیرہ دون یا علی گڑھ چلا جاتا۔

احتشام بیس سال اپنے گاؤں سے جُدا رہا اور یہ بیس سالہ دور سردار علی کے عروج واقبال کا زمانہ تھا۔ ۱۹۳۷ء سے لے کر ۱۹۵۷ء تک اس کے نام کا سکہ احتشام کی املاک اور اثاثوں پر چلتا رہا۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس کے نام کی مالا نوجوان بیوہ یعنی احتشام کی جوان جہان

والدہ جیتی رہی اور سردار علی جوئیہ کو اس عہدے کی بنا پر دُنیا کی ہر نعمت میسّر رہی۔ اگرچہ اس عہدے کی تنخواہ معمولی تھی، لیکن ہوشیاری اور عیّاری کی بدولت اس کی مالی اور معاشی حالت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ وہ ملتان شہر کے گنجان آباد علاقے میں اپنی خوب صورت کوٹھی بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے تینوں بیٹے اعلیٰ تعلیم کے بعد محکمۂ انہار میں ایکسین، محکمۂ واپڈا میں ایس ڈی او اور محکمۂ ڈاک میں بطور سپرنٹنڈنٹ ملازم ہو گئے۔ لوگ اس معیارِ زندگی پر متعجب بھی تھے اور مضطرب بھی۔ خلقِ خدا نقارہ بجاتی رہی، لیکن احتشام کی والدہ نے سردار علی کے خلاف کبھی شکایت نہ کی، کیونکہ وہ اُس کا دل اپنی مٹھی میں لے چکا تھا اور بطور مختارِ عام گزارہ الاؤنس بڑی فیاضی سے دیتا رہتا تھا۔ گاؤں کے لوگ بے بس تھے۔ حُکّامِ بالا کے کانوں میں جوانی کے کھیل کی داستان یا املاک اور آمدن میں خُرد بُرد کی کہانیاں پہنچانے کی اُن میں ہمت نہ تھی، کیونکہ جوان بیوہ اور املاک کا مختارِ عام باہم شیر و شکر تھے۔

مَیں جن دنوں ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں قید کاٹ رہا تھا، جیل کے قیدی مجھے بتلاتے کہ سردار علی جوئیہ کی عظمت کے پھریرے ضلع کے طول و عرض میں لہرا رہے تھے۔ اب چار پانچ سال سے وہ احتشام خود بالغ ہو چکا تھا اور گارڈین شپ کی کارروائی کی مزید ضرورت نہ تھی، تاہم سردار علی جوئیہ کو اب مزید کسی عہدے کی چنداں ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہ ''مالِ یتیم'' میں سے اتنا کھا چکا تھا کہ اب اُس کی زرعی و سکنی املاک احتشام کے برابر ہو چکی تھیں اور اس کے علاوہ تین کماؤ بیٹے اعلیٰ عہدوں پر براجمان تھے، لیکن اُسے ایک دُکھ ضرور تھا کہ اُس کے گھر میں پوتے پوتیاں ابھی تک پیدا نہیں ہوئے تھے، حالانکہ دس دس سال سے زائد اُس کے بیٹوں کی شادی ہوئے بیت چکے تھے۔ اب تو وہ ہر وقت بیٹوں کو یہ تلقین کرتا رہتا تھا کہ وہ اب پاک صاف اور مصفّا زندگی گزاریں، کیونکہ اب وہ صاحبِ جائیداد لوگ تھے اور اُنہیں ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن اب اس کے وعظ و نصیحت بے سُود تھے، کیونکہ اُس کے بیٹے رزقِ حرام سے پل پوس کر جوان ہوئے تھے اور اُن کے لچھن بھی عجیب و غریب تھے۔ وہ ڈٹ کر رشوت لیتے تھے اور حرام روپیہ حرام

راہوں پر پانی کی طرح بہا رہے تھے۔ ضلع ملتان کے قیدی مجھے بتلایا کرتے کہ اب جوئیہ صاحب کے بُرے ایام کی ابتدا ہو چکی تھی۔ وہ جوڑوں کے درد اور بدترین خارش کا مریض بن چکا تھا۔ بیوی بہت عرصہ پہلے فوت ہو چکی تھی اور بیٹی جیسی نعمت سے اللہ تعالیٰ نے اُسے محروم رکھا تھا۔ بیٹے عیّاش اور نافرمان تھے اور اپنی اپنی ملازمتوں سے ناجائز دولت کمانے اور پھر حرام راستوں پر اُڑانے میں مگن تھے۔ بیچارا بوڑھا مریض نوکروں کے رحم وکرم پر تھا۔ نوکروں کا روّیہ بھی گستاخانہ اور بیحد بے رحمانہ ہو چکا تھا۔ وہ اب روپیہ اور جائیداد، دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے تھے۔ بُوڑھا تجربہ کار انسان تھا۔ نوکروں کی بے ایمانی اُس سے چھپی نہ تھی۔ وہ کبھی کبھار نوکروں کو لعن طعن کرتا اور اُن کی نمک حرامی پر نفرین کا اظہار کرتا تو زیرِ لب مُسکرا کر خاموش ہو جاتے۔

جنوری ۱۹۶۷ء میں میری رہائی عمل میں آئی اور مَیں نے ارادہ کرلیا کہ مَیں جوئیہ صاحب کا گھر اور انہیں دیکھ کر جاؤں گا۔ مَیں بوسن روڈ پر اُن کے ایک ایکڑ وسیع جدید طرز کے بنگلے میں جا پہنچا۔ وہاں دُھول اُڑ رہی تھی۔ مجھے ایک بُوڑھے نوکر نے بتلایا کہ وہ ڈیرہ غازی خاں میں بڑے بیٹے کے پاس مقیم ہیں۔

''کب آئیں گے؟'' مَیں نے پُوچھا۔

''شاید آج ہی آجائیں، وہ ایک جگہ زیادہ ٹھہر نہیں سکتے، کیونکہ وہ انتہائی اونچے درجے کی خارش کے بدترین مریض ہیں۔ چل پھر نہیں سکتے، کیونکہ جوڑوں کی دردیں اُنہیں ہلکان کیے دے رہی ہیں۔ بہو بیٹا اُن کے قریب نہیں پھٹکتے، کیونکہ وہ خارش کے مریض ہیں۔ اب فی الواقع وہ موت کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی موت سے بدتر ہے''۔ سفید بنگلے کی طرف اشارہ کر کے اس نے بتلایا: ''اب یہ بدبخت مکان باسیوں کے لیے ترس رہا ہے۔ جوئیہ صاحب کا چھوٹا بیٹا سپرنٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات کثرتِ شراب نوشی کے ہاتھوں جان گنوا بیٹھا ہے۔ اس کی جوان جہان بیوی نکاحِ ثانی کر چکی ہے اور اپنے مرحوم خاوند کی جائیداد کے لیے اُس نے سول عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ مقدّمہ یکطرفہ طور پر جوئیہ صاحب کے خلاف ہو گیا ہے، کیونکہ یہ اب پیروی

کے قابل نہیں رہے۔ منجھلا بیٹا جو واپڈا میں ملازم تھا، وہ ذہنی دباؤ کا مریض ہے اور اس وجہ سے اُسے پاگل پن کے دَورے پڑتے ہیں۔ وہ ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے۔ اُس کی بیوی رُوٹھ کر میکے جا چکی ہے اور تنسیخِ نکاح کا دعویٰ فیملی کورٹ میں زیرِ سماعت ہے، جس کی وجہ خاوند کا پاگل پن بیان کیا گیا ہے۔ اب لے دے کے تیسرا بیٹا ہے جو کہ محکمۂ انہار میں اب ایس ای ہے، لیکن وہ بھی بے اولاد اور نافرمان ہے۔

یہ تفصیلات سن کر میرا دل لرز لرز اُٹھا۔ فی الواقعی بقول مولوی شیر محمد صاحب، اب وہ اپنی خود کاشتہ جھاڑیوں کے کانٹے پلکوں کے ساتھ چُننے پر مجبور تھا۔

۱۹۸۹ء کی جنوری کی ایک سرد شام مَیں پھر سے ''قصرِ سردار'' جا پہنچا۔ اب مجھے یہ دیکھ کر خاصا صدمہ ہُوا کہ قصرِ سردار کی ہیئت ہی بدل چکی تھی۔ اس کی سفیدی پر سیاہی کے دھبے جا بجا پڑ چکے تھے۔ اس کے خوبصورت لان میں خانہ بدوشوں کا ایک کنبہ ڈیرہ جمائے ہوئے تھا۔ خوبصورت برآمدے کے سنگِ مرمر سے تعمیر شدہ فرش پر خانہ بدوشوں کے گدھے بندھے ہوئے تھے۔ نفیس کمروں کی چھتیں جا بجا شکستہ ہو چکی تھیں اور اُن میں ابابیلوں، اُلوؤں اور چیلوں نے گھونسلے بنا لیے تھے۔ عجب ڈراؤنا اَور عبرت انگیز سماں تھا۔ ''قصرِ سردار'' کی تاریخِ تعمیر بروز جمعرات ۱۹۵۷ء'' کے الفاظ دُھندلا چکے تھے۔ بغلی لان میں ایک چونے کی بنی ہوئی شکستہ سی قبر تھی جس پر مدّھم الفاظ میں لکھا تھا: ''آخری آرامگاہ سردار علی جوئیہ''۔

ایک بُوڑھی خانہ بدوش عورت نے مجھے بتلایا کہ مالک مکان کو وہ نہیں جانتی۔ سُنا ہے اُن میں سے ایک باقی ہے جو پاگل خانے میں پڑا سڑ رہا ہے اور یہ بنگلہ اب کورٹ آف وارڈ ہو چکا ہے۔ لاوارث سمجھ کر انہوں نے ڈیرہ ڈال دیا ہے بالکل درست فرمایا حکیم الامت علامہ اقبال نے

ع: حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۵)

میاں محمد اکرم رانجھا صاحب کے ایک مضمون (مطبوعہ قومی ڈائجسٹ ستمبر ۸۳ء) سے پتہ چلتا ہے کہ ایوب خاں کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ضلع جھنگ میں جن سیاسی شخصیات کو خاص اثر و رسوخ حاصل ہوا، اُن میں ملک سردار خاں بھی تھا۔ یہ زمیندار تو تھا ہی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑا کاروباری آدمی بھی بن گیا اَور دولت اُس پر ساون بھادوں کی بارش کی طرح برستی ہوئی نظر آنے لگی۔

ملک سردار خاں ذہنی طور پر جماعتِ اسلامی کو پسند کرتا تھا، لیکن روایتی زمینداروں کی طرح اس کا کوئی سیاسی کردار نہ تھا، اس لئے وہ کونشن لیگ کے ساتھ وابستہ ہوگیا اَور ۱۹۷۰ء کے بعد جب پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آئی، تو وہ اس کا سرگرم حامی بن گیا کہ ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک اُسے ضلع بھر کی سیاست میں کلیدی حیثیت حاصل ہوگئی اَور پورے ضلع میں اُس کا طوطی بولتا تھا۔

یہ بھٹو دور کی بات ہے۔ پیپلز پارٹی کا ایک وزیر ملک سردار علی خاں کے گاؤں میں آیا ہوا تھا اَور ملک کے ڈیرے پر ہی براجمان تھا، بے شمار لوگ اس کی پذیرائی کے لیے موجود تھے کہ اچانک ایک باریش نوجوان نے وزیر سے ایک ایسا چبھتا ہوا سوال کیا کہ وزیر اس کا جواب نہ دے سکا۔ وہ بغلیں جھانکنے لگا، بھرے مجمعے میں اُس کی سخت سبکی ہوئی اَور وہ شرمندگی کے ساتھ اُٹھ کر چلا گیا۔

وزیر کے جانے کے بعد ملک سردار علی خاں کے بھتیجوں نے سوال کرنے والے نوجوان کو جو جماعتِ اسلامی کا ایک غریب کارکن تھا، زدوکوب کیا اَور اُس کی داڑھی مونڈھ ڈالی۔ غریب کارکن کے آنسو نکل آئے، لیکن وہ پی گیا اُس کی برادری اکٹھی ہو کر آ گئی اَور بدلہ لینے کا اعلان کیا لیکن اس کارکن نے جواب دیا ''مَیں کس چیز کا بدلہ لوں، داڑھی میری نہیں، میرے رب کے حکم کی تعمیل

تھی، اگر اس نے بدلہ لینا ہے تو وہ خود لے گا''۔

اُور اللہ نے اس ظلم کا بدلہ یوں لیا کہ ملک صاحب کے جس قریبی عزیز نے جماعت کے غریب کارکن کی داڑھی مونڈھی تھی، وہ اس قدر نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہوا کہ اُس نے اپنے عالی شان بنگلے میں اپنی ہی قیمتی بندوق سے خودکشی کرلی۔ ملک کے خاندان پر زوال ٹوٹ کے آیا، وہ ۱۹۷۷ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر ایم این اے بنا، لیکن اللہ کی تقدیر نے ساری بساط ہی اُلٹ دی، پی پی کی حکومت ختم ہوگئی، ملک سردار خان پر قتل کا مقدمہ بن گیا اُور وہ چھپ کر ملک سے فرار ہونے پر مجبور ہوگیا۔

اللہ نے اپنے ایک غریب، بے بس بندے کی توہین وتذلیل کی خوب خوب دادرسی کردی۔

حکیم محمد عبداللہؒ (۱۹۰۴-۱۹۷۴) ایک بے مثال طبیب، ایک جید عالمِ دین، ایک مثالی مسلمان اَور بہترین اخلاق و کردار کے حامل انسان تھے۔ اُنھوں نے طب وصحت کے حوالے سے ان گنت کتابیں تصنیف کیں اَور ایک کتاب اپنے عمومی مشاہدات اَور تجربات پر مبنی ''مراحلِ حیات'' کے عنوان سے مرتب فرمائی جو مسوّدہ گم ہوجانے کی وجہ سے مکمل صورت میں تو شائع نہ ہوسکی، لیکن اس کتاب کے کچھ ابواب محفوظ رہے جو ماہنامہ ''خطیب'' لاہور میں قسط وار شائع ہورہے ہیں۔ اِن میں ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے پانچ واقعات قابلِ ذکر ہیں اَور اپنے اندر عبرت اَور موعظت کا نمایاں پہلو رکھتے ہیں۔ یہ واقعات ''خطیب'' کے نومبر اَور دسمبر ۲۰۰۹ء کے شماروں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

(۶)

جب ہم نے بستی دارالسلام کی بنیاد رکھی

جن دنوں ہم نے بستی دارالسلام کی بنیاد رکھی ان دنوں ایسے افراد کم تھے جنہوں نے اس کو اپنا مرکزِ توجہ نہ بنالیا ہو۔ انہیں یہ نظریہ کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا۔ ہندو اسے پاکستان کا نام دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ دراصل نظریہ پاکستان کے حامی لوگ ہیں اور اس بستی کے زیرزمین جنگی اسلحہ تیار کررہے ہیں۔ اس لیے ہندو اس طرف سے نہیں گزرتے تھے۔

مسلمان جو ہماری سکیم سے بے خبر تھے۔ یہ مشہور کیے ہوئے تھے کہ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو مسلمان نہیں سمجھتے، اسی لیے اپنی بستیاں الگ بنانے لگے ہیں۔ عوام تو عوام بعض علماء تک لوگوں کو

ہمارے خلاف شدید اشتعال دلا رہے تھے اور مولانا مودودی اور جماعتِ اسلامی کے خلاف نفرت پھیلا رہے تھے۔

ایسی باتیں کہنے میں ایک مولانا...... صاحب پیش پیش تھے (نام اس لیے درج کرنا نہیں چاہتا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں) انہوں نے دورانِ درس کسی شخص کے اس سوال کے جواب میں کہ ان لوگوں نے یہ بستی باہر کیوں بنائی ہے، یہ کہا کہ "یہ لوگ چوہڑے یعنی خاکروب ہیں۔ ان کی آبادیاں شہر سے باہر ہی ہوتی ہیں۔"

خیر یہ تو مذاق بھی قرار دیا جاسکتا ہے (اگرچہ اس طرح کا بھونڈا مذاق کسی سنجیدہ عالم کے شایانِ شان نہیں ہے) لیکن ایک بار انہوں نے اپنے ایک عزیز کی زبانی مجھے یہ پیغام ارسال فرمایا کہ "تم لوگ اپنے بچاؤ کا انتظام کرلو۔ مَیں فلاں تاریخ تک آؤں گا اور تمہاری تجارت کو تہس نہس کر کے جاؤں گا۔ اپنے مریدوں میں تمہارے خلاف پروپیگنڈہ کر کے تمہارا بائیکاٹ کرادوں گا۔ اور تمہاری آڑھت کی دوکان اور تمہارا دواخانہ فیل کرا جاؤں گا"...... مَیں نے پیغام رساں سے عرض کیا کہ آپ ان سے پہلے میرا اسلام عرض کریں اور پھر کہیں کہ وہ ضرور بالضرور تشریف لائیں اور اپنی سی کرنے میں کوئی کمی نہ کریں۔ اس میں ان شاء اللہ فریقین کا فائدہ ہوگا۔ ہمارا فائدہ اس طرح کہ ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود جب اللہ تعالیٰ ہمیں روزی دے گا، تو ہمارا ایمان اس کی رزّاقیت میں اور بڑھ جائے گا اور ان کا اس طرح کہ ان کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے گی کہ مَیں بھی کسی کی روزی بند کرا سکتا ہوں۔"

غرضیکہ وہ مقررہ تاریخ پر یا اس سے کچھ آگے پیچھے تشریف لائے۔ ہمارے خلاف اپنے درسوں میں، تقریروں میں بہت کچھ بیان کیا۔ نیز اپنے حلقہ مریدین میں جا کر انہیں ہماری دوکان پر آنے سے روکا مگر ہماری روزی صرف ان کے مریدین پر تو موقوف نہ تھی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے ہمارا کام پھر بھی چلائے رکھا۔ اس دوران میں مجھ سے تبادلہ خیالات بھی ہوا۔ جس میں بفضلہٖ تعالیٰ ان کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے، مَیں نے گفتگو بھی کی۔ وہ اس میں لاجواب بھی ہوئے،

مگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بعض اوقات تو صاف تسلیم کرتے کہ یہ کام عین قرآن وحدیث کے مطابق ہے لیکن تعاون سے اس لیے انکار کر گئے کہ اسے فلاں مولانا صاحب پسند نہیں کریں گے۔

پھر ایک روز ہمیں ان کا یہ پیغام ملا کہ مَیں عن قریب ایک ایٹم بم لے کر آ رہا ہوں اور ممکن نہیں ہے کہ اس بم کے چھوڑ دینے کے بعد آپ کی تحریک کا اثر اس علاقہ میں باقی رہ سکے اور اس بم کا فارمولا یہ تھا کہ انہوں نے مولانا مودودی کی چند کتب میں سے قطع و برید کر کے کچھ عبارتیں نقل کر لیں اور ان سے ایک غلط سلط سوال نامہ مرتب کر لیا اور علماء کرام سے دریافت فرمایا کہ کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ بارے میں اس مسئلہ کے کہ ان عقائد اور نظریات میں ایمان رکھنے والا شریعتِ حقّہ کی رو سے مسلمان ہے یا خارج از اسلام؟

اس پر مختلف مکتبِ فکر کے علماء سے دستخط کرائے۔ ان کا خیال تھا کہ اس فتویٰ کو مکمل کر کے جب سرسہ اور سوتر کے علاقہ میں اس کی اشاعت کروں گا تو یہ لوگ ختم ہو جائیں گے۔ یہ تھا ایٹم بم کا فارمولا۔

موصوف اس بم کو اپنی جھولی میں بند کر کے لائے اور سرسہ سے دوسرے اسٹیشن سوچان کوٹلی پر اتر کر اپنے مریدوں کے مرکز کی طرف جانے لگے کہ عین اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہی شدید فالج کا حملہ ہو گیا اور وہیں گر پڑے۔

مجھے یہ خبر ایک دوسرے مولوی صاحب نے ہنس ہنس کر سنائی، حالانکہ وہ مولوی صاحب ہماری تحریک سے وابستہ نہیں تھے مگر مجھے ان کی ہنسی پسند نہ آئی۔ مَیں اللہ کے خوف سے لرزنے لگا اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے ڈر گیا۔ ہم سے ایسی صدہا کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اگر اس کا فضل شاملِ حال نہ ہو تو یہی حشر ہمارا بھی ہو سکتا ہے۔ مَیں نے اللہ سے پناہ مانگی۔

مولانا صاحب کو پنجاب کے ایک مشہور ڈاکٹر کے پاس بغرضِ علاج لے جایا گیا۔ مَیں نے اس موقع پر ایک خط لکھا اور اظہارِ افسوس کے بعد یہ عرض کیا کہ فالج کے علاج میں اللہ تعالیٰ نے مجھے تھوڑی بہت شُد بُد دی ہے اور بفضلہٖ تعالیٰ بگڑی ہوئی حالت کے مریض بھی تندرست ہو گئے

ہیں۔ اگر حکم ہو تو میری خدمات حاضر ہیں، مولانا نے جواب لکھوایا کہ الحمد للہ میں روبا صلاح ہوں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔

اس کے بعد ملے تو بہت خلق سے پیش آئے۔ اگرچہ مرضِ فالج کے شدید حملے سے تو نجات مل گئی مگر اس کے نتیجے کے طور پر مرگی میں مبتلا ہو گئے اور پھر تا مدت العمران کا دماغ صحیح نہ ہو سکا اور اسی طرح اپنے خدا سے جا ملے۔ بلکہ ان کے لختِ جگر کا دماغ بھی اپنے والد کی زندگی میں ماؤف ہو گیا۔ وہ بھی عالم تھے اور اپنے والد کے صحیح جانشین۔ دماغ ماؤف ہونے کے بعد اس نوجوان نے ایک بار تو کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ پھر ایک بار مکان سے چھلانگ لگا کر مہینوں بیمار رہے۔ ابھی تک اسی حال میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور انہیں تندرستی عطا فرمائے اور ہم سب کو بڑا بول بولنے سے بچائے رکھے۔ آمین۔

(۷)

زبان کے زخم

میں اپنی نوعمری سے ایک ناٹے قد کے برہمن کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ کہیں باہر سے آیا کرتا تھا اور دو چار روز ہمارے قصبہ روڑی ضلع حصار میں گزار کر پھر کہیں چلا جاتا تھا۔ قد ٹھگنا، بدن مضبوط۔ کھدر کے کپڑے سر پر دو ڈھائی ہاتھ کا انگوچھا، زبان میں لکنت۔ بالعموم عورتوں کے پاس آ کر بیٹھا کرتا تھا اور ان سے باتیں کر کے ان سے دودھ وغیرہ پی لیتا۔ مردوں سے گندے قسم کے مذاق کرتا اور سب سے زیادہ رواں مذاق یہ تھا کہ ہر ملنے والے سے پوچھا کرتا کہ تم میری شادی میں باراتی بن کر جاؤ گے؟ بالعموم لوگ اثباتاً جواب دیا کرتے تھے مگر بہت مدت تک بلا سوچے سمجھے محض مذاق کے طور پر کہ یہ برہمن اپنی شادی کا شوقین ہے اور شادی ہو نہیں رہی، بس اس خیال سے ہی دل بہلا رہا ہے۔

مگر پنڈت جی مہاراج کی مراد کچھ اور ہوتی تھی۔ اس کا پتہ یُوں چلا کہ جب پنڈت جی کو یہ معلوم ہوتا کہ فلاں گاؤں میں کوئی وبا پھوٹ پڑی ہے اور اس سے اتنی اموات ہوگئی ہیں تو وہ ایسی خبر سن کر بہت خوش ہوتا اور پھر ہنس کر کہتا کہ چلو ہماری بارات کی رونق بڑھی اور پھر لوگوں سے کہنے لگتا کہ فلاں گاؤں میں سے تو اتنے آدمی ہماری بارات میں شریک ہونے نکل کھڑے ہوئے۔ اس بدمذاقی کے مذاق کا یہ سلسلہ سالوں تک چلتا رہا۔

ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ صاحب کہاں سے آئے ہیں۔ زبان بھی ہمارے علاقہ سے نہیں ملتی۔ بہر کیف اس کو ہم اسی روپ میں اور اسی عمر میں بیسیوں سال تک ایک ہی ڈگر پر چلتے دیکھتے رہے۔ لوگوں کی موت پر ہنسنا، اور خوش ہونا اور لوگوں سے مذاق کرنا، اور پھر اس پر بھی خوش ہونا۔ چونکہ علاقہ ہندوؤں کا تھا اس لیے ان کا نباہ ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ غائب ہوگیا اور کافی دنوں

تک نظر نہ آیا۔ ایک روز مجھے، جب کہ میں موضع ''آدم کے'' ریاست پٹیالہ سے موضع ''نعلیکا'' جا رہا تھا، اچانک راہ میں مل گیا۔ بے حد کمزور، بمشکل چل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی رو پڑا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ میں نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ تو زبان نکال کر دکھائی کسی نامعلوم شخص نے زبان کاٹ لی تھی؟ یا کسی بیماری سے جھڑ گئی تھی؟ نہ معلوم کہاں، کس نے اور کیوں؟ زبان ہوتی تو بتاتا۔ بس یہ آخری ملاقات تھی۔ پھر پتہ نہیں چلا کہ اس کو کیا ہوا؟

(۸)

بات بات پر کفر کا فتویٰ

یہ واقعہ تو ایک پنڈت جی مہاراج کا ہے جو کہ ہندوؤں کے سربراہ کار تھے اب مسلمانوں کے رہنما ایک مولوی صاحب کا ذکر سنیں۔

مولوی صاحب غالباً ریاست فرید کوٹ کے باشندے تھے۔ بہت سی خوبیوں کے مالک پابند صوم وصلوٰۃ۔ حلال روزی کمانے والے، مگر اس کے ساتھ ساتھ مغلوب الغضب اور زبان کے سخت۔ معمولی باتوں پر کفر کا فتویٰ لگا دینا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنی دانست میں حق گوئی کا فریضہ ادا کرتے تھے اور دیگر صلح جو قسم کے علماء کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا کرتے تھے بارہا ان کو اس حق گوئی کے سلسلہ میں چوٹیں بھی آئیں۔ خود بھی اپنے پاس مضبوط سی لاٹھی رکھا کرتے تھے تا کہ ضرورت پڑنے پر کام آئے۔ سمجھانے والوں نے بہت سمجھایا کہ بات بات پر کافر کہنا کسی طرح ٹھیک نہیں ہے۔ مگر سخت کلامی اور فتویٰ بازی ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی، وہ اس کو تا زندگی نہ چھوڑ سکے۔ بیگانے تو بیگانے ان کی لڑائی اپنے ہم مسلک اور ہم عقیدہ یگانوں سے بھی ہو جاتی تھی اور وہ ان پر بھی کفر کی مشین داغ دیا کرتے تھے۔ بہر حال وہ اسی حال میں فوت ہو گئے۔ ان کے ملنے والوں سے معلوم ہوا کہ ان کی زبان پر ایک دردناک پھنسی نکلی جس کے اثر سے وہ بہت تکلیفیں اٹھا کر مرے۔ اللہ تعالیٰ معاف فرمائے۔ آمین

(۹)

طعنہ دینے کا انجام

مَیں یہاں اپنے ایک دوست کا قصہ سنانے لگا ہوں اگر صحیح نام اور صحیح مقام لکھ دوں تو وہ ناراض ہوں گے اور ممکن ہے کہ ان کی ناراضگی سے انہیں مزید نقصان پہنچے، اس لیے مَیں اس سے انہی کے فائدہ کے لیے احتراز کرتا ہوں۔ آپ فرض کرلیں کہ میں خیر الدین کا ذکر کر رہا ہوں اور اس کے گاؤں کا نام نور گڑھ ہے۔ خیر الدین ایک پابند صوم وصلوٰۃ اور عقل مند قسم کا آدمی تھا۔ قضارا اس کی ایک قریبی رشتہ دار عورت مفلس اور نادار ہو کر اس کے گھر آ پڑی۔ اس کی ایک لڑکی بھی ساتھ تھی جو کہ ایک ٹانگ سے لنگڑی تھی۔ کہتے ہیں کہ اگر دو برتن بھی یکجا ہوں تو کبھی نہ کبھی ان میں بھی تصادم ہو جاتا ہے، یہ عورت اگر چہ مفلس تھی اور انہی کے گھر رہتی تھی، مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی...... جھگڑا سا ہو جاتا تھا۔ خیر الدین اکثر تو صبر کرتا۔ مگر کبھی کبھی اس سے بھڑ جاتا اور اس کی بیٹی کو لنگڑی کا طعنہ دے دیتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مَیں نے بچشمِ خود دیکھا کہ خیر الدین کے ہاں بھی لڑکی پیدا ہوئی جو کہ اسی طرح کی لنگڑی تھی جس کو وہ طعنے دیا کرتا تھا۔

(۱۰)

ایک رئیس زمیندار کی حالتِ زار

میرے ملنے والوں میں سے ایک صاحب اچھے کھاتے پیتے اور متمول زمیندار تھے۔ صحت، حسن، زمینداری، مکانات وغیرہ سب ہی کچھ موجود تھا۔ کھانے اور پہننے کا بے حد شوق رکھتے تھے۔ نہایت خوش پوش اور خوش خور۔ حج بھی کیے تھے کہ اچانک کسی اعصابی مرض میں مبتلا ہو گئے۔ بیماری کی شکل یہ ہے کہ ہر وقت پٹھوں میں کھچاؤ اور تناؤ پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے تشنج کے شدید دورے پڑ رہے ہوں۔ بس ہر وقت بازو اور گردن کے اعصاب میں اینٹھن ہوتی رہتی ہے۔ بات کرتے وقت بھی یہی تشنجی کیفیت جاری رہتی ہے۔ البتہ سوتے وقت کوئی دورہ نہیں ہوتا۔ اس وقت پٹھے سکون حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ تکلیف تقریباً ۱۹۴۰ء سے چلی آ رہی ہے علاج کے سلسلہ میں زمین تک بک گئی اور بالکل مفلس اور قلاش حالت جو نا قابلِ دید اور عبرت انگیز ہے۔ ایک حساس انسان ان کے پاس زیادہ دیر تک بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ ابتداءً رشتہ داروں نے امداد کی ہو گی مگر کب تک۔ دائمی مریض اور غریب کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون سنبھال سکتا ہے۔ اب اس بیماری کی حالت میں اپنے مخلص احباب کے پاس بصد مشکل گرتے پڑتے پہنچتے ہیں اور طالب امداد ہوتے ہیں۔ چونکہ خاندانی آدمی تھے اس لیے بہت شرم بھی محسوس کرتے ہیں۔ گزشتہ ایام میں میرے پاس بھی تشریف لائے تھے۔ شدتِ غیرت سے رونے لگے اور کہا کہ میں سخت مجبوری کی بناء پر آپ لوگوں کو تکلیف دیتا ہوں۔ جی نہیں چاہتا مگر کیا کروں؟ میں نے عرض کیا کہ آپ تو فی الواقع معذور ہیں اور یہ وہ اضطرار کا مقام ہے جہاں یہ فعل جائز ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شرم تو ہمیں آنی چاہیے کہ ہم آپ کی ضرورت بلا سوال کیوں پورا نہیں کرتے۔ میں نے اس خیال کو دو تین مرتبہ مختلف الفاظ کے جامہ میں پیش کیا تو وہ مطمئن سے ہوئے اور ان کے آنسو نکل آئے۔ یہ

اس قابلِ رحم حال میں کیوں پہنچے اور اتنی لمبی آزمائش میں کیوں ڈالے گئے؟ اس کا صحیح علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ البتہ میں ایسے مواقع پر اپنی جگہ کچھ سمجھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں اور بہرحال کسی نہ کسی نتیجہ پر پہنچ جایا کرتا ہوں۔ میں نے ان کی گزشتہ زندگی پر نظر دوڑائی تو مجھے ان کی زندگی میں سے دو کام ایسے نظر آئے کہ ان دونوں کو یا ان میں سے ایک کو اس کا موجب گردانا جاسکتا ہے۔

اول یہ کہ آپ کھانے پہننے کے معاملہ میں اچھے خاصے فضول خرچ تھے۔ اس ٹھاٹھ اور اس شان سے رہتے تھے جتنی ان کی بساط نہیں تھی۔ اگر وہ محض دنیادار قسم کے آدمی ہوتے تو شاید اللہ تعالیٰ گرفت نہ فرماتے مگر وہ تو ایک مینارِ نور خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کو دیکھ کر لوگوں نے رہنمائی حاصل کرنی تھی۔

دوم یہ کہ آپ بعض اوقات اچھے اچھے نیک لوگوں کا نام سن کر بھی ناک چڑھا لیا کرتے تھے اور پیشانی سکیڑ لیا کرتے تھے۔ بس یہی وہ چیز تھی کہ جس نے اعضاء کو ہر وقت متشنج رہنے پر مجبور کر دیا۔ واللہ اعلم۔ بہرحال دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر بھی رحم فرمائیں اور ہمیں بھی ایسی مصیبت سے بچائے رکھیں۔ وہ تو خیر ایک نیک آدمی تھی اور ہم تو فی الواقع نہ معلوم کتنی بدعادتیں اپنے اندر لیے پھرتے ہیں۔

(۱۱)

ظلم کا بھیانک انجام

یہ واقعہ مجھے اوکاڑہ کے بزرگ اُستاد ماسٹر علی احمد صاحب نے سنایا موصوف ۱۹۳۴ء میں بُرج جیوے کے علاقہ (نزد اوکاڑہ) میں پیدا ہوئے، لیکن نوجوانی میں سندھ چلے گئے، وہیں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازم ہوگئے۔ زندگی کا بیشتر حصّہ نواب شاہ میں گزارا۔ وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول میں ریاضی اور انگلش پڑھاتے رہے اور وہیں سے ۱۹۹۲ء میں ریٹائر ہوکر اپنے آبائی علاقے میں واپس آ گئے۔

انہوں نے بتایا: ۱۹۸۲ء کی بات ہے مَیں نواب شاہ میں مارکیٹ روڈ نمبر ۲ پر ایک مکان میں کرایہ دار تھا۔ یہ مکان ایک شخص مختار احمد کی بہن کا تھا اور مختار احمد ہی اُس کا کرایہ وصول کیا کرتا تھا...... ایک مرتبہ مَیں کرایہ دینے کے لئے اُس کے گھر گیا تو اُس کی بُری حالت تھی۔ وہ زار و قطار رو رہا تھا...... مَیں نے سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں...... تین سال پہلے بیوی فوت ہوگئی تھی اور ایک ہفتہ قبل اکلوتا جوان بیٹا قبر میں اُتر گیا ہے اور میری اپنی زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے۔

مَیں نے تفصیل پوچھی تو اُس نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتایا:

مَیں پولیس میں ملازم تھا۔ ترقی کر کے ہیڈ کانسٹیبل بن گیا۔ ایک بار ڈاکے اور قتل کے ایک ملزم کو جیل سے عدالت تک پہنچانا تھا۔ اُس روز فیصلے کی تاریخ تھی میرے ساتھ ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگی تھی۔ ہم دونوں نے ملزم کو جیل سے لیا اور چونکہ عدالت تک فاصلہ زیادہ نہ تھا، اس لئے ہم تینوں پیدل ہی چل پڑے۔

یہ راستہ کچھ ویران سا تھا۔ ایک جگہ تو اونچے قد کی بہت سی جھاڑیاں تھیں، بالکل جنگل کا منظر

تھا، وہاں اُس ملزم نے بڑی لجاجت سے درخواست کی کہ میرے پیٹ میں کچھ گڑ بڑ ہو رہی ہے۔ میری ایک ہتھکڑی کھول دیں اور اجازت دیں کہ جھاڑیوں کی اوٹ میں پیشاب وغیرہ کرلوں۔

ہمیں ترس آ گیا۔ ہم نے اُس کی ایک ہتھکڑی کھول دی اور وہ قریب ہی جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ابھی اُسے بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کُھلے منہ کی ایک گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آئی، اُس میں سے سات آٹھ تنومند آدمی اُترے، اُنہوں نے آناً فاناً ہماری رائفلوں پر قبضہ کیا۔ ہمارے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے باندھے، ہمیں جھاڑیوں میں پھینکا اور ملزم کو اُٹھا کر گاڑی میں ڈال کر یہ جا وہ جا۔ یہ سب کچھ پنجابی فلموں کے انداز میں اس قدر اچانک ہوا کہ ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ تاہم اُن لوگوں نے مہربانی یہ کی کہ جاتے ہوئے وہ ہماری رائفلیں ہمارے قریب ہی پھینک گئے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ قدموں کی چاپ سے اندازہ ہوا کہ کوئی شخص اُس راستے پر چلا آ رہا ہے۔ ہم نے جھاڑیوں کے اندر سے آواز دی کہ جانے والے ذرا ٹھہر جانا اور ہماری مدد کرنا۔ وہ آدمی ٹھہر گیا اور ہمارے قریب آ گیا۔ تب ہم نے اُسے اپنی بپتا سنائی کہ ہم پولیس ملازم ہیں، ڈاکو ہمیں بے بس کر کے یہاں پھینک گئے ہیں۔ مہربانی کرو اور ہمارے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھول دو۔

اُس شخص نے ہمارے ہاتھوں اور پاؤں کی رسیاں کھول دیں۔ ہم اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ شخص ہمدردی سے ہمارا حوصلہ بڑھانے لگا اور ہاتھوں سے ہمارے کپڑوں کی مٹی صاف کرنے لگا۔

جب تک ہم زمین پر گرے پڑے تھے، اُس وقت تک جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی۔ لیکن اب نتائج و عواقب کے بارے میں سوچ کر مَیں تو چکرا کے رہ گیا...... ''ہمارے ساتھ تو بہت ہی دردناک حادثہ ہوا ہے...... اب کیا ہوگا؟ اگر ہم اسی طرح خالی ہاتھ عدالت میں جاتے ہیں اور وہاں بتاتے ہیں کہ ایک ڈاکو اور قاتل اغوا کر لیا گیا ہے تو کوئی ہماری بات نہیں مانے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ انہوں نے کوئی بھاری رشوت لے کر ڈاکو اور قاتل

کو بھگا دیا ہے۔ چنانچہ ہمیں فوراً ملازمت سے برطرف کر کے گرفتار کرلیا جائے گا...... ہم پر لازماً مقدمہ چلے گا اور ہم کسی سخت سزا کے مستحق ٹھہریں گے...... پھر کیا کیا جائے؟ بچت کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ وہ کیا طریقہ ہوسکتا ہے کہ ہم شدید قسم کی پریشانی سے بچ جائیں؟

اُور اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں ایک عجیب شیطانی تجویز نے سر اٹھایا...... ''پھر کیا ہے اگر ملزم بھاگ گیا ہے، اُس کے بدلے میں ہمیں ایک بندہ تو مل گیا ہے، پھر اِسے ہی کیوں استعمال نہ کیا جائے''۔

اُور اس سوچ کے ساتھ ہی مَیں اچھل کر اُس مہربان شخص پر حملہ آور ہوگیا اُور مکّوں اُور تھپڑوں سے اُسے پیٹنے لگا۔ میرا ساتھی کانسٹیبل حیران ہوگیا لیکن مَیں نے اُسے ڈانٹا کہ یہی ہمارا ملزم ہے، پکڑلو اُور اس کی خوب ٹھکائی کرو...... چنانچہ ہم دونوں نے مل کر اُسے خوب خوب مارا۔ وہ بے چارہ تیورا کر گر پڑا۔ پہلے اُس نے کچھ آہ و بکا کی مگر پھر اُس کے حواس جواب دے گئے اُور وہ سر گھٹنوں میں دبا کر نیم مدہوش زمین پر بیٹھ گیا...... ہمارے پاس ایک فالتو ہتھکڑی موجود تھی، اس میں اُس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے اُور کھینچتے ہوئے کچہری کی طرف چل پڑے...... اس کشمکش میں ہم خاصے لیٹ ہوگئے، جج نے پوچھا کہ لیٹ کیوں ہوئے اُور ملزم کا منہ کیوں سوجا ہوا ہے تو ہم نے بتایا کہ اس نے ہمیں دھوکا دے کر بھاگنے کی کوشش کی تھی، اس لئے اِسے قابو کرنے میں کچھ وقت صرف ہوگیا اُو اس کی مرمت بھی کرنی پڑی...... وہ مظلوم شخص ہماری بے رحمانہ مار سے اس قدر ہراساں ہوگیا تھا کہ عدالت میں اُس کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے اُور وہ خوفزدہ نظروں سے فضا میں بٹر بٹر دیکھتا رہا۔

سچ ہے قانون اندھا ہوتا ہے، جج نے اُس روز مقدمے کا فیصلہ سنانا تھا، چنانچہ اُس نے کوئی تحقیق نہ کی اُور تھوڑی دیر میں اُس بے چارے کو موت کی سزا سنا دی۔ اُس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اُور ہم اُسے کھینچتے ہوئے جیل میں چھوڑ آئے''

ریٹائرڈ سب انسپکٹر مختار احمد آج اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ وہ روتا رہا اُور ظلم کی

داستان کی ساری جزئیات سناتا رہا۔ اُس نے بتایا ''ماسٹر صاحب، یہ ٹھیک ہے کہ میری نوکری بچ گئی، مجھ پر کوئی مقدمہ بھی نہ بنا لیکن خدا کا کوڑا حرکت میں آ گیا، میرے ضمیر نے میرا جینا حرام کر دیا اُور رات سونے کے لئے جب مَیں چارپائی پر لیٹا تو نیند کوسوں دُور تھی۔ رہ رہ کر اُس مظلوم دیہاتی کی شکل نظروں کے سامنے گھوم جاتی جسے مَیں نے کسی قصور کے بغیر پہلے بے رحمی سے مارا اُور پھر پھانسی کی سزا دلوادی......اُور اُس کی شکل مجھے ایسے کرب میں مبتلا کرتی کہ مَیں اُٹھ کر بیٹھ جاتا...... پھر نیند غلبہ کرتی اُور لیٹتا تو دوبارہ یہی صورت پیدا ہو جاتی...... آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، جمائیوں پر جمائیاں آ رہی تھیں...... لیکن نیند مجھ سے روٹھ گئی تھی ...... ساری رات اسی کیفیت میں مبتلا رہا اُور مَیں ایک لمحہ کے لئے بھی سکون کی نیند نہ سو سکا......اُور مسلسل بے خوابی اُور شدید ذہنی و اعصابی دباؤ نے مجھے کئی بیماریوں میں مبتلا کر دیا......معدہ خراب ہو گیا، اُور ٹانگوں میں درد رہنے لگا......زندگی سے سکون اُور راحت جیسے رخصت ہی ہو گئے۔

اللہ کی شدید ترین ناراضگی اس صورت میں ظاہر ہوئی کہ اس واقعے کے چند ہی ماہ کے بعد میری بیوی یکا یک فوت ہو گئی۔ وہ بظاہر بھلی چنگی تھی، چھوٹی موٹی عام تکالیف کے سوا اُسے کوئی بیماری نہ تھی، مگر اُسے چند روز تک سر میں شدید درد ہوا اُور اسی حالت میں ایک روز وہ دم توڑ گئی......میری دنیا اندھیر ہو گئی، گھر کا سارا نظام ہی برباد ہو گیا...... زِچ ہو کر مَیں نے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی اُور اپنے آبائی شہر نواب شاہ میں آ گیا...... یہاں مَیں نے کریانے کی ایک دکان کر لی......ایک بیٹا تھا وہ پڑھتا تھا......اسکول سے آ کر وہ دکان پر بیٹھ جاتا...... مجھے کچھ آرام مل جاتا......اُور ساری ذہنی و جسمانی تکلیفوں کے باوجود زندگی کسی نہ کسی طرح گزرتی چلی گئی۔

لیکن لگتا یہ ہے کہ مَیں نے بھیانک قسم کے جس ظلم کا ارتکاب کیا تھا، اللہ اُس کے نتیجے میں مجھے آخری حد تک سزا دینا چاہتا ہے چنانچہ ایک ہفتہ قبل میرے بیٹے کے پیٹ میں درد اُٹھا، اُور شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ بہت علاج کیا، ڈاکٹروں، حکیموں کے ہاں دوڑتا رہا، لیکن افاقے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ درد میں اضافہ ہوتا چلا گیا، وہ تین دن تک تڑپتا رہا اُور آخر کار مجھے یک و

تنہا چھوڑ کر انتقال کر گیا۔ وہی میرا واحد سہارا تھا اُور اُسی کو مَیں دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔''

یہ عبرت ناک کہانی سناتے ہوئے مختار احمد زار و قطار روتا رہا، اُس نے بتایا: ''میری زندگی جہنم سے بدتر ہوگئی ہے۔ معدہ کوئی چیز قبول نہیں کرتا، بھوک لگتی ہے، کچھ زہر مار کرتا ہوں تو ابکائیاں آنے لگتی ہیں۔ کھایا پیا حلق کو چڑھنے لگتا ہے اُور پیٹ میں شدید مروڑ اُٹھنے لگتے ہیں...... پُرسکون نیند ایک عرصے سے خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہے۔ کبھی آنکھ لگتی ہے تو وہ دیہاتی جِسے مَیں نے پھانسی تک پہنچایا تھا، آدھمکتا ہے اُور دونوں ہاتھوں سے میرا گلا دبانے کی کوشش کرتا ہے اور مَیں چیخ مار کر بیدار ہو جاتا ہوں اور تھر تھر کانپنے لگتا ہوں۔ موت کا خوف ہمہ وقت میرے سر پر سوار رہتا ہے۔ اس کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ مَیں مر جاؤں، تاکہ ہر وقت کی اذیت سے چھٹکارا پا جاؤں، لیکن بدقسمتی سے موت بھی نہیں آتی......اُور خودکشی کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے''۔

ماسٹر علی احمد صاحب نے بتایا کہ مختار احمد ایک عرصے تک عذاب کی اسی کیفیت میں مبتلا رہا۔ مَیں جب بھی اُسے ملتا، وہ حزن وملال اُور کرب کی شدید ترین کیفیت سے دوچار نظر آتا......اُور کم وبیش ڈیڑھ دو سال تک انتہائی عبرت ناک زندگی گزار کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔

(۱۲)

دولت ہی اصل پسند تھی

چودھری حیدر علی قمر سے میری ملاقات سمبڑیال میں چودھری بشیر احمد صاحب کے ڈیرے پر ہوئی تھی۔ چودھری بشیر احمد مرحوم وہاں نہر اپر چناب پر اوورسیئر کی حیثیت سے تعینات تھے اُور بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ روایتی چودھریوں والی بارعب، دبنگ شخصیت مگر مہمان نواز، دیانت دار اور صوم وصلوٰۃ کے پابند۔ ان کا تعلق آرائیں خاندان سے تھا اور ان کی اضافی خوبی یا خامی یہ تھی کہ وہ برادری کے معاملے میں خاصی عصبیّت رکھتے تھے۔ مجھ سے ان کی محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ چودھری حیدر علی قمر ان کی سرپرستی میں نہر پر جو ٹھیکیداری کر رہے تھے، وہ بھی چودھری بشیر احمد کی اسی عنایت کا ایک انداز تھا۔

مَیں چودھری حیدر علی قمر کی دلکش اُور محبت آمیز شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ وہ خوبصورت پیکر کے حامل تھے۔ چہرے پر پوری داڑھی خوب بہار دیتی تھی۔ قد تو درمیانے سے بھی کچھ کم تھا، لیکن جناح کیپ نے ان کی قامت کو بڑھا بھی دیا تھا اُور اسے دلآویز بھی بنا دیا تھا۔ لباس ان کا باوقار تھا۔ شلوار قمیص پر واسکٹ ضرور پہنتے جس سے ان کا سراپا بہت نکھر گیا تھا۔

چودھری قمر کو جب معلوم ہوا کہ میری ملازمت لاہور میں ہے اور مَیں وہاں ایک معروف بستی میں رہائش رکھتا ہوں تو بہت خوش ہوئے۔ ان کا مکان بھی قریب ہی علامہ اقبال ٹاؤن میں تھا اُور نمازِ جمعہ عموماً میرے گھر کے قریب ہی ایک جامع مسجد میں پڑھتے تھے؛ چنانچہ اب ان کا معمول بن گیا کہ وہ جمعہ کے لیے آتے تو میرے گھر بھی تشریف لاتے۔ وہ خوش اخلاق اور خوش کلام بزرگ تھے اور ان کے پاس بیٹھ کر اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

چودھری صاحب کے خاندانی حالات معلوم کر کے مجھے ان سے زیادہ ہمدردی ہوگئی۔ ان

کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں، تین بیٹے شادی شدہ تھے، جبکہ دو بیٹیوں کی بھی شادی ہو چکی تھی، لیکن بدقسمتی سے وہ اولاد کی طرف سے سُکھی نہیں تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے کے تین بچے ذہنی طور پر معذور تھے، لیکن چونکہ وہ جسمانی اعتبار سے صحت مند تھے، اس لیے گھر میں ہمہ وقت اودھم مچائے رکھتے۔ ان کی وجہ سے پورا خاندان شدید اذیّت میں مبتلا تھا۔ بڑے بیٹے کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں، لیکن بدقسمتی سے ان کا بڑا پوتا جو صحت منداور نارمل تھا، آٹھ نو سال کی عمر میں چھت سے گر کر فوت ہو گیا اور گھر بھر کی فضا مزید سوگوار ہو گئی۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کر رہا ہوں کہ ذاتی غور و فکر اور مطالعے کے بعد مَیں عملی زندگی کے آغاز ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ہر مسلمان پر دو چیزیں فرضِ عین کی حیثیت رکھتی ہیں: تبلیغِ دین اور خدمتِ خلق اور یہ کہ دنیاوی زندگی کی کامیابیوں اور ناکامیوں پر اس حوالے سے حیرت انگیز اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس بشارت نے مسرتوں سے نہال کر دیا کہ جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی مشکل دور کرنے میں لگ جاتا ہے، اللہ اس کی مشکل دور کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اس حدیث نے بھی دل پر گہرا اثر کیا کہ تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو خلقِ خدا کے لیے نفع بخش بنتے ہیں۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ چودھری صاحب کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا غیر شادی شدہ تھے۔ خصوصاً بیٹی کی طرف سے وہ بہت فکر مند تھے؛ چنانچہ مَیں نے ان کی خواہش پر ان کی بیٹی کا رشتہ کچھ دوڑ دھوپ کے بعد اپنے سسرالی عزیزوں میں کرا دیا۔ وہ لوگ بہت شریف اور کھاتے پیتے تھے۔ وہاں ان کی بیٹی ماشاءاللہ خوش حال زندگی گزار رہی ہے۔

مَیں نے جب اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کر لی اور نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے لگا تو چونکہ سارا خاندان ان پڑھ تھا اور دیہات میں رہتا تھا، اس لیے گاؤں جاتا اور تعلیم یافتہ دوست احباب مجھے ڈاکٹر کہتے تو گاؤں کے لوگ عجیب مشکوک نظروں سے دیکھتے۔ ان کے خیال میں مَیں لاہور جا کر جعلی ڈاکٹر بن گیا تھا کہ کسی کا علاج نہیں کرتا تھا۔ اس کا مداوا مَیں نے یوں کیا کہ ہومیو

پیتھی سے دلچسپی تو تھی ہی، شام کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا اور چار سال میں کورس مکمل کر کے ہومیو پیتھی کی سند بھی حاصل کر لی۔

چودھری حیدر علی قمر صاحب پر انکشاف ہوا کہ مَیں ہومیو پیتھی سے بھی دلچسپی رکھتا ہوں تو وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ اب وہ آتے تو گپ شپ بھی کرتے، چائے بھی پیتے اور جاتے ہوئے اپنے لیے، اپنی بیگم اور دیگر افراد کے لیے دوائیں بھی لے جاتے۔ مَیں ان سے کچھ بھی وصول نہیں کرتا تھا نہ انہوں نے اس حوالے سے کبھی کوئی پیش کش کی۔

اب موصوف کی اولاد میں صرف ایک بیٹا مسعود غیر شادی شدہ رہ گیا تھا؛ چنانچہ وہ جب بھی تشریف لاتے، مسعود کی شادی کا ذکر ضرور کرتے اور تقاضا کرتے کہ مَیں ہی اس کے لیے رشتہ تلاش کروں۔ مسعود نے ایم بی اے کیا ہوا تھا اور ایک بڑی فیکٹری کے دفتر میں اچھی تنخواہ پر ملازم تھا۔ چونکہ ایک سروے رپورٹ کے مطابق پاکستان میں چالیس لاکھ لڑکیاں شادی کی عمر گزار چکی ہیں اور ایک کروڑ لڑکیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں، لیکن مناسب رشتوں کی بڑی ہی قلت ہے، اس لیے قدرتی طور پر بیٹیوں والے لوگ بہت پریشان ہیں؛ چنانچہ متعدد دوست احباب نے بیٹیوں کے رشتوں کے لیے کہہ رکھا تھا۔ اس طرح مسعود کے لیے مناسب رشتے کی تلاش ذرا بھی مشکل نہ تھی؛ چنانچہ مَیں نے چودھری صاحب سے وعدہ کر لیا کہ مَیں ان کے بیٹے کے لیے مناسب رشتہ تلاش کر لوں گا۔ احتیاطاً مَیں نے پوچھ لیا کہ وہ کیسا رشتہ چاہتے ہیں؟ فرمایا کہ وہ لوگ لازماً دیندار ہوں، شریف اور سادہ ہوں، تاہم برادری اپنی ہونی چاہیے۔ ہم آرائیوں سے باہر رشتہ نہیں کیا کرتے۔

چنانچہ جلد ہی مَیں نے انہیں ایک رشتے کی نشاندہی کی۔ لڑکی کے والد نے چودھری صاحب کے گھر کے قریب ہی علامہ اقبال ٹاؤن میں اپنا گھر بنا رکھا تھا۔ وہ ریٹائرڈ ایکس ای این تھے۔ بہت دیندار، متواضع شخصیت کے حامل۔ ان کے ایک بیٹے ائیر فورس میں سکواڈرن لیڈر تھے اور میرے دوست تھے۔ دوسرا بیٹا انجنیئر تھا اور انگلینڈ میں مقیم تھا۔ سارے خاندان کے افراد خوبصورت اور خوش اخلاق تھے۔ مَیں خوش تھا کہ یہ خاندان تو چودھری صاحب کو ضرور ہی پسند

آجائے گا، لیکن مَیں بہت پریشان ہوا جب ایک ہفتے کے بعد انہوں نے رپورٹ دی کہ ہمیں یہ رشتہ پسند نہیں آیا۔

چندروز کے بعد مَیں نے لاہور کے ایک معروف اور بڑے سرکاری اسکول کے پرنسپل سے ان کی ملاقات کرائی۔ یہ صاحب بہت نیک نام اور خوش اخلاق انسان تھے، لیکن چودھری صاحب کو یہ خاندان بھی پسند نہ آیا۔

اس کے بعد میں نے موصوف کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک دینی جماعت کے اہم قائد کی بیٹی کا رشتہ قبول کرلیں، لیکن تحقیق وتفتیش کے بعد انہوں نے یہ رشتہ بھی مسترد کردیا۔

چوتھا رشتہ لاہور سے باہر ایک قریبی شہر سے تھا۔ چودھری صاحب گھر کی خواتین کے ساتھ وہاں چلے تو گئے، لیکن عذر یہ کیا کہ اصل میں ہم لاہور سے باہر رشتہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔

اس کے چند روز بعد موصوف تشریف لائے اور مسعود کے رشتے کی بات پھر چھیڑ دی۔ لیکن مَیں نے انہیں جتانا مناسب نہ جانا کہ آپ اب تک چار بہت مناسب رشتے مسترد کرچکے ہیں۔ دراصل مَیں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے دُکھی دل کو ٹھیس لگے اور ان کے جذبات مجروح ہوں۔ یہ گمان بھی تھا کہ اس سب کچھ میں چودھری صاحب کا کوئی قصور نہیں اور جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، اس کی ذمہ داری گھریلو خواتین پر عاید ہوتی ہے، جنہیں رشتہ تلاش کرتے ہوئے اپنے بھائی یا بیٹے کے لیے کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی ..... چنانچہ اب مَیں نے چودھری صاحب کو مشورہ دیا کہ ہم ہفت روزہ ''ایشیا'' میں ضرورتِ رشتہ کا ایک اشتہار چھپوا دیتے ہیں۔ یہ رسالہ دیندار، تعلیم یافتہ طبقے میں عام پڑھا جاتا ہے۔ امید ہے اس طرح مسئلہ آسانی سے حل ہوجائے گا۔

چودھری حیدر علی قمر صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا۔ ان دنوں مَیں دیال سنگھ کالج میں تدریس کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ''ایشیا'' کا دفتر شاہ عالم مارکیٹ میں خاصے فاصلے پر ایک تین منزلہ عمارت کی آخری منزل پر تھا۔ مَیں نے اشتہار کی عبارت بنائی اور موٹر سائیکل پر ''ایشیا'' کے دفتر جاکر اشاعت کے لیے دے دیا۔

آٹھ دس دن کے بعد مَیں دوبارہ ''ایشیا'' کے دفتر گیا تو یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ اشتہار کے جواب میں بارہ خط آئے ہوئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ اب تو مسعود کی شادی کا مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا اور چودھری صاحب کو ان میں سے کوئی ایک رشتہ لازماً پسند آ جائے گا...... چنانچہ مَیں گھر آیا، فون پر چودھری صاحب کو اطلاع دی۔ خط ان کی موجودگی میں کھولے گئے، ہم دونوں نے توجہ سے پڑھے اور پھر وہ خط چودھری صاحب یہ کہہ کر ساتھ لے گئے کہ مَیں گھر والوں سے مشورے کے بعد پسند کا رشتہ منتخب کرلوں گا۔ مجھے بھی اطمینان تھا کہ سب رشتے بہت مناسب تھے، سب لڑکیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھیں۔ سب خاندان بہت شریف اور دیندار تھے۔

لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ، تقریباً ایک ہفتے کے بعد چودھری صاحب آئے اور کہنے لگے۔ ''ڈاکٹر صاحب، ہمیں تو ان میں سے کوئی رشتہ بھی پسند نہیں آیا۔'' مَیں حیرت زدہ رہ گیا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا تبصرہ کروں، تاہم جی کڑا کے ان سے کہا۔ ''چودھری صاحب! میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر آپ کیسا رشتہ چاہتے ہیں۔ اب تک آپ سولہ دین دار اور شریف خاندانوں کو مسترد کر چکے ہیں؛ چنانچہ سن لیں کہ مَیں آئندہ اس معاملے میں آپ کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کروں گا، لیکن نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم آپ تک ضرور پہنچانا چاہتا ہوں کہ دیندار رشتہ ملے تو اسے قبول کرلو، ورنہ کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے اور آپ تو ایک دو نہیں، سولہ دیندار رشتے مسترد کر چکے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کا کیا بنے گا؟ مجھے تو بہت خوف محسوس ہو رہا ہے...... مَیں نے انہیں دوٹوک انداز میں بتایا کہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ بے عمل اور جاہل لوگوں کو لمبی ڈھیل دے دیتا ہے، لیکن جو لوگ دینداری کے دعوے دار ہوں اور پھر دین کے تقاضوں کی پروا نہ کرتے ہوں، اللہ انہیں جلد پکڑ لیتا ہے، انہیں معاف نہیں کرتا۔

چودھری صاحب نے منہ لٹکا لیا اور چائے پیئے بغیر چلے گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے بھی انہیں چائے پینے پر اصرار نہیں کیا۔

اس کے بعد میرا چودھری حیدر علی قمر سے رابطہ کٹ گیا۔ سچی بات ہے مَیں بہت دل برداشتہ

ہوا تھا۔ فون پر بھی ان سے بات کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

کوئی چھ مہینے اسی طرح گزر گئے حتیٰ کہ ان کا داماد اشرف (جس سے مَیں نے ان کی بیٹی کا رشتہ کرایا تھا) ہمارے گھر آیا اور گفتگو کے دوران اس نے بتایا کہ مسعود کا رشتہ رینالہ خورد میں طے پا گیا ہے اور یہ رشتہ چودھری صاحب کے بڑے بیٹے نے تلاش کیا ہے۔ اس کے سسرال بھی رینالہ خود میں تھے۔ اشرف نے بتایا کہ مسعود کے ہونے والے سسر کی پانچ چھ فیکٹریاں ہیں، کروڑ پتی آدمی ہے اور یہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اب مسعود کے بھائی لاڈ سے اور مذاق سے کہتے ہیں کہ تمہیں تو اب دو تین فیکٹریاں آسانی سے مل جائیں گی۔ تم تو اب کروڑ پتی بن گئے۔ دیکھو ہم غریبوں کو بھول نہ جانا ہم ہی نے تمہیں لکھا پڑھا کر اس مرتبے تک پہنچایا ہے۔

اشرف نے بتایا کہ چودھری صاحب تو اب خوشی سے پھولے نہیں سماتے، بار بار کہتے ہیں میرے اس بیٹے کا ستارہ بہت اونچا ہے۔ میری ساری اولاد میں یہ سب سے بلند بخت واقع ہوا ہے۔

تب میرے دل سے آہ نکلی۔ سوچا یہ کچھ تلاش کر رہے تھے چودھری صاحب! ہیں کوا کب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دینداری، شرافت اور سادگی تو محض ایک ڈھونگ تھا۔ اصل میں وہ دین کے پردے میں خالص دنیا کمانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہوں نے سولہ دیندار، شریف رشتے ٹھکرائے تھے۔ مَیں بظاہر بہت ہی نستعلیق، مقدس چہروں پر چڑھے ہوئے نقابوں کی بوقلمونی پر حیرت زدہ ہو گیا اور کئی دنوں تک سکتے کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ فون کر کے چودھری صاحب کو مبارک دینے کی ہمت بھی نہ پڑی۔

اس واقعے کو دو ڈھائی ماہ گزرے ہوں گے کہ ایک روز (10 اکتوبر 1989ء بروز منگل) صبح آٹھ بجے دروازے کی گھنٹی بجی۔ مَیں باہر نکلا۔ دیکھا کہ چودھری حیدر علی قمر اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ اپنی گاڑی کے پاس کھڑے ہیں۔ دونوں کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ پوچھا خیر تو ہے، کیسے تشریف لائے؟ جواب دیا کہ خیر نہیں ہے۔ تین دن پہلے مسعود رات کے وقت غسل خانے میں گر کر بے ہوش ہو گیا تھا اور اب تک اس کی حالت ٹھیک نہیں ہوئی۔ اسے تیز بخار ہے اور

اس کے سر میں شدید درد ہے۔ چیختا ہے، چلاّتا ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا، اس لیے اسے اب شیخ زاید ہسپتال داخل کرانا ہے، اس کے لیے ڈاکٹر شاہد صاحب کی سفارش درکار ہے...... ڈاکٹر شاہد لاہور کے ایک بڑے ہسپتال میں ڈائریکٹر تھے اور ان دنوں میرے پڑوس میں رہتے تھے۔

میری عادت ہے کہ خاص نوعیت کے واقعات کو اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیتا ہوں۔ دونوں باپ بیٹوں کو رخصت کر کے مَیں گھر کے اندر آیا اور 10 اکتوبر 1989ء کی تاریخ میں لکھا:

''چودھری...... صاحب اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مسعود تین دن سے سخت بیمار ہے اور کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا۔ مجھے لگتا ہے کہ آخر کار اللہ کی لاٹھی حرکت میں آ گئی ہے۔ انہوں نے صرف دنیا کی خاطر سولہ دیندار رشتے ٹھکرائے تھے، لیکن اب شاید انہیں دنیا بھی نہ ملے۔ مجھے تو سب کچھ غارت ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔''

مسعود شیخ زاید ہسپتال میں کئی دن تک زیرِ علاج رہا، لیکن ٹھیک نہ ہوا۔ پھر اس کے ہونے والے سُسر اسے رینالہ خورد لے گئے۔ وہاں بھی اس کا علاج ہوتا رہا، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ درد سے اس کا برا حال تھا۔ شدید اذیت سے وہ بے طرح چیختا اور بے ہوش ہو جاتا۔ کچھ دیر کے بعد ہوش میں آ کر اس پر دوبارہ دورہ پڑ جاتا۔ اس طرح وہ بار بار انتہائی تکلیف دہ عمل سے گزرتا رہا۔ تنگ آ کر اس کے لواحقین اسے 23 اکتوبر 1989ء کو دوبارہ لاہور لے آئے اور نہر کے کنارے جب گاڑی شیخ زاید ہسپتال کی طرف رواں دواں تھی، مسعود نے خون کی الٹیاں کیں، اس کی حالت غیر ہو گئی اور ہسپتال پہنچنے سے پہلے وہ دم توڑ گیا۔ ایمرجنسی میں ڈاکٹروں نے اس کی موت کی تصدیق کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کتنی سچی بات کی ہے مولانا ظفر علی خان نے ؎

نہ جا اس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اس کی
ڈر اس کی دیر گیری سے کہ ہے سخت انتقام اس کا

(۱۴)

سرداراں

سرداراں بی بی...... کتنا اچھا نام تھا اس کا، لیکن کسی نے زنگی کا نام کافور رکھ دیا تھا کہ اس کے اطوار و روّیے میں شرافت کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ جوان ہوئی تو اپنے آشنا کرامت مغل فقیر کے کے ساتھ بھاگ کر ہمارے گاؤں میں آ گئی۔ وہ واجبی سی شکل وصورت کی مالک تھی، لیکن صحت مند راور چنچل تھی، مخاطب کو متاثر کرنے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ غصہ اس کی نس نس میں بھرا ہوا تھا اور جب خدا نے اسے چھ بیٹے اور تین بیٹیاں عطا کر دیں تو اس کی بداخلاقی میں غرور شامل ہو کر دو آتشہ ہو گیا اور اس کے پڑوس میں رہنے والے غلام محمد اور عبداللہ کا جینا حرام ہو گیا۔ یہ دونوں بھائی تھے، کرامت کے رشتہ دار بھی تھے، مسکین طبیعت کے شریف الطبع انسان تھے۔ بکریاں پال کر گزارہ کرتے تھے جبکہ کرامت نے تانگہ بنا رکھا تھا۔ اس زمانے میں تانگہ ایک معروف سواری تھی اور تانگے گھوڑے کا مالک آج کے ویگن مالک کی طرح آسودہ زندگی گزارتا تھا۔

غلام محمد اور عبداللہ کی پہلی بدنصیبی تو یہ تھی کہ وہ غریب تھے اور دوسری کم بختی یہ کہ وہ سرِداراں اور کرامت کے پڑوسی تھے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انہوں نے بکریاں پال رکھی تھیں اور بکریوں کے حوالے سے یہ ضرب المثل وہاں بار بار صادق ہوتی ہوئی نظر آتی تھی کہ غم نہ داری بز بہ خر، یعنی اگر تجھے کوئی غم نہیں تو بکریاں پال لو...... چنانچہ جونہی کوئی بکری یا بکری کا بچہ سرداراں کے کھلے صحن میں داخل ہوتا، وہ بے تحاشا چیخنے لگتی اور بیٹوں کو باقاعدہ حکم دیتی اور وہ ڈنڈے سوٹے لے کر غلام محمد اور عبداللہ کے گھر پر حملہ آور ہو جاتے اور جو سامنے آتا، اسے دھن کر رکھ دیتے۔

یہ آئے دن کا دردناک تماشا تھا جس کا وقتاً فوقتاً مظاہرہ ہوتا رہتا۔ یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کا زمانہ ہے۔ گاؤں کی زمینوں کے مالک سِکھ تھے، جبکہ مسلمان سارے کے سارے ان کے

مزارع یا مزدور پیشہ لوگ تھے۔ سکھ اس قضیے میں اس لیے دخل نہ دیتے کہ جھگڑا دو مُسلے خاندانوں کے درمیان تھا اور عام مسلمان مغلوں کی غنڈہ گردی سے خوفزدہ تھے، اس لیے اپنی اپنی نفسیاتی مجبوریوں کی وجہ سے کوئی بھی اس مسئلے میں دخل نہیں دیتا تھا، بلکہ یوں لگتا ہے کہ گاؤں والوں کے نزدیک یہ اذیت ناک ڈرامہ تفریح کا سبب بن گیا تھا...... یکا یک گاؤں کی درمیانی گلی سے شور شرابے اور چیخ پکار کی صدائیں بلند ہوتیں تو لوگ سمجھ لیتے کہ کرامت مغل فقیر کے خاندان نے غلام محمد اور عبداللہ کے گھروں پر یلغار کر دی ہے......

بار ہا ایسا ہوا کہ وہ انہیں مارتے ہوئے گاؤں کے باہر تک لے آتے اور جب تھک ہار جاتے تو دونوں بھائیوں کو ادھ موا حالت میں چھوڑ کر فاتحانہ قہقہے لگاتے ہوئے واپس لوٹ جاتے۔ کرامت اور اس کے بیٹے بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہم مغل ہیں اور دشمن کو معاف کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کے مزاج اور عمومی روّیے پر تاتاریوں کی سفاکی اور بے رحمی غالب نظر آتی تھی۔ اس نوعیت کا ایک منظر تو خود مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ 1947ء سے تھوڑا پہلے کی بات ہے، میری عمر یہی کوئی چار پانچ سال کے درمیان ہوگی۔ ہمارا گھر گاؤں کے شمالی جانب باہر کی طرف تھا۔ ایک بار یہ شور بالکل ہمارے مکان کے دروازے پر آ گیا۔ مَیں نے چھت پر چڑھ کر دیکھا، عبداللہ اور غلام محمد دونوں زمین پر چت گرے ہوئے تھے اور کرامت اور سرداراں کا سارا خاندان ڈنڈوں سے انہیں پیٹ رہا تھا۔ حتیٰ کہ میرے ہم عمر جعفر کے ہاتھ میں بھی چھوٹا سا ڈنڈا پکڑا ہوا تھا اور وہ بھی اس جہاد میں بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

تب آخر کار وہی ہوا جو ایسے حالات میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ بلی نے عاجز آ کر شیر کا منہ نوچ لیا اور اس کی آنکھیں نکال دیں۔ یعنی ایک منہ اندھیرے جب کر۔ مت رفعِ حاجت کے لیے گاؤں سے باہر ایک کھیت میں بیٹھا ہوا تھا، عبداللہ اور غلام محمد نے لاٹھیوں سے اس کا کچومر نکال دیا اور اس وقت تک اسے مارتے رہے جب تک اس کی موت کا انہیں یقین نہ ہو گیا۔ وہاں سے وہ سیدھے تھانے چلے گئے اور جا کر گرفتاری دے دی۔ پلٹ کر گاؤں آتے تو کرامت کے بیٹے ان کا

قیمہ بنا دیتے۔

سرداراں بیوہ ہوگئی۔ اُس کا شیر جیسا خاوند موت کے گھاٹ اتر گیا، لیکن اس کی کارروائیوں میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ غلام محمد اور عبداللہ کو پھانسی کی سزا ہوئی جو اپیل کے بعد عمر قید میں بدل گئی۔ عبداللہ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی، لیکن غلام محمد شادی شدہ تھا اور اس کی بیوی برکت بی بی اب مستقل طور پر مصیبتوں اور غموں کی تصویر بن کے رہ گئی، مسکراہٹ تو گویا اس کے لبوں سے رخصت ہی ہوگئی تھی...... لیکن سرداراں اسے مسلسل کچوکے دیتی رہتی اور اس کے بیٹے بھی اسے ذہنی وجسمانی اذیت پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے۔ نتیجتاً اس نے اپنے خاوند کا گھر چھوڑ دیا اور اپنی نو عمر بیٹی کے ساتھ گاؤں سے باہر ایک خالی جگہ پر ایک کٹیا میں رہنے لگی۔ سرداراں نے بغیر کسی تردد کے اس کے مکان پر قبضہ کر لیا اور اسے با قاعدہ اپنے گھر کا حصہ بنالیا۔

پاکستان بنا اور گاؤں کے سکھ ہندوستان چلے گئے تو قریب کے ایک گاؤں کا حسن نامی ایک بدمعاش جو باقاعدہ ڈاکو بھی تھا، ہمارے گاؤں میں آکر بیٹھ گیا اور سکھوں کا سارا قیمتی سامان لوٹ کر لے گیا، ورنہ حالت یہ تھی کہ گاؤں کے کسی فرد نے سکھوں کے سامان کو ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ یہیں حسن کا تعارف سرداراں سے ہوا جو گہری دوستی میں بدل گیا اور اس کا بیشتر وقت حسن کے پاس ہی گزرنے لگا اور حالت یہ ہوئی کہ جب مہاجرین آگئے اور پولیس نے حسن کو گاؤں سے نکال دیا تو سرداراں حسن کے پاس اس کے گاؤں چلی گئی اور علانیہ اس کے گھر میں رہنے لگی، لیکن جب حسن نے اپنے ہی گاؤں کے ایک زمیندار کو دن دیہاڑے قتل کر دیا اور گرفتار ہو کر جیل چلا گیا تو سرداراں اپنے بیٹوں کے پاس آ گئی۔

اسی زمانے میں اور یہ بات ہے ۵۲-۱۹۵۳ء کی کہ ہمارے گاؤں میں قریبی قصبے سے ایک نوجوان نے آکر کریانے کی ایک دکان کھول لی۔ اس کی بھی سب سے زیادہ دوستی سرداراں سے تھی اور سرداراں کی وساطت سے اس کا گہرا تعلق مہر چراغ کے گھر سے استوار ہوا اور اس مثلث کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ چند ماہ کے اندر ایک رات گاؤں کی سب سے خوبصورت اور جوان لڑکی، مہر

چراغ کی بیٹی حلیمہ اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہوگئی...... یہ سارا انتظام سرداراں ہی نے کیا تھا اور اس پورے علاقے میں اغوا کی اس پہلی واردات کا سہرا اسی کے سر بندھتا تھا۔

اب سرداراں نے رہے سہے حجاب اتار دیئے اور بدی اور بدکاری کے راستے پر سینہ تان کر چل پڑی۔ اس نے علاقے بھر کے بدقماش لوگوں سے دوستیاں لگالیں، بلکہ اپنی ایک بیٹی کو بھی اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب ہوگئی......تب اس خاندان پر خدا کا غضب ٹوٹ کر برسا۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث ہے جس کا مفہوم یوں ہے کہ جس خاندن یا قوم میں بدکاری کا چلن عام ہوجاتا ہے وہاں جوان موتیں کثرت سے ہوتی ہیں...... چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے ایک روز سرداراں کا بڑا بیٹا حنیف موت کی وادی میں اتر گیا۔ کتنا کڑیل جوان تھا وہ، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کسرتی جسم، صوم وصلوٰۃ کا پابند، مسجد کے صحن میں کھڑے ہوکر اذان دیتا تو (کسی لاوڈ سپیکر کے بغیر) تین فرلانگ دور ڈسکہ روڈ تک اس کی آواز سنائی دیتی۔ اپنے باپ کی طرح حنیف بھی تانگہ چلا کر گزارہ کرتا تھا۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے تھے اس کے اور اس کی بیوی کریماں بڑی ہی خوش اخلاق خاتون تھی...... اس وقت تو کسی کو اس کی موت کا سبب معلوم نہیں ہوا تھا، لیکن لگتا ہے کہ اس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی۔ ماں کی سرگرمیاں اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی تھیں۔

چند ہی مہینے گزرے تھے کہ شریفاں کا دوسرا بیٹا صادق بھی پیکِ اجل کا شکار ہوگیا۔ صادق بھی عیال دار تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ میاں بیوی دونوں خوبصورت اور صحت مند تھے، اس لیے بیٹے بھی وجیہہ وشکیل تھے۔ صادق مزدور پیشہ نوجوان تھا۔ جو کام ملتا کر لیتا۔ رات کو گاؤں میں چوکیداری کا فرض انجام دیتا تھا۔ اس کی موت بھی ناگہانی تھی...... سرداراں کی ساری کارستانیوں کے باوجود گاؤں کے سارے لوگ ان دونوں بھائیوں کی موت پر بہت غمزدہ اور ہراساں ہوئے۔

اب باری آئی عنایت علی کی۔ یہ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھا۔ نوعمر ہی تھا، ابھی کنوارا تھا کہ چند روز بخار میں مبتلا رہ کر چل بسا......اور پھر ایک روز جعفر کو بلاوا آ گیا۔ یہ بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ میرا ہم عمر تھا، لیکن دوسرے بھائیوں کی طرح تعلیم سے بالکل بے بہرہ رہا......اس کے

حوالے سے ایک بات مجھے کبھی نہیں بھولتی، گرمیوں کا موسم تھا، چاندنی رات تھی اور ان کے مکان کی کھلی چھت پر ایک تقریب ہو رہی تھی۔ بیعت کی تقریب، مرید بننے کی تقریب...... دراصل دیہات ہی میں نہیں بلکہ شہروں میں بھی جو ایک عقیدہ ایمان کا حصہ بنا دیا گیا ہے کہ کسی نہ کسی ''مرشد'' کی بیعت فرضِ عین ہے اور جس کا کوئی مرشد نہیں اس کا نہ نکاح جائز ہے نہ اس کا جنازہ ہو سکتا ہے...... تو اس حوالے سے گاؤں کے ہر فرد بشر کے لیے کسی نہ کسی پیر کا مرید ہونا لازم تھا...... اور آج جعفر سائیں رونق علی سے ''بیعت'' ہو رہا تھا۔

سائیں رونق علی ایک ایسی چار پائی پر رونق افروز تھا جس پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ داڑھی، مونچھوں اور سر کے بالوں سے مکمل بے نیاز...... البتہ سر کے درمیان سے تقریباً دس انچ لمبی بالوں کی ایک لٹ کانوں کے نیچے تک جھولتی جا رہی تھی۔ وہ تکیہ لگائے چار پائی پر نیم دراز تھا۔ اس کی ستار اس کے پہلو میں آرام کر رہی تھی جبکہ نیچے فرش پر بھنگ گھوٹنے کا کونڈا اور ڈنڈا فروکش تھے۔ گاؤں کے پندرہ بیس افراد نہایت عقیدت و احترام سے سائیں کی چار پائی کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور مَیں ایک مبصر کی حیثیت سے وہاں موجود...... سرداراں بی بی ایک طرف ہاتھ باندھے بیٹھی ہوئی تھی...... اور اسے ہی سائیں رونق علی سے سب سے بڑھ کر عقیدت تھی۔

سائیں رونق علی اچانک سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور ناقابلِ فہم انداز میں پنجابی کے اشلوک اور بھجن گانے لگا۔ اس کی آواز بار بار بلند اور کرخت ہو جاتی جس سے مجھ سمیت سارے حاضرین سہم سہم جاتے تھے...... اسی لے میں اس نے یکا یک زور کا ایک نعرہ لگایا اور جعفر اس کے سامنے باقاعدہ سجدے میں گر گیا اور دیر تک اسی حالت میں پڑا رہا...... سائیں بدستور اشلوک پڑھتا رہا حتیٰ کہ پانچ سات منٹ کے بعد جعفر نے سجدے سے سر اٹھایا اور سائیں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ''شکر اے اَج مَیں مسلمان ہو گیاں......'' عنایت علی کی طرح جعفر بھی کنوارا دنیا سے چل دیا...... اس نے سائیں رونق علی کا مرید بننے کے سوا زندگی کا کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔

یکے بعد دیگرے چار جوان بیٹوں کی موت سے بھی سرداراں کے اندر کا انسان بیدار نہ ہوا۔

اس نے اپنے حالات سے ذرا بھی عبرت حاصل نہ کی۔ اس نے اپنی دونوں بیوہ بہوؤں کو اتنا زِچ کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلی گئیں۔ کریماں کے بچے سیانے ہو گئے تھے وہ انہیں لے کر گوجرانوالہ چلی گئی، جبکہ فاطمہ نے قریبی قصبے سمبڑیال میں پناہ حاصل کر لی۔

سرداراں کو نیکی سے، اخلاقیات سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ گاؤں کی اکلوتی مسجد کے سامنے مشرق کی جانب مغل خاندان کا چھوٹا سا قبرستان تھا جس میں ''بابا کرے شاہ'' کی اکلوتی پختہ قبر بھی تھی۔ سرداراں کو اس قبر سے نہایت درجے کی عقیدت تھی۔ وہ علی الصبح آ کر قبر کے اردگرد جھاڑو دیتی، اس کی چادر صاف کرتی اور قبر کے اوپر والے ابھرے ہوئے حصے کو اس طرح مٹھیوں سے دباتی جیسے کوئی زندہ لیٹے ہوئے بزرگ کو دباتا ہے۔ شام کو وہ بلاناغہ چراغ جلاتی، قبر کی پائنتی کی جانب ماتھا ٹیکتی اور دوبارہ مٹھی چاپی کرتی تھی۔

سرداراں مسجد کے نمازیوں سے خوش نہیں تھی۔ اکثر بڑبڑاتی کہ نمازی ''بابا'' کی طرف پشت کر کے کھڑے ہوتے ہیں اور بے ادبی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ چنانچہ اسے مسجد سے اتنی ضد تھی کہ مسجد کی کھڑکی اور بیرونی دیوار کے عین سامنے وہ گوبر کے اوپلے تھوپ دیتی جن کی بدبو سے مسجد کی فضا متاثر رہتی۔

۱۹۸۰ء کے آغاز کی بات ہے، بارش کی وجہ سے زمین پر پھسلن تھی۔ سرداراں گھر سے بابا کرے شاہ کی ''خدمت'' کے لیے نکلی کہ پھسل گئی اور اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کی چیخ پکار سن کر لوگوں نے اسے اٹھایا، اس کے گھر پہنچایا۔ علاج معالجے کے باوجود وہ ٹھیک نہ ہوئی اور پانچ چھ سال تک چارپائی پر پڑی رہی۔ اس دوران میں اس کی حالت بڑی قابلِ رحم تھی۔ کمر پر زخم ہو گئے اور ٹانگیں مسلسل کڑلوں کی وجہ سے بدوضع ہو گئیں۔ اب وہ مزید بدمزاج ہو گئی، چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرتی جس کی وجہ سے اس کے دونوں بیٹے اور بہوئیں اور ان کے بچے بھی اس سے دور رہنے کی کوشش کرتے۔ نتیجتاً پہروں بھوکی رہتی اور شام کو اس کا بیٹا اکبر تانگہ لے کر گھر آتا تو اسے کچھ کھانا نصیب ہوتا۔

برسوں کی مالش اور ٹونے ٹونکوں سے سرداراں صرف اس قابل ہوسکی کہ لاٹھی کے سہارے گھر سے نکل کر قبرستان کے پاس کھلی جگہ تک آجاتی اور سردیوں کے موسم میں دھوپ میں بیٹھی رہتی۔اس کے حواس بعض اوقات اتنے مختل ہوجاتے کہ کوڑے کے ڈھیر سے گندگی اٹھا کر کھانے لگتی...... لیکن عجیب بات یہ ہے کہ وہ صحت کی مزید خرابی میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔ایک لمبا عرصہ وہ اس ابتلاء سے دوچار رہی حتیٰ کہ ایک روز اس پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ سسک سسک کر مرگئی۔

لوگوں نے بتایا کہ موت کے وقت اس کا چہرہ سیاہ ہوگیا تھا جسے دیکھ کر دل پر بے اختیار دہشت طاری ہونے لگتی تھی۔

(۱۴)

نذیر موچی

لڑکپن اور جوانی کا زمانہ گاؤں میں گزرا، اسے یاد کرتا ہوں اُور مختلف کرداروں کا جائزہ لیتا ہوں تو نذیر موچی کی زندگی عبرت کے حوالے سے عجیب احساس پیدا کرتی ہے۔ نذیر موچی کو جوانی میں چیچک نکل آئی تھی جس سے اس کا سارا چہرہ کالے دانوں سے بھر گیا تھا، لیکن چونکہ وہ تنومند، قد آور اور متناسب خدوخال کا نوجوان تھا، اس لئے چیچک نے اُس کی شخصیت کو بدنما نہیں کیا تھا، پھر وہ تیز طرار اور ذہین آدمی تھا، خوش مزاج اور خوش گفتار تھا اور عموماً ہنستا مسکراتا ہوا نظر آتا تھا، اس لئے ہر ملنے والے سے اس کی دوستی بڑی جلدی ہو جاتی تھی۔

لیکن بدقسمتی سے وہ چٹا ان پڑھ تھا اور حالانکہ وہ بابا فضل دین موچی کا بیٹا تھا، جس نے گاؤں کے سارے بچوں کو ناظرہ قرآن پڑھایا تھا لیکن اپنے بڑے بھائی بشیر کے برعکس وہ بالکل ہی پھسڈی اور بے عمل تھا اور مسجد کے تو قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا حتیٰ کہ قرآن تک نہیں پڑھ سکا تھا۔ اسے کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔

نذیر موچی زبانی کلامی جس قدر ذہین بنتا تھا اور باتیں بنانے میں خوب ماہر تھا، کردار کے لحاظ سے وہ بہت ہی گرا ہوا تھا۔ ایک روز نصف شب کے قریب گاؤں کے ایک حصے میں چیخ و پکار کی صدائیں بلند ہوئیں۔ گرمیوں کا موسم تھا اور چونکہ مکانوں کے صحن چھوٹے تھے اور گاؤں میں اُس زمانے میں ابھی بجلی اور پنکھوں کی نعمت میسر نہیں تھی، اس لئے لوگ راتوں کو چھتوں پر سوتے تھے۔ نذیر موچی کے بالکل پڑوس میں ایک گھرانا ایسا تھا جہاں ایک یتیم لڑکی پرورش پا رہی تھی۔ اس کا باپ مر گیا تھا۔ ماں نے دوسری شادی کر لی تھی اور آج کل وہ اپنے چچا کی کفالت میں تھی۔ وہ بھی قریب کی چھت پر سوتی تھی۔ نذیر نے ایک رات موقع پا کر اس سے چھیڑ خانی شروع کر دی

اور وہ خوف زدہ ہو کر واویلا کرنے لگی۔ لوگ بروقت بیدار ہو گئے، سلیمان کی عزت بچ گئی اور نذیر موچی کی خوب چھترول ہوئی۔

نذیر کی شادی ہو گئی، اسے بہت اچھی بیوی مل گئی، خوبصورت، دراز قد، صحت منداور خوش اخلاق، لیکن نذیر کی بدبختی کہ اس نے محلے میں ایک شادی شدہ عورت سے تعلقات استوار کر لئے اور اس معاملے میں اس نے بڑی ہی بے غیرتی کا مظاہرہ کیا۔ عام حالات میں وہ شیراں کو بہن کہا کرتا (کہ ہمارے گاؤں میں اس زمانے میں بھابھی کہنے کا رواج نہیں تھا) لیکن اس نے اس لفظ اور رشتے کی خوب خوب مٹی پلید کی اور لمبے عرصے تک وہ اپنی ''بہن'' سے منہ کالا کرتا رہا۔

خدا کی بے نیازی دیکھئے کہ نذیر کی جو پہلی بیٹی پیدا ہوئی وہ ذہنی طور پر معذور تھی۔ گوشت سے بھرا ہوا جسم، لیکن اپنی حرکتوں سے بالکل چڑیل لگتی تھی۔ بکھرے ہوئے بال، منہ سے گرتی ہوئی رالیں، خواہ مخواہ ہنستی رہتی اور قہقہے لگاتی ہوئی اِدھر اُدھر بچوں کے پیچھے بھاگتی رہتی۔ مَیں تعلیم سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج شکر گڑھ میں لیکچرار ہو گیا تھا۔ وہیں رہتا تھا اور مہینے ڈیڑھ مہینے کے بعد ہی گھر آتا تھا۔ جب ایک بار گاؤں آیا تو لوگوں نے بتایا کہ نذیر کی بیٹی گڈو کو مجید لوہار کے بیٹے جاوید نے دن دیہاڑے خون میں نہلا دیا ہے۔ تب مَیں اللہ کے منتقم ہونے پر کانپ اٹھا۔ جاوید گرفتار ہوا، اس پر مقدمہ چلا اور وہ تین سال کے لئے جیل خانے چلا گیا۔

نذیر کی دوسری بیٹی شہناز اپنی ماں کی طرح خوبصورت اور خوش اخلاق تھی لیکن کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ اس کی بیوی مختصر علالت کے بعد مر گئی۔ نذیر پر اللہ کی ناراضگی بڑھتی جا رہی تھی۔ نذیر کی دوسری شادی ہوئی، اس کی نئی بیوی پہلی کے بالکل ہی برعکس تھی۔ بمشکل ساڑھے چار فٹ کا قد، گندی مندی، دبلی پتلی، جھلی سی، غرض اس کی شخصیت میں جاذبیت یا دلکشی نام کی کوئی بات نہ تھی۔ اُس نے اسے اور اس کے والدین کو اتنا زچ کیا کہ وہ نقل مکانی پر مجبور ہو گیا۔ اسے لے کر گوجرانوالہ کی کسی نواحی بستی میں چلا گیا۔

شکر گڑھ سے میرا تبادلہ ۱۹۷۵ء میں گوجرانوالہ ہو گیا۔ مَیں کالج کے قریب ہی سیٹلائٹ

ٹاؤن مین رہتا تھا۔ ایک روز نذیر سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ وہ تھوڑے فاصلے پر نہر کے کنارے ایک بستی میں رہتا ہے۔ اُس نے اپنا پتہ دیا اور مَیں دو ایک بار صرف تجسس کی خاطر اس کے گھر گیا اور خاصا خوفزدہ ہوا۔ اُس کی بیوی میں سلیقہ نام کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ گھر کا ماحول دیکھ کر وہ پرلے درجے کی پھوہڑ دکھائی دیتی تھی۔ گھر میں صفائی، ترتیب یا خوش ذوقی نام کی کوئی بات نہ تھی۔ نذیر کی بیوی بڑی باتونی تھی، اس کی اول جلول باتیں سن کر ابکائی سی آنے لگتی تھی۔

تاہم نذیر کی بیٹی شہناز اب جوان ہوگئی تھی اور اس کی شخصیت میں رعنائی اور بانکپن کا ایک خاص انداز آرہا تھا۔ پھر یہ سن کر اطمینان ہوا کہ اس کی شادی ہوگئی لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک سال کے اندر اندر اسے طلاق ہوگئی۔ سچی بات ہے یہ خبر سن کر مجھے بہت ہی دکھ ہوا تھا۔

نذیر ایک زمانے میں فیصل آباد چلا گیا تھا اور وہاں کسی ٹیکسٹائل مل میں ملازم ہوگیا۔ آدمی ذہین اور سمجھ دار تھا۔ ملازمت سے فارغ ہو کر وہ بازار میں پرانے جوتوں کا کاروبار بھی کرتا تھا اس لئے اس نے خوب کمائی کر لی تھی اور گاؤں والوں پر رعب گانٹھنے کے لئے اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنے ماں باپ کو حج کرائے گا۔ یاد رہے کہ اس سے قبل اس علاقے میں جس میں قریب قریب کے چار دیہات شامل تھے، صرف ایک بڑھیا نے حج کیا ہوا تھا اور وہ قریبی گاؤں کے حجاموں کی والدہ تھی، ورنہ زمینداروں یا کھاتے پیتے لوگوں میں سے کسی کو بھی اس سعادت کی توفیق حاصل نہیں ہوئی تھی۔ نذیر نے یہ بھی کریڈٹ حاصل کرنا چاہا اور متذکرہ اعلان داغ دیا۔ لیکن ہوا یوں کہ اُسی برس حج کے خواہش مندوں کی تعداد زیادہ ہوگئی۔ حکومت کو قرعہ اندازی کا عمل شروع کرنا پڑا اور عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مسلسل چار سال نذیر اپنے والدین کے لئے حج کی درخواستیں دیتا رہا، لیکن قرعے میں اُن کا نام نہ نکلا اور جب پانچویں سال شاید رحم کی بنیاد پر، ان کی باری آ گئی تو حج کے اخراجات جو اس سے پہلے سات سو روپے فی کس تھے پانچ ہزار تک پہنچ گئے اور ۶۵-۱۹۶۴ء میں دس ہزار روپے کا انتظام کرنا نذیر کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ نتیجتاً اس نے یہ ارادہ ترک ہی کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بابا فضل پہلی بار حج کی درخواست جمع کراتے ہی حاجی

کہلانے لگ گیا تھا۔ وہ لوگوں سے اصرار کے ساتھ مطالبہ کرتا کہ مجھے حاجی کہا کرو۔

دلچسپ بات یہ ہے جس زمانے میں یہ طے ہو گیا کہ اب نذیر کے والدین حج نہیں کریں گے، گاؤں کی اکلوتی مسجد کی مرمت اور توسیع ہو رہی تھی۔ مَیں نے نذیر کو مشورہ دیا کہ جس رقم سے تم والدین کو حج کرانا چاہتے تھے، وہ مسجد میں دے دو، تمہیں اور تمہارے والدین کو اس کا خاص ثواب ہوگا، لیکن وہ نہ مانا اور اُس نے ایک پیسہ بھی مسجد میں دینا گوارہ نہ کیا۔ شاید اللہ ہی کو پسند نہ تھا کہ نذیر کی کمائی اس کے گھر پر صرف ہوتی۔

گوجرانوالہ کے قیام کے دوران مَیں محض اس تجسس کے تحت کہ اس شخص کو اس کی بداعمالیوں کی مزید سزا کیا ملتی ہے، کبھی کبھی چار چھ ماہ بعد اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا...... مَیں دیکھتا تھا کہ نذیر کی زندگی دُکھوں اور مصیبتوں کا مجموعہ بنتی جا رہی ہے۔ دوسری بیوی سے اس کا ایک بیٹا اور چار بیٹیاں تھیں۔ اُن میں سے کوئی ایک بچہ بھی صحت منداور نارمل دکھائی نہ دیتا تھا۔ سب بدصورت سے، گندے مندے اور رونے والے تھے، شہناز کی شادی ایک دوسری جگہ کی گئی لیکن ان لوگوں کے رویوں نے بھی نذیر کو پریشان ہی رکھا۔

ایک بار لمبے وقفے کے بعد نذیر کے گھر گیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے مکان کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔ اس نے روتے ہوئے بتایا کہ مَیں نے بڑے چاؤ سے بیٹے کی شادی کی، لیکن اس بدبخت کی بیوی نے چند مہینے بھی اکٹھے رہنا پسند نہیں کیا اور درمیان میں دیوار کھینچ کر مکان کو دو حصوں میں تبدیل کر دیا۔

جنوری ۱۹۸۰ء میرا تبادلہ لاہور ہو گیا۔ اُس زمانے میں نذیر مختلف قسم کے خطرناک امراض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پہلے اسے موٹاپے نے آلیا، جسم بے طرح سے پھول گیا۔ پھر اسے شوگر ہو گئی اور پتہ چلا کہ بعد میں اس کے گردے بُری طرح متاثر ہو گئے تھے۔ کم و بیش دو سال کے بعد ایک تعزیت کے سلسلے میں اُدھر جانے کا موقع ملا تو مَیں نے نذیر سے بھی ملاقات کی اور اس کی حالت زار دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اُس کے گھٹنوں میں شدید درد تھا، چلنا پھرنا سخت اذیت ناک عمل بن گیا تھا۔

مَیں جب تک اُس کے پاس بیٹھا رہا، وہ روتا رہا۔ شہناز کے ناگفتہ بہ حالات، بیٹے کا ظالمانہ طرز عمل، بیوی کا پھوہڑ پن، جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں کا دُکھ اور بیماریوں کی یلغار۔ مَیں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا اور پھر عبرت اور خوف کا احساس لئے واپس آ گیا۔

پتہ چلا کہ نذیر بڑے لمبے عرصے تک دُکھوں اور اذیتوں میں مبتلا رہ کر فوت ہو گیا۔ وفات سے تھوڑا عرصہ پہلے اس کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا اور بینائی جواب دے گئی تھی۔

ع حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۱۵)

اُس کی بدعملیوں نے سارا خاندان برباد کردیا

ملک باقر اپنی قسم کا ایک عجیب وغریب آدمی تھا۔ میٹرک کا امتحان تو اُس نے اسلامیہ ہائی اسکول سمبڑیال سے مجھ سے کوئی چار سال پہلے دے دیا تھا، لیکن وہ پڑھائی کے معاملے میں بڑا ہی آہستہ رو تھا اور ہر کلاس میں دو دو سال تک رُکے رہنا اُسے بہت پسند تھا چنانچہ اُس نے دو سال میٹرک پاس کرنے میں لگادیئے اور بمشکل دو سال میں وہ انٹرمیڈیٹ کی دلدل عبور کرسکا چنانچہ بی اے کے دوسرے سال میں مَیں حیرت انگیز طور پر اس کے ساتھ جاملا اور اُس کے کلاس فیلو بننے کا اعزاز حاصل کرلیا۔ اِس طرح کم از کم ایک سال تک مجھے اُس کے بہت قریب رہنے کا موقع مل گیا۔

ملک باقر تعلیم کے معاملے میں جس قدر پھسڈی تھا، گپ بازی کے معاملے میں وہ اتنا ہی تیز طرار تھا۔ وہ اخبار پابندی سے پڑھتا اور موقع ملتے ہی خبروں پر تبصرہ شروع کردیتا تھا۔ اُس کا تعلق سمبڑیال کے قریب گاؤں نما ایک ایسے قصبے سے تھا جس کی غالب آبادی مرفہ الحال ککے زئی ملکوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ تقسیمِ ہند سے قبل حیدرآباد دکن اور ریاست میسور میں کاروبار کرتے تھے اور خاصے خوشحال تھے چنانچہ ملک باقر کے شاندار دومنزلہ مکان اور حویلی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کے اجداد بھی کامیاب تاجر تھے۔

مَیں بتا رہا تھا کہ ملک باقر گپ بازی کا بہت شوقین تھا۔ مجلسی آدمی تھا، جہاں بیٹھتا، اپنی زبان دانی کے جوہر دکھانا شروع کردیتا اور سیاست پر کسی ماہر تجزیہ نگار کی طرح گفتگو کرتا ...... خاص بات یہ ہے کہ ہیر پھیر کر اُس کی گفتگو کی تان مولانا مودودی پر ضرور ہی ٹوٹتی تھی اور وہ جوش میں آئے بغیر بظاہر دھیمے اور سنجیدہ انداز میں مولانا مودودی کے بخیے ادھیڑنے لگتا۔ وہ بڑے وثوق سے کہتا کہ عنقریب مودودی مجدد اور مہدی ہونے کا اعلان کردے گا اور مسلمانوں میں ایک

نئے فرقے کی بنیاد رکھے گا۔ وہ برملا کہا کرتا کہ مودودی پاکستان کا سب سے بڑا فتنہ پرداز لیڈر ہے اُور جب تک یہ شخص زندہ ہے پاکستان کسی بھی حوالے سے کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔

سچی بات ہے ایک ان پڑھ دیہاتی ماحول سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مَیں نے اُس وقت تک مولانا مودودی کے بارے میں کچھ بھی نہیں پڑھا تھا نہ اُن کی کسی تصنیف کا مطالعہ کیا تھا، تاہم اخبارات میں اُن کے بیانات اُور دہلی کے ماہنامہ ''مولوی'' میں اُن کے مضامین کے مطالعے سے مَیں اپنے دل میں ان کے لئے احترام اُور محبت کا احساس رکھتا تھا۔ چنانچہ ملک باقر کی باتوں سے مَیں پریشان ہوا کرتا، مجھے ذہنی طور پر تکلیف بھی ہوتی، لیکن چونکہ وہ کسی حوالے سے سنجیدہ اُور لائق نہیں تھا اُور گپ بازی اُس کی عادتِ ثانیہ تھی، اس لئے مَیں اُس کی باتوں کو چنداں اہمیت نہ دیتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ناکافی معلومات کی وجہ سے مَیں اُس کی کسی بات کی تردید کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

جس قصبے سے ملک باقر کا تعلق تھا، وہاں مولانا عبدالرشید خلیل جُمعہ پڑھایا کرتے تھے۔ مولانا موصوف ڈسکہ میں ایک چھوٹی سی فیکٹری کے مالک تھے، ایک سنجیدہ دینی جماعت کے رُکن اُور بے لوث کارکن تھے اُور اخلاص اُور محبت کا پیکرِ مجسم تھے۔ ہر جُمعہ کو اپنے خرچ پر اس قصبے میں تشریف لاتے اور پنجابی میں تقریر کرتے تھے۔ ان کا اندازِ بیان اتنا مدلل اور سہل و سادہ تھا کہ بے اختیار اُن کی باتیں دل میں اترتی چلی جاتیں...... اس لئے وہ میرے بہت پسندیدہ مقرر بن گئے تھے اُور خصوصاً گرمیوں کی تعطیلات میں مَیں تین میل کا سفر طے کر کے پابندی کے ساتھ جُمعہ اُن کی مسجد میں ادا کیا کرتا اور پوری تقریر سننے کا اہتمام کرتا...... چونکہ ملک باقر میرا کلاس فیلو تھا اُور اُس کے سگے بھتیجے ملک یُوسف نے میرے ساتھ ہی میٹرک پاس کیا تھا، اس لئے مَیں نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کی شدید گرمی میں کچھ وقت ملک باقر کے ہاں گزار لیا کرتا۔

بی اے کے بعد مَیں نے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے اُردو میں داخلہ لے لیا جبکہ ملک باقر نے وکیل بننا پسند کیا اُور یونیورسٹی لاء کالج کا طالب علم بن گیا۔ چونکہ دونوں تعلیمی

ادارے آمنے سامنے تھے اور دونوں کے ہوسٹل بھی قریب قریب تھے، اس لئے مزید دو سال تک ملک باقر کا مطالعہ کرنے کا موقع مل گیا اور جب میں ایم اے کا امتحان دینے کے فوراً بعد اسلامیہ کالج سمبڑیال میں لیکچرار ہو گیا تو حسبِ سابق جمعے کی نماز کے لئے دوبارہ اُسی قصبے میں جانے لگا۔

ایل ایل بی کرنے کے باوجود ملک باقر پریکٹس کے معاملے میں سنجیدہ نہ ہوا۔ دراصل یہ اُس کے بس کا روگ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ اُس نے خود بتایا کہ وہ صبح جلد بیدار ہونے پر قادر ہی نہ تھا، اس لئے بروقت تیار ہونا، ڈسکہ کا سفر کرنا اور ٹھیک وقت پر کچہری پہنچنا اُس کے لئے ہمیشہ ہی ایک مسئلہ بنا رہا، چنانچہ وہ وکیل کی حیثیت سے ناکام رہا اور سارا دن گھر میں لیٹے ہوئے یا حویلی میں گپ شپ کرتے گزار دیتا۔ اسی لئے ہر جمعے کو اُس سے ملاقات ہو جاتی تھی...... مسجد میں نہیں، اُس کے گھر میں۔ وہ جمعے کی نماز کا بھی عادی نہ تھا۔

ملک باقر کے دو بڑے بھائی تھے۔ یہ سب سے چھوٹا تھا۔ تینوں بھائی مشترکہ خاندانی نظام کے تحت ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ دونوں بڑے بھائیوں کے سمبڑیال میں جنرل سٹور تھے۔ وہ صبح وہاں جاتے، شام کو واپس آتے جبکہ باقر سارا دن گھر پر مقیم رہتا۔ اُس وقت تک اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کا بیکار رہنا، غیر سنجیدہ ہونا اور کسی بھی دینی و اخلاقی ضابطے سے بے نیاز ہونا اُس کے اور سارے خاندان کے لئے وبال بن گیا۔

چنانچہ ایک روز یہ جان کر بہت افسوس ہوا کہ باقر کے منجھلے بھائی کا جوان سالا یکا یک فوت ہو گیا ہے۔ پھر چند ہی مہینے گزرے تھے کہ میرے کلاس فیلو یوسف کا چھوٹا بھائی یعنی باقر کے سب سے بڑے بھائی کا بیٹا ناصر سمبڑیال میں بس کے نیچے آ کر کچلا گیا اور موقع پر دم توڑ گیا۔

اور پھر تو موت نے اس گھر میں بسیرا ہی کر لیا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ باقر کے منجھلے بھائی ملک رفیع دنیا سے کوچ کر گئے۔ وہ بڑے ہی صحت مند اور وجیہہ و شکیل آدمی تھے۔ عمر پچاس سال سے کم ہی تھی اور کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ وہ یوں دیکھتے ہی دیکھتے موت کی وادی میں اُتر جائیں گے...... اور اُس وقت تو میں صدمے سے بہت نڈھال ہوا جب پتہ چلا کہ میرا میٹرک

کا کلاس فیلو ملک باقر کا بھتیجا یوسف آناً فاناً موت کے گھاٹ اتر گیا ہے۔ اُسے برین ہیمرج ہو گیا تھا۔ دو ہی سال پہلے اُس کی شادی ہوئی تھی اَور وہ بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ، سمبڑیال منڈی میں کاروبار کرتا تھا......اَور پھر ایک روز اُس کے بوڑھے والد آخرت کو سدھار گئے۔ اُن کی صحت بظاہر بہت اچھی تھی، لیکن ایک جوان بیٹے اَور دو نوعمر پوتوں کا غم اُن کے لئے جانکاہ ثابت ہوا۔ وہ گم صم رہنے لگے اَور ایک روز اچانک ہارٹ اٹیک سے زندگی ہار گئے۔

مَیں اِن ساری اموات کے مواقع پر تعزیت کے لئے ملک باقر کے پاس جاتا رہا۔ اُس کا خاندان اجڑ گیا تھا، لیکن یہ دیکھ کر بہت ہی حیرت ہوئی کہ باقر نے اِن حالات سے کچھ بھی عبرت حاصل نہیں کی تھی۔ اُس کے طرزِ گفتگو اَور اسلوبِ حیات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اُس کی شادی بھی ہو گئی تھی، لیکن سنجیدگی اُس کے قریب بھی نہیں پھٹکی تھی۔ اُس نے خدا سے یا مسجد سے تعلق پیدا کرنے کی ذرا بھی کوشش نہ کی۔ یوں لگتا ہے کہ دینی شعار سے اُسے خدا واسطے کا بیر تھا اَور نیکی کی کوئی بات اُسے اپیل نہیں کرتی تھی۔ مثال کے طور پر کئی بار دیکھا کہ ملک باقر حویلی میں بیٹھا باتیں بگھار رہا ہے، سیاست پر تبصرہ کر رہا ہے کہ باہر سے کوئی شخص آ گیا۔ اُس نے السّلام علیکم کہا تو باقر سلام کا جواب دینے کے بجائے مخاطب کو غصیلی طنز کے ساتھ ڈانٹ دیتا ''تمہیں راستے میں کوئی اور مسلمان نہیں ملا تھا جس کو تم یہ سلام مار سکتے''۔

مختلف وقتوں میں مَیں نے کئی بار ملک باقر کو دینی حوالے سے سمجھانے کی کوشش کی۔ اُسے اعلیٰ تعلیم یافتہ سمجھ کر عقلی اور سائنسی دلائل دیئے، موت اَور آخرت کا حوالہ دے کر اُسے ڈرانے کی کوشش کی، مگر میری کوئی بات اُس پر اثر نہیں کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ میرے سارے دلائل اُس کے سر کے اوپر سے گزر جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ میری ہر بات کو تمسخر میں اڑا دیتا اَور طنز بھرا قہقہہ لگا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔

اَور جب مَیں نے دیکھا کہ ملک باقر کسی ڈھب پر نہیں آتا، وہ کسی معقول اور سنجیدہ بات کو سمجھنے یا ماننے پر آمادہ نہیں، تو مَیں نے اس سے قطع تعلق کر لیا اور ایک لمبے عرصے تک اُس سے

رابطہ منقطع رہا۔کئی سالوں کے بعد ایک بار اُس کی حویلی میں گزر ہُوا تو وہاں مَیں نے ایک بڑا ہی عبرت ناک منظر دیکھا۔ایک بے ڈول سا، بارہ تیرہ سال کا لڑکا، جو بالکل ہی کودن لگتا تھا، وہاں آ گیا، پتہ چلا یہ باقر کا اکلوتا بیٹا ہے۔چار بیٹیاں اُس سے چھوٹی ہیں۔باقر نے اُس سے کوئی بات کی تو اُس لڑکے نے عجیب بدتمیزی سے، واضح گستاخانہ لہجے میں جواب دیا اَور مَیں ہکا بکا رہ گیا۔

اَور پھر دو تین برسوں کے بعد یہ خبر ملی کہ ملک باقر فوت ہو گیا ہے۔اُس کے گھر میں اب تھا ہی کون جس سے مَیں تعزیت کرتا، لیکن ایک دوست نے بتایا کہ وہ بھی اپنے والد کی طرح دردِ دل کے شدید حملے کی وجہ سے یکا یک دم توڑ گیا تھا۔وفات کے وقت اُس کی عمر چون سال تھی۔بظاہر اُس کی صحت بہت اچھی تھی، کہ اس گھر میں روپے پیسے کی فراوانی تھی، خوراک مثالی تھی اَور بظاہر وہ مسائل و مشکلات سے بالکل محفوظ تھے۔خوشحالی اَور بے فکری کی اس فضا میں ایک تندرست آدمی پر موت کا اچانک وارد ہو جانا اچنبھے کی بات تھی۔

ملک باقر کے گھر کے قریب رہنے والے ایک دوست نے بتایا کہ باقر کی موت کے بعد بس اُس کا سب سے بڑا بھائی ہی خاندان میں باقی رہ گیا تھا اَور وہ بھی یکے بعد دیگرے دو بیٹوں، دو بھائیوں اَور باپ کی موت کے بعد زندہ درگور ہو گیا۔اُس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا۔غم واندوہ کی تصویر بنا حویلی میں چپ چاپ بیٹھا رہتا، آہیں بھرتا رہتا، کسی سے بات نہ کرتا اَور اسی حالت میں ایک روز دم توڑ گیا، اس طرح اس خاندان کا آخری بڑا مرد بھی ختم ہو گیا۔اب اس گھرانے میں چار بیوہ عورتیں ہیں۔ملک باقر کا بیوقوف سا بیٹا ہے اَور لڑکیوں کی ایک کثیر تعداد ہے، جن کا حشر خدا ہی جانتا ہے، کیا ہو گا؟

مَیں نے اس المیے پر صدمے کا اظہار کیا اَور اپنے اس دوست سے استفسار کیا کہ اُس کے خیال میں اس خاندان کی غیر معمولی بربادی کا بھلا کیا سبب ہو سکتا ہے تو اس نے بتایا کہ اس کی ساری ذمہ داری ملک باقر پر عاید ہوتی ہے۔وہ دینی، اخلاقی قدروں سے بالکل عاری تھا۔گھر میں بالکل فارغ رہتا تھا، خوب کھاتا تھا اَور اپنے اطوار سے ایک وحشی بھینسا بن گیا تھا۔اُس کو نہ خدا کی

شرم تھی، نہ دنیا کی حیا تھی۔ اُس کے دونوں بڑے بھائی اَور بھتیجا کاروبار کے سلسلے میں سارا دن گھر سے باہر رہتے تھے۔ اس طرح اُس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اَور گھر کی ہر عورت کو اپنی بیوی بنالیا۔ سب سے پہلے اُس نے دونوں بڑے بھائیوں کی بیویوں سے تعلقات اُستوار کئے اَور پھر بھتیجے کی نئی نویلی دلہن پر بھی قابو پالیا اَور پھر نتیجہ وہی برآمد ہوا جس کی نشاندہی تاریخِ آدم کے سب سے سچے انسان ؐ نے فرمائی تھی کہ جس گھر میں یا معاشرے میں بدکاری عام ہو جائے، وہاں جوان موتیں کثرت سے ہوتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اُس کی منجھلی بھابی کا جوان بھائی فوت ہوا، پھر اُس کی بڑی بھابی کا نوعمر بیٹا مر گیا۔ پھر باقر کا منجھلا بھائی انتقال کر گیا اَور بعد ازاں سب سے بڑے بھائی کا بیٹا یوسف موت کے گھاٹ اتر گیا اَور آخر میں وہ خود اپنی بداعمالیوں کی جوابدہی کے لئے واپس بلالیا گیا۔

یہ باقر کے روّیے اور عمل ہی کا نتیجہ تھا کہ اُسے جو ایک بیٹا عطا ہوا وہ نامکمل شخصیت کا حامل، بداخلاق اَور بدتمیز لڑکا تھا۔ ظاہر ہے یہ بیٹا ہر وقت باقر کے لئے اذیت کا سبب بن گیا ہوگا۔ گھر میں چار بیٹیوں کی موجودگی بھی یقیناً اُس کے لیے سوہانِ روح بن گئی ہوگی اَور وہ یہ سوچ کر اکثر لرز جاتا ہوگا کہ جو کچھ اُس نے ، ری خواتین کے ساتھ کیا ہے، وہی کچھ اُس کی بیٹیوں کے ساتھ ہوا تو کیا ہوگا؟ اَور اذّیت کے ان سارے پہلوؤں نے اُس کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہوگا...... اَور پھر یہی اذیت اور خطروں کا ہمہ وقتی احساس ایک روز اُس کی اچانک موت کا سبب بن گیا۔

(۱۶)

نیکی سے نفرت اُس کے لیے وبال بن گئی

کرموں میرا بچپن کا دوست تھا۔ چار پانچ سال کی عمر میں ہم اکٹھے کھیلا کرتے تھے۔ اکٹھے آوارہ گردی کرتے اور اکٹھے ہی کتوں اور کوّوں کا تعاقب کیا کرتے تھے، لیکن کس زبان سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکرادا کروں کہ تقدیر نے ہمارے راستے جدا کردیئے۔ میرے والد اگرچہ ان پڑھ تھے، لیکن ''ترقی پسند'' اور ''روشن خیال'' تھے، اُنہوں نے عام روایت سے ہٹ کر مجھے چھ سات سال کی عمر میں اسکول میں داخل کرادیا اور حیرت انگیز طور پر کتاب سے میری دوستی بالکل آغاز ہی میں اس طرح اُستوار ہوئی کہ باقی سب دوستیاں اُس کے سامنے ماند پڑگئیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک ان پڑھ کسان کا بیٹا ایک لکھاری اور مصنف بن گیا اور اُس نے علمی دنیا کی سب سے بڑی ڈگری حاصل کرلی۔

لیکن بدقسمتی سے کرموں نے اسکول کا منہ نہ دیکھا، وہ اپنے دستخط کرنے کے قابل بھی نہ ہوسکا، جہالت میں ڈوبتا ہی چلا گیا اور نوعمری ہی میں بدعملی میں مبتلا ہوگیا۔ گاؤں میں ایک خاندان کی لڑکیاں بہت خوبصورت تھیں اور وہ خاندان شرم وحیا اور غیرت سے عاری تھا چنانچہ کئی دیگر نوجوانوں کی طرح یہ گھر کرموں کا پسندیدہ مقام بن گیا اور وہ روزانہ شام کا کھانا کھا کر وقت کا خاصہ حصّہ وہاں گزارنے لگا حتیٰ کہ شادی کے بعد بھی اُس نے اس معمول کو جاری رکھا۔ حالانکہ اس کی بیوی خوبصورت لڑکی تھی اور اس کی ماموں زاد تھی۔

بدعملی کے ساتھ ساتھ کرموں کے کردار کا دوسرا منفی پہلو یہ تھا کہ اُس کا عقیدہ بھی درست نہ تھا۔ وہ عام روایت کے مطابق پیر پرست اور قبر پرست تھا اور عام لوگوں کی طرح اس خوش فہمی میں

مبتلا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کرے گا، اگر وہ اپنے پیر سے تعلق درست رکھے گا اُور اُسے ناراض نہیں کرے گا تو روزِ قیامت پیر اُسے لازماً بخشوا لے گا، اس کے علاوہ وہ مختلف ''بزرگوں'' اور ''ولیوں'' کی قبروں پر بھی پابندی کے ساتھ حاضری دیا کرتا کہ یہ بھی مغفرت کا ایک لازمی ذریعہ تھا۔ لیکن کسی پیر یا بزرگ کی سفارش کام نہ آئی اور کرموں یکے بعد دیگرے سات بیٹیوں کا باپ بن گیا، بس آخر میں دو بیٹے بھی عنایت ہو گئے مَیں تحقیق نہیں کر سکا کہ یہ نوازش کس پیر کی طرف سے تھی۔

کرموں جاہلِ مطلق تھا اُور ذہنی و عملی آوارگی میں بھی مبتلا تھا، اس لئے اُس میں وہ ساری کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں جو ایسے افراد میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر اُس کے کردار میں ظلم کا عنصر خاصا در آیا تھا۔ اُس کے پڑوس میں اُس کے ماموں کی بہو یعنی اس کی بیوی کی نند رہتی تھی۔ اُس کا میاں فوج میں تھا اُور وہ بے چاری خود ہی سارے گھر کا نظام چلاتی تھی، لیکن کرموں اُسے تنگ کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ خاتون نے مونجی خشک کرنے کے لیے چھت پر ڈالی اُور کرموں نے رات کو اس کی خاصی مقدار چوری کر لی...... کرموں مزید ظلم یہ کرتا کہ اُس کے خاوند کو اس کے خلاف گمنام خط لکھوا کر پوسٹ کرتا رہتا اُور دونوں میاں بیوی میں لڑائی کرانے کی انتہائی مکروہ سازش کرتا رہتا۔

یوں لگتا ہے کہ کرموں کا ضمیر جیسے مر گیا تھا۔ اُس میں مروّت اُور لحاظ بھی ختم ہو گیا تھا۔ تین چار سال کی بات ہے۔ اس کے بھتیجے کی شادی تھی۔ وہ کھانا تقسیم کرنے پر مامور تھا۔ گاؤں کا ایک بزرگ آدمی آیا، اس کے پاس بیٹھ گیا اُور خواہش ظاہر کی کہ اُسے بھی چاول کھلا دے، مگر ظالم کرموں نے اُسے چاول کھلانے سے انکار کر دیا اُور بری طرح ڈانٹ کر اُسے وہاں سے نکال دیا۔ حالانکہ مذکورہ شخص گاؤں کا بزرگ ترین آدمی تھا اُور کرموں کے مرحوم باپ کا قریبی دوست بھی تھا۔

کرموں پر اُس کی کارستانیوں کا وبال اُس وقت شروع ہوا جب ہمارے علاقے میں ڈبل شاہ کا فتنہ شروع ہُوا۔ سمبڑیال اُور وزیر آباد کے علاقے میں اس مکّار اُور عیّار آدمی نے ہمارے اخلاقی زوال کی انتہاؤں کی نشاندہی کر دی اُور اس نے رقم دوگنی ادا کرنے کا کامیاب جھانسہ دے کر

محدود علاقے سے تقریباً ستر ارب روپے اکٹھے کر لئے اُور اس سیلاب میں عام دنیادار، مادہ پرست لوگ ہی نہیں، دینی علوم کے ماہر بڑے بڑے پارسا حضرات بھی بہ نکلے چنانچہ مساجد کے امام اُور خطیب اُور انقلابی دینی جماعتوں سے وابستہ لوگوں نے اس میں سرمایہ کاری کی اور ثابت ہو گیا کہ ہمارے معاشرے کے ہر طبقے سے حلال وحرام کی تمیز اُٹھ گئی ہے اُور دولت کی ہوس ہر قدر پر حاوی ہو گئی ہے۔

ڈبل شاہ کے ساتھیوں نے جگہ جگہ دفاتر قائم کئے اُور اس میں علاوہ دیگر عملے کے نوجوان لڑکیوں کو بھی ملازمتیں دیں چنانچہ سمبڑیال کے دفتر میں کرموں کی بیٹی رقیہ بھی ملازم ہو گئی۔ یہ لڑکی خاصی خوبصورت تھی۔ اس نے بی اے تک تعلیم حاصل کر رکھی تھی اُور ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھی۔ یہ لڑکی ڈبل شاہ کے مینجر کی سیکرٹری بن گئی اُور اس کے وارے نیارے ہو گئے۔ بہت بھاری تنخواہ، گاڑی، ڈرائیور اُور دبئی کے سفر۔ گھر کی ہر چیز نئی بن گئی۔ ایک بھائی دبئی جا بیٹھا، دوسرے کو یونان بھجوا دیا اُور جیسا کہ بعد میں انکشاف ہوا، رقیہ کے ذاتی اکاؤنٹ میں ساڑھے تین کروڑ کی رقم منتقل ہو گئی۔ اُن دنوں کرموں معمولی کسان سے سیٹھ بن گیا اُور اُس کا دماغ آسمان پر جا پہنچا اُور ڈبل شاہ کی نظرِ عنایت سے رقیہ کی شادی ڈبل شاہ کے مینجر سے ہو گئی۔

لیکن جب ڈبل شاہ کا ستارہ گردش میں آیا، اس کے خلاف اللہ کی لاٹھی حرکت میں آئی اُور یکا یک یہ ساری ٹیم گرفتار کر لی گئی تو رقیہ بھی لپیٹ میں آ گئی نیب کی پولیس اُسے گرفتار کر کے لاہور لے آئی اُور اس کے خلاف تحقیق وتفتیش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

جب تک کرموں کی بیٹی پر ڈبل شاہ کے آسمان سے دھن برستا رہا، علاقے بھر میں لوگوں کی طرف سے چہ میگوئیوں اور سرگوشیوں کے باوجود اُس کی غیرت بیدار نہ ہوئی اُور وہ آنکھیں بند کر کے مطمئن ومسرور رہا، لیکن جونہی اُس کی بیٹی بھی گرفت میں آئی اُور پولیس اُسے لاہور لے آئی، تو وہ زمانے کے تیر ونشتر کا مقابلہ نہ کر سکا اُور چت ہو کے رہ گیا۔

چنانچہ اب تقریباً چھ ماہ سے وہ ذہنی اعتبار سے بدترین صورتِ حال سے دوچار ہے۔ نیب

نے اُس سے ساڑھے تین کروڑ کی رقم واگزار کر لی ہے اُور اس کے بعد اگرچہ اس کی بیٹی رہا ہوگئی ہے لیکن جن لوگوں سے رقیہ نے بھاری رقمیں وصول کی تھیں، وہ اُسے پریشان رکھتے ہیں اُور وہ اُن کے دعووں سے زچ ہو کر نیم پاگل ہوگیا ہے۔ اُس پر بار بار جنون کے دورے پڑتے ہیں، کپڑے پھاڑتا ہے، برتن توڑتا ہے، سر پر دوہتڑ مارتا ہے، اور بال کھینچتا ہے۔ اُسے خارش کا عارضہ لاحق ہوگیا ہے جو اُسے ہلکان کئے رکھتا ہے۔ وہ جسم کو اس طرح کھدیڑتا ہے کہ خون نکل آتا ہے، اسی عالم میں وہ گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر اول فول بکتا ہے اپنے آپ کو گالیاں دیتا ہے...... ''میں سؤر ہوں، میں نے ساری عمر کوئی نیکی نہیں کی۔ آؤ مجھے جوتے مارو، مجھ پر پیشاب کرو''۔

بسا اوقات وہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھ لہراتا ہے اُور اللہ کے حضور گستاخیاں کرتا ہے ''تو نے مجھے اس مصیبت میں مبتلا کیا ہے۔ بتا اب کہاں جاؤں، کیا کروں'' اُور اس کے ساتھ ہی وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے اُور اس کا ضمیر یا بے مثال رسوائی کا احساس اُسے بے حال کر دیتا ہے۔

(۱۷)

شخصیت کی رعنائی مصیبت بن گئی

رانا فیروز (یہ اصل نام نہیں ہے) سے میرا تعارف میری ایک عزیزہ کے حوالے سے ہوا۔ مذکورہ خاتون ایک مخلص اَور سرگرم دینی مبلّغہ ہے اَور اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کی وجہ سے اُنہوں نے بے شمار خواتین کو متاثر کیا ہے اَور دین کے راستے پر لگایا ہے۔

تقریباً بیس سال پہلے یہ لوگ سمن آباد میں رہا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس خاتون نے مجھ سے کہا ''فاروق صاحب، سمن آباد کی ایک خاتون میرے درسوں میں آتی ہے اَور باعمل مسلمان بن گئی ہے۔ اُس کی بیٹیوں میں بھی مثبت تبدیلی آئی ہے۔ پہلے وہ پردہ نہیں کرتی تھیں، اب نقاب لیتی ہیں، نمازوں کی بھی پابند ہوگئی ہیں۔ لیکن اس عورت کا خاوند روایتی قسم کا دنیادار آدمی ہے، ریلوے میں افسر ہے اَور مجھے خطرہ ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کی شادیاں بے عمل، دنیادار گھرانوں میں کردے گا، میری خواہش ہے کہ آپ کوشش کریں اور اُن کی بڑی بیٹی کا رشتہ کسی دیندار، باعمل پروفیسر سے کرادیں۔ وہ خود بھی کالج لیکچرار ہے''۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر بتا رہا ہوں کہ جب سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ کا یہ فرمانِ گرامی میری نظروں کے سامنے آیا ہے کہ جب ایک مسلمان اپنے دوسرے بھائی کی مشکل، دور کرنے میں لگ جاتا ہے، تو اللہ اُس کی مشکل دور کرنے میں لگ جاتا ہے'' اَور یہ کہ ''بہترین لوگ وہ ہیں جو دوسروں کے لیے نفع بخش بنتے ہیں'' تو بے اختیار جی چاہتا ہے کہ دوسروں کی مشکل میں اُن سے تعاون کیا جائے اَور بحمد اللہ تعالیٰ مَیں نے اس کے غیر معمولی فیوض و برکات دیکھے ہیں۔ حسنِ اتفاق کہ تنظیم اساتذہ سے وابستہ ایک نوجوان کالج لیکچرار کنوارے تھے اَور شادی کے خواہش مند

تھے۔ مَیں نے اُن سے اجازت لی اَور ایک روز رانا فیروز سے ملاقات کے لیے چلا گیا اَور تمہید کے بعد حرفِ مدّعا زبان پر لایا تو کہنے لگے۔ لڑکے کا باپ کیا کرتا ہے۔ مَیں نے بتایا کہ وہ کوئی امیر آدمی نہیں ہے، گوجرانوالہ کے قریب ایک قصبے میں رہتا ہے اَور اپنے بچوں کو رزقِ حلال فراہم کرنے میں مصروف ہے۔

پوچھا کہ وہ کرتا کیا ہے؟

مَیں نے بتایا کہ وہ ایک سرکاری دفتر میں ملازم ہے۔

''ملازمت کی نوعیت کیا ہے؟''

''دراصل وہ ڈی سی آفس گوجرانوالہ میں نائب قاصد ہے''

''یوں کہیں نا کہ چپراسی ہے''۔ رانا فیروز بہت غصے میں چیخے۔ فاروق صاحب، آپ احساس کیوں نہیں کرتے کہ آپ میری توہین کر رہے ہیں۔ آپ جانتے نہیں کہ میرا خاندان دنیاوی لحاظ سے کس قدر معزز ہے۔ ہم زمیندار ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اَور میرے خاندان کے بہت سے لوگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ مَیں اپنی بیٹی ایک چپراسی کے گھر میں بھیج دوں اَور سارے خاندان میں نکّو بن جاؤں''

لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ نوجوان سترھویں گریڈ میں سرکاری افسر ہے، لائق ہے اَور ذہین ہے اَور اُس نے لازماً کسی شہر میں رہنا ہے۔ سسر کے گھر میں تو آپ کی بیٹی کبھی کبھار بس ملاقات ہی کے لیے جایا کرے گی''......مَیں نے تاویل پیش کی۔ ''کچھ ہو جائے، مجھے یہ رشتہ ہرگز منظور نہیں۔ آپ اس موضوع پر مزید بات نہ کریں اَور تشریف لے جائیں''۔ رانا فیروز نے سختی سے مزید گفتگو کا امکان ختم کر دیا اَور مَیں اُٹھ کر آ گیا۔

اسلامی جمعیت طلبہ کے ایک لائق نوجوان سے میرا تعارف تھا۔ اس نے انجینئرنگ یونیورسٹی ٹیکسلا سے بی ایس سی کی تعلیم مکمل کر لی تھی۔ بڑا لائق فائق اور خوبصورت نوجوان تھا۔

انگلینڈ سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد آج کل یہ انجنیئر نگ اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی لاہور میں سینیئر اُستاد ہے، اُس زمانے میں یہ ابھی غیر شادی شدہ تھا اُور رشتے کی تلاش میں تھا۔ اُس نے مجھ سے ذکر کیا تو مَیں اس مقصد کے لیے دوبارہ رانا فیروز خاں صاحب کے گھر پر حاضر ہوا۔

پہلے ہی کی طرح اُنہوں نے دوبارہ پوچھا ''لڑکے کا باپ کیا کرتا ہے'' ''وہ ٹھیکیداری کرتا ہے، مکان بناتا ہے اور بیچتا ہے'' مَیں نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک میسن ہے، راج ہے...... اور وہ پہلے ہی کی طرح پھر غصے میں آ گئے'' فاروق صاحب، یہ آپ مجھ سے مذاق کیوں کر رہے ہیں۔ کیا مَیں اتنا گیا گزرا ہوں کہ ایک راج، ایک مستری، معمار کے بیٹے کو بیٹی دے دوں، نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ آپ اس موضوع پر بات نہ کریں'' ''لیکن خان صاحب محترم یہ بھی تو دیکھیں کہ نوجوان نے بی ایس سی انجنیئر نگ کا کورس بڑے امتیاز سے پاس کیا ہے، اُس کے سامنے بہت روشن مستقبل ہے، آپ اس نوجوان کو دیکھ تو لیں، اُس سے مل تو لیں...... اُور ذہن میں یہ بات رکھیں کہ فی زمانہ اچھے رشتوں کا شدید بحران ہے۔ براہِ کرم آپ یہ موقع ضائع نہ کریں'' مَیں نے دلیل دی، وضاحت کی، مگر فیروز خاں صاحب نے دوٹوک انداز میں یہ پیش کش مسترد کر دی اُور مَیں سر جھکا کر واپس آ گیا۔

الحمدللہ کہ مَیں حالات سے بددل نہیں ہوا کرتا چنانچہ ایک تیسرا رشتہ فیروز خاں صاحب کے ہاں مَیں پنجاب یونیورسٹی کے ایک نوجوان لیکچرار کا لے گیا۔ اُنہوں نے یہ بھی مسترد کر دیا تب مَیں نے گزارش کی آپ اب تک تین دیندار رشتے مسترد کر چکے ہیں۔ مَیں آپ تک نبی اکرمؐ کا ایک فرمان پہنچانا چاہتا ہوں کہ دیندار رشتہ مسترد نہ کرو، ورنہ کسی فتنے میں مبتلا ہو جاؤ گے...... تو ناراض اور برا ہم ہو کر بولے آپ مجھے TEACH کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جتنی آپ کی عمر ہے اس سے زیادہ میرا EXPERIENCE ہے۔

چند مہینے گزرے۔ پتہ چلا کہ فرخندہ رانا کا رشتہ ایف سی کالج کے ایک انگلش لیکچرار سے

ہو گیا ہے اُور رانا فیروز صاحب بہت خوش ہیں۔ پھر سنا کہ شادی ہو گئی ہے اُور چھ ہی مہینے گزرے تھے کہ طلاق کی روح فرسا خبر سن لی...... مَیں اظہارِ ہمدردی کے لیے رانا صاحب کے گھر گیا، بہت پریشان، پشیمان اُور افسردہ تھے۔ مَیں نے اُن کی دلجوئی کی، ہمت بندھائی اُور قصہ کوتاہ یہ کہ آخرکار مَیں نے ہی ان کی بیٹی کی شادی اپنے ایک ایسے دوست سے کرادی، جن کی بیوی فوت ہو گئی تھی اُور کوئی اولاد نہیں تھی۔ رانا صاحب کی بیٹی ماشاءاللہ اپنے گھر میں خوش وخرم ہے، اُس کی ایک بیٹی اور دو بیٹے ہیں۔

رانا صاحب کے داماد میرے گھر کے قریب رہتے ہیں، وہاں وہ گاہے گاہے تشریف لاتے ہیں اُور میری ان سے سرِ راہے علیک سلیک ہو جاتی ہے۔ چند ماہ پہلے کی بات ہے مَیں نے دیکھا موصوف بیٹی کے گھر کے آگے سر نیہوڑائے گہری سوچ میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ مَیں آگے بڑھا اُور اُن کے قریب جا کر سلام کیا۔ میری آواز پر وہ چونکے اُور سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کی عمر تقریباً پچھتر سال ہے، لیکن اُن کا سراپا اب بھی دلکش ہے، سرو قد ہیں لیکن کمر میں خاصا خم آ گیا ہے، اُور خوبصورت چہرے پر اداسیوں نے ڈیرے ڈال دیئے ہیں، تاہم اُن کی دل موہ لینے والی شربتی آنکھوں میں اب بھی ایک خاص قسم کی رعنائی ہے جو دیکھنے والے کو بے اختیار اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

مَیں نے پوچھا، کیسے احوال ہیں، آج کل کیا مصروفیت ہے اُور اس وقت کس مسئلے پر سوچ بچار کر رہے تھے؟ تو لمبی آہ بھر کر ساحرلدھیانوی کا شعر پڑھا

ابھی زندہ ہوں لیکن سوچتا رہتا ہوں خلوت میں
کہ آخر کس تمنا کے سہارے جی لیا مَیں نے

پھر بولے ''فاروق صاحب مَیں بھی ساحرلدھیانوی کی طرح بہت دُکھی ہوں، بے حد پریشان ہوں۔ فرق یہ ہے کہ وہ شاعر تھا، اپنے جذبات کا اظہار شاعری میں کر لیتا تھا اُور خوش نصیب تھا کہ موت نے اُسے جلد اپنی آغوش میں لے لیا اُور اُس نے اپنے دکھوں سے جلدی

فراغت پالی، لیکن مَیں بدنصیب ہوں کہ نہ زندوں میں ہوں نہ مُردوں میں۔ پل پل مرتا ہوں اَور پل پل جیتا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، کہاں جاؤں اَور کس سے اپنے دل کا حال کہوں؟ اس سنگدل دنیا میں کوئی سننے والا بھی تو نہیں ہے، کوئی زخموں پر مرہم بھی تو نہیں رکھتا اَور اس کے ساتھ ہی اُن کی خوبصورت شربتی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

مَیں نے آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگالیا۔ پیار کیا، دلاسا دیا اَور ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

ڈرائنگ روم میں آتے ہی اُن کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ دیر تک روتے رہے، مَیں نے مداخلت نہ کی بلکہ اِسے اُن کے حق میں مفید جانا تاکہ جذبات کا انخلا ہو جائے...... اس اثنا میں مَیں نے چائے تیار کرائی اور جب اُن کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تو چائے اور لوازمات اُن کے سامنے رکھے اَور وہ رومال سے آنکھیں صاف کر کے چائے پینے لگے۔

تب میں نے سوال کیا: ''رانا صاحب محترم یہ آپ کی پریشانیوں کی نوعیت کیا ہے؟''

فاروق صاحب! کوئی ایک ہو تو بتاؤں۔ تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ مَیں شدید ترین انداز میں احساسِ تنہائی میں مبتلا ہوں۔ آپ جانتے ہیں پانچ سال پہلے میری بیگم کا انتقال ہو گیا تھا اَور گھر کی فضا ایسی ہے کہ کوئی میرا پُرسانِ حال نہیں۔ میری تین بیٹیاں اَور دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا ذہنی مریض ہے اَور گم سُم پڑا رہتا ہے، چھوٹا شادی شدہ ہے، اُس کی تین بیٹیاں ہیں، اولادِ نرینہ سے محروم ہے خود مختار حیثیت میں الگ رہتا ہے اَور اُس کی بیوی مجھے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔ تین بیٹیوں میں سے نمبر۲ بیٹی شادی شدہ تھی، اُس کے دو بیٹے تھے، خاوند ڈاکٹر تھا اَور شریف، دیندار آدمی تھا، لیکن میری بیٹی ساس سسر کو برداشت کرنے پر تیار نہ تھی۔ نتیجتاً اُسے طلاق ہو گئی۔ دونوں بیٹے باپ کے پاس ہیں۔ یہ میرے پاس رہتی ہے۔ مجھے کھانا پکا دیتی ہے، گھر کا خیال رکھتی ہے، لیکن ہمہ وقت غم واندوہ کی تصویر بنی رہتی ہے۔ بات بات پر آہیں بھرتی ہے اَور میرے لئے ایک مستقل اضافی عذاب کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

فاروق صاحب یہی نہیں میری تو پوری زندگی دُکھوں اور زخموں سے بھری ہوئی ہے۔ شادی کے بعد جو بیوی ملی، اُس سے میری کبھی بھی ذہنی ہم آہنگی نہیں ہوئی۔ وہ چڑچڑے مزاج کی ایک غصہ ور عورت تھی جس نے گھر میں کبھی بھی خوشگوار ماحول پیدا نہ ہونے دیا، اس پر مستزاد یہ کہ میری ایک جوان بہن کو طلاق ہوگئی اور چونکہ والدین وفات پا چکے تھے، اس لئے وہ میرے ہی گھر میں آ بیٹھی اور پھر اِن دونوں خواتین نے مل کر جو فضا پیدا کی، اُس نے میرے چودہ طبق روشن کردیئے۔ مَیں تو حیران ہوں کہ کس قدر ڈھیٹ ہوں جو زندہ ہوں، سچ کہا گیا ہے کہ جہنم میں موت نہیں ہوگی۔ میری زندگی بھی سراپا جہنم بنی رہی ہے اور اس کے باوجود مَیں اب تک جی رہا ہوں، آخر کیوں جی رہا ہوں، کیا آپ کوئی رائے دے سکتے ہیں؟

رانا صاحب! مَیں اس سلسلے میں کیا کہہ سکتا ہوں البتہ کئی مثالوں کی روشنی میں اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے بہت ہی رحیم و کریم ہے، وہ آزمائش یا تربیت کی خاطر اپنے بندوں کو چھوٹی موٹی مشکلات اور تکالیف سے تو دوچار کرتا ہے، لیکن لامتناہی عرصے کے لیے، غیر معمولی نوعیت کے مصائب بندوں پر تبھی آتے ہیں جب اُنہوں نے خوفناک قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کیا ہو۔ لگتا ہے آپ سے بھی کوئی شدید قسم کی لغزش سرزد ہوئی ہے جس کے نتیجے میں آپ پر اللہ کی ناراضگیاں طاری ہوتی رہتی ہیں۔

بالکل ٹھیک ہے فاروق صاحب، آپ نے مرض کی صحیح تشخیص کی ہے، یقیناً مَیں نے بہت بڑی حماقتوں کا ارتکاب کیا ہے اور مَیں انہی کا خمیازہ بھگتتا رہا ہوں۔ کاش مَیں جوانی کے جوش میں خوفناک قسم کی غلطیاں نہ کرتا، کاش مَیں عقل اور ہوش سے کام لیتا، اور میری ساری زندگی جہنم کا نمونہ نہ بن جاتی۔

''رانا صاحب، کیا آپ مجھے اعتماد میں لینا پسند کریں گے، مَیں اس سلسلے کی تفصیلات معلوم کرنے کا خواہش مند ہوں:''

فاروق صاحب۔ یہ ایک راز ہے اور مَیں پہلی بار آپ کے سامنے اس کا افشا کر رہا ہوں۔

شاید آپ میرے لیے دعا کریں، شاید میرا خدا مجھے معاف کر دے...... اور پھر اُنہوں نے انکشاف کیا:

مَیں ۱۹۵۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی اے آنرز اکنامکس کا سٹوڈنٹ تھا۔ اللہ نے مجھے صحت اور حسن و جمال دل کھول کر عطا کیا تھا اور یہی خوبی میرے لیے فتنہ بلکہ عذاب بن گئی۔ اس کالج کی اونچی کلاسوں میں اُس زمانے میں بھی مخلوط تعلیم تھی اور لڑکیوں کے لیے میرے اندر بے پناہ کشش تھی۔ اِن میں سے ایک لڑکی جو انگریزی میں ایم اے کر رہی تھی اور ایک فیکٹری اونر کی بیٹی تھی میرے بہت قریب آ گئی۔ مُجھے بھی اُس سے بے حد اُنس ہو گیا۔ کوئی دن نہیں جاتا تھا کہ ہماری ملاقات نہ ہو۔ اِن ملاقاتوں میں ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیمان ہوئے اور جب شادی کا بھی حتمی ارادہ بن گیا تو ہم بہک گئے اور بہک کر بہت دور چلے گئے۔ خیال تھا کہ جب شادی آخر کار ہو جانی ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن جب اُس لڑکی نے جلد شادی پر اصرار کیا، تو مَیں حوصلہ ہار بیٹھا اور مَیں نے صاف کہہ دیا کہ مَیں شادی نہیں کر سکتا۔ ''بھلا یہ کیسے ممکن ہے ابھی مَیں آنرز کا سٹوڈنٹ ہوں، میرا سی ایس ایس کا پروگرام ہے، فوری شادی تو میرے سارے منصوبوں کو خاک میں ملا دے گی۔ نہیں ہرگز نہیں، مَیں ایسا نہیں کر سکتا''۔

''تو یاد رکھو، اگر ایسا نہ ہوا تو میرے والدین کی عزت خاک میں مل جائے گی، مَیں کہیں کی نہیں رہوں گی اور پھر میرے پاس خودکشی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا'' اس لڑکی نے زار زار روتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن مَیں کچھ نہیں کر سکتا''۔ مَیں نے دوٹوک انداز میں کہا ''اس صورتِ حال کا تنہا مَیں ذمہ دار نہیں ہوں، تم بھی برابر کی قصوروار ہو، اس لیے تم جو مناسب سمجھتی ہو، کر لو۔ مَیں معذرت خواہ ہوں کہ شادی نہیں کر سکتا'' اور اس گفتگو کے چند ہی روز بعد وہ لڑکی ریلوے سٹیشن گئی اور ٹرین کے آگے کود کر مر گئی۔

سچی بات ہے اس حادثے نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یقیناً اس کی بربادی اور موت کا مَیں

بھی ذمہ دار تھا، چنانچہ اس کے بعد میرا سکون لٹ گیا، میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی اُور مَیں بی اے آنرز کے امتحان میں بُری طرح ناکام رہا...... دوسرے سال مَیں نے ہمت کر کے سمپل بی اے کا امتحان دیا اُور پاس ہوگیا۔ پہلے ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا، اب پی سی ایس کا امتحان دیا اُور جو چھ لڑکے کامیاب ہوئے مَیں بھی اُن میں شامل تھا، لیکن شومئی قسمت کہ حکومت نے پہلے پانچ لڑکوں کو سیلیکٹ کرلیا اُور مَیں نامراد ٹھہرا۔ اس ناکامی نے مجھے آخری حد تک پریشان اور مایوس کردیا اُور پھر مَیں نے ریلوے اکاؤنٹس میں نوکری کرلی...... گھر کے احوال مَیں بیان کرچکا ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ نوعمری کی بے راہروی کی وجہ سے میرا خدا مجھ سے شدید ترین صورت میں ناراض ہوگیا اُور میری ساری زندگی پر اُسی کا وبال طاری ہوگیا۔ بیوی کی بدمزاجی، ایک بیٹے کی ذہنی بیماری، دوسرے کی بے رخی اُور اولادِ نرینہ سے محرومی، بہن کو طلاق، ایک بیٹی کو طلاق، پھر دوسری کی بربادی گویا اذیت اُور کلفت میرا مقدر بن گئی اُور ہر مقام پر پریشانیاں میری زندگی کا لازمی حصہ بن گئیں...... اُور عجیب بات یہ ہے کہ اِن ساری نامرادیوں کے باوجود میری صحت ٹھیک رہی ہے اُور سوائے بے خوابی کے مجھے کوئی بیماری لاحق نہیں ہوئی۔ یوں لگتا ہے کہ میری عمر لمبی کر کے خدا مُجھے میری بداعمالیوں کی زیادہ سے زیادہ سزا دینا چاہتا ہے۔ دیکھئے مزید کیا سامنے آتا ہے۔

(۱۸)

اُسے غرور نے برباد کردیا

گورنمنٹ کالج عارف والہ کے پروفیسر صدیق قمر صاحب نے بتایا:

شیخ محمد شفیع ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ہمارے علاقے کا سب سے امیر اَور بااثر تاجر تھا۔ پاکپتن، بورے والا، وہاڑی اَور عارف والا کے علاقوں میں وہ کاٹن کا سب سے بڑا بیوپاری تھا۔ اُس کی زبان سے صبح کو جو ریٹ نکلتا، وہی ہر جگہ چلتا تھا۔ اُس کی رضامندی کے بغیر مارکیٹ کا ریٹ نکلتا ہی نہیں تھا...... وہ یقیناً بہت امیر آدمی تھا۔ منڈی میں آڑھت کی متعدد دکانیں تھیں، مارکیٹ تھی، بہت سے مکان تھے۔ لوگ اُس کی دولت مندی پر رشک کرتے تھے۔

ہوا یوں کہ اُس کے بیٹے کی گاڑی کے نیچے ایک غریب آدمی کا بچہ آکر کچلا گیا اَور موقع پر ہی ہلاک ہوگیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ شفیع کے بیٹے کے خلاف تھانے میں ایف آئی آر درج ہوگئی۔

ہلاک ہونے والے لڑکے کے باپ اور اُس کے خاندان نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر شیخ صاحب اُن کے پاس آجائیں اور معذرت کرلیں تو ہم معاملہ رفع دفع کرلیں گے اَور اس حادثے کو تقدیر کا ایک چکر سمجھ کر درگزر سے کام لیں گے، مگر شیخ شفیع نے کہا کہ اپنے بیٹے کے وزن کے برابر دولت خرچ کردوں گا، لیکن کسی کے گھر جا کر معذرت نہیں کروں گا، وہ بے شک عدالت میں چلے جائیں، مَیں وہاں بھگت لوں گا۔

چنانچہ مقدمہ چلا اَور شیخ صاحب اپنی دولت کے بل پر جیت گئے۔ اُن کے بیٹے کا بال بھی بیکا نہ ہُوا۔ لیکن عجیب بات یہ ہوئی کہ مقدمے کی کارروائی کے دوران ہی شیخ صاحب پر فالج کا حملہ ہُوا اور وہ معذور ہوکر بستر پر گر گئے اَور تین چار سال تک اسی کیفیت میں مبتلا رہ کر فوت ہوگئے۔ اُن کے بیٹے عیاشی اَور بدکاری کے راستے پر چل پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی شادیاں نہ ہوئیں، کاروبار

تباہ ہو گیا اُور مارکیٹ، دکانیں، مکان سب بک گئے۔ اب وہ چرس پیتے ہیں، رکشے چلاتے ہیں اُور انتہائی کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ تکبّر اُور خلقِ خدا کی تحقیر نے اُن کا سب کچھ غارت کر دیا ہے۔

(۲)

(۱۹)

بے اصولی اور دولت پرستی اس کے لیے وبال بن گئی

قبولہ کے قریب ایک گاؤں میں ہمارا ایک عزیز رہتا تھا۔محمد فاضل یہ بڑے لمبے عرصے تک انگلینڈ میں مقیم رہا تھا جہاں سے وہ بڑی دولت کما کر لایا۔ یہاں اُس نے ایک مربع زمین خریدی، آڑھت کی دکانیں بنائیں اور بڑی شان سے زندگی گزارنے لگا......لیکن چونکہ نیم خواندہ تھا، اس لیے ہر نو دولتیے کی طرح اُس کی ذہنیت بڑی پست تھی، پولیس والوں کھلاتا پلاتا اُور ان کے ٹاؤٹ کی حیثیت سے زندگی گزارنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔

سوءِ اتفاق سے محمد فاضل کے گاؤں میں ایک شخص قتل ہوگیا اُور ایک بیوہ عورت کے اکلوتے بیٹے کے خلاف پرچہ درج ہوگیا۔ملزم کی ماں نے محمد فاضل سے رابطہ کیا اُور چونکہ وہ پولیس کی کھلے عام دلالی کرتا تھا، اس لیے اس سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے مین اُس کی مدد کرے۔محمد فاضل نے وعدہ کرلیا کہ اگر وہ خاتون اسے پانچ ہزار روپے ادا کردے تو وہ اُس کے بیٹے کو رہا کرادے گا۔

یہ ۷۰-۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔وہ بے چاری بیوہ عورت لوگوں کے گھروں میں کام کر کے بڑی مشکلوں سے بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔اُس نے منت ترلے کر کے سب گھروں سے کئی سال کا ایڈوانس معاوضہ لیا اُور پانچ ہزار کا انتظام کر کے محمد فاضل کے حوالے کیے......اُور اس نے خاتون کو یقین دلایا کہ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔مَیں جانوں اور مقدمہ جانے۔مَیں تمہارے بیٹے کو ضرور رہا کراؤں گا ورنہ ایک پیسہ مجھ پر حلال نہیں ہوگا۔

اُور وہ بے چاری عورت مطمئن ہوگئی......اُسے یقین ہوگیا کہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی، لیکن افسوس کہ اس ظالم نے مقدمے میں معمولی سی بھی دلچسپی نہ لی، ساری رقم خود کھا گیا

اُور بیوہ خاتون کا بیٹا عدم پیروی کی وجہ سے مقدمہ ہار گیا، اُسے پھانسی کی سزا ہوگئی۔

تب اس مظلوم خاتون نے محمد فاضل کو خوب خوب بد دعائیں دیں، ہاتھ آسمان کی طرف بلند کر کے، جھولیاں پھیلا کر اُور رو رو کر اس نے محمد فاضل پر لعنتیں برسائیں، اُسے جی بھر کے کوسا۔

اُور اس خاتون کی بد دعائیں مقبول ہوگئیں۔ فاضل کو تکلیف دہ جلدی مرض لگ گیا، آنکھوں پر، چہرے پر اُور سارے جسم پر اُسے شدید خارش ہوتی تھی اُور یہ سلسلہ شب و روز جاری رہتا تھا حتیٰ کہ سارا جسم زخموں سے بھر گیا۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک سال جاری رہا اُور اس کی اذیّت سے فاضل کے حواس مختل ہو گئے اور آخری تین سال تو وہ گٹھڑی کی طرح چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ وہ موت مانگتا تھا، مگر موت اس سے دور رہتی تھی۔

فاضل کے چار بیٹے تھے، چاروں آوارہ اُور بد عمل ہو گئے اُور عیاشی نے ان کے رزق سے برکت چھین لی۔ اُن کی زمین بِک گئی، دکانیں بِک گئیں حتیٰ کہ مکان بِک گیا اُور وہ کرائے کے مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے......وہ اس حد تک قلاش ہو گئے کہ جو لوگ فاضل کی عیادت کے لیے جاتے، وہ اُن سے بھی پیسوں کا سوال کئے بغیر نہ رہتا۔

جنوری ۲۰۰۴ء میں بڑی مشکلوں سے فاضل کو زندگی کی اذیّت سے رہائی ملی۔ اُس کے بیٹے تا حال رُسوا کن حالات سے دوچار ہیں۔

(۲۰)

ظلم کی سزا...... پندرہ سال کا فالج

موج خاں عرف موجو میواتی مہاجر تھا جسے ہمارے علاقے میں تقسیم کے بعد سولہ ایکڑ زمین الاٹ ہوئی۔ یہ زمین مزارع کی حیثیت سے مہر اللہ دتہ نے کاشت کرنی شروع کر دی۔ تقسیم سے پہلے بھی وہی اِسے کاشت کرتا تھا اُور اُس وقت سکھ زمیندار اس کے مالک تھے۔

موجو ایک سادہ دل، شریف الطبع آدمی تھا۔ اس علاقے میں اُس کے خاندان کا کوئی اُور فرد نہ تھا اُور وہ یک وتنہا زندگی گزار رہا تھا کہ اُس کی بیوی کسی وجہ سے روٹھ کر اپنے بھائیوں کے گھر میں رہتی تھی۔

مہر اللہ دتہ کا خاندان موجو کے ساتھ بہت حسنِ سلوک سے پیش آتا رہا۔ اُسے جو مکان الاٹ ہوا تھا، وہ دور تھا، اس لئے اپنے ڈیرے پر اُس کی رہائش کا انتظام کر دیا، کھانا دو تین وقت اُسے اپنے گھر سے بھجواتے اُور اُس کی عزت افزائی کرتے۔ پھر مہر اللہ دتہ نے موجو کے سالوں سے بار بار ملاقاتیں کیں اور آخر کار اُس کی بیوی کو منانے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنے گاؤں ہی میں اُسے ایک مکان لے دیا اُور وہ مہر اللہ دتہ کا احسان مند ہو کر اطمینان سے زندگی گزارنے لگا۔

یہ ایوب خاں کے دور کی بات ہے۔ مہر اللہ دتہ نے ٹریکٹر خریدنے کا ارادہ کیا، مگر اُس زمانے کے کسی قانون کی رو سے اس کے لئے ضروری تھا کہ ٹریکٹر خریدنے والے کسان کی اپنی ملکیتی زمین بھی ہو۔ چنانچہ موجو کی سادہ دلی اُور ناواقفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ دتہ نے اُس کی زمین کا پہلے فرد لیا اُور پھر سٹمپ پیپر پر اُس کے انگوٹھے لگوا کر زمین کا انتقال اپنے نام کرا لیا اور مالک کی حیثیت سے زمین پر قابض ہو گیا۔ اُس نے انتہائی سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے موجو

کو مالکانہ حقوق سے محروم کر دیا اور لگان وغیرہ دینا بند کر دیا۔

اس حادثے کا موجو کے اعصاب نے اتنا شدید اثر لیا کہ وہ بیمار ہو گیا اور برین ہیمرج کا شکار ہو کر دم توڑ گیا۔

اس ظلم اور شقاوت کا وبال مہر اللہ دتہ پر یہ پڑا کہ جلد ہی اُس پر فالج کا حملہ ہوا، اس کا نچلا دھڑ بیکار ہو گیا اور وہ چارپائی پر مقید ہو گیا اور اس حالت میں وہ تقریباً پندرہ سال تک مبتلا رہا۔ اس دوران میں اُس کا وزن بڑھ گیا، موٹاپا ہو گیا، اُسے شوگر نے آ لیا اور جوڑوں کے درد نے اُسے شدید اذیت میں مبتلا کیے رکھا...... اُس کی بیگم کو بھی مختلف عوارض نے گھیر لیا اور وہ بھی دس بارہ سال تک چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی اور وہ دونوں انتہائی اذیت میں مبتلا رہ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ اللہ دتہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹی کی شادی ہوئی اور تھوڑے عرصے کے بعد ایک حادثے میں اُس کا خاوند فوت ہو گیا اور وہ بیوہ ہو کر اپنے والدین کے گھر آ گئی۔ اب چاروں بیٹے زمین اور دیگر جائیداد کے حوالے سے طرح طرح کے جھگڑوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اُن کی آپس میں بول چال بھی نہیں ہے اور زندگی اس خاندان کے لیے وبال بن گئی ہے۔

(۲۱)

ڈائری کے چند اوراق

(۵ر مارچ ۱۹۹۶ء)

اخباری اطلاعات کے مطابق ارشد امین اور عارف چودھری کو اُن کے مخالفین نے گولیوں سے بھون ڈالا اور اس طرح تعلیمی اداروں کے حوالے سے دہشت گردی اور قتل و غارت گری کا ایک قابلِ نفرت باب ختم ہو گیا۔ سوچتا ہوں وہ کروڑوں کی جائیداد نہ جانے اب کس کی تحویل میں جائے گی جو ارشد امین نے بنائی تھی۔ لاہور میں شاندار کوٹھی، مری میں ہوٹل، ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ، ویگنوں کے اڈے ......اور کیا کیا کچھ۔

ارشد امین، عارف چودھری، عاطف چودھری، عابد چودھری، نواز جٹ، رئیس ٹنکی اور متعدد دوسرے نوجوانوں کو ایک طلبہ تنظیم کے پلیٹ فارم پر اُس وقت کے وزیرِ اعلیٰ پنجاب نے منظم کیا تھا اور انہیں کھلی چھوٹ دی تھی کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ تعلیمی اداروں سے اسلامی جمعیت طلبہ کا زور توڑیں اور سرکاری سرپرستی میں اپنی دھاک قائم کریں چنانچہ ان لوگوں نے دیال سنگھ کالج کو خصوصی ہدف بنایا اور لاہور کے ناظمِ جمعیت نواز خاں کو دن دہاڑے نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر کے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور دیال سنگھ کالج کو مرکز بنا کر ارشد امین اور عارف چودھری نے دہشت گردی اور بدمعاشی کی نئی تاریخ رقم کی......اور یہ سلسلہ کم از کم دس سال تک قائم رہا۔

چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ سرکاری سرپرستی میں ارشد امین اس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس وحشی نے دیال سنگھ کالج کے ہوسٹل کو اپنا مستقر بنایا اور نسبت روڈ، میکلوڈ روڈ، بیڈن روڈ اور ایبٹ روڈ کے سارے علاقے کو اپنا باجگزار بنا لیا۔ نیشنل ہوٹل، طباق ہوٹل، بٹ

سویٹ اُور دیگر ہوٹلوں میں ارشد امین اُور عارف چودھری کی چٹیں جاتیں اُوران کی ہر پسندیدہ چیز، مطلوبہ مقدار میں ہوٹل کے ملازمین انہیں مہیا کر دیتے۔ اس سلسلے میں کسی کی مجال نہ تھی کہ چون وچرا کر سکے۔ ارشد امین کی سمن آباد لاہور میں زیرِتعمیر کوٹھی کے لیے سارا تعمیراتی سامان بیڈن روڈ کی مختلف دکانوں سے جاتا رہا اُوراس کی کوئی ادائیگی نہیں کی جاتی تھی، بلکہ ہر دکان اُور ہر ہوٹل سے ہر ماہ بھاری رقوم وصول کی جاتی تھیں۔ ریلوے سٹیشن پر ویگنوں کے اڈوں سے یہ مستقل بھتہ وصول کرتے تھے۔ اس طرح ہر ماہ لاکھوں کی رقم مختلف ذرائع سے حاصل کی جاتی تھی۔

لیکن معاملہ یہیں تک محدود نہ تھا بلکہ ارشد امین اُور عارف چودھری نے ایک طاقتور قبضہ گروپ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ شہر بھر سے پارٹیاں آتیں اُور یہ لوگ اُن سے بہت بھاری رقوم لے کر جائیدادوں کے قبضے دلواتے تھے......مثال کے طور پر بیڈن روڈ پر ایک خاصا بڑا پلاٹ تھا جس پر کسی طاقت ور پارٹی کا قبضہ تھا اُوروہ مالکوں کو برائے نام کرایہ دیتے تھے اُور قبضہ چھوڑتے بھی نہیں تھے۔

پلاٹ کے اصل مالک ارشد امین سے ملے۔ موصوف نے پلاٹ کی مالیت دریافت کی اُور جب اُسے پتہ چلا کہ یہ کروڑوں کی جگہ ہے تو اُس نے بیس لاکھ کا مطالبہ کیا۔ طے پایا کہ دس لاکھ پہلے وصول کیا جائیگا اُور دس لاکھ قبضے کے بعد دینا ہوگا۔ تب پروگرام کے مطابق پندرہ بیس ویگنوں پر قبضہ کر کے اُن پر تقریباً ایک سو مسلّح لڑکوں کو سوار کر کے متعلقہ پلاٹ پر دھاوا بول دیا گیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک اُور بھرپور تھا کہ قابض لوگ حالانکہ بہت طاقتور تھے، مگر وہ بھاگ کھڑے ہوئے اُور قبضہ اصل مالکوں کو مل گیا۔

اس طرح معاہدے کے مطابق دس لاکھ مزید وصول کئے گئے۔ اس رقم سے ''متحرک'' کارکنوں کو میکلوڈ روڈ سے سستے ریٹ پر موٹر سائیکلیں خرید کر دی گئیں۔

شہر کے اس علاقے میں بدمعاشوں اُور دہشت گردوں کی اُور بھی مضبوط پارٹیاں تھیں، لیکن ارشد امین اُور عارف چودھری سے سب مات کھا گئے کہ اُن کی پشت پر دو کالج تھے یعنی دیال سنگھ کالج اُوراسلامیہ کالج ریلوے روڈ......اس لیے کوئی بھی اُن کے سامنے نہ ٹھہر سکا اُورآخرکار ہر بدعنوان فرد

کی طرح یہ دونوں نوجوان شراب اُور شباب کے رسیا بن گئے اُور دیال سنگھ کالج کا ہوسٹل عیاشی کا بہت بڑا اڈہ بن گیا اُور کالج میں اس تنظیم کا ہر کارکن بدمعاشی میں ڈوب گیا۔ عالم یہ ہوگیا کہ کالج میں خوبصورت لڑکوں کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ لکشمی چوک کے اردگرد ساری سڑکوں پر چلنے والی ویگنوں کو جگہ جگہ روک لیا جاتا اُور عام لڑکے بھی اُن سے بھتہ وصول کرتے۔

کالج کے اندر عام طلبہ ہی کی نہیں بلکہ پروفیسر حضرات کی عزت بھی داؤ پر لگ گئی۔ مختلف وقتوں میں کئی بار ارشد امین کے کارندوں اُور عہدیداروں نے سٹاف روم کے اندر اساتذہ کی توہین وتذلیل کی اُور ایک مرتبہ تو پرنسپل این اے حامد کو گریبان سے پکڑ لیا، حالانکہ یہ شخص اُن کا موید و معاون اُور ہم مسلک تھا۔

مَیں نے نواز خاں کی شہادت کے بعد مختلف مواقع پر اپنی کلاسوں میں تبصرہ کیا تھا کہ انشاء اللہ نواز خاں کے قاتل کتے کی موت مریں گے اُور یہ بات مَیں نے تاریخ کی بے شمار مثالوں کی روشنی میں کہی تھی...... چنانچہ قانونِ قدرت حرکت میں آ گیا اُور نواز خاں والے المیے میں شامل لوگ آپس میں لڑنے لگے۔ بے پایاں دولت کی تقسیم پر اِن میں پھوٹ پڑ گئی اُور ارشد امین کے قریبی ساتھی عابد چودھری اُور عاطف چودھری اِن کے مقابل میں آ گئے اُور دونوں باری باری قتل ہو گئے...... ایک مقابلے میں ارشد امین کا بڑا بھائی بھی قتل ہوگیا۔ نواز جٹ اُور رئیس ٹنکی بھی مارے گئے۔ رئیس ٹنکی نواز کے قاتلوں میں بھی شامل تھا اُور وہ جمعیت کے لڑکوں کو اغوا کر کے ایم اے او کالج ہوسٹل لے جایا کرتا تھا اُور ننگا کر کے مارا کرتا تھا...... اس کے خلاف اللہ نے یہ انتقامی کارروائی کی کہ وہ سانڈے میں اپنے گھر کے قریب حمام میں نہا رہا تھا کہ اُس کے مخالفوں نے اُس پر فائرنگ کر دی وہ حمام کے اندر ہی دم توڑ گیا اُور اُس کی لاش پولیس کے آنے تک کئی گھنٹے برہنہ حالت میں پڑی رہی۔

اُور آخر کار ارشد امین اُور عارف چودھری کی رسی بھی اللہ نے باندھ دی۔ اُن کی میکلوڈ روڈ کی ایک طاقتور پارٹی سے دشمنی تھی، اُنہوں نے صلح کے بہانے انہیں علامہ اقبال ٹاؤن میں گلشنِ

اقبال کے قریب مدعو کیا۔ یہ اپنی پجارو میں مسلح محافظوں کے ساتھ گئے، مگر مخالف پارٹی نے اِن پر فائرنگ کردی اَور یہ پجارو میں چار محافظوں سمیت بھول ڈالے گئے۔ قدرتِ خداوندی نے انہیں معمولی دفاع کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ اس حادثے سے پہلے ارشد امین نے سمن آباد میں کوٹھی کی اَور مری میں ایک شاندار ہوٹل کی تعمیر مکمل کرالی تھی اَور وہ کہا کرتا تھا کہ مَیں اب سیاست سے ریٹائر ہو جاؤں گا اَور ساری توجہ کاروبار اَور آرام کی طرف مبذول کردوں گا مگر خدا نے ایک خونخوار بھیڑیے کو دانت گرنے کے بعد پرہیز گاری اختیار کرنے کا موقع نہ دیا۔

(۲۲)

اسی حوالے سے ''مکافاتِ عمل'' کا ایک اَور دردناک واقعہ بھی مجھے یاد آرہا ہے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق یکم فروری ۱۹۹۵ء کو گورنمنٹ کالج سمن آباد، فیصل آباد میں ایک طلبہ تنظیم کے لڑکوں نے وہاں ہوسٹل سپرنٹنڈنٹ پروفیسر افتخار ملک کو قتل کردیا تھا اَور عوامی وصحافتی دباؤ کے تحت یہ مقدمہ لاہور کی ایک انسدادِ دہشت گردی عدالت میں منتقل کردیا گیا تھا۔

اب قاتلوں نے یہ کیا کہ وہ افتخار ملک مرحوم کی رہائش گاہ پر، جو ہوسٹل کے قریب ہی تھی، روزانہ فائرنگ کرتے تھے اَور مرحوم کی بیوہ سے مطالبہ کرتے تھے کہ وہ قتل کا مقدمہ واپس لے لے ورنہ اس کے بچوں کو اغوا کر کے قتل کردیا جائے گا...... چنانچہ تنگ آکر بے چاری بیوہ نے مقدمہ واپس لے لیا۔

افتخار ملک کے قتل میں متذکرہ تنظیم فیصل آباد کے پانچ لیڈر ملوث تھے اَور اِن کا سرغنہ نیازی نام کا ایک لڑکا تھا۔ مرحوم کی بیوہ نے عدالت سے مقدمہ واپس لے لیا تو یہ پانچوں لڑکے فتح کا جشن منانے کے لیے ایک کار میں لاہور جارہے تھے کہ شاہکوٹ کے قریب ایک ٹرک اِن کی کار پر چڑھ گیا اَور پانچوں قاتل موقع پر مارے گئے اَور اِن کی لاشیں بُری طرح مسخ ہوگئیں۔

(۲۴)

بہت قدیمی کہاوت ہے کہ زر، زن اُور زمین فساد کی جڑ ہیں اُور بیشتر برائیاں اور لڑائیاں انہی کے سبب سے رونما ہوتی ہیں..... غور کریں تو فساد پھیلانے میں زمین کا عمل دخل دولت اُور عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے کہ زمین کے مالک عموماً رعونت اور تکبّر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اُور عام خلقِ خدا کو حقیر جان کر اُن سے توہین آمیز روّیہ اختیار کرتے ہیں۔

پاکستان کا جاگیرداری نظام دنیا کا شاید بدترین استحصالی نظام ہے جس میں عام انسانوں کی جس قدر توہین و تذلیل ہوتی ہے، اُس کی کہیں مثال نہیں ملتی، لیکن اللہ بڑا ہی جبّار و قہار ہے۔ وہ ظلم کو برداشت نہیں کرتا اُور ظالموں کو کسی نہ کسی صورت میں دنیا میں بھی ضرور سزا دیتا ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ بے رحم اور سفاک جاگیردار عام طور پر چالیس پنتالیس سال کی عمر تک طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ انہیں عموماً معدے میں السر ہو جاتا ہے اور شوگر، بلڈ پریشر اُور بے خوابی جیسے عوارض سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح زندگی ان کے لیے اذّیت اُور سزا کا نمونہ بن جاتی ہے۔

میرے ضلع سیالکوٹ میں جاگیرداری نظام کارفرما نہیں ہے۔ یہاں چھوٹی زمینداریاں ہیں اُور آبائی طور پر جس علاقے سے میرا تعلق ہے، وہاں زمیندار چالیس پچاس ایکڑ سے زیادہ کے مالک نہیں ہیں، لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ لوگ بھی چھوٹے موٹے فرعون سے کم نہیں ہیں اُور کمزوروں سے اِن کا سلوک انتہائی توہین و تذلیل کا ہوتا ہے اُور اس کے نتیجے میں انہیں مختلف حوالوں سے سزا بھی خوب ملتی ہے، اس ضمن میں اپنے چند مشاہدات پیش کر رہا ہوں:

یہ آج سے کم از کم چالیس سال پہلے کی بات ہے ہمارے علاقے میں ایک زمیندار چودھری رسول خان تھا (یہ اصل نام نہیں ہے) اپنے طبقے کا یہ واحد زمیندار تھا جو نماز پڑھتا تھا، ورنہ جاٹوں

کا یہ سارا قبیلہ نماز روزے کو غریب دستکاروں، بے نوا مزارعوں اور کمی کمین لوگوں کا ایک شعار سمجھتا تھا، لیکن ان لوگوں کے مجموعی مزاج اور کلچر کا یہ انداز تھا کہ چودھری رسول خاں بھی کسی کمتر حیثیت کے فرد کو انسان نہیں سمجھتا تھا اور تکبّر اور توہین و تذلیل کا یوں مظاہرہ کرتا تھا کہ دیکھنے والا ٹھہرا کے رہ جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے بچشمِ سر نمازِ جُمعہ کے بعد مسجد کے اندر چودھری رسول خاں کا امام مسجد اور خطیب کے ساتھ جو سلوک دیکھا، وہ میری یادداشت سے کبھی محو نہیں ہوتا۔

ہوا یوں کہ ایک روز جونہی نمازِ جُمعہ مکمل ہوئی اور نمازیوں نے سنتوں وغیرہ سے فراغت پالی تو چودھری رسول خاں نے مولوی محمد علی صاحب سے گرجتی ہوئی، رعب دار آواز میں پوچھا: مولوی تم وہ حنیف موچی کے گھر ختم دینے کیوں نہیں گئے تھے؟

''دراصل، چودھری جی، یہ لوگ میری عزت نہیں کرتے، قدر نہیں کرتے، اس لئے میں نہیں گیا''۔ مولوی صاحب نے بڑی عاجزی اور مسکینی سے جواب دیا۔

بس پھر کیا تھا، چودھری رسول خاں نے خانۂ خدا کے اندر، اُسی امام کو جس کے پیچھے اُس نے تھوڑی دیر پہلے نماز ادا کی تھی، ماں بہن کی گالیاں دیں، مغلّظات بکیں اور اُسے متعدد لوگوں کے سامنے ذلیل کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔

اسی نوعیت کی ایک اور بات مجھ تک پہنچی۔ شفیع لوہار ایک روز چودھری رسول خاں کی کوٹھی میں چلا گیا۔ باہر باغ میں دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں اور قریب ہی ایک کرسی پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ چودھری کا داماد تھا اور کسی شہر سے آیا تھا۔ شفیع عادت کے مطابق چار پائیوں کے قریب زمین پر بیٹھ گیا، لیکن چودھری کے داماد نے اصرار کیا کہ وہ چار پائی پر بیٹھے۔ شفیع نے بہت انکار کیا کہ ہم کمیّں لوگ ہیں، آپ کے برابر چار پائی پر نہیں بیٹھ سکتے، لیکن نوجوان پڑھا لکھا تھا، اُس نے ضد کی کہ نہیں تم بھی انسان ہو اور جب چار پائی خالی ہے تو تم زمین پر بیٹھے ہوئے اچھے نہیں لگتے...... چنانچہ شفیع زِچ ہو کر بادلِ نخواستہ زمین سے اُٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ چودھری رسول خاں کوٹھی سے نکل کر باغ میں آیا اور جب اُس

نے دیکھا کہ شفیع لوہار اُس کے داماد کے برابر چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے، تو وہ سخت غضبناک ہُوا۔ اُس نے جوتا اُتارا اور تین چار شفیع کے سر پر جڑ دیئے اَور پھر اُسے ماں بہن اَور بیٹی کی درجنوں گالیوں سے نواز دیا۔ غصے سے اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اَور وہ بار بار کہہ رہا تھا ''غضب خدا کا یہ زمانہ بھی آنا تھا کہ ایک ذلیل کمیں میرے داماد کے برابر چارپائی پر بیٹھے۔ اب تو ہم زمینداروں کو ڈوب مرنا چاہیے۔''

اس فرعونیت اَور رعونت کے ساتھ مَیں نے چودھری رسول خاں کا بہت بُرا حشر دیکھا۔ اُس کی تین بیٹیاں اَور دو بیٹے تھے۔ بڑی بیٹی کی ایک آنکھ بچپن میں کھیلتے ہوئے ضائع ہوگئی تھی، اس لئے اُس کی شادی نہ ہوسکی۔ دوسری بیٹی کی شادی تو ہوئی، مگر اُسے طلاق ہوگئی اَور اُس نے باقی زندگی باپ کے گھر میں گزار دی۔ چودھری نے دونوں بیٹوں کی شادیاں اپنے قریبی عزیزوں میں کیں، لیکن دونوں بھائیوں نے علاقے کی آوارہ اَور بازاری عورتوں سے تعلقات اُستوار کر لئے، اس لئے اُن کی خانگی زندگیاں برباد ہوگئیں۔ دونوں کی بیویاں روٹھ کر اپنے میکے میں چلی گئیں۔

اِن صدمات نے اَور غریب متاثرین کی بددعاؤں نے اپنا اثر دکھایا اَور ساٹھ سال کی عمر میں چودھری کو فالج ہوگیا، وہ معذور ہوکر بستر پر مقید ہوگیا اَور اُس کے چار پانچ سال غیر معمولی بے بسی اَور پریشانی میں گزرے اَور اسی حالت میں وہ ایک روز داعئ اجل کو لبیک کہہ گیا۔

(۲۴)

چودھری ناصر ہمارے ایک قریبی قصبے کا زمیندار ہے۔ بہت سی دکانوں پر مشتمل اُس کی ایک مارکیٹ بھی ہے، مگر ذاتی حیثیت میں وہ بڑا ہی دُکھی انسان ہے۔ اُس کے چار بیٹے تھے، ایک ہیروئن میں مبتلا ہو کر مر گیا اَور دوسرا قتل ہو گیا اَور اِن صدموں نے چودھری ناصر کو پہلے شوگر میں مبتلا کیا اَور پھر اُس کی بینائی کم ہوتے ہوئے مکمل زایل ہو گئی...... اَور اس کا سبب یہ بتایا جاتا ہے کہ چودھری ناصر اَور اس کے بیٹوں کے ہاتھ سے نہ کسی کی عزت محفوظ تھی، نہ جان سلامت تھی۔ غریب غربا کا تو یہ شخص جانی دشمن تھا اَور کمزوروں کو تنگ کرنے اَور اُن کو ذلیل وخوار کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا تھا، حتیٰ کہ اُس نے ظلم کی انتہا کر دی اَور اپنے پڑوس میں ایک غریب امام مسجد کے مکان پر زبردستی قبضہ کر لیا...... بس اس کے بعد اللہ کی لاٹھی حرکت میں آ گئی اَور دو بیٹوں کی ہلاکت کے بعد وہ مختلف امراض میں مبتلا ہو گیا اَور آخر کار اُس سے آنکھوں کی روشنی چھین لی گئی...... اَور اب وہ پچھتر سال کی عمر میں ٹھوکریں کھا رہا ہے اور اُس کی زندگی دنیا کے لیے عبرت بن گئی ہے۔

(۴۵)

اُسے غروراَور بدعملی نے کڑی سزادی

یہ واقعہ بھی مجھے عزیز عطا فاروقی صاحب نے لکھ کر دیا اَور زبان و بیان کی ضروری اصلاح کے بعد قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں مَیں چار سال تک ملائشیا میں ملازمت کرتا رہا۔ وہاں میری تنخواہ بہت اچھی تھی اَور مَیں خاصا خوش حال تھا۔ ایک روز میں کوالالمپور کی مسجد انڈیا سے نمازِ عصر پڑھ کر باہر نکلا تو سیڑھیوں پر ایک خوبرو مگر خستہ حال پاکستانی نوجوان کو بیٹھے دیکھا۔ اُس کی شلوار اَور پنڈلیاں خون آلود تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ساحلی جنگل میں سے چھپتا چھپاتا غیر قانونی طور پر یہاں آیا ہے اَور جونکوں نے اُس کا خوب خوب خون پیا ہے۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ وہ پاکستان کے شہر حافظ آباد کا رہنے والا ہے۔ تھائی لینڈ سے بارڈر کراس کر کے آیا ہے، ایجنٹ نے سارا ضروری سامان لانچ سے سمندر میں پھینک دیا تھا اَور اب وہ بالکل خالی ہاتھ اَور بے سروسامان ہے۔

اللہ کا شکر ہے اُس نے مجھے توفیق دی اَور مَیں اُس نوجوان کو جس کا نام محمد یوسف تھا، اپنی قیام گاہ پر لے آیا۔ وہ ایک مہینہ میرے پاس رہا اَور مَیں اُس سے خاطر خواہ تعاون کرتا رہا۔ وہ خاندانی طور پر نائی تھا اَور ہر طرح کے کھانے پکانے کا بہت ماہر تھا۔ لیکن فوری طور پر اُسے کنسٹرکشن میں ملازمت مل گئی۔ حافظ آباد سے تعلق رکھنے والے اُس کے کئی دوست بھی اُسے مل گئے اَور وہ اُن کے پاس منتقل ہو گیا۔ اس دوران میں یعنی دو ماہ کے عرصے میں اُس میں ایک تبدیلی یہ آئی کہ پہلے اُس کے خوبصورت چہرے پر چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی جو بہت بھلی لگتی تھی، لیکن پھر اُس نے اس نعمت سے چھٹکارہ حاصل کر لیا جس کا مجھے بہت افسوس ہُوا۔ خیر دو ماہ کے بعد وہ کسی دوسری جگہ چلا

گیا اُور عرصے تک اُس سے رابطہ منقطع رہا۔

تقریباً ڈیڑھ سال گزرا تھا کہ مَیں اپنی کمپنی کے ساتھ کوالالمپور سے نو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ریاست کدہ کے صدر مقام الور سٹار (ALOR STAR) میں ڈیوٹی پر تھا کہ ایک دوپہر کو ایک ہوٹل میں کھانا کھانے گیا۔ وہاں میرے سامنے والی میز پر شیف (باورچی) کی یونیفارم میں ایک نوجوان آ کر بیٹھا۔ وہ محمد یوسف تھا۔ اُسے پہچاننے میں مجھے کچھ وقت ملا، تاہم دونوں کو بہت خوشی ہوئی۔ بغل گیر ہوئے، حال احوال پوچھا۔ محمد یوسف اسی ہوٹل میں شیف تھا، بہت اچھی تنخواہ لے رہا تھا اُور ہوٹل والوں نے رہائش کے لیے اُسے ایک فلیٹ مہیا کر رکھا تھا (ملائشیا میں ہنرمندوں کی بڑی قدر ہے اُور مختلف ادارے اُن کے نخرے اُٹھاتے ہیں)۔

محمد یُوسف رات کو میری رہائش گاہ پر آیا اُور بہت اصرار کر کے سامان اُٹھا کر مجھے اپنے فلیٹ پر لے گیا...... اُس کے فلیٹ پر ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔ اُس نے دو اُور لڑکوں کو بھی اپنے پاس ٹھہرایا ہوا تھا جن میں مدراس سے تعلق رکھنے والا ایک انڈین لڑکا سلیم تھا۔ جس ہوٹل میں یوسف باورچی (شیف) کی حیثیت سے کام کرتا تھا، سلیم وہیں برتن دھونے پر مامور تھا اُور یوسف کے فلیٹ پر اُسے مفت رہائش مل گئی تھی۔ بدلے میں سلیم یوسف کے کپڑے دھو دیتا، انہیں استری کر دیتا اُور چھوٹے موٹے کام بھی کر دیتا تھا۔

سلیم بہت نیک اُور پارسا نوجوان تھا۔ پنج وقتہ نماز کے علاوہ تہجد اُور اشراق کا بھی اہتمام کرتا تھا۔ بہت خوش اخلاق تھا۔ مجھے بھیّا کہہ کر مخاطب کرتا اُور میرے بھی کپڑے دھو دیا کرتا......لیکن سلیم کا المیّہ یہ تھا کہ وہ پیدائشی مخنث تھا یعنی مردانہ صفات سے عاری تھا۔ یوسف اُس سے بہت کم سیدھے انداز میں بات کرتا اُور عموماً دھتکار کر، توہین آمیز انداز میں مخاطب ہوتا تھا۔ مَیں اُسے سمجھایا کرتا کہ سلیم پہلے ہی محرومی کا شکار ہے، تمہارے سلوک سے وہ اور زیادہ دل شکستہ ہوگا......اُور پھر ہم لوگوں کو اس کی اس اعتبار سے قدر کرنی چاہیے کہ اس جنس کے نوجوان گلیوں بازاروں میں گاتے بجاتے، غیر سنجیدہ حرکتیں کرتے ہیں، لیکن یہ بے چارہ محنت کرتا ہے، نیکی پر کاربند ہے اُور

بے حد عبادت گزار ہے، مگر افسوس کہ یُوسف ایک تو اپنی شخصیت کے غرور میں مبتلا تھا دوسرے دولت کا نشہ اُس پر چھایا رہتا تھا، اب وہ شراب بھی پینے لگا تھا اَور باقی بھی غیر اخلاقی حرکتوں میں وہ کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا...... اس لیے میری باتوں کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

الور سٹار میں ہماری کمپنی کا کام ختم ہو گیا۔ چار دن کے بعد ہمیں واپس کوالا لمپور جانا تھا کہ ایک روز جب مَیں کام سے واپس آیا تو دیکھا کہ یوسف تو اپنے کمرے میں فلم دیکھ رہا ہے، لیکن قریب ہی دوسرے کمرے سے سلیم کے رونے کی آواز آ رہی ہے، مجھے بہت تشویش ہوئی، مَیں سلیم کے کمرے میں گیا تو وہ تکیے میں منہ چھپائے زار زار رو رہا تھا۔ مَیں نے پوچھا کیا ہوا خیریت تو ہے، تو وہ بولا خیریت نہیں ہے، بس میں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے پوچھوں گا کہ مُجھے ایسا کیوں بنایا تھا؟

مَیں سمجھ گیا کہ یُوسف نے اس کے ساتھ کوئی بہت بُری حرکت کی ہے۔ مَیں یوسف کے پاس گیا اَور تلخی سے پوچھا کہ یہ تم نے سلیم کے ساتھ کیا کیا ہے تو بد بخت بڑی بے نیازی اَور ڈھٹائی سے بولا کہ آج مستی بہت چڑھ گئی تھی، اس لئے مَیں نے اس سالے ہی کو پکڑ لیا۔

مَیں نے یوسف کو لعنت ملامت کی کہ تم نے بہت بُرا کیا۔ ابھی وقت ہے سلیم سے اَور خدا سے معافی مانگ لو، ورنہ تمہیں اس کا بہت برا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ یاد رکھو کہ اُس نے خدا کے ہاں مقدمہ دائر کر دیا ہے اَور خدا ظلم کو بالکل معاف نہیں کرتا۔

صورتِ حال کے پیشِ نظر مَیں نے سلیم کو پیش کش کی کہ اگر وہ میری کمپنی میں کام کرنا چاہے تو مَیں باس سے بات کرتا ہوں، مگر اس نے بتایا کہ میرا ورک پرمٹ ختم ہو رہا ہے۔ مَیں اب مزید یہاں پر نہیں ٹھہروں گا اَور واپس انڈیا چلا جاؤں گا...... مَیں پروگرام کے مطابق دو دن کے بعد کوالا لمپور واپس آ گیا۔

تین یا چار ماہ گزرے تھے کہ لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک لڑکے اصغر کا فون آیا کہ یوسف کا روڈ ایکسی ڈنٹ ہو گیا ہے اَور اُسے ہم کوالا لمپور لا رہے ہیں۔ اصغر یوسف کے ساتھ ہی

رہتا تھا۔ چنانچہ مَیں ہسپتال پہنچ گیا جہاں رات کے تقریباً ڈھائی بجے ایمبولینس یوسف کو لے کر آئی اُور سیدھی ایمرجنسی میں چلی گئی۔ مَیں یوسف کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ اُس کا چہرہ خون سے لت پت تھا۔ تاہم اصغر سے ملاقات ہوگئی۔ اُس نے بتایا کہ حادثہ اس قدر شدید ہے کہ یوسف کا ایک جبڑا ٹوٹ گیا ہے، اس کی بائیں آنکھ کا ڈھیلا نکل باہر آ گیا ہے اُور جسم پر بے شمار چوٹیں آئی ہیں۔

یوسف کے باس کا بھائی جو کوالا لمپور ہی میں رہتا تھا۔ وہ بھی آ گیا تھا۔ میں نے اصغر سے اُور باس کے بھائی سے اجازت لی کہ اس وقت وہاں ٹھہرنے کا فائدہ بھی نہیں تھا اُور صبح ڈیوٹی پر جانا تھا۔

دوسری شام کو مَیں پھر ہسپتال گیا۔ یوسف کو دیکھا، اُس کا سر اُور منہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا اُور ایک خاص سانچے میں جکڑا ہوا تھا، اُس روز اُس سے کوئی بات نہ ہو سکی۔ تین دن کے بعد پتہ چلا کہ یوسف کے جسم پر بہت زخم آئے ہیں اُور چار پسلیاں ٹوٹ گئی ہیں۔ اُسے سر پر بھی سخت چوٹیں آئی ہیں۔ اکیس دن کے بعد یوسف کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا تو مَیں اُسے اپنی رہائش گاہ پر لے آیا۔ اب دوائیں کھانی تھیں اُور کچھ احتیاطیں کرنی تھیں...... اُس کے زخم تیزی سے ٹھیک ہو رہے تھے، مگر اُس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اُور اُس کی شخصیت کی دلکشی ختم ہوگئی تھی، وہ اندر سے ٹوٹتا جا رہا تھا اُور شدید پریشان تھا۔ یوسف کے اخراجات اُس کے باس کے بھائی باقاعدگی سے آ کر ادا کر جاتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ اس کا باس بہت اچھا انسان تھا ورنہ ملائشیا میں اچھا باس ملنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔

چند روز مزید گزرے تو یوسف کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہوئے تو پتہ چلا کہ حادثے کی وجہ سے وہ مردانہ صلاحیت سے محروم ہو گیا ہے تب مجھے مدراس کے محمد سلیم کا وہ فقرہ بہت یاد آیا جو اُس نے شدت سے روتے ہوئے ادا کیا تھا کہ مَیں اللہ سے پوچھوں گا کہ تو نے مجھے ایسا کیوں بنایا تھا۔ اللہ نے اُس کی فریاد سن لی تھی اُور یوسف کو اُس کی بدعملی اُور ظلم کی سخت سزا دی تھی۔

یوسف کئی دن تک میرے پاس مقیم رہا۔ وہ مجھ سے نظریں نہیں ملاتا تھا۔ مَیں اُسے شدید ڈیپریشن میں اکثر روتے ہوئے دیکھتا تھا۔

یوسف شادی شدہ تھا۔ حافظ آباد میں اُس کی بیوی بھی تھی اَور بچے بھی، لیکن شرمندگی اَور خوف کی وجہ سے اُس نے پاکستان جانا چھوڑ دیا...... مَیں تو ۲۰۰۰ء میں واپس آ گیا۔ اب نہ جانے وہ کس حال میں ہے اَور اپنے جرم کی سزا کس صورت میں بھگت رہا ہے۔

(۲۶)

غلط ذہنیت کا خاندان

ماسی حلیماں سے پتہ نہیں کیا خطا سرزد ہوگئی تھی کہ اُس کی شادی دینو ڈنگر سے ہوگئی۔ یہ کوئی الزامی بات نہیں ہے، نام تو اُس کا محمد دین تھا، لیکن پورے خاندان اُور اپنے محلے میں وہ اسی نام سے معروف تھا۔ کام کاج سے مکمل بے نیاز، قطعی غیر ذمہ دارانہ اسلوبِ زندگی، سارا سارا دن آوارہ گردی، لایعنی باتیں اُور پورا منہ کھول کر قہقہے لگانا۔ سیالکوٹ کے محلہ دھاروال کے محمد دین کو اِن حرکتوں کی وجہ سے سب لوگ ہی دینو ڈنگر کے نام سے پکارتے تھے اُور یہ عرف اُس کی شخصیت کے ساتھ چپک کر رہ گیا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ شادی کے بعد بھی دینو کے طور اطوار میں چنداں فرق نہ آیا، لیکن چونکہ والدین زندہ تھے اُور سب بہن بھائی اکٹھے رہتے تھے اُور گھر کا رہن سہن بہت سادہ تھا، اس لئے وقت گزرتا گیا اُور چند سالوں میں دینو تین بیٹوں اُور ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ڈنگر کا ڈنگر ہی رہا، انسانوں والی کوئی خوبی اُس میں پیدا نہ ہوسکی۔

اُور پھر ایک روز پورے خاندان نے یہ خبر بڑے ہی صدمے کے ساتھ سنی کہ دینو ڈنگر سے کنجر بن گیا ہے۔ اُس نے خسروں کے ایک گروہ میں باقاعدہ شمولیت اختیار کرلی ہے اُور بال بچوں سے مکمل ناتہ توڑ کر وہ ہمہ وقتی خواجہ سرا بن گیا ہے۔ اس نے زنانہ 'باس اختیار کرلیا ہے اُور سارا وقت وہ خسرہ پارٹی کے ساتھ ڈھولکی بجانے اُور گانے میں صرف کرتا ہے۔

اس حادثے نے ماسی حلیماں کی نیم تاریک زندگی کو مکمل طور پر اندھیروں میں ڈبو دیا، لیکن وہ ایک باہمت عورت تھی اُور خاوند کی ہمہ پہلو نالائقیوں نے اُسے ذہنی طور پر ہر مشکل سے مقابلہ کے لئے تیار کر دیا تھا اور اگر چہ بیٹے کی رذالت نے ماں باپ اُور ساس سسر چاروں کو بدنامی و

رسوائی کے غیر معمولی احساس سے دوچار کر دیا جس کے اثر سے وہ چاروں ایک ڈیڑھ سال کے اندر اندر دنیا سے منہ موڑ گئے، مگر گاؤں میں ماسی حلیماں کی بہن اور بہنوئی نے اس کڑے وقت میں اُسے سہارا دیا اور وہ پابندی کے ساتھ گندم، چاول، آٹا اور دالیں بھجواتے رہتے...... اور کپڑے لتے بھی فراہم کرتے رہتے اور یوں اس بدنصیب خاندان کی گاڑی لشٹم پشٹم رینگتی رہی۔

لیکن بال بچوں والے گھر کی ضروریات تو متنوع ہوتی ہیں، اُن کا تعلق محض کھانے پینے اور پہننے ہی سے تو نہیں ہوتا، چنانچہ مجبور ہو کر ماسی کو قریبی محلے میں دو تین گھروں کی ملازمت اختیار کرنی پڑی۔ وہ صبح بچوں کو کھانا کھلاتی اور انہیں روتے دھوتے، منہ بسورتے چھوڑ کر کام پر چلی جاتی اور دوپہر تک مختلف گھروں میں صفائی کا کام کرتی، کپڑے دھوتی، برتن مانجھتی اور بازار سے سودا سلف بھی لا کر دیتی اور جب دوپہر کو واپس آتی تو چاروں بہن بھائی بھوک سے ہلکان ہو رہے ہوتے۔ وہ اُپلے جلاتی، روٹی پکاتی اور مختلف گھروں سے رات کا بچا ہوا جو سالن لاتی، اُس سے بچوں کا پیٹ بھرتی، خود زہر مار کرتی اور پھر تھکی ہاری، چارپائی پر گر جاتی اور دیر تک اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہتی۔

مسائل اور مصائب کی اس یلغار میں ماسی حلیماں کے دونوں بڑے بیٹے یعنی لال دین اور محمد شریف اسکول یا مسجد کا منہ تک نہ دیکھ سکے۔ اُس زمانے میں یوں بھی مسلمانوں میں تعلیم کا چلن نہ ہونے کے برابر تھا لیکن یہاں تو دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے، پھر کوئی دوسرا خیال کیسے راہ پاتا، چنانچہ یہ دونوں بھائی مکمل طور پر ناخواندہ رہے حتیٰ کہ عام رواج کے مطابق قرآن ناظرہ تک نہ پڑھ سکے اور جونہی ذرا ہوش سنبھالنے کے قابل ہوئے، ماں نے دونوں کو ایک ہندو کے کارخانے میں فٹ بال سینے پر لگوا دیا...... جہاں دو سال تک تو اُنہوں نے بمشکل کام سیکھا یا گالیاں کھانے میں مہارت حاصل کی اور جب اُن کے ہاتھ سیدھے ہوئے اور انہوں نے فٹ بال سینے میں تھوڑی مہارت حاصل کر لی تو دونوں ماہوار پندرہ بیس روپے کمانے لگے اُس زمانے میں جب بکرے کا گوشت چار آنے میں ایک کلو آ جاتا تھا، یہ رقم خاصی معقول تھی۔

لیکن ماسی حلیماں کی قسمت میں شاید آسودگی اُور فارغ البالی تھی ہی نہیں ۔ چنانچہ جو رقم اُس کے بیٹے کما کر لاتے، وہ سینت سینت کر جمع کرتی جاتی اُور خود بدستور لوگوں کی چاکری میں مصروف رہتی اُور تین چار سال کی بچت کے بعد جونہی اُس کا بیٹا لال دین سولہ سال کا ہوا، اُس نے اُس کی شادی کر دی۔

اُور لال نے ماں کے ایثار اُور اخلاص کی یہ قدر کی کہ شادی کراتے ہی بیوی کو لے کر الگ ہو گیا اُور اُس نے ماں کی معمولی سی بھی خدمت کرنا مناسب نہ جانا۔ بعد میں شریف نے بھی بڑے بھائی کی تقلید کی اُور شادی ہوتے ہی اُس نے بھی کھانا پینا الگ کر لیا۔ اس گھر کے تین ہی کمرے تھے دو پر لال اور شریف قابض ہو گئے اُور تیسرے میں ماسی حلیماں اپنے چھوٹے بیٹے پرویز اُور بیٹی سلیماں کے ساتھ کولہو کے بیل کی طرح زندگی گزارتی رہی۔ البتہ خدا نے اُس پر ترس کھایا اُور سلیماں کی شادی ہو گئی، وہ اپنے سسرال چلی گئی...... پرویز کو ماسی نے ہمت کر کے اسکول میں داخل کرا دیا تھا اُور اب وہ زیرِ تعلیم تھا۔ ماسی روزانہ صبح کو اُسے ناشتہ کراتی اُور اسکول کے لئے رخصت کر کے خود مزدوری پر نکل جاتی۔ دونوں بڑے بیٹے کمال بے غیرتی سے لاتعلق بنے رہے۔ یہ دونوں بھائی اتنے سنگدل ثابت ہوئے کہ کسی عید تہوار پر نیا لباس بنوا کر دینا تو درکنار ضرورت کے وقت یا دوا کے لئے ماں کو چند روپے دینا بھی گوارا نہ کرتے۔

ماسی حلیماں اُس وقت صدمے سے نڈھال ہو گئی جب اُسے پتہ چلا کہ پرویز میٹرک کے امتحان میں فیل ہو گیا ہے۔ یہ ۵۳-۵۲ء کی بات ہے۔ اُس زمانے میں میٹرک کے ضمنی امتحان نہیں ہوا کرتے تھے اُور کسی ایک مضمون میں بھی فیل ہو جانے والے لڑکے کو سارے مضامین کا دوبارہ امتحان دینا پڑتا تھا، چنانچہ اگلے سال پرویز نے دوبارہ امتحان دیا اُور دوبارہ فیل ہو گیا اُور تیسرے سال بڑی مشکلوں سے وہ تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہوا اس لئے پورا ایک سال جوتے چٹخانے کے باوجود اسے کوئی معمولی سی نوکری بھی نہ ملی، تو اس کے بہنوئی نے اُسے شہر کے ایک ایسے محلے میں کریانے کی دکان ڈال دی جو ماسی کے گھر سے کم و بیش دو کلو میٹر کے فاصلے پر تھا۔

پرویز کا روزگار چل نکلا، تو اُس نے ماں کی ''نوکری'' ختم کرادی، لیکن اُس کی مشقت کا سخت تر دور شروع ہوگیا۔ بیٹا تو منہ اندھیرے دکان کے لئے گھر سے نکل جاتا اور ماں اُس کا ناشتہ لے کر روزانہ نو بجے گھر سے چل پڑتی اور کم از کم دو کلومیٹر کا فاصلہ پیدل طے کر کے دکان پر پہنچتی، اور کچھ دیر وہاں بیٹھ کر آٹا، دال اور سبزی وغیرہ لے کر پیدل ہی گھر آجاتی۔ ماشاء اللہ بیٹے کا مزاج خاص بنیوں والا تھا۔ وہ نپے تلے انداز میں روزانہ اتنا ہی آٹا دیتا جو ایک دن کی ضرورت کے لئے کافی ہوتا اور اتنی ہی دال بھی...... وہ لکڑی کے لئے ماں کو ایک ہفتے کے لیے ایک روپیہ دیا کرتا اور اس کا بھی باقاعدہ حساب رکھتا اور اگر کبھی ماں کسی ضرورت کے حوالے سے معمولی سا مطالبہ کرتی تو وہ باقاعدہ ڈانٹنے اور حساب طلب کرنے لگ جاتا۔

سُکھ اور آسودگی ماسی حلیماں کے نصیب میں شاید تھی ہی نہیں۔ زندگی کے کسی بھی دور میں اُسے اطمینان حاصل نہ ہوا۔ اُس کے تینوں بیٹے اپنے باپ کے سچے جانشین ثابت ہوئے۔ باپ غیر ذمہ داری میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا اور آخر خسروں کے ساتھ فرار ہوگیا اور بیٹوں نے بظاہر گھر میں رہتے ہوئے کمال بے غیرتی کا مظاہرہ کیا اور جانثار ماں کو مکمل نظر انداز کئے رکھا، اُس کے ساتھ کبھی معمولی سا تعاون نہ کیا، اس کی خدمت سے آخری حد تک بے نیازی کا مظاہرہ کیا...... اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تینوں ''مکافاتِ عمل'' کے اصول کے تحت اللہ کے غضب کی لپیٹ میں آگئے اور نہایت عبرت ناک حشر سے دوچار ہوئے۔ مَیں اس سارے المیے کا عینی شاہد ہوں۔

بڑے بھائی لال دین کو اللہ نے تین بیٹے اور پانچ بیٹیاں عطا فرمائیں، اُس کی بیوی اچھے مزاج کی تھی، لیکن وہ خود بے حد گھٹیا اور کمینی ذہنیت کا حامل تھا۔ اس کی اکلوتی بہن سلیماں اُس کے سسرالی عزیزوں میں بیاہی گئی تھی، وہ وقتاً فوقتاً وہاں جایا کرتا، لیکن محض ماں کو ستانے کے لئے وہ بہن سے بات تک نہ کرتا، پھل وغیرہ لے جاتا، لیکن بہن کو اُس سے محروم رکھتا۔ ماسی حلیماں کو پتہ چلتا تو وہ صدمے سے نڈھال ہوکر، چارپائی پر گر جاتی اور سینے پر ہاتھ مار مار کر کہتی ''ہائے ہائے وے لال، مَیں نہیں ویکھاں گی، پر دنیا ویکھے گی'' (افسوس ہے لال تجھ پر، تمہارا جو حشر ہوگا وہ مَیں

تو نہیں دیکھ سکوں گی لیکن ساری دنیا اُس کا تماشہ کرے گی) اَور حیرت انگیز طور پر ماسی حلیماں کی پیش گوئی کے عین مطابق لال مختلف حوالوں سے شدید ترین پریشانیوں میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ پہلے اس کی سب سے خوبصورت بیٹی کئی مہینے بیمار رہ کر مرگئی، بڑی بیٹی کے ہاں سات بیٹیاں ہوئیں، اُس کے دو بیٹے بھی تھے، لیکن داماد پچاس کی عمر سے پہلے ہی فوت ہوگیا......مَیں اُس کے دسویں کی تقریب میں گیا۔ قرآن خوانی کے بعد سب لوگ کھانا کھا رہے تھے، لیکن لال کا بڑا بیٹا رفیق اَور اُس کا بیٹا کھانے میں شریک نہ ہوئے اَور الگ تھلگ بیٹھے رہے۔ پتہ چلا کہ لال اَور اُس کے بیٹے میں شدید ترین مخاصمت ہے۔ دونوں میں بول چال بند ہے اَور رفیق نے زبردستی دیوار بنا کر گھر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ لال کا منجھلا بیٹا رحیم بھی اُس سے سخت بدظن ہے اَور اُس سے لاتعلق ہو کر مضافات کے ایک گاؤں میں چلا گیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جو سنگدلانہ طرزِ عمل لال نے اپنی اکلوتی بہن سے اختیار کیا تھا، بعینہٖ وہی روّیہ رفیق نے اپنی بہنوں سے اپنائے رکھا، حتیٰ کہ وہ اپنے بہنوئی کی موت پر اگرچہ دنیاداری کی خاطر آ تو گیا، لیکن دل سے بغض ختم نہ کیا اَور بہن کے گھر کا کھانا تک نہ کھایا اَور لال اپنی آنکھوں سے یہ اذّیت ناک تماشہ دیکھتا رہا۔ پتہ چلا کہ آج کل لال دین اپنے چھوٹے بیٹے فرخ کے ساتھ رہتا ہے، لیکن فرخ کی بیوی اُس سے سخت بیزار و نالاں ہے اَور اس طرح لال کی زندگی اذّیت اَور ذلت کی علامت بن کے رہ گئی ہے۔

اس تقریب میں ''مکافاتِ عمل'' کا ایک اَور پہلو بھی سامنے آیا۔ لال کی بیوہ بیٹی نسرین نے بتایا کہ اُس کا مرحوم خاوند بھولا بھالا اَور سادہ مزاج کا مالک تھا۔ عرصے تک سعودی عرب میں ملازمت کرتا رہا، اپنا مکان بنایا، بڑے بیٹے کی شادی کی۔ بہو بہت خوبصورت تھی، بیٹا تو شادی کے دو مہینے کے بعد سعودی عرب چلا گیا، لیکن باپ اب پاکستان ہی میں رُک گیا اَور حالانکہ گھر میں اس کی چار جوان کنواری بیٹیاں موجود تھیں، لیکن اُسے بہو سے عجیب طرح کا اُنس ہوگیا اَور اُسے دیکھے بغیر اُسے چین ہی نہ آتا تھا۔ اسی عالم میں ایک روز وہ سٹول پر کھڑا ہو کر چھت کے قریب جالوں کو صاف کر رہا تھا، مگر اُس کی ساری توجہ اپنی بہو کی جانب تھی کہ یکا یک اس کا پاؤں پھسلا

اُور وہ دھڑام سے نیچے گر گیا اُور پھر اُٹھ نہ سکا اُور چیخنے چلّانے لگا...... پتہ چلا کہ اُس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ایک پہلوان کی خدمات حاصل کی گئیں،لیکن افاقہ نہ ہوا بلکہ تکلیف بڑھتی چلی گئی اُور وہ چھ ماہ بستر پر پڑے پڑے دم توڑ گیا۔

ماسی حلیماں کی آل اولاد میں مکافاتِ عمل کے مناظر سلسلہ درسلسلہ دیکھے جاسکتے ہیں۔لال نے اپنی ماں اُور بہن سے بدسلوکی کا انداز اختیار کیا تو وہ بچوں کے حوالے سے بُری طرح پکڑا گیا اُور جب اُس کے بیٹے رفیق نے باپ سے اُور بہنوں سے وہی سلوک روا رکھا،تو وہ یوں گرفت میں آیا کہ ۲۰۰۶ء کے اکتوبر میں اُس کی بیوی تقریباً پنتالیس سال کی عمر میں مرگئی اُور وہ پچاس سال تک پہنچتے پہنچتے رنڈوہ اُور بے سہارا ہوگیا حالانکہ عمر کے اس حصے میں دوسرے ساتھی کی رفاقت بے حد ضروری ہوتی ہے۔اُس کے صرف تین بیٹے ہیں،ایک کی شادی ہوگئی ہے اُور مجھے یقین ہے کہ وہ بھی گھریلو سطح پر اُسی طرح کی اذیت میں مبتلا ہو جائے گا جیسا اُس کے طرزِ عمل کی وجہ سے اُس کا باپ لال دین ہوا تھا۔بالکل درست کہا نظیر اکبر آبادی نے کہ ؎

کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دن کو دے اُور رات لے
کیا خوب سودا نقد ہے، اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

ماسی حلیماں کا دوسرا بیٹا محمد شریف تھا۔اس بدنصیب نے بھی اپنی ماں کی معمولی سی بھی خدمت انجام نہ دی اُور شادی کے بعد الگ ہو کر بے تعلق ہوگیا۔اِسے بیوی بڑی بارعب ملی،بالکل تھانیداروں والا روّیہ تھا اُس کا اُور اُس کے سامنے شریف بھیگی بلی بنا رہتا۔اللہ نے اُسے چار خوبصورت بیٹے عطا کیے،لیکن اُس کی بیوی شادی کے تقریباً دس سال کے بعد مرگئی۔اُس نے دوسری شادی کی۔یہ خاتون مزاج کی بہت اچھی تھی،لیکن بمشکل ڈیڑھ دو سال کے بعد یہ بھی فوت ہوگئی۔تیسری بیوی کا بھی یہی حشر ہوا اُور پھر کم از کم کوئی بیس سال کا عرصہ محمد شریف نے بغیر کسی ساتھی کے گزارا......اس دوران میں وہ غیر معمولی المیوں سے دوچار ہوا۔اُس کا ایک جوان بیٹا کرنٹ لگنے سے ناگہانی موت مرگیا۔دو بیٹے کاروبار کرتے تھے،اُن کی پڑوسی دکانداروں سے دشمنی تھی،ایک دن اُنھوں نے حملہ کردیا، فائرنگ

سے شریف کا ایک بیٹا قتل ہو گیا جبکہ دوسرا شدید زخمی ہوا اُور لمبے عرصے تک معذور پڑا رہا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اِن سارے دُکھوں کے باوجود وہ عرصے تک زندہ رہا اُور گزشتہ برس یعنی ۲۰۰۶ء کے اوائل میں اُسے مادی زندگی کی اذیتوں سے نجات مل سکی۔

پرویز ماسی کا تیسرا اُور سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ یہ اگرچہ میٹرک پاس تھا، لیکن عقیدے اُور عمل کے اعتبار سے قطعی جاہل واقع ہوا تھا۔ یہ ''دتہ شاہی'' نامی ایک ایسے مقامی فرقے سے وابستہ ہو گیا جن کے عقاید خوفناک حد تک اسلام سے متصادم تھے۔ یہ لوگ نماز روزے کے مخالف تھے بلکہ ان کا مذاق اُڑاتے تھے۔ اُور سُود کھانا، جوا کھیلنا ان کے نزدیک بالکل جائز تھا۔ اِن کی رسمِ عبودیت صرف ایک تھی: جمعرات کو امام صاحب کے مقبرے پر زنانہ لباس پہن کر اکٹھے ہوتے۔ بھنگ پیتے، دھمال ڈالتے اُور قبر کا طواف کر کے، وہاں سجدہ ریز ہو کر گھروں کو چلے جاتے۔

چنانچہ پرویز ماں کے لئے اپنے بڑے بھائیوں سے بھی زیادہ سنگدل ثابت ہوا۔ وہ اُسے ترسا ترسا کر خرچ دیتا، اُس کا سختی سے حساب لیا کرتا اُور ڈانٹ ڈپٹ میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھتا...... نتیجہ یہ کہ صدموں کی یلغار سے تھک کر ماسی حلیماں شدید بیمار ہوئی اُور پھر دنیا سے منہ موڑ گئی۔

پرویز کی شادی ہوئی۔ اللہ نے اُسے دو بیٹے اُور تین بیٹیاں عطا کیں، لیکن خرچ کے معاملے میں اُس کا دل یہودیوں اُور بنیوں سے بھی تنگ تھا۔ اُس کی دکان اچھی چلتی تھی، اُس نے خاصی دولت کمائی، لیکن وہ لوگوں کو بھاری سود پر قرض دیتا تھا اُور چونکہ سارے مقروض اُس کے قریبی دوست تھے جو سب کے سب اُس کے ہم مسلک تھے اُور کسی اخلاقی ضابطے کے قائل نہ تھے، اس لئے اُس کی بیشتر رقمیں ڈوب گئیں۔ اُس کی سنگ دلی کا یہ عالم تھا کہ اُس کے سگے خالو نے جو اُس کے سسر بھی تھے، اُور اس خاندان کے محسن بھی نامساعد حالات کی وجہ سے اُس سے مختلف وقتوں میں قرض لیا، جو مجموعی طور پر اٹھارہ سو روپے بن گیا، لیکن اُس نے اُن سے دوگنی رقم یعنی ساڑھے تین ہزار روپے وصول کئے۔ وہ بے چارے ایک بے حد نازک رشتے کے حوالے سے خاموش رہنے پر مجبور ہو گئے اُور اُن کے بیٹے نے یہ رقم ادا کر دی۔ یہ بات ۷۰-۱۹۶۹ء کی ہے۔

سودخوری اَور مکمل بے عملی کا وبال یہ پڑا کہ پرویز کی کمائی سے برکت اُٹھ گئی۔ اُس نے بھائیوں کو مجبور کیا کہ مشترکہ آبائی مکان فروخت کر دیا جائے اَور اُس سے جو رقم ملی، وہ اللّوں تلّوں میں خرچ کر دی، بیوی بچوں کو کرائے کے ایک مکان میں بٹھا کر لاتعلق ہو گیا اَور انہیں خرچ تک دینا بند کر دیا...... اس انتہائی نازک وقت میں اُس کی بیوی کا بھائی آگے بڑھا۔ اُس نے اپنی بہن اَور بچوں کی دستگیری کی، مکان کے کرائے سے لے کر جُملہ اخراجات تک ساری ضرورتوں کا ذمہ لیا اَور بے لوث انداز میں کفالت کا حق ادا کر دیا۔ بڑی بھانجی کی شادی کر دی اَور اس سلسلے کے جملہ اخراجات کا مکمل انتظام اپنے پاس سے کیا۔ دونوں بھانجے اپنے باپ کی طرح نالائق ثابت ہوئے۔ دونوں نے میٹرک بڑی مشکلوں سے تیسرے درجے میں پاس کیا، لیکن ماموں نے انہیں کئی طرح کے شارٹ ٹیکنیکل کورس کرا دیئے اَور جب پھر بھی انہیں میرٹ پر کہیں بھی نوکری نہ ملی تو ایک فیکٹری کے نیک دل مالک نے ماموں کی سفارش پر بڑے بھائی کو اپنے ہاں ملازمت دے دی اَور اس کی اتنی قدر افزائی کی کہ بعد میں اُسے فیکٹری کا مینجر بنا لیا...... دوسرے کو بھی الیکٹرانکس کی ایک دکان پر نوکری مل گئی۔ ماموں کا بوجھ ختم ہوا اَور ان لوگوں کے دن پھر گئے تو پرویز نے گھر کا بائیکاٹ ختم کر دیا اَور سب دوبارہ شیر و شکر ہو گئے۔

لیکن اپنے خاندان کی روایت کے عین مطابق پرویز کے دونوں بیٹوں نے اپنے محسن ماموں سے کمال بے وفائی کا مظاہرہ کیا۔ ہوا یہ کہ پہلے ایک بھائی کی شادی ہوئی، تو انہوں نے عام جاہل اَور دنیا پرست لوگوں کی طرح باجے گاجے اَور دھوم دھڑکے کا اہتمام کیا۔ ماموں ایک باعمل، خدا خوف آدمی تھا، اُس نے انہیں سمجھایا کہ اس طرزِ عمل کا اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سراسر اسراف ہے، نمائش ہے۔ لیکن معذرت کرنے کی بجائے دونوں بھائیوں نے سخت بُرا مانا اَور برملا کہا کہ ہم اپنے معاملات میں آزاد ہیں، کسی کے حکم کے پابند نہیں۔ ہم تو دنیا کے ساتھ چلیں گے اَور اپنی خوشی پوری کریں گے...... جس کو ہمارا یہ انداز پسند نہیں وہ بے شک اس میں شامل نہ ہو۔

ماموں خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا...... لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اس لئے بادلِ

نخواستہ اس تقریب میں شامل رہا، بھانجوں نے بھی ''خودداری'' کا بھرپور مظاہرہ کیا اور آخر تک ماموں کو معمولی سی بھی ''لفٹ'' نہ کرائی۔

تقریباً دو سال کے بعد دوسرے بھائی کی شادی ہوئی تو نمائش، اسراف اور دھوم دھڑکے کا پہلے سے بھی بڑھ کر مظاہرہ ہوا۔ ماموں کو بہر حال مان تھا، اُس نے دوبارہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی، تو اس بار دونوں بھانجے بپھر گئے۔ انہوں نے انتہائی بدتمیزی سے اُسے ڈانٹا کہ ہم آپ کے مزارع نہیں ہیں، آپ کے خیالات کے پابند نہیں ہیں، اگر آپ اس ماحول میں خوش نہیں، تو آپ جاسکتے ہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ماموں غیرت مند اور باعمل مسلمان تھا۔ وہ ہر رات پابندی کے ساتھ اپنے رب سے وعدہ کیا کرتا تھا کہ باری تعالیٰ جو شخص بھی آپ کے احکامات سے سرتابی کرے گا، مَیں اُس کو چھوڑ دوں گا، مَیں اُس سے دور ہو جاؤں گا، چنانچہ وہ اس توہین کو جو دراصل اُس کے نظریے اور عقیدے کی توہین تھی، برداشت نہ کرسکا اور خاموشی سے اس تقریب سے واک آؤٹ کر گیا۔

اس حادثے کو دس سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ اس دوران میں پرویز چند روز کی مختصر علالت کے بعد فوت ہوگیا اور اُس کی مہلت عمل اپنے دونوں بڑے بھائیوں سے پہلے ختم ہوئی۔ اُس کے دونوں بیٹے اولادِ نرینہ سے محروم ہیں۔ ایک کی تین بیٹیاں ہیں، دوسرے کی چار ہیں۔ بڑے کی بیوی کے رحم میں ایسا نقص پیدا ہوگیا ہے کہ وہ مزید اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی جبکہ چھوٹے بھائی کی چار بیٹیاں ہوگئیں تو اس نے خوفزدہ ہو کر بیوی کا آپریشن کرادیا اور اس طرح اللہ کی ناراضگی نے اس خاندان کی جڑ ہی کاٹ دی۔

عبرت ناک بات یہ بھی ہے کہ چھوٹے بھائی کو وقتاً فوقتاً دورہ پڑتا ہے اور وہ اپنے سر پر دوہتڑ مارتا ہے اور چیخ چیخ کر روتا ہے شاید اس کا سبب یہ ہے کہ اس ظالم نے اپنی سگی خالہ کو جو اس کی بڑی بہن کی ساس بھی تھی، اُس کے بیٹے کی شادی کے روز بلاوجہ سخت پریشان کیا تھا اور اُسے بلاوجہ رُلایا تھا اسی نے دونوں شادیوں پر غیر اسلامی رسموں پر اصرار کیا تھا اور اپنے مہربان ماموں کے ساتھ توہین آمیز روّیہ اختیار کیا تھا۔

(۴۷)

وہ اذیت پسند تھا

مہر چراغ میرا دور کا رشتے دار تھا۔ بڑا عجیب وغریب آدمی تھا۔ چٹا ان پڑھ تھا، لیکن منفی ذہانت کا خاصا بڑا حصہ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھا۔ اذیت پسندی اسے محبوب تھی اَور دوسرے کو دُکھ دے کر، تکلیف میں مبتلا کر کے گویا اسے راحت ملتی تھی۔ مَیں نے یہ منظر بچشمِ سر دیکھا کہ نذیر نائی اُس کی داڑھی مونڈھنے کی تیاری کر رہا تھا اَور جیسا کہ اُس زمانے میں دیہات کا کلچر تھا، نائی کسانوں کی شیو بنانے میں صابن یا کریم کا استعمال نہیں کرتے تھے، بلکہ خالی پانی سے چہرے کے بالوں کو گیلا اور نرم کر کے استرے سے شیو بنا دیتے تھے...... چنانچہ نذیر نائی روایت اَور عادت کے مطابق بار بار پانی کی پالی میں انگلیاں ڈبوتا اَور مہر چراغ کے چہرے کا مساج کرنے لگتا۔

یکا یک نذیر نائی کی چیخیں بلند ہوئیں۔ وہ بے طرح سے تڑپ رہا تھا اَور مدد کے لئے شور مچا رہا تھا۔ چراغ نے اس کی انگلیاں دانتوں میں مضبوطی سے دبالی تھی اَور کسی طرح چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ پہلے تو لوگ اسے مذاق سمجھے اور قہقہے لگانے لگے لیکن جب کئی منٹ گزر گئے اور چراغ نائی کا ہاتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو لوگوں نے آگے بڑھ کر زبردستی بے چارے نذیر کا ہاتھ آزاد کرایا اور ایک شخص نے چراغ کے سر پر دو تین دھولیں جمائی تھیں، تب اُس نے منہ کھولا تھا اور نذیر کی انگلیاں آزاد ہوئی تھیں، یوں لگتا تھا جیسے مہر چراغ پر دیوانگی طاری ہوگئی تھی۔

دوسرے واقعے کا بڑا کردار بھی نذیر نائی ہی تھا۔ ہمارے علاقے میں تین گاؤں بالکل قریب قریب ہیں، تقریباً ایک ایک فرلانگ کے فاصلے پر۔ نذیر کا گاؤں آخری اَور تیسرا تھا۔ وہ ایک روز شام سے پہلے اپنے کام سے فارغ ہو کر حسبِ معمول چارے کا گٹھڑ اٹھائے اُس ڈیرے پر پہنچا جو ہمارے گاؤں کے ایک سرے پر واقع تھا اور جہاں پر چراغ کی کاشت کاری تھی۔ اُس نے

گٹھڑ نیچے پھینکا اور ڈیرے پر بیٹھے ہوئے چراغ سمیت مختلف لوگوں سے کہنے لگا کہ یہ میرا چارہ ہے، اس کا خیال رکھنا، میں ذرا نمبردار کے گھر سے ہو کر آتا ہوں۔

چراغ کو حسبِ عادت تکلیف دہ شرارت سوجھی۔ اُس نے چارے کا گٹھڑ کھولا، قریب پڑا ایک بھاری پتھر چارے کے درمیان میں رکھا اور گٹھڑ کو دوبارہ باندھ دیا۔ اُس کے ساتھیوں نے اُس کے ساتھ معاونت کی اور جب نذیر نائی واپس آیا تو تین چار آدمیوں نے مل کر اُسے چارے کا گٹھڑ اٹھوا دیا۔

نذیر نے بتایا کہ گٹھڑ اٹھاتے ہی مجھے غیر معمولی بوجھ محسوس ہوا۔ مَیں حیران تھا کہ میری گردن کو کیا ہو گیا ہے۔ اس میں بل کیوں پڑ رہے ہیں۔ پھر سوچا شاید یہ میرا وہم ہے۔ جوں توں کر کے گھر پہنچا تو صحن میں گٹھڑ پھینک کر گردن کو سہلاتا ہوا میں باہر نکل گیا اور بیوی کو کہہ گیا کہ چارہ بھینس کے آگے ڈال دے اور جب مَیں تھوڑی دیر کے بعد واپس گھر آیا تو بیوی نے پوچھا یہ اتنا بڑا پتھر کیا کرنا تھا، یہ کیوں اٹھا لائے، تب عقدہ کھلا کہ او ہو یہ تو چراغ کی شرارت تھی۔ دوسروں کو تکلیف میں مبتلا کر کے واقعی اسے مزہ آتا تھا۔ چنانچہ لوگوں نے بتایا کہ نوجوانی میں جب اُس کی شادی ہوئی تھی تو اُسے بہت اچھی بیوی ملی۔ وہ خوبصورت تھی، خوش مزاج تھی اور سلیقہ مند بھی، لیکن چراغ نے اس کے ساتھ بڑا ہی بہیمانہ روّیہ اختیار کیا۔ وقتاً فوقتاً وہ اس کی بے رحمی سے پٹائی کرتا حتیٰ کہ بسا اوقات رات کو اُس کے دونوں ہاتھ چارپائی کے پایوں کے نیچے دبا کر خود چارپائی پر لیٹ جاتا اور وہ بے چاری چیختی چلاتی رہتی، فریادیں کرتی، لیکن اس ظالم کو رحم نہ آتا، تا آنکہ محلے کے لوگ مداخلت کرتے اور بڑی مشکلوں سے اُس کی جان چھوٹتی۔

اللہ نے مہر چراغ کو ایک بیٹا بھی عطا کر دیا۔ خوبصورت، بہت پیارا لیکن اس سفاک کے روّیے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ غیر معمولی اذیت اور توہین کا یہ اسلوب تسلسل کے ساتھ جاری رہا، حتیٰ کہ ایک روز اُس کی مظلوم بیوی نے اس سے گلوخلاصی کی تدبیر سوچ لی۔ سردیوں کا موسم تھا۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ چراغ کھانا کھا کر کھیتوں میں چلا گیا۔ اُس کی بیوی نے بچے کو نہلایا،

اسے نئے کپڑے پہنائے، اُس کی آنکھوں میں سرمہ لگایا، صحن میں چارپائی بچھائی، اُس پر بیٹے کو لٹایا اور خود کمرے کے اندر جا کر چھت سے جھول گئی۔ گھنٹوں کے بعد ایک پڑوسن اُس کے گھر آئی تو اس نے یہ لرزہ خیز منظر دیکھ کر شور مچایا لیکن اُس وقت تک وہ زندگی کی اور مہر چراغ کی قید سے رہا ہو چکی تھی۔

مجھے یہ تفصیل مہر چراغ کی بہن ماسی ریشم نے سنائی تھی۔

اس اندوہناک حادثے کے بعد مہر چراغ یک وتنہا رہ گیا۔ بیٹے کو اس کا ماموں اپنے گھر لے گیا۔ لوگ چراغ سے شدید نفرت کرتے، کوئی اُس سے بات نہ کرتا، نہ اُس کو اپنے قریب بیٹھنے دیتا۔ زندگی اُس کے لئے جہنم بن کر رہ گئی تھی۔

تب ہر طرف سے مایوس ہو کر مہر چراغ نے میرے والد کے ہاں آمد و رفت شروع کی، وہ آتا، ڈیرے پر آ کر بیٹھ جاتا اور گم سم رہتا۔ کوئی اُس سے بات کرنا پسند نہ کرتا تھا، لیکن میرے والد صاحب طبعاً بہت رحم دل تھے اور دوسروں کو تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو جاتے تھے۔ انہیں چراغ کی بیچارگی پر ترس آ گیا۔ اسے اپنے حقے میں شریک کرنے لگے اور وقت ہو جاتا تو اُسے کھانا بھی کھلا دیتے۔ تب چراغ والد صاحب کے پاس بیٹھ جاتا، بہانے سے ان کی ٹانگیں دبانے لگتا، کمر سہلاتا اور خوشامدانہ تعریف کرنے لگتا حتیٰ کہ والد صاحب کا ہمدردانہ انداز دیکھ کر اُس نے اُن سے درخواست کی: آپ دیکھ رہے ہیں کہ دنیا میں کوئی میرا ہمدرد نہیں۔ رشتہ دار، دوست سب دور ہو گئے ہیں۔ کوئی مجھے ملنا پسند نہیں کرتا۔ اس وقت آپ کے سوا کوئی میرا خیر خواہ نہیں۔ آپ مہربانی کریں اور کہیں میری شادی کرا دیں تا کہ میرے گھر کا دروازہ کھل جائے۔ مجھے پکی پکائی روٹی مل جایا کرے۔

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا میرے والد بڑے ہی خیر پسند انسان تھے، صوم وصلوٰۃ کے پابند اور خلقِ خدا کے سچے بہی خواہ۔ وہ پریشان حال لوگوں کی مشکلات دور کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے، چنانچہ انہوں نے مہر چراغ سے وعدہ کر لیا کہ وہ اُس کا گھر آباد کرنے کی پوری کوشش

کریں گے۔

حالات کا ستم اور قدرت کا انتقام دیکھئے کہ کچھ ہی عرصہ پہلے والد صاحب کے چچازاد بھائی کی ایک گونگی بہری بیٹی کو طلاق ہوگئی تھی اور وہ لوگ اپنی اس معذور بیٹی کے لئے پریشان تھے۔ والد صاحب نے چراغ سے بات کی اور صاف بتایا کہ لڑکی گونگی ہے، بہری ہے، خوبصورت بھی نہیں اور طلاق یافتہ ہے۔ اچھی طرح سوچ لو، بعد میں اعتراض نہ کرنا۔ منظور ہے تو شادی کرا دیتا ہوں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چراغ نے یہ رشتہ بخوشی قبول کرلیا اور رشیداں بی بی سے اُس کی شادی ہوگئی۔

چراغ اور رشیداں کی جوڑی کم از کم چالیس سال تک قائم رہی۔ پہلے پچیس سال رشیداں تندرست رہی اور چراغ کا چولہا جلتا رہا لیکن پھر رشیداں پر ایک روز یکا یک فالج نے حملہ کر دیا اور وہ تقریباً پندرہ سال تک چارپائی پر مقید رہی۔ اگرچہ رشیداں نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا لیکن اُس کی دیکھ بھال زیادہ تر چراغ ہی کو کرنی پڑتی تھی اور یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے اُس کے جذبات کا جو عالم ہوگا، اُس کا تصور کر کے وجدان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

افسوس چراغ نے حالات سے بہت کم عبرت حاصل کی، اُس کی ایذا پسندی کا سلسلہ کم و بیش جاری رہا لیکن جب رشیداں بی بی مفلوج ہو کر صاحبِ فراش ہوئی تو وہ ٹوٹ پھوٹ گیا اور اُس کو اکثر روتے ہوئے دیکھا گیا۔

اسی عالم میں ایک روز چراغ کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ یکا یک دم توڑ گیا جبکہ رشیداں بی بی بھی حیرت انگیز طور پر بہت تھوڑے عرصے کے اندر وفات پا گئی۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ظلم کا انتقام لے کے رہتا ہے اور سفاک لوگوں کو ایسی کڑی سزا دیتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

(۲۸)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

آج ۲۰۰۴-۸-۵ کو معروف مضمون نگار، مصنّف اور ماہرِ تعلیم قاضی ذوالفقار احمد صاحب سے اُن کے گھر پر ملاقات کی۔ مَیں نے مکافاتِ عمل کے حوالے سے اُن کی یادیں اور مشاہدات معلوم کیے تو اُنہوں نے چند واقعات سنائے۔

فرمایا: ملک غلام عباس سنٹرل ماڈل اسکول میں ٹیچر تھا۔ بعد میں اے ڈی آئی ہو گیا۔ خوشامد میں بہت ماہر تھا۔ ملک امیر محمد خاں گورنر تھا، اُسے اپنے بچوں کے لیے ٹیوٹر کی ضرورت تھی، اس نے جھٹ اپنی خدمات پیش کر دیں اور روزانہ گورنر ہاؤس جا کر متعلقہ خدمت انجام دینے لگا۔

ملک غلام عباس کے بیٹے نے ایف ایس سی پری میڈیکل کا امتحان تھرڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ عام حالات میں ایک تھرڈ ڈویژن کے لیے کسی میڈیکل کالج میں داخلے کا دور دور تک امکان نہیں ہوتا، مگر گورنر کی عنایت سے غلام عباس کے بیٹے کو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا اور وہ ڈاکٹر بن کر انگلینڈ چلا گیا۔

ملک غلام عباس کے اس بیٹے کی منگنی بچپن ہی سے اپنے چچا کے ہاں ہوئی تھی، مگر غلام عباس نے یہ منگنی توڑ کر بیٹے کی شادی ایک معروف اور اعلیٰ خاندان کی ڈاکٹر لڑکی سے کر دی اور دونوں میاں بیوی انگلینڈ چلے گئے۔

لیکن وہاں جا کر دونوں کے تعلقات میں شدید ترین بگاڑ پیدا ہو گیا۔ لڑکی غلام عباس کے بیٹے کو ذرا بھی پسند نہیں کرتی تھی چنانچہ روز روز کے لڑائی جھگڑے کے نتیجے میں وہ نفسیاتی اور ذہنی مریض بن گئی۔ اُس پر جنون کے دورے پڑتے، وہ برتن اُٹھا اُٹھا کر خاوند کو مارا کرتی اور ایک روز دو ننھی بیٹیوں کو چھوڑ کر فوت ہو گئی۔

اب غلام عباس نے اپنے بیٹے کی شادی اپنے بھائی کی اُسی بیٹی سے کردی جس کی منگنی اُس نے توڑ دی تھی، لیکن عبرت ناک بات یہ ہوئی کہ ملک غلام عباس کا یہ ڈاکٹر بیٹا عین جوانی میں یعنی تقریباً چالیس سال کی عمر میں فوت ہوگیا...... اور اس کی ساری تگ ودو اَور خواہشات خاک میں مل گئیں۔

قاضی ذوالفقار احمد صاحب نے بتایا کہ ملک غلام عباس نے ایک عورت سے تعلقات قائم کرلیے۔ اُسے بغیر نکاح کے بیوی بنالیا اَور اُسے ایک مکان لے کر دے دیا لیکن ملک کے ایک ملازم نے بھی اس عورت سے تعلق قائم کرلیا اَور ایک روز ملک نے انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا اَور ملازم کو تھپڑ مار دیا...... ملازم نے بھی جواب میں ملک کو تھپڑ رسید کردیا جس کا اثر اُس کے اعصاب پر اس شدت کے ساتھ ہوا کہ وہ چوتھے دن برین ہیمرج سے مرگیا۔

قاضی صاحب نے بتایا: میرے چار بیٹے اَور دو بیٹیاں ہیں۔ میرے ایک بھائی فوت ہوگئے ہیں۔ اُن کی تین بیٹیاں ہیں جن میں سے دو سے میں نے اپنے دو بیٹوں کی شادی کردی ہے۔ ظاہر ہے یہ کزن میرج تھیں اَور کزن میرج کے بڑے خطرات بیان کیے جاتے ہیں، لیکن اللہ کے فضل سے میرے بیٹوں کے گھروں میں کوئی بھی پریشان کن صورتِ حال پیدا نہیں ہوئی۔ اُن کے بچے مکمل تندرست اَور نارمل ہیں۔

اس کے برعکس میرا ایک سالا انجنیئر ہے۔ بہت خوبصورت ہے، صحت مند، اُس کی بیگم ڈاکٹر ہے۔ اُس کا پہلا بیٹا ہوا تو اُس کی صورت مسخ شدہ تھی۔ دانت ناک کے قریب تھے اَور باہر نکلے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں بھی کجی تھی۔ پھر بیٹی ہوئی، وہ بھی ایسی ہی تھی۔

اس کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ انجنیئر صاحب نے بہت دولت بنائی۔ چار کنال کی کوٹھی، ٹاؤن شپ لاہور میں ہے اَور چار کنال ہی کی اسلام آباد میں ہے۔ اسلام آباد والی کوٹھی کا کرایہ ایک لاکھ ماہانہ آتا ہے، لیکن خدا نے اُسے مالِ حرام کی سزا بڑی سخت دی ہے، بچوں کی بدہئیتی کی صورت میں۔

(۲۹)

میرے ایک لائق شاگرد عابداللہ عابد نے شورکوٹ کے حوالے سے ایک واقعہ سنایا۔

اُس نے بتایا کہ اُن کے علاقے میں احسان علی نامی ایک زمیندار تھا۔ چار مربعے کا مالک تھا، لیکن بہت ہی ظالم، خسیس، شرارتی اَور متکبّر آدمی تھا۔ انسان کو انسان سمجھتا ہی نہیں تھا۔ جھوٹ بولنے کا ماہر اَور چرب زبان تھا۔ لوگوں سے ایسے مذاق کرتا جو اُن کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کا سبب بنتا۔ اُس کا رویّہ عمومی طور پر توہین وتذلیل پر مبنی ہوتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ ظالم اَور بے انصاف بھی تھا۔ مزدوروں کو کبھی پوری اجرت نہ دیتا اَور اُن سے بے رحمی سے پیش آتا۔ نرمی اَور محبت تو اُس کی سرشت ہی میں نہ تھی، یہاں تک کہ اُس نے اپنے باپ کی جائیداد میں سے کسی بہن کو حصّہ نہ دیا (اُس کی چار بہنیں تھیں)۔

احسان علی کا ذاتی کردار بھی بہت گھناؤنا تھا۔ عیاشی کرتا اَور شراب پیتا تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ زمینداروں کی عام روایت کے برعکس اُس کی شادی اڑتیس سال کی عمر میں ۱۹۸۳ء میں ہوئی اَور یکے بعد دیگرے چھ بیٹیاں اس کی جھولی میں ڈال دی گئیں۔ بیٹا ایک ہی تھا اور وہ سب سے چھوٹا تھا، اُس کا نام یاسر تھا۔ وہ بہت ہی نالائق تھا۔ میٹرک بھی نہ کر سکا۔ باپ کا نافرمان بھی تھا۔

عیاشی، شراب نوشی، اَور غریبوں کی بددعائیں رنگ لائیں اَور ۱۹۹۸ء میں احسان علی کو فالج ہوگیا۔ اُس کی دائیں ٹانگ بیکار ہوگئی۔ ۱۹۹۹ء میں اُسے شوگر ہوگئی اَور اُس نے اتنی شدت اختیار کی کہ ڈاکٹروں نے ۲۰۰۱ء میں اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا۔ اب وہ موٹر سائیکل وہیل چیئر میں اِدھر اُدھر آتا جاتا ہے اَور چونکہ بیٹا مکمل آوارہ اَور نالائق اَور غیر ذمہ دار ہے، اس لئے سارے ہی جھمیلے اُسے اپنی معذوری کے باوجود خود ہی نپٹانے پڑتے ہیں۔

عابداللہ عابد نے بتایا: مَیں جب بھی شورکوٹ جاتا ہوں، احسان علی سے ملاقات ہوتی ہے۔

مَیں نے اُسے کبھی بھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔غم وحزن کی تصور بنا رہتا ہے اَور اب تو اُس کی بد عملیوں کا وبال اس قدر پھیل گیا ہے اَور بیماریوں نے (بشمول عارضۂ قلب) اس قدر یلغار کی ہوئی ہے کہ اس کی ساری اراضی بِک گئی ہے اَور اب بمشکل پانچ ایکڑ زمین باقی رہ گئی ہے جس پر یہ خاندان بڑی کسمپرسی کے ساتھ زندگی گزار رہا ہے۔

دردناک بات یہ بھی ہے کہ احسان علی کی کسی بیٹی کی بھی شادی نہیں ہوئی۔لوگ اُس کے کردار اَور روّیے سے اتنے متنفر ہیں کہ کوئی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔

(۳۰)

حاجی خادم حسین گوجر ہمارے علاقے کا ایک معروف کردار تھا اور سالہا سال تک وہ اپنے ماحول پر چھایا رہا۔ اللہ نے اُسے دولت کی فراوانی عطا کی، اُسے قوت اور شہرت بخشی اور چھ بیٹوں کی نعمت سے نوازا، مگر افسوس اُس نے شکر کی بجائے تکبر اور ظلم کا انداز اپنالیا اور آخر کار اللہ کی سنت کے مطابق نشانِ عبرت بن گیا۔

حاجی خادم حسین مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے آیا تھا اور ایک چھوٹے سے گاؤں میں مقیم ہُوا تھا۔ اُس نے عملی زندگی کا آغاز ٹرک مالکان کے باورچی کی حیثیت سے کیا۔ پھر ٹرک کنڈکٹر کے طور پر کام کرتا رہا اور پھر ٹریکٹر ٹرالی کا انتظام کر کے لوگوں کو مٹی فراہم کرنے کا کاروبار شروع کیا۔ وہ ابتدا ہی سے بے اصول آدمی تھا اور دھونس اور زبردستی کا اسلوب اختیار کیے ہوئے تھا...... چنانچہ اپنے مقابلے میں کسی کو مٹی اٹھوانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اور مخالفین پر تشدد کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا۔

حاجی خادم حسین بہت ذہین اور ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے علاقے میں گوجر برادری کو منظم کیا، خود ان کا سربراہ بن گیا اور مطالبہ کیا کہ مجھے گوجروں کے سب گھرانے ایک ایک بچھیا فراہم کریں۔ اس طرح وہ دیکھتے ہی دیکھتے گائیوں کے بہت بڑے ریوڑ کا مالک بن گیا۔ یہ ریوڑ بھی اپنے مالک کی طرح منہ زور تھا، اور لوگوں کے کھیتوں میں تباہی پھیرتا رہتا۔ اگر کوئی غریب اعتراض کرتا تو حاجی اور اس کے بیٹے اور ملازم اس کی خوب پٹائی کرتے اور وہ خاموشی کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتا۔

ٹریکٹر ٹرالی کے بعد حاجی نے ٹرکوں کی باربرداری کا کاروبار شروع کیا اور اس میں بھی دھونس اور غنڈہ گردی کے بل پر علاقے میں ٹرکوں کے کاروبار پر چھا گیا اور سب متعلقہ ٹرک مالکان

دُبک کر الگ ہو گئے۔

حاجی موصوف مزید آگے بڑھا اَور اس نے بسوں کا پورا ایک بیڑہ تیار کرلیا۔ یہ بسیں پسرور، سیالکوٹ اَور گوجرانوالہ کی طرف چلتی تھیں اَور اُن کے سامنے باقی سارے بس مالکان سہمے سکڑے رہتے تھے اَور پولیس اِن کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی تھی۔

اس زمانے میں حاجی خادم حسین علاقے کا سب سے طاقتور آدمی تھا۔ وہ ایک مضبوط قبضہ گروپ کا سرغنہ بن گیا تھا۔ کمزور لوگوں کی جائیدادیں ناجائز ہتھکنڈوں سے ہتھیانا اُس کا پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ اس طرح اُس نے کروڑوں کی جائیداد بنالی اَور قصبے کی میونسپل کمیٹی کا پہلے کونسلر اَور پھر وائس چیئر مین بن گیا...... اب وہ اس قدر منہ زور ہو گیا کہ مخالفون کو قتل کرانے سے بھی دریغ نہ کرتا، چونکہ پولیس سے اُس کے مراسم خاصے مضبوط تھے، اس لئے وہ بڑے سے بڑا جرم بھی کرتا تو پولیس اُس پر ہاتھ نہیں ڈالتی تھی۔ چنانچہ وہ چرس، ہیروئن، جوئے اور شراب کا کاروبار بھی علانیہ کرنے لگا اَور کوئی اُسے روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔

ایک غریب آدمی کو اُس نے دن دیہاڑے بے رحمی سے قتل کر دیا، لیکن چونکہ کسی نے حاجی کے خلاف گواہی دینے کی جرأت نہ کی تھی، اس لئے وہ چھ ماہ بعد ہی رہا ہو کر گھر آ گیا اَور اس کی چیرہ دستیاں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں، لیکن جیسا کہ اللہ کا دستور ہے، آخر کار وہ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آ گیا۔ اس کے چھ بیٹے تھے، ایک ٹریفک کے حادثے میں مر گیا...... اَور چونکہ اس خاندان میں شراب اور بدکاری کا عمل دخل عام ہو گیا تھا، اس لئے حاجی کے بیٹوں میں مختلف حوالوں سے شدید اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں ایک بھائی نے ایک ہی ہلے میں اپنے تین بھائیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا...... قاتل گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ اس طرح اُس کی نظروں کے عین سامنے چھ میں سے پانچ بیٹے دردناک حشر سے دوچار ہوئے اَور اُس کا سارا غرور بُری طرح خاک میں مل گیا......

مخالفوں نے جب دیکھا کہ حاجی حالات کی شدید گرفت میں ہے، تو وہ شیر ہو گئے اَور ایک

دن اُنہوں نے اُس پر سامنے سے فائر کھول دیا گولی اُس کے سر کی کھال کو کاٹتی ہوئی نکل گئی، وہ مہلک وار سے بچ گیا، مگر بیٹوں کی ہلاکت کے بعد وہ اس حملے سے اس قدر خوفزدہ ہوا کہ اُسے فالج ہو گیا، ہلنے جلنے سے معذور ہو کر بستر پر پڑ گیا اَور کئی سال تک شدید اذیت میں مبتلا رہا۔ اسی حال میں اُس کا ذہنی توازن بگڑ گیا اَور وہ انتہائی بے چارگی اَور ذلت کی موت مر گیا۔ موت سے پہلے مقدمات اَور ظلم وستم کی نحوست نے اس کی ساری جائیداد ختم کر دی۔ بسیں بِک گئیں، اڈے ختم ہو گئے اَور اس کا خاندان قلاش اَور کنگال ہو گیا۔

اس طرح مالِ حرام اَور خلقِ خدا کی بددعاؤں نے حاجی خادم حسین کے خاندان کو عبرت کی ایک دردناک مثال بنا دیا۔

(۳۱)

ڈاکٹر غلام جیلانی برق مرحوم نے اپنی کتاب ''میری داستانِ حیات'' میں مکافاتِ عمل کے حوالے سے ایک عبرت ناک سچا واقعہ تحریر کیا ہے۔ اُسے ضروری ترمیم کے بعد قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

گڑھی (ضلع اٹک کے قصبہ بسال کے قریب ایک گاؤں) سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر مشرق کی جانب ایک چھوٹا سا گاؤں ڈھوک گدڑاں کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں کے نمبردار سمندر خاں کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام کرم خاں اور سب سے چھوٹے کا اکبر خان تھا۔ اکبر خاں نہائت خوبصورت نوجوان تھا، والد کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور ساری بستی کا لاڈلا...... لیکن حالت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُس کی بیوی سیاہ رنگ کی بھدی سی عورت تھی...... اکبر اُسے پسند نہیں کرتا تھا اور عموماً گھر سے باہر رہتا تھا۔

بیوی کو شک گزرا کہ اکبر خاں نے کسی دوسری عورت سے تعلق اُستوار کرلیا ہے، اس لئے گھر سے غیر حاضر رہتا ہے۔ اُس نے اپنے باپ سے شکایت کی اُور باپ نے اکبر خاں کے بڑے بھائی کرم خاں سے گٹھ جوڑ کیا۔ طے پایا کہ جس رات اکبر خاں گھر پر ہوگا، اُسے قتل کر دیا جائے گا۔

چنانچہ ایک رات جب کہ اکبر خاں اپنے گھر پر سو رہا تھا، اس کی بیوی، سسر اُور بڑے بھائی کرم خاں نے مل کر اُسے بے رحمی سے قتل کر دیا۔ کرم خاں اس لالچ میں اس گھناونی سازش میں شامل ہوا تھا کہ اکبر خاں راستے سے ہٹ گیا تو اُسے باپ کی وسیع زرعی زمین میں سے زیادہ حصہ مل جائے گا۔

بہ ہر حال ان تینوں نے مل کر اکبر خاں کو ہلاک کیا اُور لاش آبادی سے دور ایک ویران کنوئیں میں پھینک دی۔ بیوی نے خون آلود فرش پر پلستر پھیر دیا اُور خون آلود بستر اُور چادریں جلا

دی گئیں۔ پولیس نے بڑا زور مارا، مگر قاتلوں کا سراغ نہ ملا۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق لکھتے ہیں:

''آج سے چند سال پہلے مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ایک فوجی افسر کے ہاں ٹھہرا۔ اُس کا اردلی ٹھیٹھ انکی زبان میں باتیں کرتا تھا۔ مَیں نے اُس کا حسب نسب پوچھا تو کہنے لگا میں ڈھوک گدڑاں کا رہنے والا ہوں۔ میرا دادا قتل ہو گیا تھا۔ اُس کا نام اکبر خاں تھا، اُسے اُس کے سسر اُور بڑے بھائی کرم خاں نے قتل کیا تھا۔

مَیں نے پوچھا کیا کرم خاں زندہ ہے؟ کہا کہ نہیں وہ مر چکا ہے۔ اس کے آخری چالیس سال انتہائی بُری حالت میں گزرے تھے۔ زمین، جائیداد اُس کا سب کچھ غارت ہو گیا تھا۔ اُس کے تین جوان بیٹے اُس کی نظروں کے سامنے موت کے گھاٹ اُتر گئے تھے، وہ نابینا ہو گیا تھا اُور اُس کے آخری بیس سال مسجد کے دروازے پر بھیک مانگتے ہوئے گزرے تھے۔

(۳۴)

چودھری رحمت علی اُور چودھری غلام عباس سگے بھائی تھے اُور ہمارے قریبی عزیز، یعنی میری والدہ کے پھوپھی زاد۔ انگریزوں نے جب پنجاب میں نہری نظام کا اجراء کیا اُور مختلف اضلاع میں زمینوں کی آبادکاری کی تو غلام عباس نے سرگودہا میں دو مربعے حاصل کر لئے جبکہ چودھری رحمت علی نے بہاول نگر میں پچھتر ایکڑ زمین خرید لی۔ کسی سستے زمانے میں ان کے والد نے چالیس ایکڑ زمین اپنے آبائی ضلع سیالکوٹ میں کوڑیوں کے بھاؤ خرید لی تھی۔ اس طرح یہ دونوں بھائی ہمارے پورے خاندان میں زمینوں کے مالک تھے اُور اس حوالے سے امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔

سال میں ایک مرتبہ دونوں بھائی اکٹھے ہو کر اپنے آبائی ضلع کا خیر سگالی دورہ کرتے تھے، رشتے داروں سے ملتے تھے اُور وراثتی زمین پر آباد مزارعین سے لگان وغیرہ حاصل کرتے تھے۔ اسی ضمن میں وہ ہمارے ہاں بھی تشریف لاتے تھے اُور میری والدہ اُن کی خوب خوب تواضع فرماتی تھیں۔ وہ خوشی سے پھولی نہ سماتیں اُور بڑے فخر کے ساتھ آس پڑوس کی عورتوں کو بتاتی تھیں کہ میرے یہ بھائی مربعوں والے ہیں، اپنے علاقوں میں اِن کا بڑا رعب ہے۔ وہ رازداری سے بتایا کرتیں ''انہوں نے اپنے ڈیروں پر ڈاکو پال رکھے ہیں جو ڈاکے مارتے ہیں۔ خود بھی کھاتے ہیں، انہیں بھی کھلاتے ہیں''۔ ''لیکن یہ تو بہت بڑا ظلم ہے، مَیں کہا کرتا۔ اللہ نے انہیں زمینیں دے رکھی ہیں اِن کے پاس تو روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ پھر یہ ایسی کمینی حرکت کیوں کرتے ہیں؟''۔

میری والدہ مجھے ڈانٹ دیتیں۔ ''بڑوں کے بارے میں ایسا نہیں کہتے، تمیز سے بات کرتے ہیں۔ دراصل مربعوں پر سارے لوگ ہی ایسا کرتے ہیں۔ سب کی آپس میں دشمنیاں ہوتی ہیں۔ ڈاکوؤں کی مدد کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے''۔

اس طرح نوعمری ہی میں مَیں ان دونوں ماموؤں سے سخت بدظن ہو گیا، یہ آتے تو مَیں ان

سے دُور دُور رہتا اَور کبھی بے تکلف ہونے کی کوشش نہ کرتا۔ میری اس روش پر وہ حیران بھی تھے اَ پریشان بھی۔ انہوں نے جب میری والدہ سے دریافت کیا کہ عبدالغنی ہمارے پاس کیوں نہیں بیٹھتا، بات کیوں نہیں کرتا تو والدہ نے عذر پیش کیا۔ ''ہمارا یہ بیٹا پڑھ لکھ کر گمراہ ہو گیا ہے، نہ پیروں فقیروں کو مانتا ہے نہ قبروں پہ جاتا ہے، اس لئے اس سے کوئی شکایت نہیں کرنی چاہیے''...... تب دونوں بھائیوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے اَور توبہ توبہ کرتے ہوئے مجھ سے علانیہ بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔

اَور پھر اِن ماموؤں سے میری ملاقات کا وقفہ کئی سالوں پر محیط ہو گیا۔ انہوں نے ہمارے ہاں آنا جانا بھی بہت کم کر دیا۔ پتہ چلا کہ آبائی زمین کی تقسیم پر دونوں بھائیوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے اَور غلام عباس نے زبردستی اُس پر قبضہ کر لیا ہے، اس کی ضرورت اُسے اس لئے پیش آئی کہ دوسری شادی کرنے پر اُس کی بیوی اور سالوں نے اُس کے خلاف کامیاب آپریشن کیا اَور اُسے سرگودھا کی زمینوں سے اَور گھر سے نکال باہر کیا اَور وہ سیالکوٹ والی زمین پر آ کر براجمان ہو گیا اَور بزورِ بازو اس پر قبضہ کر لیا۔

ایک روز والدہ محترمہ کو بہت پریشان دیکھا۔ پتہ چلا کہ بہاول نگر میں چودھری رحمت علی کے حالات بہت خراب ہیں اَور وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہے۔ والدہ نے روتے ہوئے بتایا کہ غیر معمولی موٹاپے میں تو وہ ایک مدت سے مبتلا تھا، لیکن اب شوگر نے بھی اسے ہلکان کر رکھا ہے۔ اُس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کی شادی ہوئے کم از کم دس سال ہو گئے تھے اَور اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ چھوٹے کو پتہ نہیں کیا ہوا کہ اُس نے ایک روز بیٹھے بٹھائے کنپٹی پر پستول رکھا اَور خود کشی کر لی...... مَیں اللہ کے انتقام پر بڑا خوف زدہ ہوا۔ بے اختیار جی چاہا کاش میں کسی طرح چودھری رحمت علی کو بتا سکتا کہ جو لوگ اللہ کی مخلوق کے لئے دکھوں کی کاشت کرتے ہیں وہ زندگی میں کبھی سکھ کا سانس نہیں لے سکتے اور ایک وقت ضرور آتا ہے جب اُن کی زندگی جہنم کا نمونہ بن جاتی ہے ...... لیکن بہاول نگر کے ایک دور افتادہ گاؤں اَور ہمارے گھر کے درمیان فاصلہ اتنا طویل تھا کہ میرا

تصوّر بھی وہاں تک کا سفر بڑی مشکلوں سے طے کر پاتا تھا۔

تاہم چودھری غلام عباس کی زمین ہمارے گاؤں سے زیادہ سے زیادہ پندرہ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی، اس لئے اُن سے میرے والدین کی میل ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ دوسری بیوی سے اُن کے دو بیٹے تھے۔ بڑا یونان چلا گیا۔ چھوٹے حافظ امجد نے کمال سوجھ بوجھ اُور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔ سیالکوٹ میں کھیلوں کے سامان کی تجارت شروع کی اُور خوب پیسہ کمایا۔ رہائش وزیر آباد روڈ پر قریبی قصبے میں منتقل کر لی۔ وہاں پہلے لڑکوں کا اسکول قائم کیا جو خوب چلا اُور پھر لڑکیوں کا اسکول بنالیا اُسے بھی خوب فروغ حاصل ہوا۔

لیکن غلام عباس بھی، جو اپنے رشتہ داروں کو فخر سے بتایا کرتا تھا کہ اُس نے اپنے ڈیرے پر ڈاکو پال رکھے ہیں بلکہ بعض اوقات خود بھی اُن کے ساتھ کارروائیوں میں شریک ہوتا ہے، اب اللہ کی گرفت میں آ گیا۔ پتہ چلا کہ وہ غسل خانے میں پھسل کر گرا اُور اس کے کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ خدا کی بے نیازی دیکھئے کہ اُس کی بیوی کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا اُور دونوں معذور ہو کر چارپائیوں پر مقیّد ہو گئے۔ مَیں والدہ محترمہ کے ساتھ عیادت کے لئے اُن کے ہاں گیا تو انہیں سخت اذیت میں مبتلا پایا۔ دونوں میاں بیوی نے کسی مقامی پہلوان سے پٹیاں کرا رکھی تھیں۔ دونوں بستر پر بڑے کراہ رہے تھے اُور اس تصوّر سے سخت خوفزدہ تھے کہ تیل کی مالش انہیں شدید تکلیف میں مبتلا کر دیتی ہے۔

حافظ امجد کا ایکسپورٹ کا کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا اُور اُس کے دونوں اسکول بھی خوب ترقی پر تھے، کہ اُسے مزید دولت کی ہوس نے اکسایا اُور اُس نے ویزوں کا دھندا شروع کر دیا۔ اُس کا بڑا بھائی یونان میں تھا چنانچہ اُس نے اپنے بھائی سے اُور دیگر ذرائع سے بہت سے ویزے حاصل کئے اُور انہیں بھاری رقوم پر فروخت کیا اُور پچاس ساٹھ افراد کو بیرونِ ملک بھیج دیا۔ ان سب سے اس نے تقریباً ایک کروڑ روپیہ جمع کر لیا...... لیکن ہوا یوں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی یونان یا یورپ کے کسی ملک میں داخلے کی اجازت نہ ملی اُور یہ ترکی اُور دیگر مختلف ملکوں میں گرفتار ہو

کر جیلوں میں چلے گئے......

یہ بات بڑی پُر اسرار ہے کہ اتنی بڑی رقم حافظ امجد نے کہاں صرف کی کہ جب بیرونِ ملک جانے والوں کے لواحقین نے اُس پر یلغار کی تو وہ کسی کو بھی ادائیگی نہ کر سکا اَور روپوش ہو گیا۔ لیکن اُس کی روپوشی سے مسئلہ تو حل نہیں ہوتا تھا، متاثرین بپھرے ہوئے تھے، وہ روز اُس کے مکان کا گھیراؤ کرتے اَور چودھری غلام عباس کو زِچ کرتے...... اِن لوگوں نے حافظ امجد اَور اُس کے باپ کے خلاف مقامی تھانے میں کیس رجسٹر کرا دیا تھا چنانچہ اب پولیس بھی اُس کے گھر پر چھاپے مارنے لگی اَور ایک مرتبہ تو غلام عباس کو بیساکھیوں سمیت گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ اسی حالت میں کئی دن حوالات میں بند رہا، بڑی مشکلوں سے اُس کی ضمانت ہو سکی......اور آخر کار نوبت یہ آئی کہ اُسے اپنی بچی کھچی زمین اونے پونے بیچنی پڑی، دونوں اسکول فروخت کرنے پڑے حتیٰ کہ رہائشی مکان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے تب کہیں جا کر بمشکل تین چوتھائی دعوے داروں کی رقوم واپس ہو سکیں......ان حالات میں اس کی بے بسی کا یہ عالم تھا کہ دونوں بہوئیں اپنے والدین کے پاس چلی گئی تھیں اَور معذور میاں بیوی یک و تنہا حالات کی سختیوں کا سامنا کر رہے تھے۔

اسی حالت میں وہ ایک روز بڑی بے چارگی کے ساتھ سیالکوٹ کے نواح میں کسی گاؤں میں منتقل ہو گئے اور ساری دنیا سے رابطہ توڑ کر روپوش ہو گئے اَور سنا ہے کہ وہیں پہلے غلام عباس فوت ہوا اَور کچھ ہی عرصے کے بعد اُس کی بیوی انتقال کر گئی۔ پتہ چلا ہے کہ حافظ امجد گرفتاری کے خوف سے ماں باپ کے جنازے میں بھی شامل نہ ہوا تھا۔

(۴۴)

گوجرہ کے ڈاکٹر عبدالواحد سندھو صاحب نے بتایا کہ قیامِ پاکستان سے پہلے گوجرہ میں کسان ٹرانسپورٹ کا چرچا تھا۔ اِس میں سات آٹھ بسیں تھیں یہ کمپنی ہندوؤں کی ملکیت تھی اُور بسیں گوجرہ اُور فیصل آباد کے درمیان چلا کرتی تھیں۔

حمید اُور نذیر دو مسلمان بھائی اس میں ایک پیسے کے حصہ دار تھے۔ حمید اسی کمپنی میں ڈرائیور تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد یہ ٹرانسپورٹ کمپنی ایک ایسے مہاجر خاندان کو الاٹ ہوئی جس کے سب مرد شہید ہو گئے تھے اُور بیوہ عورتیں اُور یتیم بچے ہی موجود تھے، لیکن حمید اُور نذیر دونوں بھائیوں نے دھونس اُور غنڈہ گردی سے بیوہ عورتوں کو اتنا خوفزدہ کیا کہ وہ بے چاری اس کی ملکیت سے دستبردار ہو گئیں۔ متذکرہ دونوں بھائیوں نے انتظامیہ سے ساز باز کر کے کمپنی پر قبضہ کر لیا۔

دونوں بھائی بے حد خسیس اُور کمینی ذہنیت کے حامل تھے۔ بہت امیر ہونے کے باوجود کسی غریب مسکین کی ایک پیسہ مدد نہ کرتے، کسی رفاہی کام میں حصہ نہ ڈالتے حتیٰ کہ منڈی میں نئی مسجد تعمیر ہوئی تو اس کے لیے بھی انہوں نے معمولی چندہ نہ دیا۔

ایوب خاں کا مارشل لاء لگا اُور فوجی حکام نے پکڑ دھکڑ کی تو حمید کو ہارٹ اٹیک ہوا اُور وہ پچاس سال کی عمر ہی میں مر گیا۔

نذیر بہت عیاش تھا، بدکار تھا، فلیٹیز ہوٹل لاہور میں ٹھہرا ہوا تھا کہ کسی نے اُسے زہر دے دیا اُور وہ بھی تقریباً پچاس سال کی عمر میں جاں بحق ہو گیا۔

دونوں کی اولاد بھی خائب و خاسر ہو گئی۔

(۳۴)

ظفر وال ضلع نارووال میں بھارتی سرحد کے قریب ایک تاریخی قصبہ ہے۔ قیام پاکستان کے وقت وہاں چودھری عبداللہ خاں بڑے زمیندار تھے اور ذیلدار بھی..... موصوف بہت خدا ترس اور نیک انسان تھے۔

ظفر وال میں ہندو اور سکھ جو جائیدادیں چھوڑ کر گئے، چودھری عبداللہ خاں نے اُن کی حفاظت کا اہتمام کیا۔ اُن کی کوشش تھی کہ یہ جائیدادیں صرف مہاجرین کو ملیں اور کوئی مقامی شخص ان پر قبضہ نہ کرنے پائے..... جبکہ بدعنوان، خدا بے خوف لوگ ان جائیدادوں کو ہتھیانے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے..... لیکن جب وہ اپنے ناپاک عزائم میں ناکام ہوئے تو انہوں نے ایک رات چودھری عبداللہ خاں کو شہید کردیا..... وہ اپنی حویلی میں سو رہے تھے جب ظالموں نے انہیں موت کی نیند سلا دیا۔

یہ وہ دور تھا جب ہر طرح نفسا نفسی کا عالم تھا، قانون، ضابطے سب معطّل تھے، اس لئے خلقِ خدا کے اس سچے بہی خواہ کے قاتلوں کی کچھ بھی نشاندہی نہ ہوسکی اور لوگ جلد ہی اس سانحے کو فراموش کرگئے۔

لیکن، چودھری طارق احسان اللہ صاحب اور چودھری محمد اشرف گھمن صاحب نے بتایا، کہ چودھری عبداللہ خاں کے بہت قریبی عزیزوں میں ایک شخص جلد ہی بدترین حالات سے دوچار ہوگیا..... اُس کا ذہنی توازن خراب ہوگیا، وہ پھٹے حالوں، پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتا رہتا..... حیرت انگیز طور پر اس کی ساری زمین بک گئی اور وہ پائی پائی کا محتاج ہوگیا حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ اس کی جوان بیٹیوں کو لوگوں کے گھروں میں خادماؤں کی حیثیت سے نوکریاں کرنی پڑی اور وہ خود سسک سسک کر زندگی گزارتے ہوئے کس مپرسی کی موت مرگیا..... اُس کا ایک بیٹا تھا، وہ جوان ہونے پر کسی طرح امریکہ چلا گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔

اس شخص کا اور اس کے خاندان کا جو انتہائی عبرت ناک انجام ہوا اس حوالے سے لوگوں کا قیاس ہے کہ دراصل یہی چودھری عبداللہ کا قاتل تھا، جس کا مقدمہ دنیا کی کسی عدالت میں تو نہ چلا، لیکن اللہ کی عدالت نے اس کا خوب فیصلہ کیا۔

(۳۵)

چودھری مہدی خاں گوندل (سن پیدائش ۱۹۳۸ء) جماعتِ اسلامی کے رکن ہیں اُور میرے پڑوسی ہیں اُن کا آبائی تعلق منڈی بہاؤالدین کے گاؤں کوٹ رحم شاہ سے ہے۔ انہوں نے اپنے گاؤں کے حوالے سے ''مکافاتِ عمل'' کا واقعہ سنایا۔

☆☆☆

بتایا کہ یہ واقعہ پاکستان بننے سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۴۶ء کا ہے۔ میری عمر اُس وقت آٹھ سال تھی اُور مَیں قریبی گاؤں ہیلاں کے گورنمنٹ مڈل اسکول میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ حسین شاہ کا تعلق ہمارے ہی گاؤں سے تھا، وہ نمبردار کا بیٹا تھا اُور اگرچہ پانچویں جماعت میں پڑھتا تھا، مگر اُس کی عمر خاصی زیادہ تھی۔ ہٹا کٹا نوجوان تھا۔

اسی اسکول میں ہیلاں کا ایک ہندو لڑکا دچھی رام بھی پڑھتا تھا۔ وہ شاید چوتھی جماعت میں تھا اُور بہت خوبصورت تھا۔ ایک روز حسین شاہ کی نیّت میں فتور آیا۔ اُس نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر سازش تیار کی اُور بیر کھلانے کے بہانے اصرار کر کے دچھی رام کو قریبی نہر پر لے گیا اُور وہاں حسین شاہ اُور اس کے بدقماش دوستوں نے مل کر دچھی رام سے زبردستی بدفعلی کی۔ وہ بے چارہ روتا رہا، اِن کی منتیں کرتا رہا، لیکن کسی نے اس پر رحم نہ کھایا۔

اس واقعے کے بعد حسین شاہ پر اللہ کی یہ لعنت طاری ہوئی کہ جنسی حوالے سے وہ شدید قسم کی مجرمانہ ذہنیت میں مبتلا ہو گیا اُور اپنے بیگانے کا امتیاز کھو بیٹھا۔ بھابی کو بہت تنگ کرتا اُور محلے کی خواتین کے لئے عذاب بن گیا۔ جہاں کسی کا دروازہ کھلا دیکھتا، اندر گھس جاتا اُور خواتین پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وجہ سے وہ گاؤں کا انتہائی قابلِ نفرت کردار بن گیا۔

کئی سال اسی کیفیت میں گزر گئے حتیٰ کہ ایک روز اُس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ کوئی اجنبی

مسافر لڑکا گاؤں میں آیا تھا اور مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس ظالم نے اُسے دبوچ لیا اور مسجد کے اندر ہی اُس کی بے حرمتی کر ڈالی۔ وہ چیختا رہا، شور مچاتا رہا، مگر دوپہر کا وقت تھا، سب لوگ گھروں میں دبکے ہوئے تھے، اس لئے کوئی بھی اُس کی مدد کو نہ آیا۔ البتہ ایک عورت نے اس کی چیخ پکار سن کر مسجد کے اندر جھانکا اور یہ قبیح منظر دیکھ لیا۔

حسین شاہ فارغ ہو کر ایک شادی والے گھر میں جا کر بیٹھ گیا اور بے چارہ مظلوم لڑکا روتا ہوا گاؤں سے باہر نکل گیا۔ گوندلوں کے چار پانچ لڑکے ایک درخت کے نیچے دوپہر گزار رہے تھے۔ اس عورت نے انہیں جا کر اس حادثے کی اطلاع دی۔ وہ بھاگ کر اس لڑکے کے پاس گئے، اس سے واقعے کی تصدیق کی اور پھر حسین شاہ کو تلاش کرنے لگے جو شادی والے ایک گھر میں بیٹھا حلوہ پکنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اِن لڑکوں نے باہم مشورہ کر کے تہیہ کر لیا کہ آج حسین شاہ کو اس کی بدمعاشی اور خانۂ خدا کی بے حرمتی کی سزا دی جائے۔ یہ حسین شاہ کے پاس گئے اور اُسے بہانے سے بہلا پھسلا کر ایک حویلی میں لے گئے اور وہاں اُس کو وہ ماردی، اس شدت سے زدوکوب کیا کہ وہ ادھ موا ہو گیا اور جب اِن لڑکوں نے اسے چھوڑا تو وہ پاگلوں کی طرح لڑکھڑاتا ہوا گاؤں سے باہر نہر کی طرف بھاگ گیا۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا کہ گوندلوں نے مجھے قتل کر دیا ہے۔

اسی حالت میں وہ جا کر نہر کے درختوں میں گم ہو گیا اور پھر کبھی کسی کو نظر نہیں آیا۔ لگتا ہے کہ اُس نے نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ کیا عجب کہ یہ وہی جگہ ہو جہاں اس نے دچھی رام سے جرمِ عظیم کا ارتکاب کیا تھا۔

(۳۶)

پروفیسر بخاری سائنس کالج میں میرا کولیگ تھا۔ اکنامکس پڑھاتا تھا اور ہوسٹل کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ بڑی ہی عجیب وغریب ذہنیت کا مالک تھا۔ کج فکری اور بدعملی اُس پر ختم تھی۔ اُس کو نیکی اور شرافت سے خداواسطے کا بیر تھا۔ مثال کے طور اس کی کوشش تھی کہ ہوسٹل میں کسی داڑھی والے لڑکے کو داخلہ نہ دیا جائے۔ نیک اور باعمل لڑکوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا......اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اُسے خطرہ تھا کہ نیکی پر کاربند ہونے والے طلبہ کہیں اُس کی بے اصولیوں اور بد عنوانیوں پر گرفت نہ کریں اور اس کے لیے پریشانی کا سبب نہ بن جائیں۔

بخاری ہر طرح کی کرپشن میں مبتلا تھا۔ ہوسٹل کو اُس نے اپنی جاگیر بنالیا تھا۔ اُس کے مہمان اور دوست آتے اور وہ انہیں سرکاری کھاتے سے خوب کھلاتا پلاتا۔ جس روز اچھی ڈش تیار ہوتی اُس روز اُس کے دوست اور رشتہ دار ضرور مدعو ہوتے اور وہ اُن کی خوب تواضع کرتا۔

بخاری خوشامد کا فن خوب جانتا تھا۔ متعلقہ پرنسپلوں اور سینئر پروفیسروں کو خوش رکھتا اور اپنی چرب زبانی سے انہیں آسانی سے شیشے میں اُتار لیتا۔ اُس نے ہوسٹل میں جاسوسی کا نظام قائم کر رکھا تھا اور اُس کے پروردہ لڑکے ایسی فضا قائم کیے رکھتے تھے کہ ہوسٹل میں رہتے ہوئے کوئی اُف تک کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ کوئی لڑکا کسی حوالے سے معمولی رائے زنی کرتا تو اُسے فوراً بھاری جرمانہ کرکے ہوسٹل سے خارج کردیا جاتا۔

کئی سالوں کے بعد جب ایک انکوائری کمیٹی قائم کی گئی اور تحقیق ہوئی تو پتہ چلا کہ بخاری نے ہوسٹل کی رقوم اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں منتقل کررکھی تھیں اور وہ طالب علموں کو سیکورٹی یعنی قابلِ واپسی زرِضمانت واپس ہی نہیں کرتا تھا اور وہ بے چارے امتحانات سے فارغ ہوکر بجبری کوشش کرتے، باربار ہوسٹل کے چکر لگاتے لیکن اُن کی رقومات واپس نہیں کی جاتی تھیں۔

بخاری اخلاقی اعتبار سے بھی کرپٹ تھا۔ خوفِ خدا یا شرافت اس کے قریب سے بھی نہیں پھٹکی تھی، وہ جھوٹ، منافقت اُور مکّاری کا ایک پیکرِ مجسم تھا...... لیکن وہ اپنی بداعمالیوں پر بڑی مہارت سے پردہ ڈالتا رہا اُور یہ سلسلہ آٹھ دس سال تک قائم رہا، لیکن آخرکار اللہ کا کوڑا حرکت میں آ گیا۔ اس کی شادی ہوئی اُور اس کی بیوی اور سسرال نے بہت جلد اندازہ کرلیا کہ اس شخص میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہے اُور شادی کے بعد بھی یہ اپنی غلیظ حرکتوں کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے، تو اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی۔ اس کے سالے فوج میں افسر تھے، وہ ایک روز آئے، اس کی خوب پٹائی کی اُور جہیز کا سارا سامان ٹرک پر لاد کر لے گئے۔

ہوسٹل کے لڑکوں نے جب اپنی آنکھوں سے، دن کی روشنی میں اِسے ذلیل وخوار ہوتے ہوئے دیکھا اُور اُن کی نظروں کے سامنے اس کی پٹائی ہوئی، تو ان کی جھجک دور ہوگئی۔ وہ شیر ہوگئے اُور انہوں نے اس کے خلاف محاذ بنالیا اُور کالج میں اس کے خلاف جلوس نکالا، نعرے بازی کی اُور اس کی بدعنوانیوں پر مشتمل ایک قرطاس ابیض مرتب کر کے کالج میں مختلف مقامات پر چسپاں کردیا۔

بخاری کا ایک بھائی پولیس میں افسر تھا، اُس نے ایک بار پولیس کی نفری ہوسٹل میں بھجوادی، متعدد لڑکوں کو گرفتار کرلیا، لیکن بخاری کے خلاف نفرت کی تحریک بڑھتی چلی گئی، سینیئر اساتذہ کی انکوائری کمیٹی نے اس کے خلاف فیصلہ دے دیا...... اُور پھر ایک روز ہوسٹل کے طلبہ نے بخاری کی رہائش گاہ پر حملہ کر کے اُسے زبردستی نکال باہر کیا اُور اُسے واقعتاً بھاگ کر جان بچانی پڑی...... اُس نے کالج سے دوسال کی چھٹی لے لی اُور کہیں غائب ہوگیا چونکہ اُس کا تعلق ایک مضبوط، بااثر کمونٹی سے ہے، اس لئے اُس نے لاہور ہی کے ایک نسبتاً کم معروف کالج میں تقرر کرالیا ہے، لیکن مسلسل اُور شدید نوعیت کی پریشانیوں نے اُسے شوگر اُور بلڈ پریشر میں مبتلا کردیا ہے اُور وہ بے خوابی کا مستقل مریض بن گیا ہے۔ اس طرح بخاری کی زندگی رسوائی اُور عبرت کی علامت بن گئی ہے۔

(۳۷)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

(۱۶؍جولائی ۲۰۰۷ء)

ایک عزیز نے بتایا پروفیسر سعود خاں کا کاروبار مکمل تباہ ہو گیا ہے اَور برانڈرتھ روڈ پر اُس کی وہ دکان جو کم از کم ایک کروڑ روپے میں بِک سکتی تھی، اس نے صرف اڑتالیس لاکھ میں بیچ دی ہے...... مارکیٹ میں اس کا ایک پیسے کا اعتبار نہیں رہا تھا اَور بے شمار لوگوں کا اس نے قرض دینا تھا۔ اس سے قبل اس نے اسی کاروبار کی خاطر اپنا ذاتی مکان بھی فروخت کر دیا تھا۔

سعود خاں سائنس کالج وحدت روڈ میں میرا کولیگ تھا۔ اس کا تعلق بھی شعبہ اقتصادیات سے تھا۔ اللہ کا شکر ہے اس سے ملاقات بہت کم ہوتی تھی، لیکن کبھی کبھار، بہت دنوں کے بعد اس شعبے میں جانے کا اتفاق ہوتا اَور سعود خاں کی باتیں سنتا تو دیر تک طبیعت بدمزہ رہتی۔ کتنا اکھڑ پن تھا اس کی باتوں میں، لگتا ہی نہیں تھا کہ اس کا تعلق تعلیم جیسے شعبے سے ہے۔ گردن اکڑا کر، بازو لہرا لہرا کر وہ اس رعونت کے ساتھ اپنی تعریفیں کرتا اَور دوسرے لوگوں کا تمسخر اڑاتا کہ مَیں چکرا کے رہ جاتا...... وہ تاثر دیتا تھا کہ وہ بہت بڑا تاجر ہے، کروڑوں میں کھیلتا ہے اَور یہ ''پروفیسری'' کی تو اس کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہیں...... اسی لئے وہ کلاسوں کی پروا بھی نہیں کرتا اَور اگر کوئی اسے زیادہ تنگ کرے گا تو وہ فوراً ہی نوکری پر لات مار دے گا۔

برانڈرتھ روڈ پر سعود خاں نے ہارڈ ویئر کا کاروبار شروع کیا تو ایک سادہ دل، مخلص دوست کو بھی شیشے میں اُتار لیا اَور اِس کے اصرار پر اُس بے چارے نے اپنا مکان فروخت کر کے ساری رقم اس کے حوالے کر دی...... اس نے جھانسا دیا تھا کہ وہ ہر ماہ بہت معقول رقم اسے منافعے میں دیا کرے گا اَور اس کی اصل رقم بھی محفوظ رہے گی، لیکن افسوس کہ سعود خان نے اپنے کسی وعدے کا

پاس نہ کیا، ماہانہ منافع بھی غتر بود ہو گیا اَور اصل رقم بھی اُسے واپس نہ ملی۔

میرے عزیز نے بتایا کہ سعود خاں ایک مغرور، بے اصول اَور بد دیانت آدمی تھا۔ مارکیٹ میں کاروبار زبانی وعدوں اَور باہمی اعتبار پر چلتا ہے، لیکن سعود خاں ہر ایک سے منہ پھلا کر تکبر سے بات کرتا، لینے والا دکان کے تھڑے پر نمودار ہوتا تو یہ انتہائی بدتمیزی اَور بداخلاقی کے ساتھ اُسے دور سے دھتکار دیتا...... ''آج نہیں آج نہیں، پرسوں آؤ پرسوں آؤ'' ......اَور ان کا پرسوں ہفتوں پر محیط ہو جاتا، نتیجہ یہ کہ مارکیٹ میں یہ شخص اچھوت بن گیا اَور بالآخر حالات نے دھکے دے کر اسے وہاں سے نکال دیا۔

سعود خاں چھچھورے مزاج کا انتہائی غیر سنجیدہ آدمی تھا۔ لاف زنی اُس پر ختم تھی، تقریباً ہر محفل میں اس بات پر فخر کرتا کہ میرے دو بیٹے ہیں، دونوں حافظِ قرآن ہیں، بظاہر اساتذہ کی ایک دینی تحریک سے بھی وابستہ تھا، مگر ریٹائرمنٹ تک اُسے داڑھی رکھنے کی توفیق نہ ہوئی اَور نمازوں میں سخت ہی تساہل سے کام لیتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے رزق سے برکت اُٹھ گئی، اس کے معاملات خراب ہوتے چلے گئے اَور وہ مسائل کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

(۳۸)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۱۴-۸-۰۷

وزیر آباد سے میرے دو رشتہ دار آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہاں گوجروں کا ایک خاندان ہے۔ سات آٹھ بھائی ہیں، اِن میں سے بھولا اُور لیاقت دھڑلے سے دودھ میں پانی ملاتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دونوں کی بھینیں مرتی ہی رہتی ہیں۔ ایک مرتبہ لیاقت کی اکٹھی سات بھینیں مرگئی تھیں۔ بھولے کی بھی برسات کے دنوں میں کرنٹ لگنے سے دو دو تین تین بھینیں مرجاتی ہیں، لیکن دونوں بھائی بے ایمانی کا عمل ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے اس کے برعکس، میرے عزیزوں نے بتایا، چودھری ثناء اللہ چیمہ کی تقریباً تین سو بھینیں ہیں، لیکن اُن کے ہاں دودھ میں پانی نہیں ملایا جاتا...... نتیجہ یہ کہ گاہکوں کی قطار لگی رہتی ہے، اللہ نے اُن کے رزق میں خاص برکت عطا کی ہوئی ہے اُور اُن کے جانوروں کا کبھی نقصان نہیں ہوتا۔

(۳۹)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

(۷-۸-۰۷)

لکشمی چوک کے علاقے سے ایک دوست آئے تھے۔ انہوں نے بتایا تقریباً بیس سال پہلے دل محمد روڈ پر دو بدعنوان آدمی تھی۔ حسین گاڈی اور چھینو بدمعاش۔ دونوں نے پورے علاقے پر اپنی دھاک بٹھا رکھی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُن کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اُنہوں نے زبردستی درانیوں کے قبرستان پر قبضہ کرلیا۔ وہاں ہوٹل بنالیا، اور دکانیں کھڑی کر لیں...... منشیات کا کاروبار بھی دھڑلے سے کرتے تھے۔ اُن کے سامنے کسی کی عزت یا جان محفوظ نہ تھی جس کو چاہتے سرِ عام پیٹ ڈالتے، جس کی جو چیز پسند آتی ہتھیا لیتے۔

راوی نے بتایا کہ آخر اللہ کا کوڑا دونوں کے خلاف حرکت میں آ گیا۔ حسین گاڈی کو جذام کی بیماری لگ گئی، اُس کا سارا جسم گل گیا اور وہ ترس ترس کے مر گیا۔ چھینو بدمعاش کو لقوہ ہو گیا اور شدید خارش میں مبتلا ہو کر حافظہ کھو بیٹھا اور پھر شدید ترین اذیت میں مبتلا گلیوں میں آوارہ پھرتا رہتا اور نالیوں کا گندا پانی پیتا رہتا...... اسی کیفیت میں بڑی دیر مبتلا رہ کر وہ بھی مر گیا۔

(۴۰)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

(۳۰-۱۱-۱۹۹۷)

آج بہت لمبے عرصے کے بعد مجیب شامی صاحب کے گھر پر انیس احمد شیخ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ یہ شکر گڑھ میں میرے پرنسپل تھے اَور چونکہ پکے ''بزرگ پرست'' تھے اَور ہر جمعرات کو اہتمام کے ساتھ ''داتا صاحب'' حاضری دیا کرتے تھے، اس لئے میری ساری فرض شناسی اَور حسنِ سلوک کے باوجود اُنہوں نے خفیہ رپورٹ میرے خلاف لکھی تھی۔

باتوں کے دوران کہنے لگے: مَیں گزشتہ چوبیس سال سے اپنی سینارٹی کے سلسلے میں عدالتوں اَور دفتروں کے دھکے کھا رہا ہوں۔ ایم اے خاں نے میرا کیس ایسا خراب کیا کہ آج تک سلجھنے میں نہیں آیا۔

تب مجھے بڑی عبرت حاصل ہوئی۔ اس شخص نے محض تعصب میں میری رپورٹ خراب کی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے نقصان سے بچالیا اَور حیرت انگیز طور پر میری پروموشن صرف نو سال کی ملازمت کے بعد ہوگئی حالانکہ اِن میں سے پانچ سال کی رپورٹیں میرے خلاف تھیں...... جبکہ یہ شخص آج تک پریشان حال پھر رہا ہے حالانکہ اس کو ریٹائر ہوئے بھی بارہ تیرہ سال ہوگئے ہیں۔

پتہ چلا کہ شیخ صاحب کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اِن کا پوتا سائنس کالج میں میرا شاگرد ہے۔

(۴۱)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۱۵-۸-۲۰۰۱

کوٹ بلند میں چودھری محمد نواز گھمن صاحب سے ملا۔ اُنہوں نے بتایا کہ سیالکوٹ کے قریب ایک گاؤں میں ایک زمیندار ہے۔ وہ وکیل بھی ہے۔ گاؤں میں اُس کا شاندار محل نما مکان ہے اور اُس نے دس کنال میں ایک اسکول بھی بنا رکھا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس اسکول میں ستائیس اُستانیاں کام کرتی ہیں اور سب عیسائی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اسکول کا مالک اسلام اور مسلمانوں سے سخت بدظن ہے۔ شاید وہ یہ چاہتا ہے کہ بچوں تک اسلام یا نیکی کی کوئی بات نہ پہنچ سکے۔

اس شخص کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ تینوں بیٹے آوارہ اور بدعمل ہیں۔ کسی کی بھی مناسب تعلیم نہیں ہو سکی۔ بیٹی کی عمر تیس سے تجاوز کر چکی ہے، مگر اُسے کوئی رشتہ نہیں ملتا۔ اس وجہ سے وکیل سخت پریشان ہے اور لوگوں کی منتیں کرتا پھرتا ہے کہ میری بیٹی کا کہیں رشتہ کرا دو۔

(۴۲)

میاں عبد الماجد صاحب نے بتایا: ہمارے گاؤں چک میانہ (ضلع گجرات) میں کھوکھر زمینداروں کا ایک خاندان تھا۔ صاحبِ خانہ اسکول ٹیچر تھے۔ اُن کے دو بیٹے تھے۔ دونوں آرمی میں آفیسر تھے۔ ایک کرنل، ایک میجر ان کی ماں بہت مغرور اور جاہل عورت تھی۔ کبھی بھولے سے بھی نماز نہ پڑھتی۔ عورتیں توجہ دلاتیں تو منہ پھلا کر کہتی: میرے گھر میں کون سی کمی ہے جو مَیں خدا سے مانگوں۔ دو بیٹے فوجی افسر ہیں، زمین ہے، شاندار مکان ہے، دولت ہے، عزت ہے، پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ زمین پر ناک رگڑتی پھروں؟

پچاس پچپن سال کی عمر میں اس عورت کو فالج ہو گیا۔ ٹانگیں جڑ گئیں، ہلنے جلنے کے قابل نہ رہی، کرسی پر بٹھانا مشکل ہو گیا سارا دن ویل چیئر پر پڑی رہتی ...... بیٹی کوئی تھی نہیں اور کوئی بہو پاس نہیں تھی جو خیال رکھتی۔ ملازمہ کے رحم و کرم پر سالہا سال تک بے بسی کی زندگی گزارتی رہی۔

اس عورت کا جو بیٹا کرنل تھا وہ بھی غیر معمولی مغرور اور بد اخلاق آدمی تھا۔ حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ اُس کا باپ اُسے ملنے گیا۔ وہ اس زمانے کے روایتی دیہاتی لباس میں ملبوس تھا۔ پگڑی، تہ بند، چھڑی۔ بیٹے کو پتہ چلا تو ملنے سے انکار کر دیا اور باپ کچھ دیر دفتر کے باہر بیٹھ کر واپس آ گیا...... کرنل کی ماں مر گئی تو کندھا تک نہ دیا۔ کہنے لگا میری جگہ کوئی مزدور رکھ لو، مَیں اُسے پیسے دے دوں گا۔

کرنل نوکری سے ریٹائر ہوا تو جتنا پیسہ ملا، اُس سے گاؤں میں شاندار مکان بنا لیا، ساری رقم اس پر خرچ کر دی۔ یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، لیکن کسی سے بھی اولاد نہ ہوئی۔ نتیجے میں کرنل شدید چڑچڑے پن اور غصے میں مبتلا ہو گیا...... تینوں بیویاں اُسے چھوڑ کر چلی گئیں...... آخر میں بالکل پاگل ہو گیا تھا۔ چھت پر چڑھ کر فائر کرتا رہتا...... اسی حالت میں ۹۵ء، ۹۶ء میں مر گیا۔

(۴۳)

مجیب شاہ خاں صاحب وارث کالونی (وحدت روڈ، لاہور) میں رہتے ہیں۔ بہت سادہ دل، مخلص انسان ہیں۔ ۱۹۳۳ء میں ضلع بیدر (حیدر آباد دکن) کے ایک گاؤں تورنال میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے بعد ہیلی کالج لاہور سے بی کام کیا اُور سرکاری ملازم ہوگئے۔ ۱۹۹۳ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ میں ڈپٹی سکرٹری تھے۔

مجیب شاہ خاں صاحب نے بتایا کہ تورنال میں آٹھ دس گھر پٹھانوں کے تھے، باقی سب ہندو تھے، لیکن پٹھان پورے ماحول پر چھائے ہوئے تھے کہ زمینوں کے مالک یہی تھے۔ یہ صاحبِ جائیداد تھے۔ بیل، گھوڑے، بندوقیں انہی کے پاس تھیں۔ ہٹے، کٹے، چھ چھ فٹ قد، بڑے شہ زور تھے اُور ساتھ ہی بے حد جاہل اُور گنوار بھی۔ مالگذاری اُور لگان نہیں دیتے تھے، گاؤں میں کوئی اسکول نہ تھا، ڈسپنسری نہیں تھی سب ظلم اُور جہالت میں غرق تھے۔ اکثر افراد کو کلمہ تک نہیں آتا تھا۔ ایک دوسرے کے خلاف خوب لڑائیاں کرتے اُور جب چاہتے ہندو اکثریت کو روند کر رکھ دیتے۔ ایک مرتبہ رات کو ہندو بھجن کی تقریب میں مصروف تھے جب پٹھانوں نے اُن پر حملہ کر دیا اُور چار پانچ افراد ناحق مار دیئے۔

۱۹۴۸ء میں ''مکافاتِ عمل'' کا منظر مَیں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا جب ہندوستان نے حیدر آباد پر حملہ کر دیا اُور سب کچھ برباد کر کے رکھ دیا۔ تورنال کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اُور ساری بستی کھنڈر میں تبدیل ہوگئی۔

خان صاحب نے بتایا: ''مکافاتِ عمل'' ہی کے حوالے سے ایک اُور واقعہ مجھے یاد ہے۔

ہمارے گاؤں میں سعادت خان نام کا ایک پٹھان تھا۔ اپنے قبیلے ہی کی طرح خوب تنومند اُور

طاقت ور تھا۔اس کے پاس گھوڑا بھی تھا اُور بندوق بھی اُور وہ اُن سے خوب کام لیتا تھا یعنی لوگوں پر دھونس جماتا، اُن سے چیزیں چھین لیتا خصوصاً بکروں سے تو اُسے بہت ہی محبت تھی، کھلے عام اُٹھالاتا اُور بھون کر کھا جاتا۔

سعادت خاں کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ایک بھتیجا، نور خاں، پال رکھا تھا۔بیٹوں کی طرح اُس کی پرورش کی، وہ بھی قد آور اُور بہت صحت مند نکلا اُور عجیب عبرت ناک بات یہ ہے کہ جوان ہو کر اپنے محسن چچا کے مقابلے میں کھڑا ہو گیا۔دونوں میں مقابلہ ہوا اُور چچا نے بھتیجے کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

نور خاں کے بھائی شریف خاں نے اس کا بدلہ یوں لیا کہ اُس کی بیٹی کی شادی پر چچا (سعادت خاں) آیا تو شریف خاں نے اُسے وہیں ڈھیر کر دیا۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم کو کسی صورت بھی پسند نہیں کرتا اُور ظالم کو ضرور سزا دیتا ہے۔

(۴۴)

ذاتی ڈائری کے چند اوراق

آج ۲۰۰۴-۷-۳۱ کو جماعتِ اسلامی کے قائد اُور کارکن جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب سے خاصی طویل ملاقات ہوئی۔ مَیں نے ''مکافاتِ عمل'' کے حوالے سے اُن کی یادداشتیں معلوم کیں۔ موصوف محترم نے اس سلسلے کے کئی واقعات سنائے (ڈاکٹر صاحب بھائی پھیرو، ضلع قصور میں مقیم تھے اُور بے مثال خوبیوں کے حامل تھے۔ اپریل ۲۰۰۷ء میں انتقال فرما گئے)۔

☆☆☆

سردار......ڈوگر بھائی پھیرو خاص میں رہتا تھا۔ ساری ہی برائیوں کا مجموعہ تھا۔ ظالم، زانی، شرابی، پورے علاقے میں اُس کی بدمعاشی مسلّم تھی، سب لوگ اُس سے دہشت زدہ تھے، اس نے بے شمار خفیہ قتل کرائے تھے۔

خدا کا کرنا یہ ہوا کہ اُس کی کھوکھروں سے دشمنی ہوگئی اُور یہ مخالفت اتنی شدت اختیار کرگئی کہ سردار ڈوگر بھائی پھیرو سے نقل مکانی کر کے لاہور چلا گیا...... یہاں ہنجروال کے یکا بکا سے اُس کی چپقلش ہوگئی اُور یکا بکا نے اُسے اغوا کر کے قتل کیا اُور گٹر میں بہا دیا۔ ڈوگر کے تین بیٹے تھے۔ دو قتل ہوگئے، ایک ملک سے باہر بھاگ گیا اُور اس طرح ایک ظالم کا دوسرے ظالم کے ہاتھوں خاتمہ ہوگیا۔

یکا بکا بھی بہت ظالم تھا، اِسے ڈوگر کے رشتہ داروں نے قتل کردیا......دونوں خاندان غارت ہوگئے۔

(۴۵)

ذیل کی خبر روزنامہ ''جنگ'' لاہور کے شمارہ ۲۰۰۵-۵-۱۹ میں شائع ہوئی تھی۔ یہ عبرت کا ایک عجیب نمونہ ہے:

خبر کے مطابق فیصل آباد کے چک نمبر ۳ رام دیوالی میں ایک جرائم پیشہ آدمی محمد اکبر نے دن کے ایک بجے دو بے گناہ افراد کو قتل کر دیا۔ وہ پہلے محمد علی جٹ کے گھر داخل ہوا اَور اس کی بیوی کی موجودگی میں اُسے چھری کے وار کر کے ہلاک کر دیا۔ پھر وہ محمد علی جٹ کے رشتہ دار ماسٹر عباس جٹ کے گھر گیا اَور اُسے بھی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

اس کے بعد یہ ظالم شخص مسجد میں گیا، لاؤڈ سپیکر کھولا اَور اعلان کیا کہ مَیں نے اپنے دو دشمنوں کا کام تمام کر دیا ہے۔ شیر ابھی گاؤں میں موجود ہے، جس کی جرأت ہے سامنے آئے اَور مقابلہ کر کے دیکھ لے۔

یہ کہہ کر قاتل مسجد سے باہر نکلا اَور اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔ اخبار کے نمائندے کے مطابق اُس وقت اِس شخص کو پیچھے سے کسی نے گولی ماردی اَور وہ وہیں گِر کر مر گیا۔ گولی مارنے والے کا سراغ کسی کو نہیں مِلا نہ گاؤں والوں کو نہ پولیس والوں کو۔

مَیں نے یہ خبر اپنے بیٹے عزّ ام فاروق کو سنائی اَور پوچھا کہ اس بدمعاش قاتل کو کس نے گولی ماری ہوگی تو اس نے برجستہ کہا: فرشتے نے...... اَور میرا ذہن بھی اسی طرف جاتا ہے کہ چونکہ قاتل نے خدا کے گھر میں کھڑے ہو کر نہایت سفا کی اَور بے باکی کے ساتھ دو افراد کے قتل کا اعتراف بھی کیا اَور گاؤں والوں کو للکارا بھی، اس لئے اللہ نے اس کے خلاف خود کارروائی کی اَور کسی فرشتے نے انسانی روپ میں اُس کا کام تمام کر دیا۔

(۴۶)

مندرجہ ذیل واقعہ روزنامہ ''جنگ'' کے سنڈے میگزین مورخہ ۲۰۰۰-۷-۲ میں شائع ہوا۔ اِسے زینت اقبال (کراچی) نے تحریر کیا تھا۔

انکل اور ان کے ایک دوست نفیس صاحب ایک ہی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ نفیس صاحب کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں اور میرے انکل کے علاوہ ان کے ایک اور دوست سعد صاحب بھی تھے۔ ان ہی دنوں نفیس صاحب کو اپنی بڑی بیٹی کی شادی کے لئے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے انکل سے پچاس ہزار روپے مانگے انکل نے کہا! ''میرے پاس تو نہیں ہیں، سعد سے معلوم کر لیتے ہیں اگر اس کے پاس ہوں گے تو میں دلوا دوں گا۔'' سعد صاحب سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا ''میری عنقریب پچاس ہزار کی کمیٹی کھلنے والی ہے تو میں وہ آپ کے دے دوں گا اور جب ضرورت پڑے گی تو آپ لوٹا دیجئے گا۔'' انکل نے کہا ٹھیک ہے ''رقم میں آپ کو دلوا دوں گا۔'' اور یوں نفیس صاحب کو سعد صاحب نے پیسے دے دیئے جس کے گواہ صرف انکل ہی تھے۔

نفیس صاحب کی بیٹی کی شادی بخیر وخوبی انجام پا گئی۔ کچھ مہینوں بعد سعد صاحب کو اپنی والدہ کے علاج کے لئے پیسوں کی ضرورت پڑی تو انہوں نے نفیس صاحب سے اپنے پیسے مانگے۔ پہلے تو وہ ٹال مٹول کرتے رہے کہ میں کل دے دوں گا، ہفتے بعد دے دوں گا، بعد میں ان کے دماغ میں پتا نہیں کیا شیطان سما گیا کہ وہ سرے سے مکر ہی گئے کہ ''میں نے کوئی پیسے ویسے لئے ہی نہیں۔'' اب تو سعد صاحب کو بہت غصہ آیا۔ انہوں نے انکل سے بات کی تو انکل نے کہا ''ٹھیک ہے، بات کرتا ہوں'' انہوں نے نفیس صاحب سے پوچھا تو وہ صاف پھر گئے۔ انکل نے کہا ''میں نے تمہیں خود پیسے دلوائے ہیں۔'' لیکن وہ نہیں مانے اور اب انکل کے علاوہ کوئی گواہ بھی نہیں تھا لہٰذا بات نہیں بن سکی۔ انکل بھی بے بس ہو گئے کہ آخر نفیس کو کیا ہو گیا ہے؟ پچاس ہزار

کے لئے اپنا ایمان خراب کر رہا ہے۔'' بہر حال سعد صاحب نے ایک وکیل سے بات کی اور نفیس صاحب پر کیس دائر کر دیا۔

جس دن نفیس صاحب اور سعد صاحب کو کورٹ میں بلایا گیا اس دن انکل بھی گئے۔ سعد صاحب نے قرآن اٹھا کر کہا کہ ''میرا ایک گواہ ہے اور مَیں نے پیسے نفیس صاحب کو دیئے ہیں۔'' مگر جب نفیس صاحب سے قرآن پاک اٹھانے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے قرآنِ شریف اٹھا کر صاف انکار کر دیا کہ ''مَیں نے سعد سے کوئی پیسہ نہیں لیا۔'' پتا نہیں اس لمحے سعد صاحب کو کیا ہوا کہ انہوں نے کہا ''بس! اب مجھے کسی کا فیصلہ نہیں چاہئے مَیں اپنا کیس واپس لیتا ہوں اور اب فیصلہ میرا رب کرے گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کورٹ سے باہر نکل گئے۔

اس بات کو ابھی مہینہ بھی نہیں گزرا ہو گا کہ نفیس صاحب کی اس بیٹی کو طلاق ہو گئی جس کی شادی پر انہوں نے قرض لیا تھا۔ ایک بیٹا فوج میں تھا اس کا میڈیکل چیک اپ ہوا تو معلوم ہوا کہ اس کو ایڈز جیسا مہلک مرض لاحق ہو گیا ہے چنانچہ اُسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ ابھی وہ ان حادثات سے سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ ان کا چھوٹا بیٹا جو کالج میں پڑھتا تھا کسی تنظیم کی لڑائی کے دوران فائرنگ سے ہلاک ہو گیا اور جب اس بیٹے کی لاش گھر پر آئی تو نفیس صاحب کی حالت پاگلوں جیسی تھی۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ سعد مجھے معاف کر دو، مجھے معاف کر دو، میرا پورا گھر تباہ ہو گیا ہے۔'' اور حیرت کی بات یہ ہے کہ سعد صاحب کی بیمار والدہ قدرتی طور پر بالکل صحت یاب ہو گئیں۔ واقعی خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ جب فیصلہ رب پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہ ایسی کڑی سزا دیتا ہے کہ دنیا کے لئے باعثِ عبرت بنا دیتا ہے۔

(۴۷)

چودھری ریاض تقریباً پچیس سال سے کویت میں مقیم ہے مالدار آدمی ہے، اس کا ایک مکان سمن آباد لاہور میں بھی ہے۔ کسی زمانے میں س کا خاندان یہیں رہتا تھا۔ بعد میں سب لوگ کویت منتقل ہو گئے۔

ریاض کے تین بیٹے اُور ایک بیٹی ہے۔ سب بچے خوبصورت ہیں اُور خوبصورتی اُن کے لیے وبال بن گئی ہے۔ مَیں نے اُن کے بڑے بیٹے فیصل کو شادی کی ایک تقریب میں اُس وقت دیکھا تھا جب اُس کی عمر بارہ تیرہ سال تھی۔ بہت خوبصورت اُور ذہین لڑکا تھا۔

ریاض نے فیصل کی شادی اپنی بہن رضیہ کی بیٹی سے کی، لیکن بدقسمتی سے فیصل نے اُسے ایک ہی سال کے بعد طلاق دے دی...... کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ریاض نے اپنی اکلوتی بیٹی کی ایک جگہ شادی کی اُور اُسے بھی تھوڑے ہی عرصے کے بعد طلاق ہوگئی...... اب دونوں بہن بھائیوں کی بیٹیاں اپنے والدین کے گھروں میں بیٹھی ہیں اُور قسمت کو رو رہی ہیں۔

(۴۸)

عقیل سیّد میرا ایم اے کا کلاس فیلو تھا۔ وہ لائق تو نہیں تھا، لیکن ذہین بہت تھا، فائنل امتحان میں اُس نے بہت کم نمبر حاصل کئے یعنی تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا، مگر دورانِ تعلیم وہ غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت سرگرم رہا۔ موسیقی کی محفلیں منعقد کراتا، مشاعرے کراتا، سیر وسفر کے پروگرام بناتا اُور لڑکیوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کا کوئی موقع جانے نہ دیتا...... ہمہ وقت مذاق، ہمہ وقت لطیفے عقیل سیّد کی شناخت بن گئی تھی۔

موصوف کو نمبر کم ہونے کی وجہ سے کوئی سرکاری ملازمت تو نہ ملی، لیکن وہ صحافت کی دنیا سے وابستہ ہو گیا اُور اِسی دشت کی سیاحی میں اُس نے ساری عمر گزار دی۔ بعد میں طویل وقفوں کے بعد اُس سے گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ تاہم لاہور منتقل ہونے کے بعد اس سے رابطے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی تھی۔ مَیں فون پر اس کی خیریت دریافت کرتا رہتا تھا جس سے اُس کے حالات سے آگاہی ہوتی رہتی تھی۔

بدقسمتی سے غیر سنجیدگی عقیل سیّد کی زندگی اُور رویّوں کا جزوِ لاینفک بن گئی۔ اُسے نیکی بدی اور گناہ وثواب کا کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ جب بھی موقع آتا وہ اپنا وزن اُن طاقتوں کے پلڑے میں ڈال دیتا جو لادینیت اُور تخریب کی علمبردار ہیں۔ چنانچہ اُس کی زندگی کا واحد مقصد پیسہ اُور تفریح تھا۔ اس سے ہٹ کر کوئی رویہ اختیار کرنا اُس کے بس کا روگ ہی نہیں تھا۔ فکر وعمل کی انہی پستیوں کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے عقیل سیّد کو ہمیشہ مشکلات اُور پریشانیوں میں مبتلا کئے رکھا۔ اُس کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹے کی نعمت سے وہ محروم رہا۔ اس نے گھر میں مکمل بے پردگی کا چلن اختیار کئے رکھا اُور اُسے بیوی اُور بیٹیوں کی آزادانہ چلت پھرت سے عار محسوس ہی نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اُس کی بڑی بیٹی نے جو خاصی خوبصورت تھی اُور مکمل بے پردہ تھی جب یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تو

اخبارات میں اُس کی جو تصویر چھپی وہ کھلے بالوں کے ساتھ بھرپور ماڈرن لڑکی کی تصویر تھی۔

بڑی بیٹی تعلیم سے فارغ ہوئی تو اُسے یونیورسٹی ہی میں ملازمت مل گئی اَور کچھ ہی عرصے کے بعد قریبی رشتہ داروں میں اُس کی شادی بھی ہوگئی۔ شادی مکمل ماڈرن انداز میں ہوئی۔ اُس میں باجے گاجے بھی تھے، بھنگڑے اَور رقص بھی اَور مخلوط محفل آرائی بھی۔

عقیل سیّد اپنی بڑی بیٹی کی شادی اَور اُس کی باعزت رخصتی پر بہت خوش تھا۔ اللہ نے اُسے بیٹا بھی عطا فرمایا جس پر موصوف نہال ہوا جاتا تھا۔ لیکن افسوس کہ خوشی اور اطمینان اُس کے نصیب میں نہ تھا۔ نواسے کی پیدائش کے چند ہی مہینے کے بعد اُس کی بیٹی کی سسرال سے ان بن ہوگئی اَور ایک روز اُس کے خاوند نے اُسے کھڑے کھڑے طلاق دے دی۔

یہ حادثہ سید موصوف کے خاندان پر گویا بم بن کر گرا۔ صدمے سے اُن کی بیگم کو فالج ہو گیا۔ ٹانگیں جواب دے گئیں، گویائی سلب ہوگئی اَور وہ اس کیفیت میں لمبے عرصے تک مبتلا رہی۔ کم و بیش دو سال کے علاج کے بعد بیگم سیّد کی صحت کسی حد تک بحال ہوئی۔ اس دوران میں موصوف شدید ترین پریشانی اَور ڈیپریشن میں مبتلا رہے جس کے اثر سے وہ شوگر اَور بلڈ پریشر کے مریض بن گئے اَور غیر معمولی مالی بحران میں مبتلا ہو گئے۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ بڑی بیٹی باپ کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے اَور چھوٹی نے شادی کرانے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ بڑی یونیورسٹی میں ملازم ہے اَور چھوٹی ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل کے ساتھ منسلک ہے اَور عقیل سیّد بڑھاپے کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے اپنے کمزور کندھوں پر مکافاتِ عمل کا بوجھ اُٹھائے ہانپ رہے ہیں اَور حیران ہیں کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟

(۴۹)

محمد یونس ایک کسان ہے اُور اُس کا تعلق چھانگا مانگا کے قریب چک نمبر ۱۱۷ سے ہے۔ چند سال پہلے تک وہ ہمیں روزانہ دودھ مہیّا کرتا تھا۔ ۲۰۰۴-۴-۲۲ کو اُس نے مجھے بتایا کہ تقریباً ۲۵ سال پہلے ہمارے گاؤں میں دو لڑکوں...... حبیب اُور منظور...... نے ایک غریب آدمی کی گونگی بہری لڑکی سے زبردستی ریپ کیا۔ دونوں کی وقت پر شادیاں ہوئیں۔ حبیب کے ہاں چار بیٹے اُور ایک بیٹی ہوئی۔ سب گونگے اُور بہرے تھے۔ منظور کو خدا نے تین بیٹے عطا کئے۔ یہ تینوں بھی ابنارمل تھے۔ اِن کے سر بڑے بڑے تھے جنہیں یہ دائیں بائیں ہلاتے رہتے تھے۔ انہیں دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔

(۵۰)

محمد شکور صاحب میرے عزیز ہیں۔ چک نمبر ۱۰۴ جنوبی سرگودھا سے تعلق ہے۔ انہوں نے بتایا (۲۰۰۴-۴-۱۷) کہ خوشی محمد میرا تایا زاد بھائی تھا۔ ۲۰۰۱ء میں اُس نے کینسر سے وفات پائی۔ سگریٹ بے تحاشا پیتا تھا۔ اُس کے چار بیٹے اُور دو بیٹیاں تھیں۔ سب ذہنی طور پر معذور تھے۔ خوشی محمد خود بتاتا تھا کہ مَیں ضلع جیکب آباد سندھ کی تحصیل ٹھل کے گاؤں میر پور بلٹرا میں زمیندارہ کرتا تھا۔ ایک روز کھیت میں غلے کا ڈھیر لگا ہوا تھا کہ ایک فقیر آیا۔ اُس نے خیرات مانگی۔ مَیں نے کچھ دینے سے انکار کر دیا، لیکن اُس نے اصرار کیا تو مَیں نے اُسے خوب گالیاں دیں اُور ڈنڈے سے اُس کی پٹائی کی...... اِس پر اُس نے بددعا دی کہ خدا تمہارا بیڑہ غرق کر دے اُور تمہیں کبھی سُکھ نہ ملے۔

خوشی محمد نے بتایا کہ اُس کے بعد میری شادی ہوئی اُور سارے بچے معذور پیدا ہوئے اُور فقیر کی بددعا کے عین مطابق مجھے زندگی بھر سکون نہ ملا۔

(۵۱)

ڈاکٹر شیر محمد خاں صاحب (ایم بی بی ایس) کا تعلق لیہ سے ہے۔ بہت نیک، مُخلص اَور خدا ترس انسان ہیں۔ تقریباً ہر سال رمضان المبارک میں منصورہ کی جامع مسجد میں اعتکاف بیٹھتے ہیں اَور یہیں اِن سے ملاقات ہوتی ہے۔ ۳۰-۱۰-۰۵ کو موصوف محترم نے ایک عبرت ناک واقعہ سنایا۔

فرمایا کہ لیہ میں دانتوں کا ایک عطائی ڈاکٹر تھا: ڈاکٹر منظور، عیاش اَور بے عمل آدمی تھا۔ ایک دن وہ ایک شخص کو میرے پاس لایا اَور اُسے باہر بٹھا کر علیحدگی میں مجھے کہنے لگا کہ مَیں اس آدمی کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہوں، آپ میری مدد کریں اَور اسے زہر کا ٹیکا لگا دیں۔

اس پر مَیں نے اُسے ڈانٹا اَور اس ظلم میں حصّہ دار بننے سے انکار کر دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ واقعی موصوف نے اُسے مروا دیا ہے۔ ڈاکٹر شیر محمد خاں صاحب نے بتایا کہ دراصل اس عطائی ڈاکٹر کے مقتول کی بیوی سے تعلقات تھے اَور قتل کی قبیح حرکت اُس نے رقابت کی بنیاد پر کی تھی۔ اس کے بعد اُس نے عورت سے علانیہ تعلق اُستوار کر لیا اَور کچھ عرصے کے بعد جب اس نے کچھ بیگانگی اَور بے نیازی کا مظاہرہ کیا تو ایک روز یہ مٹی کے تیل کی بوتل لے کر اس کے گھر میں گیا اَور اعلان کیا کہ آج مَیں تمہارے سامنے اپنے آپ کو آگ لگا لوں گا اَور ثابت کر دوں گی کہ تمہارے عشق میں مَیں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ دراصل یہ شخص بہت ہی چھچھورے مزاج کا، غیر سنجیدہ آدمی تھا اَور محض ڈرامہ کر رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے کپڑوں پر مٹی کا تیل ڈال لیا اَور ماچس کی تیلی جلا کر کپڑوں کو دکھادی اَور جونہی قمیض کو آگ لگی اُس نے بڑی تیزی کے ساتھ قمیض اُتار کر پھینک دی اَور شلوار اتارنے کی کوشش کی، مگر ازار بند پھنس گیا۔ اتفاق سے تیل کی کافی مقدار نے شلوار کو سامنے سے خاصا گیلا کر دیا تھا، چنانچہ شلوار نہ اُتری، آگ بھڑک اُٹھی اَور اس نے اُس کے جنسی اعضا کو بری طرح سے جلا دیا اَور وہ دو دن تک تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

(۵۲)

محمد شکور صاحب (سن پیدائش ۱۹۴۰ء) قیامِ پاکستان سے قبل ضلع سنام، ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں سوہلر میں رہا کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے والد (چودھری محمد حسن مرحوم) کے حوالے سے یہ واقعہ سنایا کہ ایک برس گندم سے غلہ نکالنے میں تاخیر ہوگئی اَور برسات کا موسم شروع ہوگیا۔ اتفاق سے ایک سِکھ کسان پریتم سنگھ نے اپنا غلہ بروقت نکال کر اپنے مکان میں محفوظ کرلیا۔ اس پر محمد حسن صاحب نے اُسے کہا کہ پریتم سنگھا تم پر تو خدا نے بڑا کرم کیا ہے تم نے غلہ وقت پر نکال لیا ہے، اب دیکھیں ہمارا کیا بنتا ہے۔ اللہ مالک ہے، بارشیں تو شروع ہوگئی ہیں، اس پر پریتم سنگھ بدبخت نے موٹی سی گالی دی کہ خدا نے مجھ پر کوئی کرم نہیں کیا، مَیں نے ڈنڈے کے زور سے غلہ بچایا ہے۔

اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ جس کمرے میں پریتم سنگھ نے غلہ ڈھیر کیا ہوا تھا، اُس کی چھت کی ایک کڑی ٹوٹ گئی، دو دن مسلسل بارش ہوتی رہی اَور چھت کا سارا پانی کمرے میں جاتا رہا، حتیٰ کہ تمام غلہ مکمل طور پر غارت ہوگیا اَور پریتم سنگھ کو اُس وقت خبر ہوئی جب تلافی کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔

(۵۳)

محمد شکور صاحب نے بتایا کہ اُن کے گاؤں (چک نمبر۱۰۴ جنوبی سرگودہا) میں بشیر احمد نامی زمیندار تھا۔ نیم خواندہ سا تھا اَور زمیندارے کے ساتھ ساتھ پتھر کرش کرنے کا کاروبار بھی کرتا تھا، اس لئے خاصا امیر ہوگیا تھا اَور دولت کی ریل پیل نے اُسے شدید قسم کے غرور میں مبتلا کر دیا تھا اَور اذیّت پسندی اُس کے مزاج اَور کردار کا لازمی حصہ بن گئی تھی۔ وہ طنز، تمسخر، تضحیک کے اسلحے سے ہمہ وقت لیس رہتا اَور کسی کو معاف نہ کرتا، نہ کسی بزرگ کو، نہ نوجوان کو، گاؤں کا کوئی فرد اُس کی نشتر زنی سے محفوظ نہ تھا۔ جو بھی اُس کے قریب سے گزرتا، وہ اُسے سان پر چڑھا لیتا کسی کو خاندان کا طعنہ دیتا، کسی کے قد کا مذاق اڑاتا اور کسی کے رنگ اَور حلیے پر طنز کرتا۔ مزید یہ ہوا کہ وہ جوا بھی کھیلنے لگا اَور معمولی باتوں پر لوگوں کے ساتھ مقدمہ بازی کرتا اَور نقصان پہنچانے سے دریغ کرتا ہی نہیں تھا۔

خلقِ خدا کے لیے بشیرِ احمد کی مسلسل ایذا رسانیوں کے نتیجے میں آخرکار خدا کا کوڑا حرکت میں آ گیا، اس کے تین بیٹے تھے۔ بڑا نشے پر لگ گیا اَور صرف ۳۵ سال کی عمر میں وفات پا گیا۔ دوسرے دونوں بیٹے بھی پرلے درجے کے آوارہ اَور نالائق تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسی نے بھی انہیں رشتہ دینا پسند نہ کیا اَور دونوں کی شادی نہ ہوسکی۔

بشیر احمد کی کمائی سے برکت بھی جاتی رہی۔ ''کرش'' کا کاروبار مکمل تباہ ہوگیا اَور اولاد کی نالائقی کی وجہ سے فصلوں کی رونق بھی جاتی رہی۔

مالی نقصانات اَور مسلسل صدمات کا نتیجہ تھا کہ بشیر احمد فالج میں مبتلا ہوگیا اُس کا ایک بازو بیکار ہوگیا اَور زبان بند ہوگئی۔ اب وہ کبھی یہاں، کبھی وہاں بیٹھا رہتا ہے اَور بٹر بٹر فضا میں گھورتا رہتا ہے۔

(۵۴)

چودھری جاوید نے بتایا میرا ہم زلف احمد علی گجرات میں ایک فیکٹری کا مالک تھا، شنیل کے دوپٹے بناتا تھا۔ اُس کا کاروبار چل پڑا تھا اَور وہ خاصا خوشحال تھا۔ فیکٹری کے قریب ہی اُس کا کشادہ، خوبصورت گھر تھا۔

احمد علی گجرات میں بابا کاواں والی سرکار کے مزار پر گیا اَور منّت مانی: بابا مجھے بیٹا عطا کردو، مَیں تیرے مزار پر ننگے پاؤں حاضری دوں گا...... چنانچہ بیٹا تولّد ہوا تو احمد علی نے اپنے گھر سے مزار تک خاصا لمبا سفر ننگے پاؤں اس حال میں طے کیا کہ آگے ڈھول بج رہا تھا، پھر کچھ لوگ جھنڈے اَور نیاز کی دیگیں اُٹھائے ہوئے تھے اَور اُن کے پیچھے چودھری احمد علی ننگے پاؤں ناچتا ہوا چل رہا تھا۔

چودھری جاوید نے بتایا آج احمد علی کا وہ بیٹا ماشاءاللہ جوان ہو چکا ہے اَور پرلے درجے کا آوارہ، بدمعاش بلکہ بدکار ہے۔ سارے عیب اُس میں موجود ہیں اَور وہ والدین کے لیے مصیبت بنا ہوا ہے۔ گویا یہ کاواں والی سرکار کا زندہ معجزہ ہے۔

احمد علی پر اللہ کی مزید ناراضگی یہ طاری ہوئی کہ اُس کا کاروبار مکمل طور پر تباہ ہو چکا ہے، فیکٹری اَور مکان سب بِک گئے ہیں، دو بیٹے ہیں۔ دونوں بیرونِ ملک دھکے کھا رہے ہیں۔ شادی شدہ بیٹی آٹھ سال سے باپ کے گھر میں بیٹھی ہے اَور وہ خود گوجرانوالہ میں چار مرلے کے مکان میں گزر بسر کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

(۵۵)

پروفیسر شیر محمد شاہ صاحب نے اپنے خاندانی حالات کے حوالے سے ایک عبرت ناک واقعہ لکھ کر دیا۔

ہم نے اپنے ایک بیٹے کی شادی اپنے ہی شہر یعنی پاک پتن میں کی۔ اُس کے سسرال والوں نے مجبور کیا کہ وہ ہم سے مکمل علیحدگی اختیار کر لے چنانچہ اُس نادان نے گھر کے درمیان دیوار کھینچ لی اَور ہم سے میل جول ختم کر لیا حتیٰ کہ وہ اپنی بیمار ماں سے بھی ملنا گوارا نہ کرتا۔

اس کا فوری خمیازہ اُسے یہ بھگتنا پڑا کہ اُس کے گھر میں چوری ہوگئی اَور وہ پچیس ہزار کے زیورات سے محروم ہوگیا۔ اب سسرال والوں نے اُس کے مزید کان بھرے کہ یہ چوری تمہارے والدین نے کرائی ہے۔ وہی پڑوس میں رہتے ہیں اَور جانتے ہیں کہ تم لوگ کب گھر پر نہیں ہوتے۔

میرے بیٹے نے اس بہکاوے پر بھی آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا اَور ہم سے ربط ضبط اس حد تک کم کر دیا کہ عید کے ایک موقع پر بھی وہ ہمارے گھر نہ آیا۔ اُس کی بیمار والدہ نے اس روّیے کا گہرا اثر لیا، اُس کی بیماری مزید شدت اختیار کر گئی اَور وہ اسی حالت میں ایک روز دم توڑ گئی۔

اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ میرے اس بیٹے کے سالے نے جو لاہور میں وکالت کرتا تھا اَور اب بھی وہیں مقیم ہے، والدین کی اجازت اَور مشورے کے بغیر لاہور ہی میں شادی کر لی اَور ماں کو اُس وقت پتہ چلا جب اُس کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی اَور اُسے مجبور ہو کر گھر والوں کا تعاون حاصل کرنا پڑا۔ اس پر ماں نے ناراضگی کا اظہار کیا تو اُس کی بیوی نے اُسے پاک پتن جانے اَور والدین سے معمولی تعلق قائم رکھنے سے بھی روک دیا اَور اُس نے زن مرید ہونے کا غیر معمولی مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے والدین کے ہاں آنا جانا بالکل چھوڑ دیا۔

تب تاریخ نے اپنے آپ کو دہرا دیا، مکافاتِ عمل کا الٰہی قانون حرکت میں آ گیا اَور میرے بیٹے کی ساس اپنے بیٹے کے سنگدلانہ روّیے کے نتیجے میں بیمار ہوگئی اور اسی علالت نے اُسے قبر کی آغوش میں پہنچا دیا۔ اہم بات یہ ہے کہ یہی وہ خاتون تھی جس نے اپنے داماد کو مجبور کیا تھا کہ وہ اپنے والدین سے مکمل قطع تعلق کر لے۔

(۵۶)

انگریزی کتب کے مشہور ناشر شیخ محمد اشرف قیامِ پاکستان سے قبل ایک ہندو ناشرِ کتب کے پاس ملازمت کرتے تھے۔ تقسیم کے وقت ہندوستان جانے سے پہلے اس ہندو نے دکان اور کاروبار کا حقِ ملکیت شیخ صاحب کے نام منتقل کر دیا اور باقاعدہ کاغذات پر دستخط کر دیئے، مگر شاید اس خدشے کے تحت کہ کہیں یہ ہندو دوبارہ یہاں نہ آ جائے اور اپنی جائیداد واپس نہ لے لے، انہوں نے اُسے قتل کرا دیا۔

یہ بات مجھے ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کے منیجر چودھری بشیر احمد خاں صاحب نے بتائی تھی اور یہ کسی زمانے میں ہفت روزہ ''چٹان'' میں شائع بھی ہوئی تھی کہ اِس واقعے کو تھوڑے ہی عرصے کے بعد شیخ محمد اشرف کا اکلوتا بیٹا سلیم حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔ یہ چھبیس سال کا شادی شدہ نوجوان تھا۔ اُردو بازار لاہور کے قریب سلیم ماڈل ہائی اسکول اسی کے نام سے موسوم ہے۔

چودھری بشیر احمد خاں صاحب نے بتایا کہ شیخ اشرف صاحب برملا اعتراف کرتے تھے کہ مجھے اکلوتے بیٹے کی موت کے المیے سے اس لئے دوچار ہونا پڑا کہ مَیں نے اپنے سابق ہندو مالک کو ناحق قتل کرایا تھا۔ یقیناً مَیں نے ظلم کیا تھا اور اسی ظلم کی سزا مجھے بھگتنی پڑی۔

چودھری بشیر احمد خاں مرحوم نے یہ عجیب بات بھی بتائی کہ قتل کے فوراً بعد ہندو سیٹھ کی لاش میو ہسپتال کے شعبہ حادثات میں جس بیڈ پر رکھی گئی تھی، عین اُسی بیڈ پر زخموں سے چُور سلیم کو لٹایا گیا تھا اور وہیں اُس نے دم توڑ دیا تھا۔

(۵۷)

مَیں نے بھابی اقبال بانو سے پوچھا، آپ گاؤں میں رہتے ہیں آپ کو تو دودھ خالص بھی ملتا ہوگا اَور سستا بھی۔ کہنے لگیں: نہیں نہ خالص ملتا ہے نہ سستا ملتا ہے۔ مَیں نے تعجب سے کہا: ایسا کیوں ہے؟ آپ دودھ کس سے لیتے ہیں؟

''ہمارا پڑوسی ہے حسن چیمہ۔ ہمارے گھر کے بالکل سامنے ہے گھر اُس کا؟ وہ دودھ میں پانی بھی ملاتا ہے اَور مہنگا بھی دیتا ہے''۔ ''حیرت ہے، وہ پڑوسی ہونے کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔'' مَیں نے کہا۔ ''اُس کی اولاد کیا ہے اَور اُس کے حالات کیسے ہیں'' مَیں نے تجسّس سے پوچھا۔

''اُس کے تین بیٹے ہیں۔ ایک بیٹی ہے'' بھابی اقبال بانو نے بتایا: ''تینوں بیٹے نشہ کرتے ہیں اَور پرلے درجے کے آوارہ اَور نالائق ہیں۔ بیٹی کی شادی ہوئی، مگر ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اُسے طلاق ہوگئی۔ حالانکہ وہ مزاج کے اعتبار سے بہت اچھی لڑکی ہے''۔

تب مَیں نے تبصرہ کیا، کاش اس جاہل کو احساس ہوتا کہ دودھ میں پانی ملانا اور اُسے مہنگے داموں فروخت کرنا ہی اوّل درجے کا گناہ ہے، لیکن اگر اس گناہ کا ارتکاب ایک پڑوسی سے کیا جائے، تو اس کا تناسب کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے اَور اس کا وبال پھر وہی ہوسکتا ہے جس کا تجربہ حسن چیمہ کو اولاد کی صورت میں ہورہا ہے۔

مزید: حسن چیمہ کے ایک نشئی بیٹے نے کچھ عرصہ قبل اپنے سگے تایا کو گولی مار کر قتل کردیا تھا۔

(۵۸)

اُسے پُراسرار مرض لاحق تھا

اکبر علی گزشتہ برس فوت ہوگیا۔ وہ کم از کم دس سال تک کسی پُراسرار بیماری میں مبتلا رہا۔ بظاہر اُسے نہ فالج تھا نہ اُس کے گھٹنوں کے جوڑ متوّرم تھے، نہ جسم میں درد تھے، لیکن وہ چوبیس گھنٹے ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگائے، سر سینے کے ساتھ چپکائے چارپائی پر پڑا رہتا تھا۔ اُٹھنے کی کوشش کرتا تو اُٹھ نہ سکتا، چنانچہ پیشاب یا پاخانے کے لئے صحن میں آتا تو رکوع کی حالت میں کراہتا ہوا، گھسٹ گھسٹ کر چلتا۔ کسی کی سمجھ میں اُس کی بیماری نہ آئی تھی۔ حکیم دیکھتے تو حیران ہوتے کہ اُس کی نبض بالکل متوازن ہے۔ نہ دل میں کوئی تکلیف ہے نہ ذہن میں کسی بیماری کے آثار ہیں۔ ڈاکٹروں نے بھی دیکھا: اُس کا بلڈ پریشر ٹھیک تھا، گردے ٹھیک کام کرتے تھے اُور جگر اُور معدے کا عمل بھی نارمل تھا لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی، اُس کے اعصاب بالکل جواب دے گئے تھے۔ اُٹھنے کو، ہلنے کو اُس کا جی نہ چاہتا۔ کسی بات کا جواب نہ دیتا، مایوسی، آخری حد تک مایوسی، ہمہ وقت اس پر حاوی رہتی۔ امید کی کوئی رمق اُس کے عمل سے ظاہر نہ ہوتی۔ اُس کے سامنے کوئی خدا کا ذکر کرتا تو وہ غصے میں آ جاتا اور اول فول بکنے لگتا۔ لوگوں نے بارہا دیکھا کہ وہ رفع حاجت کے لئے گھر کے عین سامنے کھلی جگہ پر بیٹھ جاتا، اور کوئی توجہ دلاتا تو خدا کو گالیاں دینے لگ جاتا۔ ”یہ سارا خدا کا قصور ہے، وہ نہ مجھے ٹھیک کرتا ہے، نہ موت دیتا ہے“۔

اکبر علی ہمارے گاؤں کا ایک عجیب وغریب کردار تھا۔ پرانے وقتوں میں اُس نے ایک قریبی گاؤں کے پرائمری اسکول سے تین جماعتیں بھی پاس کی ہوئی تھیں۔ اس طرح وہ اردو کتابیں اور اخبار پڑھ لیتا تھا اور اندھوں میں کانا راجہ کے مصداق اُسے گاؤں کے ماحول میں خاصی اہمیت حاصل تھی...... لیکن بدقسمتی سے وہ حُسنِ عمل سے ہمیشہ ہی دور رہا۔ یہ چار بھائی تھے اور چاروں

اکٹھے کاشتکاری کرتے تھے۔ ''تعلیم یافتہ'' ہونے کی وجہ سے باقی بھائیوں نے اسے خاندان کا پردھان بنا رکھا تھا۔

یہ خاندان وسیع پیمانے پر سبزیاں کاشت کرتا تھا اور اکبر علی ہی یہ سبزیاں ریڑھے پر لدھوا کر مختلف قریبی قصبوں کی منڈیوں میں لے جاتا تھا۔ سُنا ہے وہ اس سلسلے میں مالی اعتبار سے عام گھپلے کرتا۔ اس طرح اس نے جو دولت بنائی، وہ ضرورت مند، غریب لوگوں کو بھاری سود پر قرض دیتا رہتا۔ انسان اکلِ حلال سے روگردانی کرتا ہے، تو پھر گرتا ہی چلا جاتا ہے، پھر وہ سارے اخلاقی ضابطوں، اصولوں سے پیچھا چھڑا لیتا ہے۔

اکبر علی کا ایک ہی بیٹا تھا، تین بیٹیاں تھیں۔ اُس کی بیوی بہت اچھی عورت تھی۔ خوش اخلاق، خوبصورت اور نیک اطوار، سیرت و کردار کے حوالے سے گاؤں کی جن خواتین کو یاد کر کے خوشی ہوتی ہے اُن میں اکبر علی کی بیوی فاطمہ بھی ہے۔

اکبر علی کا بیٹا جاوید میٹرک کر کے ریلوے میں ملازم ہو گیا اور راولپنڈی میں اس کا تقرر ہوا۔ اکبر علی نے اس کی شادی بڑی دھوم سے کی۔ اُس کی بہو خوبصورت، الہڑ اور آزاد خیال تھی۔ اُس کا باپ بھی خاصا لبرل اور ماڈرن تھا۔ چونگیوں کے محکمے میں کلرک تھا اَور سنا ہے کہ اسے بھی حرام حلال کی کوئی تمیز نہ تھی۔ اُس کی چھ بیٹیاں تھیں، صرف ایک ہی بیٹا تھا جو نوعمری میں فوت ہو گیا تھا۔ اُس کی ایک بیٹی پولیس میں ملازم تھی۔

اس خاندان کی بدنصیبی کا آغاز یوں ہوا کہ جاوید راولپنڈی میں مقیم ہونے کی وجہ سے تین تین چار چار ہفتوں کے بعد گھر آیا کرتا تھا۔ اُس کی بیوی جوان تھی اَور باپ ناجائز دولت اور سود خوری کی وجہ سے ساری اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو چکا تھا، چنانچہ پھر یوں ہوا کہ اکبر علی کی بہت صحت مند بیوی ایک روز مختصر علالت کے بعد وفات پا گئی۔ دیکھنے میں آیا ہے اور متعدد شواہد میرے سامنے موجود ہیں کہ جوان، نیک نہاد بیویاں بلاوجہ نہیں مرا کرتیں، اس میں خاوندوں کا ''خاص'' روّیہ فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔

اور پھر جاوید کو بھی گھر کی صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا۔ لگتا ہے اس نے کسی طرح سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا، چنانچہ اس نے بھاگ دوڑ کر کے سعودی عرب کا ویزہ حاصل کیا اور جدہ منتقل ہو گیا اور گزشتہ پندرہ سال سے وہ وہیں مقیم ہے۔ اس دوران میں وہ بمشکل دو بار پاکستان آیا ہے، وہ بھی چار چار پانچ پانچ دن کے لئے۔ گاؤں کے سادہ دل لوگ حیران ہیں کہ جاوید کی پانچ بیٹیاں ہیں، دو بڑی بیٹیاں جوان ہیں، شادی کے لائق ہیں۔ اس کے مالی حالات بھی اچھے ہیں۔ اس نے خاصی دولت جمع کر لی ہے اور وہ باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ کیوں واپس نہیں آ جاتا اور اپنے معذور باپ کی خدمت کیوں نہیں کرتا...... لیکن واپس آنا تو کجا، اس نے تو جدہ جا کر اپنی بیوی کو طلاق بھجوا دی تھی۔ مجھے پتہ چلا تو چونکہ مَیں اُس وقت تک مختلف معاملات سے شناسا نہیں ہوا تھا، اس لئے مجھے جاوید کی بیوی اور خصوصاً بیٹیوں پر بڑا ہی ترس آیا۔ جاوید نے پہلی طلاق بھجوائی تھی، اس لئے ابھی مصالحت کی گنجائش موجود تھی، چنانچہ مَیں نے اُسے دو طویل خط لکھے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے طلاق واپس لے لی اور اس خاندان پر تباہی کا جو خطرہ وارد ہو رہا تھا، وہ ٹل گیا۔

لیکن بشمول میرے سارے لوگ ہی سخت حیران ہیں۔ آخر کیا سبب ہے، اکبر علی کو کیا ہو گیا تھا۔ بغیر کسی ظاہری بیماری کے وہ چارپائی کا اسیر کیوں ہو گیا تھا؟ جاوید نے بیوی کو طلاق نامہ کیوں بھجوایا تھا؟ اور غضب یہ کہ باپ پچھلے سال مر گیا لیکن جاوید پھر بھی پاکستان نہیں آیا؟ یہ سب اکبر علی کے گھناؤنے کردار کا نتیجہ تھا۔ پتہ چلا کہ اس کے مرنے پر اس کا چہرہ نہیں دکھایا گیا تھا، نہ جانے کیوں؟

(۵۹)

میاں شریف جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ میں میرا بی اے کا کلاس فیلو تھا۔ بہت غیر سنجیدہ اُور لاابالی طبیعت کا مالک تھا۔ شروع ہی سے ظلم اُس کی طبیعت میں راسخ تھا۔ اندازہ کیجیے کہ اُس نے ایک غریب کلاس فیلو کا قیمتی قلم چھین لیا اُور واپس نہ کیا، لیکن پھر ایک وقت آیا کہ وہ سیالکوٹ کا بہت بڑا صنعت کار بن گیا اُور پیپلز پارٹی نے اُسے ۱۹۸۸ء میں ایم این اے کا ٹکٹ بھی دے دیا جس پر وہ کامیاب بھی ہو گیا......لیکن اُس کی شخصیت کا سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غیر معمولی تکبّر میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ منہ در منہ بھی لوگوں کی تحقیر کرتا اُور پیٹھ پیچھے بھی سب کا ذکر حقارت سے کرتا......عیاشی اُور بے عملی کا اسلوب اس کے علاوہ تھا۔

ڈائری کا ایک ورق

۶ رفروری ۲۰۰۸ء

آج سیالکوٹ سے میرے اُور میاں شریف کے مشترکہ کلاس فیلو قاری عبدالرحمٰن صاحب نے فون کیا۔ فرمایا کہ میاں شریف کے لیے دعا کریں۔ وہ آج کل امریکہ میں زیرِ علاج ہے اور کتنی ہی بیماریوں میں مبتلا ہے: دو مرتبہ اُس کا بائی پاس آپریشن ہو چکا ہے۔ اُس کے دونوں گردے بیکار ہو گئے ہیں اُور جگر کی ٹرانس پلانٹیشن بھی ہوئی ہے۔ خواجہ راشد نے فون پر اُس سے بات کی تھی۔ گفتگو کے دوران میاں شریف مسلسل روتا رہا وہ انتہائی بے بسی اُور کسمپرسی کی حالت میں زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

قاری صاحب نے بتایا کہ میاں کا ایک ہی بیٹا اُور ایک ہی بیٹی ہے۔ اُس کا کاروبار مکمل تباہ ہو چکا ہے کہ وہ تمام تر بنکوں کے سودی قرضوں پر اُستوار تھا، اُس کے ہمہ پہلو زوال کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ جا کر بیماری سے پہلے وہ ٹیکسی تک چلاتا رہا ہے۔

(۶۰)

مورخہ ۰۸-۶-۵ کو ماہنامہ ''خواتین میگزین'' کے دفتر میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی: نام ہے سلطان فریدی، شاعر بھی ہیں ان کا ایک نعتیہ مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ ضلع صوابی کے ایک مقام ذروبی میں پاسبان ماڈل اسکول کے نام سے تعلیمی ادارہ چلا رہے ہیں۔

سلطان فریدی صاحب نے بتایا کہ اُن کا ایک بیٹا پاکستان نیوی میں ملازم ہے۔ اُس کی روایت ہے کہ سابق نیول چیف کی بیگم نے اپنے ایک نوجوان باورچی کے منہ میں جلتا ہوا چمٹا ڈال دیا تھا جس کے اثر سے بے چارے کی زبان اَور ہونٹ بری طرح زخمی ہو گئے۔

اس واقع کے جلد بعد ہی نیول چیف کی بیگم پُراسرار طور پر حواس کھو بیٹھی، اُس کی ساری حسیں معطّل ہو گئیں اَور وہ بہت لمبے عرصے تک بے حس وحرکت ہسپتال میں پڑی رہی (اورتا حال اسی کیفیت میں مبتلا ہے) حتیٰ کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔

میرے دوست امتیاز انور صاحب نے جو نیوی میں افسر ہیں، اس واقعے کی تصدیق کی۔ اُنھوں نے بتایا کہ باورچی ایک نوعمر لڑکا تھا جب اس کی زبان اَور ہونٹ جل گئے اَور وہ بولنے اَور کھانے تک سے معذور ہو گیا تو اُس کی ماں نے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر بیگم چیف کو بددعا دی تھی اَور یہ بددعا بڑے عبرت ناک انداز میں قبول ہوئی۔

(۶۱)

وہ بہت اچھا ادیب تھا، بہت اچھا افسانہ نگار تھا خوش اخلاق انسان تھا اَور خوبصورت شخصیت کا حامل تھا۔ وہ ایک بڑے اخبار کے پبلشنگ ونگ کا ڈائریکٹر تھا اَور میرا اُس سے اُس زمانے سے تعارف تھا جب وہ ایک ہفت روزے میں ملازم تھا اَور مَیں بھی اسی ہفت روزے میں لکھتا رہتا تھا۔

میری معروف ومقبول کتاب ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' کا چھٹا ایڈیشن اُردو بازار کے ایک ادارے نے شائع کیا تھا۔ ایک روز ایک معروف صحافی نے مشورہ دیا کہ مَیں یہ کتاب ''فلاں بڑے اخبار'' کے اشاعتی ادارے سے چھپواؤں۔ وہ کتاب خوبصورت گٹ اپ کے ساتھ چھاپتے ہیں، وہاں ایک ایک ایڈیشن پانچ پانچ ہزار کا چھپتا ہے اَور وہ رائیلٹی بہت اچھی دیتے ہیں۔ چنانچہ مَیں موصوف یعنی حسن علی (اصل نام نہیں ہے) سے مِلا۔ وہ بہت تپاک سے ملے، اُنہوں نے کتاب چھاپنے پر آمادگی ظاہر کردی تحریری معاہدہ طے پا گیا جس کے مطابق وہ دو ہزار کی تعداد میں کتاب چھاپیں گے اَور ساڑھے بارہ فیصد رائیلٹی ادا کریں گے۔

لیکن کم وبیش ایک سال کے بعد کتاب شائع ہوئی تو اس پر تعداد پانچ سو لکھی ہوئی تھی۔ مَیں نے پوچھا تو جواب دیا کہ دراصل ہماری مطبوعات کی تعداد بہت زیادہ ہے اَور گودام کی سہولت کم ہے، اس لئے پانچ پانچ سو کی تعداد ہی میں کتاب شائع ہوگی اَور جونہی یہ تعداد ختم ہوگی، ہم فوراً ایک ہفتے کے اندر اندر مزید پانچ سو چھاپ لیں گے۔ پریس ہمارا اپنا ہے، وسائل لامحدود ہیں، اس لئے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔

لیکن تعجب اَور تشویش اس حوالے سے ہوئی کہ کتاب کا یہ پہلا ایڈیشن جو صرف پانچ سو کی تعداد میں تھا، کہیں ایک سال میں جا کر ختم ہوا حالانکہ جس اخبار کے ساتھ یہ ادارہ منسلک تھا وہ مختلف مقامات

سے دس لاکھ کی تعداد میں چھپتا تھا اَور وقتاً فوقتاً اس میں کتاب کا تفصیلی اشتہار بھی چھپتا رہتا تھا اَور جب کہ کتاب کا موضوع بے حد دلچسپ اَور غیر معمولی افادیت کا حامل تھا، اس حوالے سے پانچ سو کی تعداد تو ایک مہینے میں ختم ہو سکتی تھی، لیکن حسن علی صاحب کا اصرار تھا کہ کتاب کی نکاسی ہو نہیں رہی حالانکہ اُردو بازار میں بغیر کسی اشتہار کے اس کتاب کا ایک ہزار کا ایڈیشن سال ڈیڑھ سال میں نکل جاتا تھا۔

بہ ہر حال جب یہ صورتِ حال سامنے آئی اَور ایک سال کے بعد علی حسن صاحب نے کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی پانچ سو کی تعداد میں شائع کیا اَور وہ بھی مزید ایک سال تک لٹکا رہا، تو میں نے معاہدہ ختم کر دیا اَور آئندہ انہیں کتاب شائع کرنے سے روک دیا۔ اس دوران میں میرے پہلے پبلشر نے اصرار کیا کہ "فلاں ادارے" سے کتاب شائع کرانے کا شوق آپ نے پورا کر لیا ہے، اس لئے کتاب مجھے واپس کر دیں اَور یہیں سے شائع ہونے دیں۔ چنانچہ کتاب دوبارہ اُردو بازار سے شائع ہونے لگی اَور اب تک الحمدللہ تعالیٰ اس کے سترہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اس سارے واقع میں حسن علی صاحب کے کردار اَور روّیے نے مجھے چکرا کے رکھ دیا اَور انہوں نے جھوٹ اَور فریب دہی کی مجھ سے عجیب واردات کر ڈالی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ ایک شخص سے اتنا پرانا تعارف ہے، وہ ادیب ہے، افسانہ نگار ہے، دانشور ہے، اپنی گفتگوؤں اَور تحریروں میں معاشرے کے تضادات پر کڑھتا رہتا ہے، پھر وہ عملی طور پر خود اِن تضادات میں مبتلا ہے اَور بددیانتی اور بے اصولی اَور ظلم و استحصال کا وہی انداز دوسروں سے اختیار کرتا ہے، جس پر وہ عموماً تنقید کرتا رہتا ہے۔

یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ موصوف ادارے کی وسعت اَور مالکان کی بے نیازی سے فائدہ اٹھا کر غیر معمولی ہیر پھیر اَور مالی کرپشن سے کام لیتے ہیں اَور مصنفین کو بھاری نقصان پہنچا کر اپنی جیب گرم کرتے ہیں۔

اس تلخ تجربے کے بعد مَیں نے حسن علی صاحب سے رابطہ توڑ لیا اَور آئندہ کئی سال تک اُن سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

اکتوبر ۲۰۰۷ء کی بات ہے اخبار میں پڑھا کہ حسن علی صاحب شدید بیمار ہو گئے ہیں اَور شیخ زید ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ تب مَیں نے اُن کے گھر فون کیا تو اُن کی بیٹی نے بتایا کہ گزشتہ اگست میں موصوف کو دل کا شدید عارضہ لاحق ہوا تھا جس کے اثر سے اُن کے دونوں گردے بیکار ہو گئے ہیں اَور شیخ زید ہسپتال میں اُن کا ہفتے میں دو بار ڈائیلیسز ہوتا ہے۔

حسن علی کے ادارے میں کام کرنے والے ایک دوست نے بتایا کہ موصوف خوب کھایا کرتے تھے: کڑاہی گوشت، چرغے اَور بریانی اُن کے پسندیدہ کھانے تھے۔ وہ کسی پرہیز کے قائل نہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں شوگر ہو گئی لیکن اب ایسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں جہاں سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ گردے تباہ ہو گئے ہیں، دل کی تکلیف ہے، بلڈ پریشر ہے اَور نقاہت بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ ہفتے میں دو بار ڈائیلسز کا خرچ پانچ ہزار ہے، اس طرح کم از کم اب تک تین لاکھ روپے خرچ کر چکے ہیں اَور صحت یابی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔

بلاشبہ بددیانتی، بدعنوانی اَور ناجائز خوری دنیا میں بھی اپنا اثر دکھا کے رہتی ہے اَور حسن علی اس کی زندہ، جیتی جاگتی مثال ہے۔

(۶۲)

شیر علی بٹ سے میرا تعارف گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں ہوا۔ وہاں ان کے سسر خواجہ محمد حسین لائبریرین تھے اُور انگلش کے ایڈہاک لیکچرار کی حیثیت سے اِن کی تقرری اسی کالج میں ہوئی تھی۔

کم گو اُور باریش شیر علی بٹ سے تعارف کر کے بہت خوشی ہوئی، مگر وہ بمشکل ایک سال وہاں ٹھہرے اُور ۱۹۷۸ء میں یہ ملازمت چھوڑ کر لاہور چلے گئے اُور ایک معروف ماہنامے میں ملازم ہو گئے۔ وہ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ بہت اچھا کرتے تھے اُور اس رسالے کو باصلاحیت مترجمین کی بڑی ضرورت رہتی تھی۔

پھر بٹ صاحب ایک کثیر الاشاعت ہفت روزے کے مدیر بن گئے اُور وہاں سے چھلانگ لگا کر انہوں نے پاکستان کے دوسرے بڑے اخبار کے ڈپٹی ایڈیٹر کا منصب حاصل کر لیا اُور زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ وہ پاکستان کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار میں اسی منصب پر براجمان ہو گئے...... وہ لکھاری بھی اچھے تھے، بات کرنے کا اُور مخاطب کو شیشے میں اُتارنے کا ڈھنگ جانتے تھے، اس لئے اپنے ہدف کو حاصل کر ہی لیتے تھے۔

پاکستان کے سب سے بڑے اخبار کا ڈپٹی ایڈیٹر بن کر شیر علی بٹ نے غیر معمولی کامیابیاں حاصل کیں۔ ایک روایتی اخبار نویس کی حیثیت سے وہ پیسہ بنانے کا فن جانتے تھے۔ چنانچہ پتہ چلا کہ ۱۹۸۵ء کے غیر جماعتی انتخابات میں انہوں نے ایک سیاسی رہنما کے حق میں دو صفحے کا فیچر شائع کیا اُور اس سے دو لاکھ روپے حاصل کئے، اس طرح اس زمانے میں موصوف پر دولت کی دیوی خاص مہربان ہو گئی تھی اُور انہوں نے وحدت روڈ پر ایک معروف بستی میں ڈیڑھ کنال کی شاندار

کوٹھی بنالی تھی جہاں دو شاندار کاریں ہر وقت کھڑی رہتی تھیں۔

مالی مفادات اور زر اندوزی کے محاذ پر شیر علی بٹ جس قدر آگے بڑھتے گئے، دینی اور اخلاقی اعتبار سے وہ اُسی قدر پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ پہلے اُنہوں نے داڑھی رکھی ہوئی تھی، اخباری دنیا میں آ کر اُنہوں نے اس نعمت سے چھٹکارا حاصل کر لیا، پھر وہ کسی صحافی خاتون کے چکر میں بھی پڑے رہے اور اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا حالانکہ اُن کی بیوی اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھی اور شیر علی بٹ کے سسر اُن پر بہت خرچ کیا کرتے تھے...... اخلاقی حوالے سے عرض کروں کہ مَیں اُن دنوں دیال سنگھ کالج میں تھا جب موصوف ایک دن میرے پاس تشریف لائے۔ مَیں اُن کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ سڑک کے کنارے گزرتی ہوئی لڑکیوں پر آوازے کستے جا رہے تھے۔ مَیں بہت خوفزدہ ہوا اور انہیں اس حرکت سے روکنے کی کوشش کرتا رہا کہ میں بہ ہر حال ایک اُستاد تھا اور اُن کی اس حرکت سے کسی بدنامی میں مبتلا ہو سکتا تھا، لیکن میری نصیحت اور فریاد کا اُن پر کوئی بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

جن دنوں بٹ صاحب پاکستان کے سب سے بڑے اخبار کے ڈپٹی ایڈیٹر تھے اور وحدت روڈ پر ایک جدید بستی میں مقیم تھے، اُن کے انداز و اطوار بڑے شاہانہ تھے اور اُن سے ملاقات کے لیے پاکستان کے درجۂ اول کے سیاسی رہنما اکثر آتے رہتے تھے اور جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، دو قیمتی گاڑیاں اُن کے جلو میں کھڑی رہتی تھیں۔ چنانچہ شیر علی صاحب تکبّر اور خود پسندی میں مبتلا ہو گئے اور معاملہ جب حد سے بڑھ گیا تو مکافاتِ عمل کا کوڑا حرکت میں آ گیا۔ ہوا یوں کہ امریکہ میں اخبار نویسوں کی کوئی بین الاقوامی کانفرنس تھی۔ پاکستان کی نمائندگی شیر علی صاحب فرما رہے تھے۔ وہاں اُنہوں نے ہوٹل میں کسی لڑکی سے چھیڑ خانی کی، اُس نے شکایت کر دی اور یہ گرفتار کر لئے گئے، دنیا بھر میں پاکستان کی بھی بدنامی ہوئی اور ان کے اخبار کی بھی...... نتیجہ یہ کہ مالکان نے پاکستان ہی سے اُن کی برطرفی کے احکام جاری کر دیئے اور یہ بصد رسوائی جب پاکستان واپس آئے تو ان کی صحافتی اور اخلاقی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔

اب شیر علی بٹ زوال کی طرف بڑھتے ہی چلے گئے۔ چونکہ انہوں نے مکان بنانے کے لیے بنک سے بھاری قرضہ اس امید پر لیا تھا کہ جیسے بے شمار لوگ معاف کرا لیتے ہیں، یہ بھی اس رعایت کے مستحق ہو جائیں گے، لیکن حالات بدلنے سے ایسا نہ ہوا، انہیں وہ مکان جو کم از کم ایک کروڑ کی مالیت کا تھا، چھتیس لاکھ میں فروخت کرنا پڑا۔ گاڑیاں بھی بک گئیں اور موصوف ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح حالات کی لہروں پر ڈولتے رہے۔

شیر علی بٹ کے تین بیٹے تھے۔ اُن میں سے بڑا ذہنی طور پر خاصا پس ماندہ ہے۔ اس کی انہوں نے ایک امیر خاندان میں شادی کی، مگر چند ہی ماہ کے بعد اُن کی بہو نے طلاق کا مطالبہ کر دیا اور انہیں یہ مطالبہ ماننا پڑا...... اور پھر کسی دوسرے بیٹے کی شادی کرنے کی انہیں جرأت نہ ہوئی۔

مکان فروخت کرنے کے بعد بٹ صاحب مسلم ٹاؤن میں ایک فلیٹ کرائے پر لے کر رہنے لگے لیکن یہ فلیٹ انہیں ذرا بھی راس نہیں آیا۔ وہاں منتقل ہونے کے جلد بعد اِن کے گھر میں ڈاکا پڑا اور سب کچھ لٹ گیا...... اس حادثے کے بعد پھر ایسا ہی واقعہ ہوا تو میں نے فون کر کے اظہارِ افسوس کیا۔ کہنے لگے: میرے ہاں تو چوریاں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ یہ آٹھویں چوری ہے۔ تین گاڑیاں بھی چوری ہو چکی ہیں...... اور ایسا شاید اس لئے بھی ہوتا تھا کہ موصوف اپنی تحریروں میں رسوائے زمانہ فوجی آمر پرویز مشرف کی علانیہ حمایت کرتے رہتے تھے اور آج کل دنیا بھر کی سیاسی تاریخ کے کرپٹ ترین حکمران کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے۔

(۶۳)

احمد نذیر میرے دُور کے رشتے دار ہیں۔ اُنہوں نے میٹرک کے بعد ڈسپنسر کا کورس کیا اَور ضلع سیالکوٹ کے ایک دور افتادہ، پس ماندہ قصبے میں ڈاکٹر احمد نذیر کے نام سے پریکٹس شروع کردی۔ آدمی تیز طرار تھے، باتوں کے دھنی تھے اَور علاقے میں ان پڑھ کسانوں اَور غریب لوگوں کی اکثریت تھی، اس لئے اُن کی پریکٹس خوب چلی اَور اُنہوں نے ایک شاندار، وسیع مکان کے علاوہ بھی خاصی جائیداد بنالی۔

لیکن مکان، دولت اَور ظاہری عزت کے باوجود ڈاکٹر احمد نذیر کی ذہنی سطح کبھی بھی بلند نہ ہوسکی۔ وہ اگرچہ رسمی نوعیت کی پنج وقتہ نمازوں کے عادی تھے، لیکن عمومی طور پر وہ رسم پرستی، پیر پرستی اَور قبر پرستی کے حصار سے کبھی بھی باہر نہ نکل سکے...... چنانچہ نہایت اہتمام کے ساتھ وہ جمعرات اَور گیارھویں کا ختم دلاتے، بڑی پابندی کے ساتھ وہ سیالکوٹ میں حضرت امام صاحب، لاہور میں داتا صاحب، جھنگ میں سلطان باہو، اسلام آباد میں امام بری اَور پاک پتن میں بابا فرید الدین گنج شکر کے مزارات پر حاضری دیا کرتے خصوصاً اِن مقامات پر جب بھی عرس کی تقریبات ہوتیں تو وہ ساری مصروفیات ترک کرکے بچوں سمیت وہاں حاضر ہوتے۔ قرب وجوار کی دیگر درگاہوں پر بھی وہ نذر نیاز چڑھانے میں کبھی کوتاہی نہ کرتے۔

لیکن یہ سارے پاپڑ بیلنے اور طرح طرح کی خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ ہی مسائل اور امراض کی یلغار میں گھرے رہتے۔ ابھی اُن کی عمر چالیس سال سے بھی کم تھی جب اُن کی جوان بیوی پانچ ننھے بچوں کو یتیم چھوڑ کر موت کی آغوش میں پہنچ گئی۔ تین بیٹیاں تھیں، دو بیٹے تھے، اُنہوں نے دوسری شادی کی، لیکن اُن کی یہ بیوی عنفوانِ شباب میں ہونے کے باوجود

اُن کے گھر میں آتے ہی بیمار ہوگئی اَور آج تک بیمار ہے۔ اُسے دمے کا مرض لاحق ہے اَور کھانسی اَور نزلے زکام میں ہمیشہ مبتلا رہتی ہے اَور ان امراض کی وجہ سے وہ شدید نقاہت سے دوچار ہے۔ بات کرتے ہوئے وہ کھانستی ہی رہتی ہے اَور اکثر بخار میں مبتلا نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر احمد نذیر نے بڑے بیٹے کی شادی کی۔ اللہ نے اسے دو بچے عطا کئے، لیکن بدقسمتی دیکھئے کہ وہ بھی عین جوانی میں یعنی صرف پچیس سال کی عمر میں ایک روز یکا یک موت کے گھاٹ اُتر گیا۔ افسوس کسی بھی بزرگ یا ولی سے ڈاکٹر احمد نذیر کی گہری ارادت کام نہ آئی۔

ڈاکٹر احمد نذیر خود بھی کئی طرح کے امراض میں مبتلا ہے۔ موٹاپے نے اُس کی زندگی اجیرن کردی ہے۔ اُس کے گھٹنے بیکار ہوگئے ہیں۔ سوجن بھی ہے اَور درد بھی ہے، معدے کا عمل بھی درست نہیں، گیس اَور جلن کا عارضہ اُسے مستقل پریشان رکھتا ہے......اس طرح موصوف کی ساری زندگی سراپا الم بن کے رہ گئی ہے۔

مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر احمد نذیر پر یہ سارا وبال اُس کی قبر پرستی اَور پیر پرستی کا پڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس سے شدید ناراض ہے اَور یوں لگتا ہے کہ رحمت کے فرشتے اُس کے گھر سے کنارہ کش ہوگئے ہیں۔

(۶۴)

کھاریاں کے میاں عابد محمود صاحب نے اپنے علاقے کے حوالے سے ایک عبرت ناک واقعہ سنایا۔

اُنہوں نے بتایا ۱۹۹۲-۹۳ کی بات ہے۔ چک رجادی کے نوجوان زمیندار اکرم خاں نے پورے علاقے میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ وہ ایک سکہ بند بدمعاش تھی۔ کسی کی عزت نہ اُس کے ہاتھوں محفوظ تھی نہ مال اُس کی دستبرد سے بچا ہوا تھا۔ جس گھر میں چاہتا دندناتا ہوا داخل ہو جاتا اَور کوئی اُس کے سامنے مزاحمت کی جرأت نہ کرتا۔ پورے علاقے میں اُس کی دہشت تھی اَور ہر شخص اس سے خوفزدہ تھا۔

اَور پھر ایک روز اللہ کی لاٹھی حرکت میں آ گئی۔ اکرم خان کھاریاں کچہری آیا ہوا تھا اَور جنرل بس سٹینڈ کے قریب سلطان باہو سویٹ ہاؤس سے مٹھائی لے رہا تھا، جب کسی نے پیچھے سے اُسے گولی ماردی جو اُس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہوگئی۔ وہ گر پڑا اَور پھر پاؤں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ اُس کا نیچے کا دھڑ ہمیشہ کے لئے بیکار ہوگیا۔ چنانچہ کم از کم سولہ برس بیت چکے ہیں، وہ کسی بھی علاج سے ٹھیک نہیں ہوا۔ نہ وہ کھڑا ہوسکتا ہے، نہ چل سکتا ہے۔ گھر میں ہو تو ہمہ وقت لیٹا رہتا ہے یا پھر کوئی ملازم اُسے وہیل چیئر پر بٹھا کر بمشکل سیر کرا دیتا ہے۔ نقل وحرکت ختم ہونے سے وہ اَور بھی کئی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔ موٹاپا، جوڑوں کا درد اَور بے خوابی۔ زندگی اس کے لیے عذاب بن گئی ہے اَور یہ نتیجہ ہے اُس کے غرور کا، ظلم کا، بدعملیوں کا اَور بے شمار لوگوں کی بددعاؤں کا۔

باب: ۱۱

بے حیائی اور فحاشی پھیلانے والوں کا انجام

قرآنِ پاک کی سورۂ نور کی آیت نمبر۱۹ ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحِبُّوۡنَ اَنۡ تَشِیۡعَ الۡفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ فِی الدُّنۡیَا وَ الۡاٰخِرَۃِ ط وَ اللّٰہُ یَعۡلَمُ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ط اس کا ترجمہ یوں ہے: جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں بے حیائی یعنی فحاشی پھیلے، وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اس آیت کی تفسیر میں اگرچہ مختلف مفسرین نے یہ لکھا ہے کہ اسلامی معاشرے میں فحاشی پھیلانے والے مجرم ہیں اور انہیں دنیا میں بھی سزا ملنی چاہیے اور ایک اسلامی حکومت کو اِن کا محاسبہ کرنا چاہیے، لیکن غور کریں اور کھلی آنکھوں سے بغور مشاہدہ کریں تو فحاشی و عریانی کا ارتکاب کرنے والے اور اس کو پھیلانے والے لازماً دنیا میں بھی ''مکافاتِ عمل'' کی زد میں آتے ہیں۔ اس ضمن میں میرے سامنے بہت سے واقعات ہیں جو قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مثال کے طور پر سینما مالکان کی زندگیوں میں سکون نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ یہ لوگ خاندانی حوالے سے طرح طرح کے مسائل اور امراض میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کی اولادیں آوارہ اور نالائق ہوتی ہیں اور پورے خاندان میں لڑائی جھگڑے اور باہمی بغض و عداوت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ایسے سینما مالکان جو رفاہی کاموں میں حصہ لیتے ہیں اور خلقِ خدا کے لئے نفع بخش بننے کی کوشش کرتے ہیں، وہ بھی کسی نہ کسی حوالے سے اس کے وبال سے محفوظ نہیں رہتے۔

میرے سامنے ''نوائے وقت'' مورخہ ۰۸-۱۱-۲۴ کا ایک تراشہ پڑا ہے۔ یہ حافظ آباد کے ایک شخص رائے محمد شفیع کا ایک مراسلہ ہے۔ اس میں موصوف نے اپنے مسائل اور پریشانیوں کا

رونا رویا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ مَیں تحریکِ پاکستان کا ایوارڈ یافتہ کارکن ہوں اُور ۱۹۴۸ء میں جہادِ کشمیر میں حصّہ لے چکا ہوں۔ گورنمنٹ گرلز کالج گوجرانوالہ کے ہوسٹل کی تعمیر میں میرا حصّہ سب سے زیادہ تھا۔ مَیں نے حافظ آباد میں ایجوکیشن ایڈ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے گرلز ہائی اسکولوں کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا اُور گرلز کالج بھی بنوایا۔ مَیں نے حافظ آباد میں معذور لوگوں کی عید ملن پارٹی کا آغاز کیا، لیکن میرے ساتھ سخت ظلم ہوا ہے۔ میرے بھتیجوں نے میری زرعی زمین پر، مکان اُور پلاٹوں پر، ویگن سٹینڈ اُور میرج ہال پر قبضہ کرلیا ہے، مجھے بزور حافظ آباد سے نکال دیا ہے اُور اب مَیں گلبرگ لاہور میں بے بسی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ براہ کرم میری مدد کی جائے اُور میری جائیداد واگزار کرائی جائے۔

مکتوب نگار نے مزید لکھا ہے ''میری بیگم لندن یونیورسٹی سے مسلم فیملی لا میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اُور ڈیڑھ سال سے بیمار اُور صاحبِ فراش ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے، وہ بھی عرصہ سے بیمار رہتا ہے''۔

اس مکتوب کے آخر میں رائے محمد شفیع کا موبائل نمبر بھی لکھا تھا۔ مَیں نے فون کیا اُور معلوم کیا کہ اُن کے بیٹے کو کیا تکلیف ہے تو انہوں نے بتایا کہ وہ کسی ذہنی مرض میں مبتلا ہے۔ دو بار اُس کی شادی کی ہے، مگر دونوں بار ناکام رہی ہے۔ اُس کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ گویا موصوف کی نسل چلنے کا کوئی امکان نہیں رہا۔

قارئین گرامی، مَیں یہ خط پڑھ کر جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ مکتوب نگار نے حافظ آباد میں قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ایک سینما تعمیر کرلیا تھا اُور اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں فحاشی اُور بے حیائی کی کھلم کھلا اشاعت شروع کردی تھی۔ بس اِسی گناہ کا وبال ہے جو اِسے لے بیٹھا ہے، بیوی ڈیڑھ سال سے معذوری کی زندگی گزار رہی ہے، بیٹا ذہنی مریض اُور لاولد ہے اُور ساری جائیداد پر اپنوں نے قبضہ کرکے اُسے شہر بدر کردیا ہے۔ یہ دنیا کے ''عذابِ الیم'' کا ایک ہلکا سا نقشہ ہے جو فحش کی اشاعت کے صلے میں سامنے آیا ہے اُور جس کی وعید آیتِ بالا میں دی گئی ہے۔

(۲)

حافظ آباد کے رائے محمد شفیع کے حالات سے تجسس پیدا ہوا کہ دیگر سینما مالکان کے بارے میں بھی معلوم کرنا چاہیے کہ فحاشی و بے حیائی کی اشاعت نے اُن پر کیا اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس ضمن میں مَیں نے اپنے عزیز دوست اَور ضلع شیخوپورہ کے سابق امیر جماعت اسلامی چودھری محمد الیاس صاحب سے بات کی اَور اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے مرید کے سے تعلق رکھنے والے سینما مالکان کے حالات سے آگاہ فرمائیں۔ چودھری محمد الیاس صاحب کا آبائی تعلق مرید کے سے ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے مجھے جی ٹی روڈ پر واقع مرید کے میں ''نشاط سینما'' کے مالکان کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کیں جو قرآنِ پاک کی محولہ بالا آیت کے عین مطابق دنیا ہی میں اللہ کے عذاب میں مبتلا ہو کر عبرت کا نشان بن گئے۔ یہ معلومات اخذ کرنے میں چودھری الیاس صاحب کے ساتھ ملک سرفراز حسین صاحب اَور عباس علی عابد صاحب نے معاونت کی۔ مَیں اس حوالے سے تینوں حضرات کا تہِ دل سے ممنون ہوں اَور دعا گو بھی۔

نشاط سینما مرید کے ۱۹۶۵ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے مالکان دو بھائی تاج دین اَور دین محمد (طور راجپوت) تھے۔ وہ اس علاقے کے بڑے زمیندار تھے اَور مختلف دیہات میں اُن کی چار مربعے زرعی زمین تھی۔ محمود بوٹی بند روڈ لاہور میں اُن کی شہری جائیداد بھی تھی۔ اس طرح یہ لوگ بہت خوشحال تھے اَور دنیا جہاں کی ساری سہولتیں اَور آسائشیں انہیں حاصل تھیں یعنی ٹریکٹر ٹرالی، گاڑی، ٹیوب ویل، جانور، نوکر چاکر۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء تک نشاط سینما خوب چلا اَور اس کے مالکان نے بہت پیسہ بنایا، مگر پھر اللہ کا قانونِ مکافات حرکت میں آ گیا اَور سینما کو اَور اس خاندان کو زوال نے آ لیا اَور اب تو حالت یہ ہوگئی ہے کہ سب کچھ برباد ہو گیا ہے۔ ساری زمینیں، جائیداد، ٹریکٹر، ٹرالی، مال مویشی سب کچھ ختم ہو گیا ہے حتیٰ کہ سینما کی آدھی جگہ بھی فروخت ہو چکی ہے۔ مزید یہ ہوا کہ دونوں

بھائیوں کی اولاد میں سے کوئی بھی تعلیم حاصل نہ کر سکا اُور خاندان کے سارے ہی نوجوان نشے پر لگ گئے، ان کی صحتیں برباد ہوگئیں، عزت خاک میں مل گئی اُور اس قدر کنگال ہوئے کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے دونوں بھائیوں کے بیٹے بہت معمولی مزدوری کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں یعنی غلہ منڈی میں بوریاں ڈھو کر گزارہ کرتے ہیں۔

فحش کی اشاعت نے اِن کی دنیا بھی بَرباد کردی اُور انہیں دین کے لائق بھی نہ چھوڑا۔ خسر الدنیا والآخرہ۔

(۳)

ڈبلیو زیڈ سٹوڈیوز (وحدت روڈ، لاہور) کا مالک وجیہہ الدین، ضیاء الدین پونا (ہندوستان) سے نقلِ مکانی کر کے آیا۔ پونا میں وہ شالیمار سٹوڈیوز کا مالک تھا۔

ایک بیٹا تھا جو فلم ڈائریکٹر تھا۔ وہ کینسر میں مبتلا ہو کر عین جوانی میں باپ کے سامنے مر گیا۔ خود لمبے عرصے تک بیمار رہنے کے بعد ۰۷-۴-۱۵ کو وفات پا گیا۔

(۴)

چودھری عید محمد رتن سینما (میکلوڈ روڈ، لاہور) کا مالک تھا۔ وفات پا چکا ہے، اُس کے آٹھ دس بیٹے ہیں۔ سب میں سینما کی ملکیت کے حوالے سے باہم سر پھٹول جاری ہے اُور مقدمے عدالتوں میں چل رہے ہیں۔ سینما بڑی دیر سے بند پڑا ہے۔

(۵)

مدھو بالا ہندوستان کی فلمی دنیا کی صفِ اوّل کی اداکارہ تھی جس نے اپنے حسن و جمال اُور فنِ اداکاری میں بے پناہ مہارت کی وجہ سے برصغیر کے فلمی شائقین میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کی اُور خصوصاً مشہور تاریخی فلم مغلِ اعظم نے اُسے شہرت اُور مقبولیت کی انتہا تک پہنچا دیا'۔ ''پھاگن'' اُور ''برسات کی رات'' بھی غیر معمولی طور پر پسند کی گئیں۔ ان تینوں فلموں پر مدھو بالا کو فلمی دنیا کے اعلیٰ ترین ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔

مدھو بالا ۱۹۳۳ء میں بمبئی کے ایک مسلمان عطاء اللہ خاں کے ہاں پیدا ہوئی۔ چونکہ اُس کے باپ کی چھ بیٹیاں تھیں اُور وہ دینی غیرت سے بے نیاز تھا، اس لیے اُس نے اپنی بیٹی ممتاز کو جو ساری بہنوں میں سب سے خوبصورت تھی، محض دولت کے لالچ میں آٹھ سال کی عمر ہی میں فلمی دنیا کے حوالے کر دیا اُور وہ کم عمری ہی میں مدھو بالا کے نام سے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گئی...... لیکن وہ کم عمری ہی میں بالغ ہوگئی اُور دلیپ کمار کے ساتھ اس کے تعلقات بہت مستحکم ہوگئے اُور قریب تھا کہ دونوں میں شادی ہو جاتی کہ اُس نے ''بادل'' اُور ''ساقی'' میں پریم ناتھ کے ساتھ کام کیا اُور اس کے ساتھ مدھو بالا کا ایسا سکینڈل بنا کہ دلیپ کمار سخت بدظن ہو کر اس سے ہمیشہ کے لیے دور ہو گیا اس کے بعد اس نے کشور کمار سے تعلق قائم کیا اُور اس سے شادی بھی کر لی مگر وہ دل سے دلیپ کمار کی یادوں کو نہ نکال سکی۔

مدھو بالا نے آزادروی اُور بے باکی کا جو اسلوبِ حیات اختیار کر لیا تھا، اُس نے اُسے کئی بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔ وہ اکثر فلموں کے سیٹ پر زور زور سے کھانسنے لگتی۔ کئی بار منہ سے خون بھی آیا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی تو پتہ چلا کہ اُسے دل کا عارضہ ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء کی بات ہے جبکہ اُس کی عمر صرف سترہ سال تھی۔ دلیپ کمار سے قطع تعلقی نے اُسے مزید بیماریوں میں مبتلا کر دیا حتیٰ

کہ وہ صرف چھتیس سال کی عمر میں ۱۹۶۹ء میں وفات پا گئی۔

مدھو بالا کی زندگی کے آخری ایام بہت دردانگیز اَور تکلیف دہ تھے۔ اُسے علاج کے لیے انگلینڈ لے جایا گیا اَور دل کے بہت ماہر اَور معروف ڈاکٹروں نے بتایا کہ دل کی تکلیف ایسی پیچیدہ ہوگئی ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ مریضہ بس چند مہینے ہی زندہ رہے گی، لیکن حیرت انگیز طور پر مدھو کی بیماری نو سال کے طویل عرصے پر محیط ہوگئی اَور اس دوران میں تکلیف اَور اذّیت سے یہ عورت پل پل مرتی رہی...... موج مستی کرنے والی اَور ہر وقت ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے رکھنے والی یہ شہرہ آفاق اداکارہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی اَور اُسے زندہ رکھنے کے لیے آکسیجن کا سہارا لینے کی ضرورت رہتی تھی۔

مدھو بالا کے آخری الفاظ تھے:

یہ میرے لئے خوشی اَور اطمینان کی بات ہے کہ میں مر رہی ہوں۔ مَیں نے زندگی میں لوگوں کو خلوص دیا مگر بدلے میں مجھے دھوکا ملا‘‘۔ غالب نے شاید اسی خاتون ہی کے لیے کہا تھا ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمیّد
نا اُمیّدی اس کی دیکھا چاہیے

(یہ تحریر روزنامہ ’’پاکستان‘‘ کے مضمون مطبوعہ ۰۸-۵-۱۳ کی روشنی میں مکمل کی گئی)

(۶)

نازیہ حسن اُور زوہیب حسن بہن بھائی تھے جو ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بالکل نوعمری میں پاپ موسیقی کی دنیا میں داخل ہوئے اُور تھوڑے ہی عرصے میں اُنہوں نے بے پناہ شہرت اُور مقبولیت حاصل کرلی اُور پاکستان اُور ہندوستان دونوں ملکوں کی فلمی دنیا پر چھا گئے۔ لیکن اللہ کی سنت کے مطابق نازیہ حقیقی سکون اُور سچی مسرت سے ہمیشہ محروم رہی، اُسے کینسر کا موذی مرض لاحق ہوگیا۔ لندن میں اُس کا علاج ہوتا رہا اُور کیموتھراپی سے نہ صرف اس کے سر کے بال جھڑ گئے بلکہ اُس کا حلیہ بگڑ گیا اُور صرف ۳۵ برس کی عمر میں وہ (۱۳-۸-۲۰۰۰ کو) موت سے ہمکنار ہوگئی۔

نازیہ نے کراچی کے ایک امیر آدمی اشتیاق بیگ سے شادی کی لیکن یہ شادی کامیاب نہ ہوئی۔ نازیہ نے ایک انٹرویو میں بتایا کہ اشتیاق بیگ نے پہلے بھی'' شادیاں کی ہوئی تھیں۔ ایک بیوی کو طلاق دے رکھی تھی اُور ایک فلپائنی عورت سے بھی شادی کی ہوئی تھی۔ اُس کے ایک اداکارہ سے بھی علانیہ تعلقات تھے، گویا گھریلو سطح پر بھی شادی نے نازیہ کو کوئی سکون نہ دیا اُور موت سے پانچ سال پہلے میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی...... اس طرح بظاہر اپنی آواز اُور حرکات کے ذریعے لوگوں میں خوشیاں بانٹنے والی لڑکی ساری عمر دُکھوں اُور پریشانیوں کی آگ میں جلتی رہی اُور عین جوانی میں لقمۂ اجل بن گئی۔

(۷)

روحی بانو پاکستان ٹی وی کی بہت خوبصورت اَور اعلیٰ تعلیم یافتہ اداکارہ تھی۔ اُس نے گورنمنٹ کالج لاہور سے نفسیات میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ غیر معمولی باصلاحیت فنکارہ تھی چنانچہ اپنے حسن و جمال اَور فن کے حوالے سے وہ ایک لمبے عرصے تک ٹی وی ناظرین میں بے حد مقبول رہی......لیکن اکثر اداکاراؤں کی طرح روحی بانو بھی ہمیشہ بدنصیبی کی نحوست میں مبتلا رہی، اُسے زندگی کے کسی دور میں بھی سکون میسر نہ آیا حتیٰ کہ وہ نفسیاتی مریض بن گئی اَور اکلوتے بیٹے کے قتل کے بعد تو وہ مینٹل ہسپتال میں باقاعدہ زیرِ علاج رہی اَور زندہ درگور ہوگئی۔

روحی بانو کا باپ ایک طبلہ نواز تھا جس نے اپنی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرلی تھی چنانچہ موصوفہ نے ایسے ماحول میں پرورش پائی کہ جب وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھتی تھی، تو اس نے گلبرگ کے مغل ہوٹل میں ڈانس شروع کردیا تھا۔ بعدازاں اسی ہوٹل کے مالک اکرام شاہ سے اُس نے شادی کرلی، جس سے اُس کا اکلوتا بیٹا علی پیدا ہوا، مگر یہ شادی کامیاب نہ ہوئی اَور روحی بانو نے اکرام شاہ سے طلاق لے لی اَور ایک دوسری شادی کی، مگر وہ بھی طلاق پر منتج ہوئی۔

روحی بانو کا ایک سرکاری افسر افتخار حسین شاہ سے بھی معاشقہ چلا، مگر اس میں بھی اُسے شدید ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کا اکلوتا بیٹا علی پرلے درجے کا نالائق اَور آوارہ تھا، شراب پیتا تھا اَور بھاری قرض کے نیچے دب گیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اِن ساری پریشانیوں اَور عملی و ذہنی حادثوں نے روحی بانو کو نفسیاتی مریض بنادیا اَور وہ گھر پر بند ہوکر رہ گئی......اُس کا فن اَور مقبولیت سب کچھ داؤ پر لگ گیا اَور اُس کی بدنصیبی اُس وقت اپنی انتہا پہ پہنچ گئی جب ۶ رنومبر ۲۰۰۵ء کو اُس کا بیٹا علی قتل کردیا گیا۔

گھریلو اَور جذباتی زندگی کی مسلسل ناکامیوں نے روحی بانو کو نفسیاتی مریض تو پہلے ہی بنادیا

تھا، مگر اکلوتے بیٹے کی موت نے اُس کے حواس کو بالکل ہی معطل کر دیا......اَور اب وہ لمبے عرصے سے مصیبت، وحشت اَور عبرت کا ایک لرزہ دینے والا نمونہ بن گئی ہے۔ نہ زندوں میں، نہ مردوں میں، پل پل مرتی ہے پل پل جیتی ہے، دنیا میں اس سے زیادہ تنہا اَور بے بس کوئی نہیں۔ ماں مر چکی ہے، ایک بہن ہے جو انگلینڈ میں مقیم ہے اَور بھائی کی نعمت سے وہ محروم ہے، خدا دشمن کو بھی ایسے حالات سے دوچار نہ کرے۔

(۸)

بدنصیبی، رسوائی اُور نا آسودگی کی یہ داستان صرف نازیہ حسن، روحی بانو اُور مدھو بالا تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس طبقے کی جس خاتون کی زندگی کا بھی مطالعہ ومشاہدہ کیا جائے، وہاں حیرت انگیز طور پر حالات یکساں نظر آتے ہیں۔ یہ خواتین جو اپنی اداکاری سے اپنے ناظرین میں مصنوعی خوشیاں بانٹتی رہیں، اپنے کردار اُور اعمال کی وجہ سے سچی مسرتوں سے ہمیشہ محروم رہیں اُور شدید ترین پریشانیوں کا سامان کرتے ہوئے عین جوانی کی عمر میں موت کے گھاٹ اتر گئیں...... ذیل میں اس نوعیت کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

خالدہ ریاست ٹی وی سکرین پر نمودار ہوئی تو اپنی اچھی شکل وصورت، اعلیٰ تعلیم اُور بہترین اداکاری کی وجہ سے جلد ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ بعدازاں اُس نے سندھ کے ایک جاگیردار سے شادی کرلی، خدانے اُسے ایک بیٹے سے بھی نوازا، مگر اُس کی اپنے خاوند سے نہ بن سکی اُور حالات میں اس قدر بگاڑ پیدا ہوا کہ جس کے اثر سے وہ نشے پر لگ گئی...... اور کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہوگئی۔ اس نے زندگی کے آخری ایام انتہائی عُسرت وتنگدستی میں گزارے۔ روزنامہ پاکستان کے خرم منصور قاضی کے الفاظ میں ''وہ واقعی معنوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئی''۔

ٹی۔وی کی ایک اُور خوبصورت، تعلیم یافتہ اُور ذہین آرٹسٹ بندیا بھی تھی۔ اُس نے ایک فلسطینی نژاد خماش نامی شخص سے شادی کی، اُس سے ایک بیٹا ''پرنس'' پیدا ہوا، مگر یہ شادی ناکام ہوگئی اُور وہ اپنے بیٹے اُور ماں کے ساتھ گلبرگ لاہور کے ''اومیگا کمپلیکس'' کے ایک فلیٹ میں برسوں نا آسودہ زندگی گزارتی رہی اُور جب والدہ فوت ہوگئی تو اس نے اداکار اسد نذیر سے شادی کرلی اُور اُس کے ساتھ امریکہ چلی گئی، مگر وہاں جاکر جلد ہی دونوں کے جھگڑے شروع ہوگئے۔ نوبت لڑائی، مار کٹائی تک جاپہنچی حتیٰ کہ دونوں میں طلاق ہوگئی۔

(۹)

پیپلز پارٹی سے وابستہ ایک ممتاز سیاست دان کی اداکارہ بیٹی زیبا بختیار کی پہلی شادی ناکام رہی اُور طلاق پر منتج ہوئی۔ اس نے دوسری شادی مشہور پاپ سنگر عدنان سمیع سے کی۔ ان کا بھی ایک بیٹا "اذان" ہے، مگر یہ شادی بھی بُری طرح ناکام ہوئی اُور اب زیبا بختیار لمبے عرصے سے اکلوتے بیٹے کے ساتھ غمزدہ زندگی گزار رہی ہے۔

ماضی کی مشہور و مقبول اداکارہ دیبا بھی اسی نوعیت کے حادثے سے دوچار ہوئی۔ اس کی شادی بھی ناکام رہی، اُس کا بھی ایک بیٹا ہے اُور وہ بھی حسرت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

(۱۰)

حمیرا چودھری اداکارہ اُور گلوکارہ ہے۔ مشہور اداکار عابد علی سے لو میرج کی، مگر عابد علی نے بیوفائی کی۔ اُس کے بہت سی لڑکیوں سے تعلقات تھے اُور اس نے دوسری شادی بھی کر لی تھی، اس لئے حمیرا نے طلاق لے لی۔

حمیرا چودھری کا اپنا مکان کوئی نہیں۔ کرائے کے مکان بدل بدل کر تنگ آ چکی ہے۔ تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی مریم ہے جو ڈراموں میں کام کرتی ہے، اُس کی شادی ہوئی مگر طلاق ہوگئی اُور وہ ماں کے پاس آ گئی ہے۔

دوسری بیٹی ایمان علی، ماڈل اُور اداکارہ ہے۔ بیمار رہتی ہے، نروس بریک ڈاؤن میں مبتلا ہے۔ ہندوستان سے بھی علاج کرا کے آئی ہے۔

(روزنامہ پاکستان میگزین ۰۷-۱۱-۱۸)

(۱۱)

میناشوری

ماضی کی بہت خوبصورت اداکارہ۔ یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ سب ناکام رہیں۔ اولاد سے محروم رہی۔ بہت دولت تھی مگر سب عیش وعشرت میں غارت ہوگئی۔ ۱۹۸۲ء میں ساٹھ سال کی عمر میں موہنی روڈ کے ایک تنگ وتاریک مکان میں وفات پائی۔

آخری عمر میں بھانجے کے پاس رہتی تھی۔

(مضمون ابرار حسین قومی ڈائجسٹ ستمبر ۲۰۰۴)

(۱۲)

الیاس کاشمیری

پنجابی فلموں کا اداکار اَور مشہور ولن تھا۔ بھاری تن وتوش کا حامل تنومند آور شخص تھا۔ وہ آج ۰۷-۱۲-۱۲ کو فوت ہوگیا۔

روزنامہ ''ایکسپریس'' اَور ''نوائے وقت'' کے مطابق وہ آٹھ سال تک فالج میں مبتلا رہا۔ اُسے شوگر تھی، گنگرین کی وجہ سے بائیں ٹانگ کٹ گئی تھی۔ سماعت بہت کمزور ہوگئی تھی اَور بینائی بھی۔

بیوی دس سال پہلے فوت ہوگئی تھی۔ دو بیٹے تھے دونوں امریکہ میں رہتے ہیں۔ گھر میں ایک نوکر کے ساتھ بالکل یک وتنہا رہتا تھا...... بیماری کے اس سارے عرصے میں فلمی دنیا کا کوئی فرد اس کی عیادت کے لئے نہ آیا۔

(۱۳)

احمد رُشدی

ایشیا کا پہلا پاپ سنگر تھا۔ ۱۹۳۸ء میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوا۔ صرف ۴۵ سال کی عمر میں ۱۹۸۳ء میں فوت ہو گیا۔ وفات سے قبل مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔

(روزنامہ پاکستان ۰۸-۴-۱۲)

(۱۴)

وحید مراد

پاکستان کی فلمی دنیا کا مقبول ترین اَور بہت خوبصورت اداکار تھا۔ ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوا۔ مقبولیت، شہرت اَور دولت کے باوجود سراپا غم تھا۔ بیوی بچوں کو لے کر امریکہ چلی گئی اَور تنہائی کے احساس نے اِسے زندہ درگور کر دیا۔

۱۹۸۳ء میں پے در پے حادثات سے دوچار ہوا۔ جنوری میں السر کا آپریشن ہوا۔ ستمبر میں کار گڑھے میں گر گئی اَور شدید زخمی ہوا۔ نومبر میں ایک منہ بولی بہن کے گھر میں مقیم تھا جب ہارٹ اٹیک سے زندگی ہار گیا۔ (ایکسپریس میگزین ۰۷-۱۱-۱۸)

(۱۵)

''رانی''

مشہور اداکارہ اَور رقاصہ......۱۹۴۶ء میں پیدا ہوائی۔ بے شمار فلموں میں کام کیا۔ بڑی شہرت اَور مقبولیت حاصل کی۔ یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں لیکن سب ناکام ہوئیں۔ مسلسل

پریشانیوں نے اُسے کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا کر دیا اُور وہ ۴۶ سال کی عمر میں وفات پا گئی۔
(ایکسپریس ۰۷-۵-۲۷)

(۱۶)

عندلیب بہت خوبصورت اُور مقبول اداکارہ۔ سالہا سال تک ٹی وی کی فضا پر چھائی رہی، اس کے تعلقات سیالکوٹ کے ایک صنعت کار حنیف گھمن سے تھے جس نے کسی بات پر ناراض ہوکر اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا جس سے اس کی شخصیت مسخ ہوگئی اُور وہ فلمی دنیا سے خارج ہوگئی۔

بیرونِ ملک سے پلاسٹک سرجری کرانے کے بعد عندلیب نے سیالکوٹ ہی کے ایک شخص علی سے شادی کرلی......لیکن اب دونوں میاں بیوی میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں، اُور وہ دوبارہ فلمی دنیا میں داخلے کے لئے کوشش کر رہی ہے۔ (روزنامہ پاکستان ۰۶-۲-۱۵)

(۱۷)

میرے پیشِ نظر قرآن پاک کی سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۴ اور ۱۷۵ ہیں جن کا ترجمہ یوں ہے: ''اور اے نبی، ان کے سامنے اُس شخص کا حال بیان کرو جس کو ہم نے اپنی آیات کا علم عطا کیا تھا مگر وہ اُن کی پابندی سے نکل بھاگا۔ آخر کار شیطان اس کے پیچھے پڑ گیا یہاں تک وہ بھٹکنے والوں میں شامل ہو کر رہا۔ اگر ہم چاہتے تو اُسے ان آیتوں کے ذریعے سے بلندی عطا کرتے، مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشِ نفس ہی کے پیچھے پڑا رہا''۔

اور جب بھی یہ آیات میرے سامنے آتی ہیں، میرا ذہن فوراً اُس مشہور صحافی کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوا، اللہ نے اُسے بے پناہ ذہانت عطا فرمائی، اُسے ایک خوبصورت شخصیت سے نوازا۔ اُس نے عربی میں ایم اے کیا، اور ترجمہ و تصنیف و تالیف کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا...... اُس نے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنے حلقے میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا اور اپنی محنت، لگن اور ذہانت سے بیک وقت کئی اخبارات کا مالک بن گیا۔

مگر افسوس صد افسوس کہ اُس نے خداداد کمالات کا استعمال بہت ہی غلط طریقے سے کیا۔ وہ مکمل دنیادار بن گیا۔ اُس کے ماموں ایک راست فکر دینی جماعت کے رُکن تھے، اُنہوں نے ہی تعلیم کے دوران اُس کی سرپرستی کی تھی، اُس کا باقی خاندان بھی دینی پہچان کا حامل تھا، مگر اُس نے ساری دینی و اخلاقی قدروں کو تج دیا۔ اپنی خاندانی روایت پسندی اور دینی مزاج کا بھی لحاظ نہ کیا اور آنکھیں بند کر کے، کمال ڈھٹائی کے ساتھ جلبِ زر، شہرت پسندی اور عیاشی کے راستے پر چل پڑا اور اس ضمن میں اُس نے بلیک میلنگ اور ظلم کا ہر انداز اختیار کیا اور زر اندوزی کے ساتھ ساتھ بدعملی اُس کے کردار کا لازمی حصہ بن گئی حالانکہ ایک ایر ہوسٹس سے اُس نے دوسری شادی بھی کر لی تھی۔ یاد رہے کہ اُس کی پہلی شادی بھی محبت کی شادی تھی۔ اُس نے بلیک میلنگ ہی سے ایک بڑی بلڈنگ پر قبضہ کیا اور اپنے دفتر کے ساتھ ایک ایسا ریٹائرنگ روم تعمیر کرایا کہ اخباری مالکان کے

دفاتر میں اُس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس نے اس ریٹائرنگ روم کو عیاشی کا اڈہ بنالیا اَور ثقہ راوی کے مطابق اس ادارے کی ملازم خوبصورت لڑکیوں کی عزت داؤ پر لگ گئی۔ چنانچہ حیا کا ہر عنصر اس کے کردار سے رخصت ہوگیا، جس کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اپنی بیٹی کی شادی پر نہ صرف خود بھنگڑہ ڈالا بلکہ اس کے دونوں بیٹوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

اس نامور صحافی کا ایک اخبار دوپہر کو شائع ہوتا تھا۔ یہ چھ صفحات پر مشتمل تھا اَور فحاشی، سنسنی خیزی اَور عریانی کا شاہکار تھا۔ اس کے اندر کے دو صفحے تو مکمل طور پر کسی ایک فلمی اداکارہ کی تصویروں سے آراستہ ہوتے تھے۔

اخلاق، تہذیب اَور دینی وانسانی قدروں کے خلاف سالہا سال پر مشتمل اس شخص کی محاذ آرائی آخرکار رنگ لائی اَور اللہ کے غضب نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا، وہ پہلے شوگر میں مبتلا ہوا، پھر اس کے گردوں میں خرابی ہوگئی اَور پھر وہ ریڑھ کی ہڈی کی کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوگیا کہ جو پاکستان میں لاعلاج تھی، چنانچہ یہ امریکہ جانے پر مجبور ہوگیا اَور وہاں کسی ہسپتال میں داخل ہوگیا۔ اس کا بڑا بیٹا جو کاروبار میں اس کا دست وبازو تھا، جوان اَور شادی شدہ تھا، اس کی تیمارداری کے لیے اس کے پیچھے گیا، لیکن واپس آتے ہوئے لندن میں اچانک ہارٹ اٹیک سے جاں بحق ہوگیا۔ باپ بیماری کی شفا کے لیے گیا تھا، لیکن وہ واپس اس حال میں آیا کہ اس کا اپنا علاج بھی نہیں ہوسکا تھا اَور جوان بیٹے کی میّت اس کے ہم رکاب تھی۔

حیرت کی بات یہ ہے اتنے غیر معمولی حادثے کے بعد بھی اس شخص نے کوئی عبرت حاصل نہ کی اَور اس کے اخبارات کے رنگ ڈھنگ میں بھی کوئی فرق واقع نہ ہوا حتیٰ کہ کئی طرح کی بیماریوں کے باوجود اس کے لچھن قائم ودائم رہے اَور اس نے ایک روز ادارے کی ایک نوجوان ٹیلی فون اپریٹر کو اپنے دفتر میں بلایا اَور اس سے دست درازی کی کوشش کی۔ لڑکی کے والدین نے اس کی شکایت اس کے بیٹے سے کی۔ بیٹا باپ کی حرکتوں سے اس لئے بھی نالاں تھا کہ اس نے دوسری شادی کر کے اس کی ماں پر ایک سوتن مسلط کردی تھی چنانچہ بیٹے نے باپ کو گریبان سے پکڑ

لیا اُور اُسے خوب برا بھلا کہا اُور دوسری بیوی نے برسرِ عام اُسے تین چار تھپڑ رسید کر دیئے اس سے باپ بیٹے کے درمیان فاصلے بہت بڑھ گئے اُور باپ نے بیٹے کو اخبار کی انتظامی ذمہ داریوں سے الگ کر دیا۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ کئی طرح کی بیماریوں نے اُور گھریلو چپقلش نے اس شخص کی زندگی جہنم زار بنا دی ہے۔ دونوں بیویوں سے لڑائی، بیٹے سے لڑائی اُور بیماریوں سے ہر وقت کی جنگ...... چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں اُس کی کمر کا درد بہت بڑھ گیا ہے اُور وہ چھڑی کے سہارے کے باوجود خاصا جھک کر چلتا ہے۔ اخبار کے ادارتی اُور انتظامی معاملات سے اُس کی گرفت بہت ڈھیلی ہوگئی ہے اُور ایک باخبر سینئر اخبار نویس کی رائے یہ ہے کہ آئندہ بہت تھوڑے عرصے میں اس کا اخبار دیوالیہ ہو کر بند ہو جائے گا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ بے مثال اُور ڈھیر ساری بیماریوں کے باوجود یہ شخص حیرت انگیز طور پر زندہ ہے، یوں لگتا ہے کہ موصوف نے زندگی بھر جس ظلم اُور شقاوت کا مظاہرہ کیا ہے اُور عریانی اُور فحاشی کی جس وسیع پیمانے پر اشاعت کی ہے اُور مالِ حرام کا جس ڈھٹائی سے اہتمام کیا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کے نتیجے میں اسے لمبی عمر عطا کر کے اِسے خوب خوب ذلیل و رسوا کرنا چاہتا ہے، اُور جس گھناؤنے کردار کا اس نے عمر بھر مظاہرہ کیا ہے اُس کا فطری تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ خود بھی عبرت کا نشان بن جائے اُور اس کا اخبار اُور غضب و نہب کے نتیجے میں اس نے جو املاک بنائی ہیں وہ بھی قصۂ پارینہ بن جائیں۔

باب: ۱۲

اللہ کے دشمنوں کا انجام

(۱)

نواب اکبر بگٹی ۱۲ر جولائی ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم متحدہ ہندوستان کے سب سے باوقار اُور مہنگے تعلیمی ادارے ایچی سن کالج لاہور سے حاصل کی۔ بعدازاں وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی زیرِ تعلیم رہے، لیکن تعلیم نے اُن کے مزاج کی اصلاح میں کوئی کردار ادا نہ کیا۔ وہ ۱۹۴۶ء میں اپنے قبیلے کے سردار بنے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مغرب کا یہ تعلیم یافتہ شخص نواب بن کر اپنے علاقے کی فلاح و بہبود اُور اپنے عوام (یا صحیح تر الفاظ میں اپنی رعایا) کے لیے خیر و برکت اُور ترقی کا باعث بنتا، لیکن واقفِ حال لوگوں کا کہنا تھا کہ دنیا کی مہنگی ترین اُور محفوظ ترین گاڑیوں میں سفر کرنے والے نواب اکبر بگٹی کے علاقے میں عام لوگوں کو سائیکل بھی میسر نہیں تھی۔

بے رحمی، سفاکی اُور تکبّر نواب اکبر بگٹی کے مزاج کا لازمی حصّہ تھا۔ یہی سبب ہے کہ اُنہوں نے پہلا قتل بارہ سال کی عمر میں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ محض نشانہ سیدھا کرنے کی خاطر اُنہوں نے اپنے ایک ہاری کو گولی مار دی تھی۔ اسی طرح اُن کے شہر کا ایک پرائمری اُستاد اُن کے عتاب کا شکار ہو گیا۔ حکم دیا کہ اس کو قتل کر کے اس کی لاش سڑک پر پھینک دی جائے۔ حکم کی تعمیل ہوئی اُور اس غریب کی لاش تین دن تک سرِ عام سڑک پر پڑی رہی۔

اکبر بگٹی صوبہ بلوچستان کے گورنر بھی بنے اُور وزیرِ اعلیٰ بھی...... گورنر بننے پر جب وہ اپنے علاقے میں گئے تو استقبال کرنے والوں نے اُن کے گلے میں ہار ڈالنے چاہے...... موصوف چونکہ بہت لمبے قد کے تھے، اس لئے استقبالیوں نے درخواست کی کہ وہ سر کو تھوڑا سا جھکا لیں تاکہ ہار اُن کی گردن میں ڈالے جاسکیں۔ اس پر نواب اکبر بگٹی نے بڑے تکبّر کے ساتھ کہا ''میری یہ

گردن زندگی بھر کبھی خدا کے سامنے بھی نہیں جھکی، پھر اِن پھولوں کی خاطر تمہارے سامنے کیسے جھک سکتی ہے'' انہوں نے اپنے بازوؤں کو پھیلا کر کہا'' یہ ہار میری بانہوں کو پہنا دو''۔ اکبر بگٹی کو اسلام اُور پیغمبر اسلام سے جو بغض تھا اُس کا اندازہ نوائے وقت ۰۷-۷-۳ کی اس خبر سے ہوسکتا ہے جس کے مطابق اقلیتی رکنِ اسمبلی ایم پی بھنڈارا نے ایک نجی ٹی وی پروگرام میں بتایا کہ اکبر بگٹی ملعون سلمان رشدی کے بہت شیدائی تھے۔ خود بھی اُس کی کتابیں شوق سے پڑھتے تھے اُور مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیتے تھے۔

ایک انگریز صحافی خاتون ایما ڈنکن نے اُن سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں انٹرویو کیا تھا جس میں اُس نے سوال کیا تھا کہ آپ اب تک کتنے لوگوں کو ہلاک کر چکے ہیں؟

''مَیں گنتی بھول گیا ہوں'' اُنہوں نے جواب دیا تھا۔

ایک اور سوال کے جواب میں اُنہوں نے کہا تھا'' ہم قتل اس لئے کرتے ہیں کیونکہ ہمیں کوئی اور کام آتا ہی نہیں''

اس انٹرویو میں جب اس صحافی خاتون نے کہا کہ آخری فیصلہ تو خدا کرتا ہے موت کے ذریعے..... تو اکبر بگٹی نے برملا خدا کا اُور آخرت کا انکار کیا اُور کہا'' مَیں ایسی باتوں پر ایمان نہیں رکھتا'' اُن کے الفاظ ہیں:'' موت اُور موت کے بعد کیا ہے، زمین ہے، کیڑے مکوڑے ہیں، موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا تصوّر ہی غلط ہے''۔

اس کردار، روّیے اُور عقاید کے ساتھ نواب اکبر بگٹی کو دنیا ہی میں'' مکافاتِ عمل'' کی جس صورتِ حال سے گزرنا پڑا، وہ بڑی ڈرا دینے والی ہے۔ اُنہیں پہلی سزا تو یہ ملی کہ وہ عمر بھر بےخوابی کے مرض میں مبتلا رہے، کوئی دوا، کوئی کوشش انہیں نیند کی نعمت عطا نہ کر سکی بس وہ بستر پر لیٹ جاتے تھے اُور کروٹیں بدلتے رہتے تھے، اس سے جو تھوڑا سا آرام ملتا، وہ نیند کا بدل بن جاتا تھا۔

دوسرا ذہنی اُور عملی عذاب جس سے نواب صاحب کو دوچار ہونا پڑا، وہ یکے بعد دیگرے تین جوان بیٹوں کی موت اُور ایک کی جلاوطنی تھی۔

اکبر بگٹی کے چار بیٹے تھے: سلیم اکبر بگٹی، طلال بگٹی، ریحان بگٹی اَور سلال بگٹی۔

اِن میں سے سلیم اکبر بگٹی عین جوانی میں مر گیا۔ طلال نے نواب صاحب کے ہندو مینجر کو مارا پیٹا اَور اُس سے تین لاکھ روپے کی رقم چھین لی۔ ہندو مینجر قبائلی روایت کے مطابق اپنا گریبان پھاڑ کر نواب صاحب کے سامنے پیش ہوا، تو نواب نے طلال کو حکم دیا کہ کل دس بجے تک اپنا سب کچھ لے کر ڈیرہ بگٹی سے نکل جاؤ اَور پھر کبھی واپس نہ آنا، ورنہ قتل کرا دوں گا اَور وہ واقعی وہاں سے نکل گیا اور باپ کی موت کے بعد ہی واپس جا سکا۔

طلال بگٹی کی جلاوطنی کے چند ماہ بعد ریحان بگٹی گردے فیل ہونے کی وجہ سے وفات پا گیا۔

اَور ۱۹۹۱ء میں اکبر بگٹی کا سب سے خوبصورت بیٹا سلال بگٹی مخالفوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اَور وہ خود ۲۶ اگست ۲۰۰۶ء کو فوج کے ہاتھوں انتہائی دردناک موت سے دوچار ہوئے، کاش کوئی سوچے، کاش کوئی عبرت حاصل کرے۔

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کالم نویسوں کی تحریروں سے استفادہ کیا گیا ہے:

۱- تنویر قیصر شاہد (تکبیر ٹائمز فیصل آباد)

۲- ایک سردار کی کہانی ماہنامہ ''بیداری'' حیدر آباد، اکتوبر ۲۰۰۶ء

۳- کالم۔ میجر (ر) محمد یونس روزنامہ پاکستان ۰۹-۵-۳

(۲)

اُردو کے بے مثال ادیب، انشا پرداز، افسانہ نگار، مزاح نگار، ناول نویس عظیم بیگ چغتائی ۱۸۸۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۱ء میں ۴۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

بہت باصلاحیت تھے...... میٹرک کے دوران ہی ''قصرِ صحرا'' کے عنوان سے ناولٹ لکھا۔ اس اعتبار سے مزاج کے بہت اچھے تھے کہ وکالت کے دوران غریبوں، بیواؤں کی مدد کرتے تھے اَور ان کے مقدمات اعلیٰ عدالتوں تک مفت لے جاتے تھے۔

لیکن موصوف کے عقاید ونظریات بہت گمراہ کن تھے۔ اس حوالے سے اُنہوں نے تین کتابیں مرتب کیں: ''قرآن اَور پردہ، ''حدیث اَور پردہ'' اَور تفویض''۔

حدیثِ رسول کا علانیہ انکار کرتے تھے، لکھتے ہیں: ''ان ملّاؤں نے قرآن شریف کو محض سنی سنائی بات (جو دوڈھائی سو برس بعد لکھی گئی) سے قربان کر کے پھینک دیا۔ درحالیکہ قرآن شریف میں صاف صاف خداوند تعالیٰ احادیث کے بارے میں کہتا ہے کہ اِس (قرآن) کے بعد وہ کس حدیث پر ایمان لائیں گے''۔

فقہ اور ائمہ کرام کا بھی انکار کرتے تھے۔ لکھتے ہیں: ''ہم اِن چاروں اماموں کے اقوال کو اُٹھا کر زور سے دیوار پر مارتے ہیں کہ یہ تمام اقوال مردود ہیں'' اس ضمن میں امامِ اعظمؒ کی برملا تضحیک کرتے ہیں اَور اُن سے بے حد لایعنی باتیں منسوب کرتے ہیں ان کے الفاظ ہیں: امام اعظم فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص سگی بہن سے شادی کرے یا سگی ماں سے یا سگی خالہ سے تو یہ نکاح حضرت امام موصوف کے نزدیک باطل نہیں ہوگا بلکہ اولاد بجائے حرامی کے حلالی ہوگی''۔

موصوف کی بہن عصمت چغتائی نے لکھا ہے کہ ''وہ یزید کے بڑے مداح تھے اَور امام حسینؓ

کی شان میں بکواس کیا کرتے تھے‘‘۔

عظیم بیگ چغتائی پردے کے سخت مخالف تھے۔ لکھتے ہیں: ’’میں پردہ کرنے کو مذہباً گناہ خیال رکھتا ہوں اور دنیا کی خرابیوں کی جڑ اسی پردہ کو سمجھتا ہوں‘‘۔

’’تفویض‘‘ کے دیباچے میں رقم طراز ہیں:

’’لوگ کہتے ہیں کہ مسلمان عورتوں کی ناگفتہ بہ حالت اس وجہ سے ہے کہ اُنہوں نے اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اُن کی جان محض اس وجہ سے مصیبت میں ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔ آج اپنا مذہب چھوڑ دیں اور کل ان کی ساری مصیبتیں ختم ہو جائیں‘‘۔

مزید لکھتے ہیں:

’’مجھے بھی اپنی عمر میں دس بیس مسلمان لڑکیوں کو عیسائی بنوا دینے کا ضرور بالضرور موقع مل جائے گا کیونکہ ایسا کرنے سے اُن کی جان گھل گھل کر مرنے سے بچ جائے گی جس کا مجھے ثواب ملے گا‘‘۔

اسی دیباچے میں مزید کھل کر لکھتے ہیں:

’’جو کچھ بھی شرعِ محمدی کی رُو سے عورت کا درجہ اسلام میں ہے وہ یہ ہے کہ:

(۱) جائز ہے کہ عورت کو مویشی کی طرح خریدو اور بیچو

(۲) بغیر نکاح کے اس کو بطورِ داشتہ عورت کے رکھو، کوئی گناہ نہیں

(۳) جی چاہے اُس کو فروخت کر ڈالو، ورنہ کسی دوسرے کے ساتھ شادی کر دو اور پھر شوہر ہونے کے باوجود بھی گاہے گاہے اس کو بہ اجازت اس شوہر کے اپنی ناجائز زوجیت میں لاتے رہو۔ یہ سب عقلاً شرعاً و قانوناً درست ہے۔

(۴) عورت کو جب جی چاہے، شوہر بغیر کسی قسم کی وجہ کے طلاق دے سکتا ہے۔ مگر عورت اگر مرد سے بیزار ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں محض اس لیے کہ یہ شوہر صاحب خدائے مجازی ہیں۔

(۵) کوئی صورت نہیں جو عورت ایسے موذی سے چھٹکارا حاصل کر سکے بلکہ بعد مرنے کے بھی جان نہیں چھوٹے گی اور جنت میں پھر اسی موذی سے سابقہ پڑے گا۔

عظیم بیگ چغتائی کو اسلام سے اُور مسلمانوں سے خدا واسطے کا بیر تھا چنانچہ چنگیز خاں اُور ہلاکو خاں نے اسلام اُور مسلمانوں کے خلاف جو بدترین اُور ہولناک سلوک روا رکھا، اُس پر موصوف فخر کرتے ہیں:

''ہمارے جدِ امجد یعنی چغتائی خاں کے بھائی ہلاکو خاں اُور ان کے والد چنگیز خاں نے اس نام نہاد اسلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی''

''میں بھی آخر چغتائی اُور چنگیزی ہوں لہٰذا اس کتاب کے ذریعے فتنۂ مولویت کا استیصال کرتا ہوں جس طرح جدِ امجد چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے اسلام کی بہترین خدمت کی کہ فتنۂ مولویت کا تلوار سے استیصال کیا (حدیث اُور پردہ ص ۹۳)

عظیم بیگ نے پورے ۳۶ صفحے کا ایک رسالہ رقص وسرود کے جواز میں بھی تصنیف کیا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا ظلم موصوف نے یہ کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھی یاوہ گوئی سے بھی باز نہ رہے اُور ''حدیث اُور پردہ'' میں آپ کی ذاتِ گرامی پر ایسا الزام تھوپ دیا کہ جسے نقل کرنے کی قلم میں تاب ہی نہیں ہے، اس ہرزہ سرائی کی جسارت شاید کسی بدترین دشمنِ اسلام نے بھی نہیں کی ہوگی۔

یہ گھناؤنے خیالات وعقاید تھے اسلام اُور پیغمبر اسلام کے بارے میں اُردو کے اس ادیبِ اعظم کے، چنانچہ حیرت انگیز طور پر اللہ نے اس کو پکڑا اُور خوب پکڑا۔ اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

ریاست جاروہ کی ملازمت کے دوران پہلے دمے کی تکلیف شروع ہوئی جو شدید کھانسی میں تبدیل ہوگئی اُور بعد میں ٹی بی کی صورت اختیار کر گئی۔ تیز تیز بخار چڑھتے تھے۔ شدت کی کھانسی سے سانس سینے میں نہیں سماتا تھا اُور خون تھوکتے رہتے تھے۔ چار سال تک یہی کیفیت رہی۔ نچلا دھڑ بیکار ہوگیا، چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے......اس کے ساتھ ہی تواتر کے ساتھ بے خوابی میں

مبتلا ہو گئے۔

موصوف کی بہن عصمت چغتائی نے لکھا ہے کہ اُن کی ٹانگیں اکڑ گئی تھیں اور بازو انجکشنوں کی کثرت سے گدے ہوئے تھے۔ کولہے میں امرود برابر پھوڑا نکل آیا تھا۔

شاہد احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ بیماری نے مرزا کے دماغ پر عجیب سا اثر ڈال دیا تھا کہ انہیں دوسروں کو تکلیف پہنچا کر لطف آتا تھا مثلاً بھائیوں سے لڑا دیتے، کسی پر چوری کا الزام لگا دیتے۔ طبیعت سے گھڑ کر ایسی بات کر دیتے کہ دو آدمی اُلجھ جائیں۔

چنانچہ اس روّیے کے نتیجے میں گھر کے سب افراد موصوف سے سخت متنفر اَور بیزار رہتے تھے۔ عصمت چغتائی لکھتی ہیں: وہ لاکھ کہتے مگر دشمن نظر آتے تھے۔ بیوی شوہر نہ سمجھتی۔ بچے باپ نہ سمجھتے، بہن نے کہہ دیا تم میرے بھائی نہیں اَور بھائی آواز سن کر نفرت سے منہ موڑ لیتے، ماں کہتی ''سانپ جنا تھا میں نے''۔

عصمت مزید لکھتی ہیں: وہ جھوٹے تھے، اُن کی زندگی جھوٹی تھی، سب سے بڑا جھوٹ تھی، لوگ کہتے ہیں: ماں باپ کو دُکھ دیا، بیوی کو دُکھ دیا اَور سارے جگ کو دُکھ دیا۔

اس سب کچھ کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی عظیم بیگ چغتائی کے لیے جیتے جی جہنم بن گئی۔ وہ سسک کر جیتے رہے، سوکھ کر کانٹا ہو گئے، گندگی اَور تعفن میں ڈوب گئے حتیٰ کہ چیونٹوں نے اُن کے جسم اَور بستر میں بسیرا کر لیا اَور وہ اسی حالت میں نہایت عبرت ناک موت سے ہمکنار ہوئے۔ شاہد احمد دہلوی نے اُن سے اپنی آخری ملاقات (۳؍اگست ۱۹۴۱ء) کا حال لکھا ہے:

میں نے آواز دی اَور سلام کیا تو منہ پر سے لحاف اُٹھایا۔ مجھ پر بجلی گر پڑی۔ مرزا صاحب کے بدلے ایک سِکھ دکھائی دیا۔ بڑی بڑی داڑھی مونچھیں اَور بڑھے ہوئے سر کے بالوں پر ایک رومال بندھا ہوا، پیلا چہرہ، پھٹی پھٹی آنکھیں۔ لحاف ہِلا تو اُس میں سے بدبو کا ایک بھبکا آیا۔ پایوں کیے نیچے پانی کے پیالے رکھے ہوئے تھے، مگر پلنگ پر ٹانگے چیونٹے پھر رہے تھے۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی۔ بولے بس اب ختم سمجھو، پھر ایک دم سے مسکرائے اَور کراہتے ہوئے

بولے ''ارے ارے آپ کو دیکھئے'' اور لحاف میں سے ایک چیونٹا چٹکی میں پکڑ کر نیچے پھینکا ''مرنے سے پہلے اپنا حصہ لینے چلے آئے۔'' اسی کیفیت میں موصوف ۲۱ راگست ۱۹۴۱ء کو خالقِ اکبر کے حضور اپنے اعمال کی جوابدہی کے لیے پہنچ گئے۔

یہ مضمون جاوید اختر بھٹی کی کتاب مرزا عظیم بیگ چغتائی (فن و شخصیت) مطبوعہ بیکن بکس لاہور (۲۰۰۳ء) کی مدد سے تیار کیا گیا ہے۔

(۳)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۱۱-۵-۲۰۰۵

بی اے خاں صاحب تشریف لائے۔ یہ دیال سنگھ کالج میں میرے کولیگ تھے۔ انگریزی کے پروفیسر تھے، وائس پرنسپل تھے اور کچھ عرصہ قائم مقام پرنسپل بھی رہے۔ نواز خاں کی شہادت کے وقت یہی پرنسپل تھے۔

موصوف کسی زمانے میں کٹر کمیونسٹ تھے، دہریے تھے، خدا کا انکار کرتے تھے اور دینی تعلیمات کے سخت مخالف تھے...... مگر اب اللہ نے انہیں ہدایت دے دی ہے، وہ بہت حد تک سیدھے راستے پر آ گئے ہیں اور اپنی گزشتہ زندگی پر متأسف ہیں۔

اُنہوں نے بتایا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ایک شخص دیال سنگھ کالج کا پرنسپل بنا جو بظاہر سیّد کہلواتا تھا، بہت بڑا شاعر تھا، نامور نقاد تھا، لیکن پرلے درجے کا بدعمل تھا۔ اُس نے کالج میں مخلوط تعلیم کو نافذ کر دیا، لڑکیوں کو کثرت سے داخلے دے دیئے اور اس قدر بے باکی اور بے حیائی کا مظاہرہ کیا کہ وہ کسی نہ کسی لڑکی کو کسی بہانے سے روک لیتا اور اپنے آفس میں اس سے منہ کالا کرتا۔ بعد میں کلرک حضرات اُس لڑکی کو بلیک میل کرتے۔ اس طرح یہ کالج تھوڑے عرصے میں چکلے کی صورت اختیار کر گیا اور پرنسپل اور پروفیسر حضرات سب اس حمام میں ننگے ہو گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۳ء تک جاری رہا۔

بی اے خاں صاحب نے بتایا کہ اس نام نہاد سیّد پرنسپل سے قدرتِ خداوندی نے خوب انتقام لیا۔ اس کی سات بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ ساری بیٹیاں خوبصورت تھیں۔ اس کی رہائش مجیٹھہ ہال میں تھی۔ وہاں روزانہ شام کو ترقی پسند، کمیونسٹ حضرات جمع ہوتے، شعروشاعری کی محفل جمتی، خوب شراب چلتی، پرنسپل کی جوان بیٹیاں مہمانوں کو شراب پلاتیں اور باپ کی موجودگی میں یہ بے

خدا، مادر پدر آزاد لوگ اُس کی بیٹیوں سے وہی سلوک کرتے جو یہ کالج کی طالبات سے کرتا تھا۔
بی اے خاں نے بتایا کہ یہ شخص بڑا ہی بے غیرت تھا، شرم و حیا نام کی کوئی چیز اس کے قریب بھی نہیں پھٹکی تھی۔ اَور مکافاتِ عمل کے تحت اُس کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہئے تھا۔

☆☆☆

(۴)

بی اے خاں صاحب نے بتایا ڈاکٹر ص بھی دیال سنگھ کالج کا پرنسپل تھا۔ انگریزی کا اُستاد تھا اَور کئی کتابوں کا مصنف تھا۔ بہت ہی بے دین اَور گمراہ آدمی تھا۔ دینی تعلیمات پر برملا تنقید کرتا تھا، خصوصاً قربانی کی بہت مخالفت کرتا تھا اَور اسے ظلم اَور دولت کا ضیاع قرار دیتا تھا حالانکہ اس کی بیوی قربانی دیتی تھی اَور داتا صاحب کی بڑی شیدائی تھی۔

بی اے خاں صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر ص کے دو بیٹے تھے۔ چھوٹا عین جوانی میں مر گیا۔ بڑے کی شادی کی، مگر دس بارہ سال تک اولاد ہی نہ ہوئی۔ پھر ایک آدمی نے ڈاکٹر ص کو بتایا کہ اگر آپ کی بہو فلاں پیر صاحب سے ملتی رہے تو اُس کی ''دعا'' سے لازماً اولاد ہو جائے گی اَور واقعی ایسا ہو گیا۔ ڈاکٹر ص کو تین چار پوتے مل گئے، مگر ڈاکٹر کا بیٹا درمیانی آدمی اَور پیر کا سخت مخالف تھا اَور دونوں کو منہ بھر بھر کے گالیاں دیا کرتا تھا۔

بی اے خاں صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر ص کی موت عجیب طریقے سے ہوئی۔ ٹی وی کا ایک پروگرام تھا: ''چہرہ''۔ اس میں معروف علمی شخصیات کے انٹرویو نشر ہوتے تھے۔ ڈاکٹر ص کا بھی انٹرویو ہو رہا تھا۔ نعیم بخاری کمپئر تھے، جو مزے مزے کے سوال کر رہے تھے اَور ڈاکٹر ص بہت خوش تھا، خوشی اُس کی پوری شخصیت سے چھلک رہی تھی کہ اچانک نعیم بخاری نے سوال کر دیا کہ ڈاکٹر صاحب وہ آپ کی سروس بریک کا کیا معاملہ تھا، اُس کا کیا سبب تھا؟

اس سوال کا ہونا تھا کہ ڈاکٹر ص کو جیسے زوردار کرنٹ لگا، وہ زور سے اچھلے، ایک طرف کو گر

پڑے اور وہیں دم توڑ گئے۔ سارے حاضرین حیرت اور صدمے کی کیفیت میں مبتلا ہو گئے۔

بی اے خاں صاحب نے بتایا کہ اصل بات یہ تھی کہ بی اے کرنے کے بعد ڈاکٹر ص اسکول ٹیچر ہو گیا تھا، وہ لواطت کے قبیح مرض میں مبتلا تھا، پکڑا گیا اور اس کی ملازمت ختم کر دی گئی۔ خان صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر ص ہمیشہ اس لعنت میں مبتلا رہا اور کبھی اس سے چھٹکارہ حاصل نہ کر سکا۔

(۵)

یہ الزام کی بات نہیں ہے کہ عزیز الدین شیخ ایک سکہ بند کمونسٹ تھے اُور بھٹو دور سے پہلے شاہ حسین کالج لاہور کے بانی پرنسپل تھے۔ پھر جب بھٹو نے سارے پرائیویٹ کالجوں کو قومیالیا، تو شاہ حسین کالج بھی سرکاری تحویل میں چلا گیا اُور چونکہ اس میں طلبہ کی تعداد بہت ہی کم تھی اُور یہ کامیابی سے چل بھی نہیں رہا تھا، اس لیے حکومت نے اس کا وجود ختم کر دیا اُور اس کے طلبہ اُور اساتذہ کو دوسرے کالجوں میں ''منتشر'' کر دیا گیا۔

اس کے بعد عزیز الدین شیخ اپنی ہم خیال گورنمنٹ کی عنایت سے محکمہ تعلیم میں بہت ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوئے۔ وہ ڈائریکٹر تعلیم بھی بنے، سیکنڈری بورڈ کے چیئرمین بھی اُور ٹیکسٹ بک بورڈ کے صدر نشین بھی۔ اُن کا ایک ہی بیٹا تھا، اُور وہ ڈائریکٹر تعلیمات تھے جب اُس نے ایف ایس سی پری میڈیکل میں بہت ہی اچھے نمبر ''حاصل'' کر لیے اُور وہ میرٹ پر کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں داخل ہو گیا۔

کسی بھی میڈیکل کالج میں ڈاکٹر بننے کے لیے پانچ سال کی مدت مقرر رہے، لیکن عزیز الدین شیخ کے بیٹے نے اسی کالج میں سات سال گزار دیئے، مگر وہ مطلوبہ کورس میں کامیاب نہ ہوا۔ حتیٰ کہ ایک سال اُس نے اپنی ایک لیڈی ٹیچر کو اغوا کر لیا اُور مجبور کیا کہ وہ اُسے لازماً اپنے پرچے میں پاس کر دے۔

جنرل ضیاء الحق کا دور تھا۔ یہ لیڈی ٹیچر نیوی کے چیف ایڈمرل یو کرامت کی قریبی عزیزہ تھی۔ معاملہ ایڈمرل تک پہنچا، اُور ضیاء الحق نے فوری طور پر عزیز الدین شیخ کو بھی ملازمت سے برطرف کر دیا اُور اُن کے بیٹے کو بھی کالج سے خارج کر دیا یہ معلومات مجھے دیال سنگھ کالج کے پروفیسر سعید شیخ نے مہیا کی تھیں جو کسی زمانے میں شاہ حسین کالج میں عزیز الدین شیخ کی سربراہی

میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ سعید شیخ کے بقول عزیز الدین شیخ کہا کرتے تھے کہ میرے اس اکلوتے بیٹے نے میری زندگی حرام کردی ہے۔ میری اگر سات بیٹیاں ہوتیں تو میں اس قدر پریشان نہ ہوتا جس قدر اس ایک بیٹے کی وجہ سے پریشان ہوں۔

(۶)

مَیں نے ۱۹۵۹ء میں اسلامیہ ہائی اسکول سمبڑیال سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ سکول کے آرٹس گروپ میں میری پہلی پوزیشن تھی۔ ادب اَور تاریخ میرے پسندیدہ مضامین تھے۔ چنانچہ اسی سال جب مَیں نے جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ کے سالِ اوّل میں داخلہ لیا تو دیگر مضامین کے ساتھ اُردو کا انتخاب کیا۔ اُردو کی حیثیت اُن دنوں اختیاری مضمون کی تھی۔ یہ ابھی لازمی مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھایا جارہا تھا۔

اُردو کی کلاس میں کم وبیش دس لڑکے تھے اَور ہمیں پڑھانے پر جو اُستاد مامور ہوئے، اُن کا نام اعجاز الرحمٰن تھا۔ گورے چٹے، وجیہ وشکیل اَور صحت مند نوجوان تھے۔ ہر اعتبار سے خوبصورت اَور دلکش شخصیت کے حامل تھے یہ الگ بات ہے کہ اُن کے جمال میں نسوانیت کا پرتو غالب محسوس ہوتا تھا۔ وہ لدھیانے کے کسی زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

انسان خوبصورت ہو، امیر ہو لیکن اُس کا علمی ذوق نہ بنا ہو یا جو کچھ اُس نے پڑھا ہو، اُسے سلیقے سے ہضم نہ کیا ہو تو وہ لامحالہ غرور میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پروفیسر اعجاز الرحمٰن کے ساتھ بھی یہی حادثہ گزرا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھے، لیکن وہ لائق ہرگز نہیں تھے، اُن کا مطالعہ بہت ہی محدود تھا، ترقی پسند ادباء وشعراء کی تخلیقات سے باہر نکلا ہی نہ تھا۔ مذہب یا تاریخ یا عمرانیات سے انہیں ذرا بھی مس نہ تھا۔ عربی فارسی سے قطعی نابلد تھے حالانکہ ادب کے ایک اُستاد کے لئے اِن مضامین سے ضروری واقفیت بڑی ہی لازم ہے۔

پھر یوں محسوس ہوتا تھا کہ انہیں کسی وجہ سے مذہب اسلام اَور دینی شعائر سے خداواسطے کا بیر تھا اَور وہ لہجہ بدل بدل کر اِن پر تنقید کرتے تھے اَور دین پسند ادباو شعرا، سب اُن کے نزدیک گردن

زدنی تھے۔ مولانا حالی کے تو گویا وہ جانی دشمن تھے۔ اُن کی مسدّس کے خوب لتّے لیتے، اَور اُن کی غزل پڑھاتے ہوئے اُن کے خیالات پر خوب تنقید کرتے، اَور وضاحت کرتے ہوئے بعض ترقی پسند نقادوں کے بہت ہی فحش فقرے بول جاتے۔ اسی طرح اکبر الہ آبادی پر بھی خوب برستے۔ مولوی نذیر احمد کی خوب درگت بناتے۔ البتہ کسی مصلحت کے تحت وہ اقبال کے معاملے میں نرم لب ولہجہ اختیار کرتے لیکن یہ ضرور بتاتے کہ اقبال کے ہاں تضادات ہیں، وہ فاشزم کی تبلیغ کرتا ہے، سوشلزم کے لئے نرم گوشہ رکھتا ہے اَور اُس نے اپنے بیشتر نظریات یورپ کے مختلف فلسفیوں سے اخذ کئے ہیں لیکن پھر بھی کسی کمپلیکس کے تحت یورپ پر سخت تنقید کرتا چلا جاتا ہے۔

پروفیسر اعجاز الرحمٰن کے کردار کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ وہ کلاس میں بڑی بے تکلفی سے فحش کلامی کرتے تھے۔ نہائت عریاں لطیفے سناتے، ہزلیہ شعر پڑھتے اَور وقتاً فوقتاً لڑکوں سے دریافت کرتے ''کبھی عشق کیا ہے؟ میر تقی میر کے والد کا یہ مشورہ بہت مفید ہے جو اُنہوں نے اپنے بیٹے کو دیا تھا کہ عشق کرو عشق ہی زندگی ہے اَور اسی عشق نے میر کو امر کر دیا تھا''۔

مَیں اپنے ایک استاد کے بارے میں یہ بات لکھتے ہوئے بہت ہی شرمندہ اَور معذرت خواہ ہوں کہ پروفیسر اعجاز الرحمٰن میں شرم وحیا نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ اندازہ کیجیے کہ وہ اپنے باپ پر بھی بے باکی سے تنقید کرتے تھے۔ کہا کرتے ''میرے باپ نے تین شادیاں کی تھیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ اُس کی بیٹی غیر مردوں کے سامنے نہ آئے...... کیوں نہ آئے وہ جوان ہے، خوبصورت ہے، اُس کا بھی جی چاہتا ہے لڑکوں سے باتیں کرے، ہنسے کھیلے''...... چنانچہ اُن کے کھلے ڈھلے اسلوبِ حیات کی وجہ سے کالج کے سارے اوباش اَور آوارہ منش لڑکے ان کے فدائی تھے اَور اس طرح ان کا گھیراؤ کئے رکھتے تھے جیسے وہ ان کے پیر ومرشد ہوں۔ حتیٰ کہ جب وہ کالج سے فارغ ہوتے تو یہ لڑکے انہیں ان کے گھر تک چھوڑ کے آتے۔

سچی بات ہے کہ مَیں پروفیسر موصوف کے روّیے سے سخت ہی نالاں تھا۔ میرے دوسرے ساتھی تو ان کی باتوں سے لطف لیتے، لیکن مَیں مسلسل کڑھتا رہتا۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض

کروں کہ ساتویں آٹھویں جماعت ہی سے مجھے مطالعے سے گہرا شغف ہو گیا تھا۔ مرحوم و مغفور نسیم حجازیؒ کو مَیں نے خوب توجہ سے پڑھا تھا اَور میرے دل و دماغ پر اُن کے گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ مَیں نے اسلامیات، تاریخ، ادب اَور دیگر عمرانی موضوعات سے متعلق بھی خاصا مطالعہ کر لیا تھا اَور چونکہ اللہ نے سلامتِ طبع عطا فرما رکھی تھی، اس لئے کالج تک پہنچتے پہنچتے مختلف حوالوں سے میری ایک رائے بن گئی تھی اَور مختلف رسالوں میں میرے ہلکے پھلکے تاثراتی مضامین میٹرک ہی میں چھپنے لگ گئے تھے۔ مَیں سالِ دوم سے سالِ چہارم تک کالج میگزین کا ایڈیٹر بھی منتخب ہوتا رہا اَور بی اے میں میرے طبع زاد مضامین ''اُردو ڈائجسٹ'' میں چھپنے لگے تھے۔ یہ رسالہ اُس زمانے میں ملک میں سب سے زیادہ چھپنے والا رسالہ تھا۔

چنانچہ مَیں اعجاز الرحمٰن کی انٹ شنٹ منفی تنقید سنتا تو سوالات کی صورت میں اُن کی تردید کرتا۔ چونکہ موصوف کا مطالعہ بہت ہی محدود تھا اَور ذہانت کی اُن میں شدید کمی تھی، اس لئے وہ اکثر سٹپٹا جاتے، مجھے خاموش رہنے کی تلقین کرتے اَور بعض اوقات سخت بھنا جاتے اَور دھمکیوں پر اُتر آتے اَور برملا کہتے ''مَیں امتحان میں تمہاری خبر لوں گا''۔ اصل میں ۶۰-۱۹۵۹ء میں محکمۂ تعلیم نے پہلی اَور آخری بار انٹر کے امتحان میں ایک نئی روایت کا آغاز کیا تھا۔ وہ یہ کہ ہر مضمون میں سے ۲۵ نمبر اُستاد کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے تھے یعنی ایک اُستاد کلاس روم میں اَور داخلی ٹیسٹوں میں طالب علم کے روّیے اَور کارگزاری کے مطابق ۲۵ میں سے جتنے نمبر چاہتا اُسے الاٹ کر سکتا تھا...... اعجاز الرحمٰن صاحب مجھے اپنے متذکرہ اختیار کی دھونس دیا کرتے تھے، مَیں جواب میں کہا کرتا کہ میرا نفع نقصان میرے خدا کے ہاتھ میں ہے، آپ کے اختیار میں نہیں ہے، اس لئے مجھے اس کی پروا نہیں اور مَیں آپ کی غلط اور قابلِ اعتراض باتوں سے اختلاف کرتا رہوں گا۔

لیکن دو سال کا سیشن ختم ہوا تو عجیب و غریب اَور پُر اسرار بات یہ ہوئی کہ پروفیسر اعجاز الرحمٰن صاحب نے مجھے ۲۵ میں سے ۲۴ نمبر مرحمت فرما دیئے تھے۔ مَیں اِسے خالص اللہ کی عنایت سمجھتا ہوں ورنہ وہ تو اخلاقی قدروں کے چنداں قائل ہی نہ تھے اَور اپنی دھمکی میں بڑے سنجیدہ تھے۔

مَیں کالج کے تیسرے سال میں تھا جب اعجاز الرحمٰن صاحب نے ایک افسوس ناک ناٹک رچایا اَور طالب علموں کے تین دن بُری طرح ضائع کر دیئے۔ ہوا یوں کہ اُن کا انتخاب پشاور یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں لیکچرار کی حیثیت سے ہوگیا، لیکن چونکہ وہ نمود و نمائش اَور شہرت کے بے حد رسیا تھے، اس لئے محض اپنی اہمیت جتانے کے لئے انہوں نے اپنے چاہنے والے آوارہ مزاج، غیر سنجیدہ لڑکوں میں یہ بات پھیلا دی کہ کالج انتظامیہ نے انہیں ملازمت سے فارغ کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک روز کالج نعروں کے شور سے گونج اُٹھا، گھنٹی بج اُٹھی اَور سارے لڑکے کلاسوں سے نکل کر باہر لان میں جمع ہو گئے۔ کچھ لڑکے واویلا کر رہے تھے کہ سوہنے پروفیسر کو کالج سے نکال دیا گیا ہے اَور یہ ہم برداشت نہیں کریں گے...... کالج میں گھنٹوں تک ہنگامہ رہا پھر زور زور سے گھنٹی بجی اَور لڑکے منتشر ہو کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔

دوسرے روز بھی یہی ہنگامہ رہا اَور تیسرے روز بھی۔ شاید پہلے اَور دوسرے روز کالج انتظامیہ سمجھ ہی نہ سکی کہ معاملہ کیا ہے اَور فتنے کی بنیاد کیا ہے۔ اعجاز الرحمٰن صاحب کے حلقۂ اثر کے لڑکے کسی کی سنتے ہی نہ تھے، کوئی ذمہ دار بات کرنا چاہتا تو وہ خوب نعرے بازی کرتے، ہوٹنگ کرتے اَور متعلقہ شخص زچ ہو کر خاموش ہو جاتا۔ آخر کار تیسرے روز شہر کی انتظامیہ حرکت میں آئی، ڈی سی صاحب آئے، مقبول عوامی رہنما خواجہ صفدر صاحب کو میں نے پہلے رہ زا اسی موقع پر دیکھا۔ اِن سب نے طالب علموں سے بات کی کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ اَور وہ چاہتے کیا ہیں؟ تب پتہ چلا کہ کسی کے پاس بھی کوئی ٹھوس مطالبہ نہیں۔ کچھ لڑکوں نے شکایت کی کہ سوہنے پروفیسر اعجاز الرحمٰن صاحب کو کالج سے نکالا جا رہا ہے۔ اس کے جواب میں پرنسپل نے وضاحت کی کہ اُن کی سلیکشن پشاور یونیورسٹی میں ہو چکی ہے اَور وہ خود اپنی مرضی سے، اپنی خوشی سے وہاں جا رہے ہیں۔ انہیں ہرگز ملازمت سے نہیں نکالا جا رہا...... اس پر موصوف کے حواریوں کے غبارے سے ہوا نکل گئی، عام طلبہ نے انہیں لعنت ملامت کی اَور اس طرح بڑی مشکلوں سے یہ ہنگامہ فرو ہوا۔

ثقہ روایت کے مطابق پشاور یونیورسٹی میں جا کر بھی اعجاز الرحمٰن صاحب نے اپنا مخصوص

روّیہ جاری رکھا، کلاس میں فحش گوئی کی اَور لڑکیوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی، تو وہاں ہنگامہ ہوگیا۔ پوری کلاس نے ہڑتال کردی اَور اعلان کردیا کہ ہم اس شخص سے ہرگز تعلیم حاصل نہیں کریں گے۔ کئی روز تک یہ ہنگامہ جاری رہا حتیٰ کہ بالآخر انہیں انتہائی خفیف ہو کر طلبہ سے معافی مانگنی پڑی اَور عہد کرنا پڑا کہ آئندہ وہ ایسی حرکت ہرگز نہیں کریں گے۔

اَور اس کے بعد اللہ کا کوڑا حرکت میں آ گیا۔ انہیں سب سے پہلے شوگر نے آلیا۔ لگتا ہے شدید رسوائی اَور غیر معمولی پریشانی نے انہیں اس مرض میں مبتلا کردیا...... پھر وہ ہائی بلڈ پریشر سے دوچار ہوئے اَور اس کے ساتھ ہی ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ بینائی بھی کم ہونے لگی اَور یہ عمل چھ سات سال تک جاری رہا۔ پشاور یونیورسٹی شعبۂ اُردو کے صدر ڈاکٹر شمس الدین صاحب سے لاہور میں ایک بار ملاقات ہوئی اَور مَیں نے اُن سے اعجاز الرحمٰن صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ دنیا جہاں کی بیماریوں کا مجموعہ بن گئے تھے اَور آخر میں تو اُن کا سارا جسم پھوڑوں سے بھر گیا تھا۔ وہ شدید ترین اذیت میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا تھا حتیٰ کہ ڈیڑھ دو سال اسی مصیبت کا سامنا کر کے وہ جان ہار گئے اَور چالیس سال سے بھی کم عمر میں وفات پا گئے۔ اللہ نے انہیں اولاد کی نعمت سے بھی محروم رکھا تھا۔

دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ایک شخص اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، اُس پر اتمامِ حجت ہو جائے اَور وہ اپنی روش کو ترک کر کے راست روی اختیار نہ کرے، تو پھر اللہ کا کوڑا حرکت میں آ جایا کرتا ہے اَور وہ عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

(۷)

ن م راشد اگست ۱۹۱۰ء میں حافظ آباد کے ایک مولویوں کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے کج فکری اَور بد عملی اس شخص کا مستقل شعار بنا رہا۔ ۱۹۳۵ء میں ماموں زاد سے شادی ہوئی۔ بیوی وفا شعار اَور سلیقہ مند تھی لیکن راشد نے اُسے عزت اَور محبت نہ دی۔ چار بیٹیاں اَور ایک بیٹا تھا۔ بیوی ہمیشہ شاکی رہی اَور بچے باپ کی محبت کو ترستے رہے۔

اکتوبر ۱۹۶۱ء میں ۲۶ سال کی رفاقت کے بعد بیوی فوت ہوگئی تو راشد نے اٹلی کی ایک اسکول ٹیچر شیلا انجلینی سے شادی کرلی۔ اس پر بچوں نے باپ کے خلاف باقاعدہ محاذ بنالیا۔ بیٹے شہر یار نے باپ سے پوچھے بغیر شادی کرلی اَور اسے شادی میں شرکت کی دعوت تک نہ دی۔

راشد کے آخری ایام سخت ذہنی کرب میں گزرے۔ اُن کی نئی بیوی سے بھی نہ بنی۔ دونوں میں ہروقت ٹھنی رہتی تھی جس کی وجہ سے گھر کی فضا تلخیوں میں ڈوبی رہتی۔

۱۰ /اکتوبر ۱۹۷۵ء کو ن۔ م راشد ہارٹ اٹیک سے فوت ہوگئے اُنہوں نے وصیت کی تھی کہ انہیں دفن کرنے کی بجائے جلایا جائے چنانچہ اُن کی میت کو بجلی کی بھٹی میں ڈال کر جلا دیا گیا۔ بیٹا باپ کی آخری رسوم میں شامل نہ ہوا۔

راشد ایک منکرِ خدا، جنس زدہ شاعر تھا۔ اپنی ہوس کا بے باکانہ اظہار کرتا ہے اَور خدا کے بارے میں گستاخانہ انداز اختیار کرتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ مَیں اس سلسلے میں چند اشعار بطورِ مثال پیش کروں، مگر قلم میں انہیں نقل کرنے کی تاب نہیں ہے۔ چنانچہ یہ شخص جو ساری عمر کرب اَور حزن کی آگ میں جلتا رہا اَور سکون اَور سچی مسرّت سے مکمل محروم رہا، اُس کی وجہ صاف سمجھ میں آتی ہے۔ خدا اَور خلقِ خدا کے ساتھ اس کا سلوک بہت ہی منفی تھا، جس کے صلے میں اللہ کا غصہ مختلف صورتوں میں اس پر بھڑکتا رہا۔ اَور اُسے اسی دنیا ہی میں آگ کے حوالے کردیا گیا۔

(ماخوذ ن م راشد۔ شخصیت اَور فن از ڈاکٹر ضیاء الحسن اکادمی ادبیات پاکستان)

(۸)

م۔ حسن لطیفی۔ کمیونسٹ شاعر اُور دانشور۔

بہت لائق آدمی تھے۔ جرمن، فرانسیسی اُور انگریزی زبانوں پر عبور تھا۔ فارسی کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے۔ لندن اُور پیرس کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل تھے۔

کسی زمانے میں بڑے خوش لباس اُور محفل نواز تھے، مگر نوجوان اکلوتے بیٹے کی موت نے انہیں مستقل طور پر افسردہ و غمگین بنادیا...... اُور مسکراہٹ اُن کے لبوں سے مستقل طور پر رخصت ہوگئی۔

(مضمون اے حمید۔ نوائے وقت میگزین ۰۷-۵-۶)

---

(۹)

سیّد علی عباس جلالپوری

بائیں بازو کے نامور مصنف اُور محقق تھے۔ بہت لائق اُور وسیع المطالعہ شخص تھے۔ ایم اے اُردو، ایم اے فارسی (گولڈ میڈلسٹ)، ایم اے فلسفہ (گولڈ میڈلسٹ) تھے۔ مختلف موضوعات پر کم وبیش پندرہ کتابیں تصنیف کیں۔ سرکاری کالجوں میں ملازم رہے، ۱۹۷۴ء میں ریٹائر ہوئے۔

پوری زندگی تشکیک بلکہ الحاد کا پرچار کیا۔ انہیں اسلامی تعلیمات سے خدا واسطے کا بُغض اُور عناد تھا۔ ۱۹۸۴ء یعنی ستر سال کی عمر میں بیمار ہوئے۔ پانچ سال لاٹھی کے سہارے چلتے رہے لیکن بعد کے نو سال معذوری کی حالت میں بستر پر پڑے رہے دسمبر ۱۹۹۸ء میں وفات پائی۔

(مضمون اکرام خالد مطبوعہ ایجوکیشن کارنر لاہور تاریخ نامعلوم)

(۱۰)

مبارک احمد

کٹڑ کمونسٹ دانشور۔ ترقی پسند تحریک کا سرگرم کارکن۔ ہمیشہ ماؤ کیپ پہنے رکھتا۔
اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ ذہنی اعتبار سے نارمل نہیں تھا۔
(کالم افضل توصیف ''پاکستان'' ۰۶-۱۲-۷)

☆☆☆

(۱۱)

مشہور شاعر فراق گورکھپوری بچپن ہی سے بہت ذہین لیکن غیر معمولی حسن پرست اُور عشق باز تھے۔ خصوصاً لڑکوں سے عشق کے معاملے میں وہ بہت بدنام تھے۔ اس کی سزا انہیں یہ ملی کہ اُن کی شادی ایک ایسی لڑکی سے ہوگئی جو خوبصورت بھی نہیں تھی اُور سمجھ دار بالکل نہیں تھی۔ اُن کے الفاظ ہیں ''پھوہڑ، بدسلیقہ، بدصورت''۔ ''زندگی ناقابلِ برداشت عذاب بن گئی''۔ ''پورے ایک سال شادی کے بعد مجھے نیند نہیں آئی اُور عمر بھر اس مصیبت کو بھول نہیں سکا۔ آج تک مَیں اس بات کے لیے ترس گیا ہوں کہ کسی کو اپنا سمجھوں یا کوئی مجھے اپنا سمجھے''۔

فراق گورکھپوری بے خوابی اُور مسلسل کرب کی وجہ سے ''سنگرہنی'' کی بیماری میں مبتلا ہو گئے''۔ ۲۴ گھنٹوں میں ایک پل بھی ایسا نہیں گزرتا تھا کہ مجھ کو اپنی ازدواجی زندگی کی بدنصیبی بھول سکے''۔

فراق کا ایک بیٹا ہوا۔ وہ مخبوط الحواس تھا۔ اس نے جوانی میں خودکشی کرلی۔
(''جہانِ فراق'' مرتبہ تاج سعید۔ ''سنگِ میل'' لاہور ۱۹۹۱ء)

(۱۲)

''کاوش رضوی''

شاعر، نثر نگار، دانشور، کٹر کمونسٹ تھے۔

۱۹۲۵ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ عمر بھر کمیونزم کے فروغ واشاعت کے لیے کام کیا۔ سیاسی حوالے سے نیپ اَور پیپلز پارٹی سے وابستہ رہے۔

پانچ بیٹیاں تھیں، دو بیٹے تھے۔ بڑا بیٹا ذہنی طور پر معذور تھا۔

۱۹۷۸ء میں سڑک کے ایک حادثے میں ان کی ایک ٹانگ بُری طرح ٹوٹ گئی جو متعدد مرتبہ اپریشن کے باوجود ٹھیک نہ ہوئی لہٰذا ۱۹۹۰ء یعنی وفات تک بارہ برس معذوری کی زندگی گزارتے رہے۔ ۱۹۸۵ء میں اُن کی بیگم ایک حادثے کا شکار ہو کر فوت ہو گئی تھیں۔

(''جنگ'' سنڈے میگزین ۲۰۰۰-۶-۱۱)

(۱۳)

گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ میں بائیں بازو کے اساتذہ کے قائد رانا ناظر تھے۔ وہ اخلاقی ودینی قدروں کے سخت مخالف تھے اَور اسلام دشمن قوتوں کے حامی اَور منفی ذہنیت کے راہنماؤں کے پرستار تھے۔

جنوری 1980ء میں گوجرانوالہ سے میرا تبادلہ ہو گیا اَور مَیں لاہور آ گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی یعنی پچپن چھپن سال کی عمر میں رانا ناظر کی اپنے عزیزوں سے لڑائی ہو گئی اور اُن کے بھتیجے نے انہیں گولی مار کر قتل کر دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آئی تو پولیس افسروں کا تبصرہ تھا کہ قاتل بہت بیوقوف تھا، اس نے خواہ مخواہ قتل کا الزام اپنے سر لے لیا۔ کیونکہ پروفیسر رانا کے دونوں گردے تباہ ہو چکے تھے اَور وہ بہت جلد موت سے ہمکنار ہونے والا تھا۔

رانا ناظر کو اللہ نے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔

(۱۴)

ذاتی ڈائری کا ایک ورق

۱۰؍فروری ۱۹۹۷ء

پ۔ملک سائنس کالج میں سوشیالوجی کا وہ پھکڑ باز پروفیسر ہے جو بے حد غیر سنجیدہ ہے اُور فحش گوئی میں جواب نہیں رکھتا وہ بے عمل ہی نہیں بلکہ دین اسلام کا کھلا دشمن ہے۔ دینی شعار کا مذاق اڑانے کا کوئی موقع وہ ضائع نہیں کرتا۔

آج کنٹرولر امتحانات کے کمرے میں اُس کی زبانی یہ سن کر میں بہت خوفزدہ ہوا کہ اس کا ایک ہی بیٹا ہے، تھرڈ ائیر کا طالب علم ہے اُور اسی کم عمری میں دل کی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اُور اس کی بینائی بھی کمزور ہو رہی ہے۔

اللہ معاف فرمائے میں نے عزیز الدین شیخ، ظفر علی خان، جاوید شیخ، رانا ناظر اُور اب پ ملک کے معاملے میں دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو دین کے دشمن ہیں، انہیں اولاد کے حوالے سے اللہ نے سخت آزمائشوں مین مبتلا کر رکھا ہے۔ کاش یہ لوگ عبرت حاصل کریں۔(10-2-1997)

ضمیمہ

ڈبن پورہ کی حقیقت......قدرتِ خداوندی کے غصّے کی ایک مثال

ملتان روڈ لاہور پر علامہ اقبال ٹاؤن کے سامنے کھاڑک نام کا ایک قدیم گاؤں ہے۔اس کے عقب میں ڈبن پورہ کے نام سے ایک آبادی ہے۔ یہ دراصل بیس فٹ گہری جگہ تھی جسے غریب اَور متوسط درجے کے لوگوں نے سستے داموں خریدا اَو وہاں گھر تعمیر کر لیے......مگر ۱۹۷۷ء سے پہلے یہاں بہت زرخیز زرعی زمین تھی جہاں ہر طرح کی فصلیں اَور سبزیاں بڑی افراط سے پیدا ہوتی تھیں۔ یہ قطعہ ایک مربع یعنی پچیس ایکڑ زمین پر مشتمل تھا اَور اس کا ایک ہی مالک تھا،لیکن ۱۹۷۷ء میں دریائے راوی میں سیلاب آیا اَور پانی کی تندوتیز لہریں اس پورے مربعے کو بہا کر لے گئیں اَور یہاں بیس فٹ گہرا گڑھا بن گیا جو تقریباً بیس برس تک بے آباد اَور ویران پڑا رہا تا آنکہ اس صدی کے آغاز میں لوگوں نے اسے رہائشی آبادی میں تبدیل کر دیا۔

سوال یہ ہے کہ ایک بے حد زرخیز زرعی زمین کا پورا ایک مربع کیوں برباد ہوا،اُسے دریا کی لہریں کیوں نگل گئیں، اَور یہ پورا قطعۂ زمین بیس فٹ گہرے گڑھے میں کیوں تبدیل ہوگیا؟ دراصل یہ مکافاتِ عمل کی بڑی ہی ڈرا دینے والی اَور عبرت ناک کہانی ہے اس کا ذکر میرے سامنے سب سے پہلے نوید الاسلام صدیقی صاحب نے کیا تھا اَور اُن کی تحریک پر مَیں عبدالغفار صاحب سے ملا جنھوں نے مجھے ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔

عبدالغفار صاحب (تاریخ پیدائش ۱۹۵۰-۳-۳ سمندری) مشروبات کی مشہور کمپنی امرت کولا میں شپنگ منیجر ہیں اَور منصورہ کے عقب میں ایک بستی کرامت کالونی میں رہتے ہیں۔ اُنھوں نے بتایا کہ وہ ۱۹۷۷ء میں کوکا کولا فیکٹری میں شپنگ انچارج کی حیثیت سے ملازم تھے۔ یہ فیکٹری کھاڑک کے سامنے ملتان روڈ پر واقع ہے۔اگست کا مہینہ تھا کہ دریائے راوی میں سیلاب آ گیا۔دریا بپھر کر کناروں سے باہر آ گیا اَور اس نے موجودہ سبزہ زار سکیم کے زرعی علاقے اَور

کھاڑک کا رُخ کرلیا اور کھاڑک کے عقب میں ایک لہلہاتے ہوئے زرخیز مربعے کو نشانے پر رکھ لیا۔ دریا کا بہاؤ یہاں اس قدر تیز تھا اور وہ زمین کو یوں کاٹتا جارہا تھا جیسے آری لکڑی کو کاٹتی ہے۔ یہ سلسلہ چار دن تک جاری رہا حتیٰ کہ پورا مربع دریا بُرد ہوگیا اور جب یہ عمل مکمل ہوا تو سیلاب کی تندی و تیزی ختم ہوگئی اور یہ پیچھے ہٹ کر اپنی اصل گزرگاہ میں چلا گیا...... یوں لگا جیسے دریا اسی مربعے کو نگلنے کے لیے کناروں سے باہر آیا تھا اور اپنا فرض انجام دے کر واپس چلا گیا۔

اب سنئے کہ یہ انوکھا حادثہ کیوں رونما ہُوا۔ عبدالغفار صاحب نے بتایا کہ وہ اس زمانے میں اپنے تین چار دوستوں کے ساتھ غفوری مسجد کھاڑک کے قریب ایک مکان میں کرائے پر رہتے تھے۔ پتہ چلا کہ اس مربعے کا مالک ادھیڑ عمر کا ایک زمیندار تھا جو بہت ہی بد اخلاق اور ظالم آدمی تھا۔ اُس کی زمین سونا اگلتی تھی اور ہر طرح کی فصلیں افراط سے ہوتی تھیں، لیکن اس زمیندار میں رحم یا نرمی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وہ غرور میں اندھا ہوگیا تھا۔ اُس زمانے میں لوگ رفعِ حاجت کے لیے کھیتوں ہی میں جایا کرتے تھے مگر یہ زمیندار انہیں اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ کوئی اس کے کھیت میں جاتا تو یہ اُسے پتھر مارتا اور ننگی گالیاں دیتا اور ڈنڈے سے اُس کا تعاقب کرتا۔ کوئی فرد اُس کے ٹیوب ویل پر نہا نہیں سکتا تھا، کوئی عورت کپڑے نہیں دھو سکتی تھی اور کوئی بچہ اس کے کھیت میں جاکر گاجر یا مولی توڑنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ایسی حرکت کرنے والے سب افراد کی توہین و تذلیل کرتا اور انہیں کڑی سزا دیتا تھا۔ وہ اس معاملے میں کسی سے بھی رو رعایت کا قائل نہ تھا اور انتہائی بے مروّتی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کرتا تھا۔

اس زمیندار کا یہ روّیہ جب خلقِ خدا کے ساتھ ایک عرصے تک جاری رہا تو آخر اللہ کی قدرت کا غصہ حرکت میں آگیا اور وہ واقعہ ظہور میں آیا جس کا ذکر گزشتہ سطور میں آچکا ہے۔ دریا نے سب کچھ یکا یک تہ و بالا نہیں کیا بلکہ یہ عمل چار دن تک جاری رہا۔ روزانہ مربعے کا کچھ حصہ کٹ کر دریا بُرد ہوتا اور زمیندار یہ دردناک تماشا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا حتیٰ کہ اس کا سارے کا سارا مربع غائب غلہ ہوگیا، اُس کا ٹیوب ویل، کنواں، ڈیرہ، درخت پھل دار پودے اور فصلیں

سب اس کی نظروں کے سامنے برباد ہو گئیں اور سیلاب ختم ہونے پر جب اُس نے دیکھا کہ اُس کے جنت نظیر مربعے کی جگہ بیس فٹ گہرا تالاب بن گیا ہے تو وہ اپنے حواس کھو بیٹھا، اُس کے دماغ کی رگ پھٹ گئی اور وہ اپنے معدوم رقبے کے کنارے گر کر دم توڑ گیا۔

برباد شدہ رقبے کا پانی خشک ہوا تو دیکھا گیا کہ مٹی پر ریت کی بہت موٹی تہہ چڑھی ہوئی ہے گویا مستقل انتظام کر دیا گیا کہ اس زمین پر مستقبل میں کوئی بھی چیز کاشت نہ کی جا سکے۔

اسی مصنف کی دیگر کُتب

۱۔ ''ہم کیوں مسلمان ہوئے؟'' دنیا بھر کے ۹۰ نومسلموں کا تذکرہ، بے حد دلچسپ، بہت ایمان افروز اور روح پرور۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی بڑی کتاب، مقبولیت کا یہ عالم کہ اس کا حال ہی میں سترھواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ صفحات ۶۱۹، قیمت ۳۳۰ روپے۔

۲۔ ''ہمیں خدا کیسے ملا؟'' دنیا بھر کی ۸۱ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے قبولِ اسلام کے واقعات۔ یہ بھی اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اسلام کی حقانیت کے منہ بولتے سچے واقعات۔ اس کا ساتواں ایڈیشن شائع ہوا ہے۔ پہلا ایڈیشن ۲۰۰۰ء میں چھپا تھا۔ صفحات ۴۹۰، قیمت ۲۷۵ روپے۔

۳۔ "Our Journey to Islam" ایک سو نومسلموں کا تذکرہ انگریزی میں۔ اپنے موضوع پر بھرپور، جامع کتاب۔ صفحات ۵۱۱، قیمت ۳۰۰ روپے۔

۴۔ ''کاروانِ عزیمت'' عہدِ حاضر اور ماضیِ قریب کے دس ایسے بزرگوں کے تذکرے جو تقویٰ وللّٰہیت اور دعوت وتبلیغ کے حوالے سے بے مثال کردار کے حامل تھے۔ اس کتاب کی تحقیق وتالیف پر مصنف کے پانچ سال صرف ہوئے۔ صفحات ۵۱۰، قیمت ۲۸۰ روپے۔

۵۔ ''اوصافِ حمیدہ'' بے مثال دینی ودعوتی کردار کی مالک خاتون محترمہ حمیدہ بیگم کے سوانحی حالات اور دینی خدمات کا تذکرہ۔ محترمہ شادی کے بعد جب پہلے روز اپنے خاوند کے گھر تشریف لائیں اور محلے کی عورتیں انھیں دیکھنے کے لیے جمع ہوئیں تو انھوں نے وہیں، اُسی محفل میں درسِ قرآن شروع کردیا اور پھر زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کا ذکر بلند کرنے میں گزار دیا۔ صفحات ۳۲۰، قیمت ۱۵۰ روپے۔

۶۔ ''ماہر القادری...... حیات اور ادبی خدمات'' نامور شاعر، نعت گو، ناول نگار، افسانہ

نویس، ماہرِ لسانیات، مبلغ، دانشور، صحافی اور مفکر مولانا ماہر القادری کے حالات اور علمی و ادبی کارناموں پر مشتمل کتاب...... یہ مصنف کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ صفحات ۵۰۷، قیمت ۲۷۵ روپے

۷- ''چودھری علی احمد خاں'' ایک فردِ بے مثال کا تذکرہ۔ وہ ۱۹۴۴ء میں تھانیدار تھے، مگر محض اللہ کی رضا کی خاطر ملازمت چھوڑ کر ساری صلاحیتیں دینِ حق کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے وقف کر دیں۔ وہ بلاشبہ عہدِ صحابہؓ کی ایک سچی تصویر تھے۔ صفحات ۸۰، قیمت ۶۰ روپے

۸- ''کلیاتِ ماہر القادری'' ۱۰۵۰ صفحات پر مشتمل مولانا ماہر القادری کا مدّون، غیر مدّون، مطبوعہ، غیر مطبوعہ کلام یکجا کر دیا گیا ہے۔ قیمت ۹۰۰ روپے۔

۹- ''مغرب پر اقبال کی تنقید'' اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب۔ اہل نظر نے بہت پسند کی ہے۔

۱۰- ''یہ ہے مغربی تہذیب'' ۱۹۸۵ء سے ۲۰۰۶ء تک بیس برسوں کے اخبارات کے تراشے۔ ایک چونکا دینے والی، معلومات افزا کتاب جس میں امریکہ اور یورپ میں خاندانی زندگی کی تباہی، بچوں اور عورتوں کی حالتِ زار، اخلاقی اور عمومی جرائم اور مکافاتِ عمل کا عبرت ناک نقشہ سامنے آتا ہے۔ صفحات ۳۴۴، قیمت ۱۸۰ روپے۔

۱۱- ''مولانا مودودیؒ اور محترمہ مریم جمیلہ کی مراسلت''۔ انگریزی سے ترجمہ جو اہلِ نظر نے بہت پسند کیا ہے۔ صفحات ۱۲۸۔

۱۲- کائنات کے پانچ راز قرآن وسنت اور جدید ترین سائنسی تحقیقات کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ برمودا مثلث کا راز کیا ہے؟ اُڑن طشتریاں اور بلیک ہولز کیا ہیں اور ناسا کی تصویریں دراصل کیا ہیں؟ ٹھوس دلائل کے ساتھ اس کتاب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دنیا میں گرمی کیوں بڑھ رہی ہے اور گلیشیر کیوں پگھل رہے ہیں۔ ایک منفرد، اچھوتی تحقیق، ایمان افروز، فکر انگیز تجزیہ۔ صفحات ۳۲، قیمت ۱۵ روپے۔

''مکافاتِ عمل۔دید و شنید''

عہدِ حاضر کے مشہور مصنف، مبلّغ اور محقق ڈاکٹر گوہر مشتاق (پی ایچ ڈی، مقیم امریکہ) اپنی قابلِ قدر کتاب ''موسیقی، اسلام اور جدید سائنس کی روشنی'' میں لکھتے ہیں۔

''اگر ہم قرآن کے انداز پر غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ ایک طریقہ جس سے قرآن اپنا پیغام لوگوں کے دل و دماغ تک پہنچاتا ہے، وہ سچے واقعات کا بیان ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہیکہ واقعات کے ذریعے پیغام پہنچانا زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے، بہ نسبت خشک اندازِ بیان کے۔انسانوں کو ایسے واقعات کی ضرورت ہوتی ہے جن کے ذریعے وہ زندگی میں کوئی سبق حاصل کر سکیں۔اس کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ واقعات کا تعلق تاریخ سے ہوتا ہے اور قرآن ہمیں ہمیشہ تاریخ سے سبق حاصل کرنا سکھاتا ہے۔قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ (سورۃ الاعراف آیت ۱۷۶)

''پس بیان کرو واقعات تاکہ لوگ غور و فکر کریں۔''

اور اس کتاب کو مرتّب کرنے کا میرا بھی واحد مقصد یہ ہے کہ اپنے قارئین تک اسی معاشرے کے جیتے جاگتے، زندہ واقعات پہنچائے جائیں جو اُن کے لیے عبرت اور نصیحت کا ذریعہ بن جائیں اور جسکے نتیجے میں اُن کے اخلاق کی تعمیر ہو، وہ روزمرہ زندگی میں غیر سنجیدگی کو ترک کر دیں اور انہیں بعض حکماء کے اس قول کی صداقت کا یقین ہو جائے کہ جو شخص دنیا کی چیزوں پر بغیر عبرت حاصل کیے نظر ڈالتا ہے، اس کے دل کی آنکھیں اس غفلت کے نتیجے میں کمزور ہو جاتی ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ میرے قارئین کو شرحِ صدر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص اور نیکی کو کبھی ضائع نہیں کرتا اور اس دنیا میں بھی اس کا صلہ اور انعام عطا فرما دیتا ہے جبکہ بدنیتی، بدخواہی، بددیانتی اور ظلم و طغیان کو وہ ہرگز گوارا نہیں کرتا اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو دنیا میں بھی لازماً اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔

(مصنّف)

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 021-32212991, 32633887

کتاب سرائے
پبلشرز، امپورٹرز، منیجان کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ پاکستان
فون: 042-37320318 فیکس: 042-37239884

Designed by Naveed Ahmad 0321 840 1998